استاذ الکل

حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی رح

نور الحسن راشد کاندھلوی

حضرت مفتی الٰہی بخش اکیڈمی

کاندھلہ، ضلع مظفر نگر ۔ ۲۴۷۷۷۵

دہلی کالج کے صدر مدرس اور روح رواں

استاذ الکل

حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی ؒ

احوال و خدمات، تصانیف و تراجم، آثار، خاندان اور تلامذہ

تالیف

نور الحسن راشد کاندھلوی

ناشر

مفتی الٰہی بخش اکیڈمی،

کاندھلہ، ضلع مظفّر نگر (یوپی) انڈیا

Ustazul Kul Hazrat Molana MAMLOOKUL ALI Nanotvi.

Author:

Noorul Hasan Rashid Kandhlavi

Publisher:

MUFTI ELAHI BAKHSH ACADEMY,

KANDHLA (Muzaffar Nagar), U.P., India. Pin: 217775

Price: In India Rs.300/ only.

From other countrues: USD 20 only.

Library Edition (Hard Bound): INR 400/= , USD 25 only.

1st Print: March 2009/-Rabiul Awwal, 1430 H.

نام کتاب: استاذ الکل حضرت مولانا مملوک العلیؒ نانوتوی

(جس میں صاحب سوانح کے احوال و خدمات، تصانیف و تراجم، مکتوبات و آثار اور تذکرہ تلامذہ کے علاوہ ان کے وطن نانوتہ کی تاریخ، آبا و اجداد اور خاندان کے مختصر حالات، نانوتہ کے مشائخ و علماء، تعلیم کے لئے مولانا کے سفر و اساتذہ کرام، دہلی کالج کے شعبہ تدریس سے وابستگی، کالج کے دیگر علمی و اشاعتی کاموں کی نگرانی، تدریس میں انہماک، گھر پر بھی طلباء کا ہجوم و اسباق، دیگر تعلیمی اداروں سے وابستگی کی روایات، حزب ولی اللہی اور تحریک سید احمد شہیدؒ سے تعلق، دینی و اصلاحی خدمات اور فتاوٰی کی تصدیق وغیرہ کا احاطہ کیا گیا ہے۔)

مؤلف: نور الحسن راشد کاندھلوی

ناشر: مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، کاندھلہ، ضلع مظفر نگر، یوپی

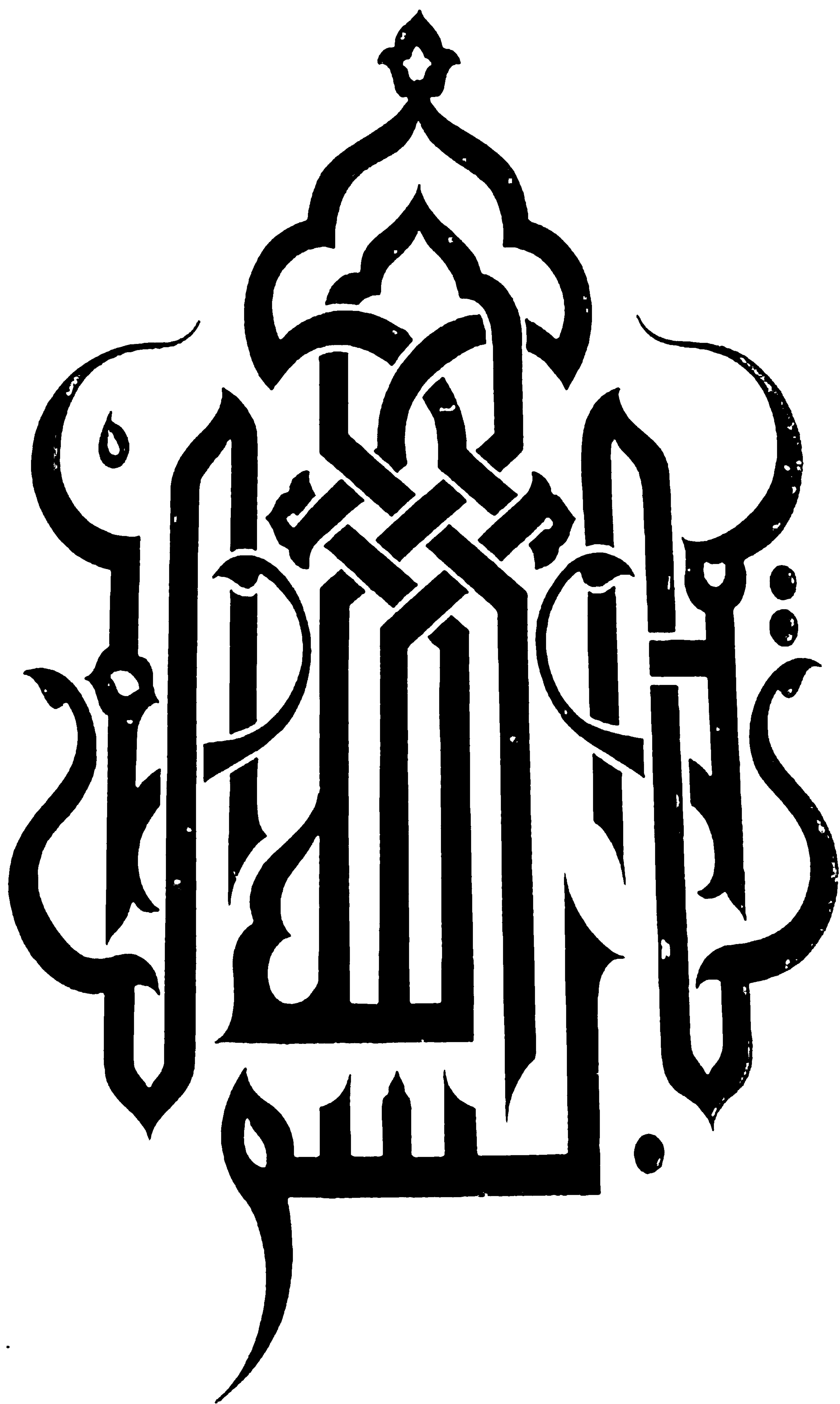
پاکستان میں حق اشاعت: محمد ندیم، دار الکتاب، اردو بازار لاہور

طباعت: بار اول: مارچ ۲۰۰۹ء مطابق ربیع الاول ۱۴۳۰ھ، تعداد: ایک ہزار

قیمت: ہندستان میں 300/روپیہ، بیرون ہند سے 25/امریکی ڈالر

لائبریری ایڈیشن مجلد: 400/روپیہ/ 20/امریکی ڈالر

Printer:



بہ تری صورت سے کسی کی نہیں ملتی صورت
ہم جہاں میں تری تصویر لئے پھرتے ہیں

امام بخش ناسخ لکھنوی

نوٹ: یہ شعر (شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے والد ماجد) مولانا ذوالفقار علی دیوبندی نے اپنی تالیف 'الهدية السنية فی ذکر المدرسة الديو بندية' (مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء) میں مولانا مملوک العلی کے تعارف میں درج کیا ہے۔ ناسخ کے دیوان (مطبوعہ منشی نولکشور، لکھنؤ ۱۳۲۳ھ) میں یہ شعر (ص ۱۱۱ پر) اسی طرح درج ہے جبکہ 'الهدية السنية' میں قدرے مختلف درج ہوگیا ہے۔ مؤلف)

فہرست عنوانات

ابتدائیہ اور متعلقات

۱

نانوتہ کی مختصر تاریخ اور چند نامور مشائخ اور علماء

۲

صدیقی خاندان کی نانوتہ میں آمد اور قیام

۴

مولانا کے اساتذہ کے مختصر حالات

۵

دہلی کالج کا پس منظر اور قیام

مدرسہ غازی الدین حیدر سے دہلی کالج تک مدرسہ دہلی، ابتدائی مدرسین، نظام تعلیم اور طریقۂ تعلیم پر مشرقی مدارس کا اثر، مغربی اثرات سے بڑی حد تک حفاظت اور مشرقی شعبہ کا مغربی شعبہ سے امتیاز اور متعلقات

۶

مولانا مملوک العلی کا دہلی کالج میں تقرر

۷

مولانا مملوک العلی کے عہد میں دہلی کالج

نصاب تعلیم، درجوں کی کیفیت، امتحانات کے بہتر نتائج، مولانا کے شاگردوں کی اعلیٰ ترین استعداد اور مولانا کی تربیت کے اثرات

۱۳

مولانا مملوک العلی کی تصانیف، مؤلفات، حاشیے اور ترجمے

۱۴

حضرت مولانا کا ایک عربی مکتوب صنعت مہملہ میں، منقولہ کریم الدین پانی پتی

حاشیہ کے چند اہم مندرجات

تعارف شخصیات

چند متفرق حاشیے اور توضیحات

۲۲

حضرت مولانا مملوک العلی نانوتویؒ کی مکتوبہ چند اہم تحریرات وتصانیف اور مکان ومدفن کے عکس

۳۷۱	۶	'لامیہ صلاح الدین صفدی' مکتوبہ مولانا مملوک العلی کا آخری صفحہ۔ تحریر کے آخر میں درج ہے: 'تمام شد الراقم مملوک علے'	559
	۷	مولانا مملوک العلی کی بیاض میں درج ایک عربی یادداشت، جس پر مولانا کے دستخط ثبت ہیں: 'نوشتہ مملوک الطلباء مملوک علے'	560
۳۷۲	۸	حضرت مولانا مملوک العلی کی بیاض میں ان کا مکتوبہ قصیدہ کا ایک صفحہ	561
	۹	حضرت مولانا مملوک العلی کی بیاض کا ایک اور صفحہ	562
۳۷۴	۱۰	عربی سے ترجمہ مولانا مملوک العلی کی 'تحریر اقلیدس کے چار مقالہ اول' کی پہلی طباعت کا سرورق۔ جیومیٹری کی یہ کتاب ۱۸۴۴ء میں مکتبہ رفاہ عام، دہلی سے باہتمام مولوی کریم الدین شائع ہوئی۔ یہ مسودہ خود مولانا مملوک العلی کا مکتوبہ ہے۔	563/1
	۱۱	'تحریر اقلیدس، چار مقالہ اول' کا ایک اندرونی صفحہ جس میں 'مثلث' 'مربع' اور 'کثیر الاضلاع' سطحی اشکال کی اقسام بیان کی گئی ہیں۔	563/2
	۱۲	مولانا مملوک العلی کی مرتبہ مصححہ اور تحشیہ 'تاریخ یمنی' کی پہلی طباعت کا سرورق۔ یہ کتاب دہلی کالج (مدرسہ دہلی) کے اپنے مکتبہ سے طبع ہوئی۔	564/1
	۱۳	'تاریخ یمنی' پہلی طباعت کا اندر کا ایک صفحہ۔	564/2
۳۷۵	۱۴	دہلی کالج (مدرسہ دہلی) کی ایک نادر یادگار۔ سند توصیف جو جنوری ۱۸۳۰ء میں مولانا نورالحسن کاندھلویؒ کو عطا کی گئی۔	565
	۱۵	مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کا تحریر کردہ تصفیہ نامہ تنازعہ عیدگاہ کاندھلہ مکتوبہ ۳رشعبان ۱۲۸۹ھ، دوشنبہ	566
۳۷۶	۱۶	کشمیری گیٹ، پرانی دہلی کے بڑے ڈاکخانہ سے متصل 'گورو گوبند سنگھ اندر پرستھ یونیورسٹی' کے احاطہ میں 'لائبریری داراشکوہ' کی وہ عمارت جس میں دہلی کالج کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اب اس عمارت میں محکمہ آثار قدیمہ کی لائبریری و میوزیم ہے۔	567

۲۳

اشاریہ

ترحیب

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری

شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند

سورۃ النمل آیت:۵۹ میں ارشاد پاک ہے: قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى، آللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ. **ترجمہ**: کہئے تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔ اور اس کے ان بندوں پر سلام ہو جن کو اس نے منتخب فرمایا۔ بتاؤ اللہ تعالیٰ بہتر ہیں، یا بندے جن کو وہ شریک ٹھہراتے ہیں؟

بے شک اللہ تعالیٰ ہی بہتر ہیں، وہی معبود ہیں، ان کا کوئی شریک وسہیم نہیں۔ کیوں کہ تمام کمالات انہیں کی طرف دوڑتے ہیں۔ اور تمام صفات حمیدہ ان کی خانہ زاد ہیں۔ پس وہی تمام تعریفوں کے مستحق اور سزاوار ہیں۔ اور جن بندوں میں کوئی دینی کمال پایا جاتا ہے، جیسے رسولوں میں رسالت، نبیوں میں نبوت، علماء میں علمیت اور اولیاء میں ولایت...... جن سے دھوکہ کھا کر لوگ ان کو مرتبہ معبودیت پر فائز کرتے ہیں، وہ سب خوبیاں اللہ تعالیٰ ہی کی بخشی ہوئی ہیں۔ ان کمالات کی وجہ سے ان میں شان الوہیت پیدا نہیں ہوتی البتہ ان کمالات کی وجہ سے ان کی شان دوبالا ہوتی ہے۔ وہ اللہ کی طرف سے امن وسلامتی کے مستحق ہوتے ہیں۔ یہ آیت کریمہ رسولوں، نبیوں کے ساتھ خاص نہیں، اس کے الفاظ عام ہیں۔ العبرۃ لعموم اللفظ لالخصوص المورد، پس اللہ تعالیٰ کے تمام پسندیدہ بندے آیت کریمہ کے

مصداق ہیں۔

بزرگان دیوبند کے سرخیل حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہی، اور حضرت اقدس مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہما ہیں، انہیں دونوں بزرگوں سے یہ روحانی اور علمی سلسلہ قائم ہوا ہے۔ روحانیت میں ان کے پیشوا حضرت اقدس سید الطائفہ حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی مکی قدس سرہٗ ہیں اور علمیت میں ان کے استاذ، استاذ الکل حضرت اقدس مولانا مملوک العلی صاحب نانوتوی قدس سرہٗ تھے۔

حضرت حاجی صاحب سے جماعت دیوبند کسی درجہ میں واقفیت رکھتی ہے، لیکن مولانا مملوک العلی صاحب سے کماحقہ واقف نہیں، اس لئے ضرورت تھی کہ آپ کی کوئی مفصل سوانح مرتب کی جاتی جو جماعت دیوبند کے لئے سرمۂ بصیرت بنتی۔ اس ضرورت وخدمت کا اوروں کے علاوہ مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی کو بھی بہت احساس تھا مولانا زید فضلہ نے اس فرض کفایہ کی تکمیل اور اس سوانح کی تصنیف کے لئے قلم اٹھایا اور محنت شاقہ برداشت کر کے، استاذ الکل حضرت مولانا مملوک العلی نانوتویؒ کا بہت عمدہ جامع اور مفصل تذکرہ مرتب کر دیا۔ مولانا راشد دوآبہ(۱) کے علماء واولیاء کے حالات پر مبصرانہ، بلکہ مجتہدانہ نظر رکھتے ہیں، وہ استنباط احوال کا گُر بھی جانتے ہیں، واقعات کی مفقود کڑیوں کو ملا دیتے ہیں اور اہم بات یہ ہے کہ پیشیں سوانح نگاروں پر انگلی رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

میں نے اس کتاب کا معتد بہ حصہ پڑھا ہے، صاحب سوانح پر ہمہ جہتی روشنی ڈالنے کے

---

(۲) دوآبہ وہ علاقہ جو بڑے دریاؤں کے بیچ آباد ہو اور یہ دریا اس کے لئے سرحد اور خط فاصل کا کام کرتے ہوں، مغربی یوپی کا دوآبہ دینی علمی حلقوں میں معروف ہے اور عموماً اسی کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ دوآبہ ضلع سہارنپور ومظفرنگر کے قصبات ونواح پر مشتمل ہے اور دریائے جمنا وگنگا سے گھرا ہوا ہے۔ مشرقی پنجاب کے اضلاع جالندھر، کپورتھلہ اور نواں شہر کا دوآبہ بھی اپنی شخصیات اور مردم خیزی کے لئے مشہور تھا لیکن اب وہاں ان اکابر ومشائخ کے نام جاننے والے بھی موجود نہیں۔ سدا نام رہے اللہ کا (نور)

علاوہ، سوانح نگار نے اس زمانے کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ قاری اس زمانے میں پہونچ جاتا ہے، اور صاحب سوانح کے متعلقات بھی کافی تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ جیسے نانوتہ اور اس کے مشائخ کا تعارف، حضرت مولانا مملوک العلی صاحب کی اولاد اور تلامذہ کا مفصل تذکرہ۔

یہ بات پورے اعتماد سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ کتاب صاحب سوانح کی شخصیت سے واقفیت کے لئے کافی وافی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو قبولیت سے نوازے اور امت کو اس سے فیضیاب فرمائے۔ آمین۔

کتبہ

سعید احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری

خادم دار العلوم دیوبند

۱۶؍ جمادی الاول ۱۴۲۴ھ

پیش لفظ

عامی اور عالم دونوں کے لئے استفادہ اور حوالہ کی کتاب

جناب شمس الرحمن فاروقی☆

اسلامیات ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ اور مسائل ، اورانیسویں صدی میں جن انقلابات سے اردو معاشرے کو دو چار ہونا پڑا آج کے عام اردو حلقوں میں ان معاملات پر کچھ زیادہ گفتگو نہیں ہوتی، اس کا نقصان صرف یہی نہیں کہ ہم اپنے بہت سے بزرگوں کے بارے میں نہیں جانتے جنہوں نے انیسویں صدی کے تہذیبی انتشار کے روبرو قوم کا بکھرتا ہوا شیرازہ مجتمع کرنے کی کوشش کی بلکہ اس کا نقصان یہ بھی ہے کہ ہم نے تاریخی تناظر کھودیا ہے۔ ہم اس بات سے بے خبر ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے پہلے اور بعد انگریز کی ہزار کوشش کے باوجود ہندوستانی مسلمانوں میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے جنہوں نے علم وادب، سیاست ومعاشرت، تحریک وعمل کی دنیا میں پائیدار نقوش چھوڑے اور اس کے مقابل ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے بعد کا منظر ہے کہ اکا دکا کو چھوڑ دور دور تک کسی میدان میں ایک بھی قابل ذکر مسلمان نظر نہیں آتا۔

مولانا مملوک العلی نانوتوی (۱۲۰۴ھ تا ۱۲۶۷ھ) کا نام کچھ بہت غیر معروف نہیں، لیکن اگر کوئی تفصیل پوچھے تو لوگ آسانی سے بتا بھی نہیں سکیں گی کہ وہ کس رتبہ کے بزرگ تھے اور ان کے کارنامے کیا تھے۔ جن لوگوں کو دہلی کالج کی تاریخ سے کچھ دلچسپی ہے وہ لوگ مولانا مملوک العلی کے نام اور کام سے تھوڑا بہت واقف ہیں۔

ایسا کیوں ہوا، اس کی کئی وجوہ میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے انیسویں صدی کی تاریخ وتہذیب کو بھلا دیا ہے اور وہ لوگ جن سے یہ تاریخ اور تہذیب عبارت ہے ان میں

☆ نامور ناقد، ادیب، شاعر، مصنف اور محقق

سے بھی اکثر کو بھلا دیا ہے، ایسے ہی بڑے لوگوں میں سے ایک مولانا مملوک العلی نانوتوی بھی تھے۔

مولانا مملوک العلی ان لوگوں میں تھے جنہوں نے انیسویں صدی اور خاص کر اس صدی کے نصف اول کی ہند اسلامی تہذیب اور معاشرے کو نئے زمانے کا مقابلہ کرنے کی ہمت دی، انہیں علمی متانت اور وقار کی تعلیم دی، ''انہیں پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ'' کا سبق سکھایا۔ انگریزی حکومت اور انگریز کے وجود کو انہوں نے قبول نہیں کیا لیکن اس کے ساتھ زیست باہمی صورتیں نکالیں۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ اصلاح کی راہ اور علم کی راہ دونوں ایک ہیں، مسلمانوں کو اپنی اصلاح کرنی ہے تو انہیں علم حاصل کرنا ہوگا۔ ''علم'' کی تعریف ان کی نظر میں سراسر وہ نہ تھی جو سرسید کی نظر میں تھی، لیکن وہ اس بات سے واقف بھی تھے کہ بدلے ہوئے زمانے میں بطور مسلمان اور بطور ہندوستانی زندگی بسر کرنے کے لئے صرف پرانی تعلیم کافی نہ ہوگی۔

دہلی کالج میں مولانا مملوک العلی کا وہی مرتبہ تھا جو شہر دہلی میں غالب کا تھا، دہلی کالج کے پرنسپل کو جب فارسی کے استاد کی تلاش ہوئی تو اس نے یہی کہا کہ فارسی میں ہمیں ایسا آدمی درکار ہے جیسے کہ عربی میں مملوک العلی ہیں، چنانچہ غالب کا انتخاب ہوا، بعد میں غالب نے معذرت کر لی اور نوکری قبول نہ کی، لیکن اصول تو قائم ہو گیا کہ فارسی میں غالب اور عربی میں مولوی مملوک العلی کا ہم پلہ کوئی نہیں۔

یہ بڑی اچھی بات ہے کہ نور الحسن راشد کاندھلوی نے مولانا مملوک العلی صاحب کی حیات اور کارناموں پر قلم اٹھایا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اُردو میں اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے، لیکن اگر پہلی کتاب نہ بھی ہو تو بھی اس میں کوئی شک نہیں کہ مولوی صاحب کے بارے میں اتنی مبسوط تحریر اردو کیا، عربی اور فارسی میں بھی نہیں ہے۔

نورالحسن راشد نے اس سے پہلے بھی اٹھارہویں اورانیسویں صدی کے بعض اکابر مسلمان علماء پر عمدہ تحریریں لکھیں ہیں، انہیں اپنے موضوع سے اخلاقانہ دلچسپی ہے اور وہ اپنے رواں اور سلیس اسلوب کی بدولت خشک معلومات کو بھی دلکش بنادیتے ہیں، ان کی علمی لیاقت اعلیٰ ہے، انہوں نے مولانا مملوک العلی سے متعلق اردو، فارسی اور عربی میں تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحریروں سے استفادہ کیا ہے۔

نورالحسن راشد کاندھلوی کی ایک مدت سے اردو زبان اور ادب کی خاموش اور بے غرض خدمت میں مصروف ہیں، وہ ان نوجوانوں میں سے ہیں جنہیں دیکھ کر امید بندھتی ہے کہ ہماری علمی روایت ابھی برقرار رہے گی۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی یہ کتاب عامی اور عالم دونوں کے لئے استفادہ اور حوالہ کا ذریعہ بنے گی۔

شمس الرحمٰن فاروقی

۲۸/ستمبر ۲۰۰۲ء

استقبال

وسیع مطالعہ اور موضوع پر گہری نظر کی ترجمان

جناب جمیل جالبی ☆

مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی سے میرا پہلا تعارف ان کی تصنیف ''حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی'' کے ذریعہ ہوا۔ کتاب پڑھی تو ان کے علم اور ان کے نظر نے متاثر کیا، اپنی اس تصنیف میں راشد صاحب نے نہ صرف مطبوعہ مواد سے استفادہ کیا ہے، بلکہ ان مخطوطات کو بھی استعمال کیا ہے، جن تک عام طور پر دوسروں کی رسائی نہیں ہوتی۔ مولانا راشد کم وبیش چودہ پندرہ کتابوں کے مؤلف ومصنف ہیں، اور ان کے متعدد مقالات پاکستان وہندوستان کے بلند پایہ علمی رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

مولانا راشد صحیح معنی میں محقق ہیں، بال کی کھال نکالنے والے، صحیح وغلط کو الگ الگ کر کے دکھانے والے، علم وادب کے پارکھ، تاریخ کے فاضل، اب جو مولانا مملوک العلی نانوتوی پر ان کی نئی تصنیف نظر سے گذری تو میں ان کے علم وفضل اور نظر کا مزید قائل ہوگیا۔ میں خود اب تک مولانا مملوک العلی کو سرسید کا استاد سمجھتا رہا تھا، اور فی الواقع یہ سبق میں نے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور شیخ محمد اکرام سے پڑھا تھا، لیکن جن دلائل اور حوالوں کے ساتھ مولانا راشد نے زیرنظر کتاب میں ''سرسید کے مولانا مملوک العلی سے تلمذ اور دہلی کالج میں پڑھنے کی روایت پر ایک نظر'' کے عنوان کے تحت اسے بے بنیاد بتایا ہے، وہ بہمہ وجوہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

☆ ممتاز ادیب، محقق، مصنف، مورخ، اور ماہر لسانیات، سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی وسابق صدر مقتدرۂ قومی زبان، پاکستان

وہ دلائل کو دلائل کی سطح پر رکھتے ہیں اور انہیں ذاتیات کی کیچڑ میں نہیں سانتے، انہوں نے جہاں کہیں دوسرے علماء و محققین سے اختلاف کیا ہے وہاں بھی، دینی مدارس کی خالص علمی روایت کے زیر اثر، عزت واحترام کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

وہ ایسے محقق ہیں جو اختلاف کر کے اتراتے نہیں، بلکہ معروضی انداز میں دلائل اور حوالوں کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہتے ہیں، مثلاً زیر نظر تصنیف: ''حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی'' میں، مولانا مملوک العلی کی مدرسہ دارالبقا سے وابستگی کے سلسلہ میں، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اور نزہۃ الخواطر کے مؤلف ومصنف حکیم عبدالحی سے اختلاف کیا ہے، اور اپنی بات کو نئے اور پرانے مآخذ سے اس طرح مدلل پیش کیا ہے کہ مولانا راشد سے اتفاق کرنا پڑتا ہے۔ راشد صاحب دلائل اور اصل مآخذ کے حوالوں سے، اپنے زاویۂ نظر کے لحاف میں ڈورے سے ڈالتے چلے جاتے ہیں۔ وسیع مطالعہ اور موضوع پر گہری نظر ان کی تحقیق وتحریر کی اصل طاقت ہے۔

مولانا مملوک العلی (متوفی ۱۱ر ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ) اپنے وقت کے جید عالم تھے، جنہوں نے شاہ ولی اللہ کی روایت تعلیم وفکر کو نہ صرف اپنے دور میں پھیلایا، اور وسعت دی بلکہ آنے والی نسلوں تک اسے پہنچا کر ایک ایسا استحکام بھی بخشا کہ آج تک ان کا نام زندہ و پائندہ چلا آتا ہے۔ وہ صحیح معنی میں ایک ایسے معلم واستاد تھے جو طلبہ کے دلوں میں اتر کر علم وادب سے ان کے ذوق وشوق کو زندہ تر کر دیتے ہیں۔ مولانا مملوک العلی استاذ الاساتذہ حضرت مولانا عبدالعزیز دہلوی ابن شاہ ولی اللہ کے شاگرد رشید تھے، ان کے دوسرے استادوں میں مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلوی اور مولانا رشید الدین خاں کشمیری جیسے جید علمائے وقت شامل ہیں۔ فاضل مصنف مولانا راشد نے مولوی مملوک العلی کے پچاس شاگردوں کی جو فہرست مع حالات وخدمات مرتب کی ہے، ان میں ایسے ایسے نام آتے ہیں کہ ہر نام پر احترام سے

دست بستہ کھڑے ہونے کو جی چاہتا ہے، جن میں مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، ڈپٹی نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ اور صاحب طبقات الشعراے ہند منشی کریم الدین پانی پتی وغیرہ کے نام نامی شامل ہیں۔ یہ سب لوگ ''دہلی کالج'' کے طالب علم تھے۔

''دہلی کالج'' کا قیام ۱۰رشوال ۱۲۴۰ھ/ جون ۱۸۲۵ء کو عمل میں آیا اور مولانا مملوک العلی کا تقرر بھی کم وبیش اسی زمانے میں عمل میں آیا، اور وہ اپنی وفات ۱۱رذی الحجہ ۱۲۶۷ھ/ ۷راکتوبر ۱۸۵۱ء تک ''دہلی کالج'' سے وابستہ رہے۔ مسلمانوں پر قیامتِ صغریٰ ٹوٹنے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ابھی چھ سال باقی تھے۔ کالج میں مولانا مملوک العلی نے نہ صرف درس وتدریس سے تعلق رکھا بلکہ ''شعبۂ تصنیف'' کے لئے ''اقلیدس'' کے چار مقالوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا، جو نصاب میں شامل تھا۔ اس طرح ''سنن ترمذی'' اور ''تاریخ یمینی'' (یعنی خلاصۂ مسعودی) کا بھی اردو میں ترجمہ کیا، یہ دونوں غیر مطبوعہ ہیں۔

میں نے مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی کی اس تالیف کو پڑھا تو انیسویں صدی عیسوی کی تاریخ کا ایک دور نظروں کے سامنے آگیا، ساتھ ہی وہ معلومات بھی سامنے آئیں جنہیں فاضل مؤلف نے بڑی کوشش وکاوش سے مستند مطبوعات اور کمیاب مخطوطات سے حاصل کر کے، حسب ضرورت اس تصنیف میں پھیلا دیا ہے۔

امید ہے جناب راشد کاندھلوی کی زیر نظر تصنیف علمی حلقوں میں قبولیت عام کا درجہ حاصل کرے گی۔ اس کتاب کی تصنیف واشاعت پر میں مولانا راشد کو دلی مبارک دیتا ہوں۔

☆ **ڈاکٹر جمیل جالبی**

۲۹راگست ۲۰۰۵ء

مبارک باد

ڈاکٹر خلیق انجم☆

مولانا مملوک العلی انیسویں صدی کے جید اور بڑے عالم تھے۔ ان کو عربی اور فارسی پر ایسی غیر معمولی قدرت حاصل تھی کہ ان کے زمانے کے لوگ انہیں اس میدان میں بے بدل اور بے مثال کہا کرتے تھے۔ اسلامیات کے تمام شعبوں پر بھی ان کی گہری نظر تھی، سرسید نے ان کے غیر معمولی حافظے کی تعریف کی ہے، شاگردوں میں کچھ تو ایسے تھے، جنہوں نے اردو ادب میں غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ ان میں سے کچھ کے نام ہیں: مولوی ذکاء اللہ، ڈاکٹر ضیاء الدین، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی کریم الدین وغیرہ۔

مولانا مدرسۂ دہلی (جس کا نام بعد میں دہلی کالج ہو گیا تھا) میں عربی کے استاد مقرر ہوئے تھے، پھر انہوں نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے مدرسے کے ذمہ داروں کو ایسا متاثر کیا کہ انہیں شعبۂ عربی میں میر مولوی کے عہدے پر مقرر کیا گیا۔

مولانا مملوک العلی نے دہلی کالج میں تقریباً چھبیس سال استاد کی حیثیت سے کام کیا تھا، اس لئے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی تھی۔

مولانا مملوک العلی کا آبائی وطن سہارنپور قصبہ نانوتہ تھا۔ یہ وہ سرزمین ہے، جس نے بیسویں صدی میں مولانا قاسم نانوتویؒ جیسے کئی بڑے عالم پیدا کئے۔

مولانا مملوک العلی کے سوانح، شخصیت، فن اور ان کی علمی کارناموں کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ میں ان کے بارے میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ ہندوستان کی عظیم ہستی سرسید کے استاد تھے۔ میں نے دہلی کے قبرستان میں ایک لوحِ قبر پر ان کا نام پڑھا تھا، بس ان کے بارے میں میری اتنی ہی معلومات تھیں۔ جب میں نے سرسید کی ''آثار الصنادید'' مرتب کی تو

☆ ممتاز محقق و مصنف، سیکریٹری انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی۔

پہلی بار ان کے حالات سے کچھ واقفیت حاصل ہوئی، جب سرسید کی عبارت پر حاشیہ لکھنے کے لئے کچھ مواد حاصل کیا تو ''طبقات شعرائے ہند'' مرحوم دہلی کالج مزارات اولیائے دہلی حکایات اولیاء اور ''فرائد الدہر'' میں کچھ حالات پڑھنے کو ملے، اس کے علاوہ اور دو چار کتابوں میں مولانا کے حالات بکھرے ہوئے ہیں اور بس۔

پہلی بار نورالحسن راشد کاندھلوی صاحب نے مولانا مملوک العلی پر ایک ایسی کتاب لکھی ہے جو جامع اور مستند ہے۔ راشد کاندھلوی صاحب نے اپنی کتاب کا انداز بالکل وہی رکھا ہے جو اعلیٰ درجے کے تحقیقی مقالوں کا ہوتا ہے۔

اگر میں راشد صاحب کی اس کتاب پر تفصیل سے لکھوں تو یقیناً اچھی خاصی کتاب ہو جائے گی، انہوں نے بڑی محنت، دیدہ ریزی سے یہ کام کیا ہے، انہوں نے فارسی، عربی اور اردو زبان کی کتابوں میں مولانا پر محفوظ مواد حاصل کر لیا ہے، جہاں سے جو کچھ ملا وہ بہت مختصر تھا لیکن راشد صاحب نے بڑے سلیقے سے، ان تمام تحریروں سے اس طرح استفادہ کیا کہ ایک مکمل اور مستند کتاب بن گئی ہے۔

آج کل یونیورسٹیوں میں بے شمار تحقیقی مقالے لکھے جاتے ہیں لیکن عموماً ان کے موضوعات ایسے سطحی قسم کے ہوتے ہیں کہ ان مقالوں کے لئے زیادہ پڑھنا، تحقیق کرنا، مواد تلاش کرنا اور ان سے نتائج برآمد کرنے ضروری نہیں ہوتا، مگر راشد صاحب نے مولانا مملوک العلی پر ایک ایسی کتاب لکھی ہے جو ہر لحاظ سے قابل قدر ہے۔

میں پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہند و پاکستان کی یونیورسٹیوں میں جتنے تحقیقی مقالوں پر پی ایچ ڈی کی ڈگریاں دی جارہی ہیں۔ ان میں سے ۹۵٪ مقالوں سے یہ کتاب بہتر ہے۔ میں اس اعلیٰ علمی کارنامے پر راشد صاحب کو مبارک باد دیتا ہوں۔

ڈاکٹر خلیق انجم

سکریٹری، انجمن ترقی ہند، اردو گھر، راؤز اوینیو، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض مؤلف

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم. ہندوپاکستان کے علمی تعلیمی اداروں اور کاروان علم و فضل کا ذکر آتے ہی جن علماء اور ممتاز شخصیتوں کے تذکروں سے علمی محفلیں مہک جاتی ہیں اور ان کے کمالات اور علمی احسانات کے ذکر میں ہر اک زبان رطب اللسان ہو جاتی ہے، اور ہر اک ان کا ممنون کرم، گرویدہ اور دلدادہ نظر آتا ہے۔ ایسے ہی بہت نمایاں، ممتاز اور سرفہرست ناموں میں سے ایک نام استاذ الکل حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ (ولادت ۱۲۰۴ھ، وفات ۱۲۶۷ھ) کا ہے۔ برصغیر کے بہت کم دینی ادارے اور علمی تصنیفی دنیا سے وابستہ بہت کم اصحاب ایسے ہوں گے جو کسی نہ کسی واسطہ سے حضرت مولانا سے وابستہ، مولانا کی فیضیابی کے جرعہ نوش، مولانا کے علمی فیضان سے بہرہ ور اور مولانا کے تلامذہ سے منسلک اور مستفید نہ ہوں۔

بلاشبہ مولانا مملوک العلی کی حیثیت اپنے عہد کے ایک دبستاں اور بڑے مرکز علم و فضل کی تھی۔ مولانا کی ذات بابرکات سے غیر معمولی علمی فیض ہوا۔ مولانا کے حلقۂ درس سے ایسے ایسے بلند قامت افراد اٹھے جو اپنے اپنے وقت کے امام، امت کے کھیون ہار اور کشتی ملت کے ناخدا ثابت ہوئے۔ ان کے وجود سے علم کی وہ شمعیں جلیں، وہ آفتاب و ماہتاب روشن ہوئے کہ جن کے نور سے ایک عالم تابناک ہے اور جن کی روشنی میں برصغیر کی ملت اسلامیہ کم سے کم ڈیڑھ صدی سے دین و شریعت، علم و ثقافت اور ادب و کمال کا سفر طے کر رہی ہے۔

اگرچہ حضرت مولانا مملوک العلی کے سلسلۂ تعلیم و تلمذ اور مولانا کے علمی احسانات کا کثرت

سے ذکر اور بار بار اعتراف کیا جاتا ہے مگر حیرت ہے کہ مولانا کے احوال وسوانح پر کوئی کتاب، مجموعۂ مضامین بلکہ اچھا مفصل مضمون بھی معلوم و دستیاب نہیں۔ میری معلومات کے مطابق حضرت مولانا کے عہد سے آج تک مولانا کے احوال وسوانح کی جمع و ترتیب کی کوئی کوشش نہیں ہوئی، اگر کوئی کوشش ہوئی ہو تو وہ اب تک سامنے نہیں آئی، اس کا کہیں تذکرہ بھی نہیں ملتا۔ اسی بے توجہی اور غفلت کا اثر ہے کہ اگر کوئی شخص حضرت مولانا کے علمی مرتبہ، برصغیر کی علمی ترقی میں مولانا کے مقام اور دینی و علمی خدمات کا اندازہ اور مطالعہ کرنا چاہے تو اس کو کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

مولانا کے تعارف پر مختلف تذکروں میں جو اطلاعات ہیں وہ بہت مختصر بلکہ نا تمام اور بکھری ہوئی ہیں، انہیں کا اکثر تذکرہ نگاروں اور اہل قلم نے اپنی مؤلفات و مضامین میں اعادہ کیا ہے مگر ان سے حضرت مولانا کی سوانح و خدمات کی واضح تصویر نہیں ابھرتی۔

اگرچہ برسوں پہلے سیرت یعقوب و مملوک کے نام سے ایک کتاب جو مولانا انوار الحسن شیرکوٹی کی تالیف ہے، ہندو پاکستان دونوں جگہ شائع ہو چکی ہے (۱) مگر اس میں حضرت مولانا مملوک العلی نانوتویؒ کا تذکرہ صرف نو صفحات پر مشتمل ہے (صفحہ ۲۶ سے ۳۵ تک) اور مولانا محمد یعقوب کے احوال میں بھی صحیح مستند اطلاعات اور نئی معلومات کا بہت کم اضافہ ہے۔ مولانا یعقوب صاحب کے حالات کے لئے بیاض یعقوبی کے مندرجات کو ترتیب بدل کر شائع کرنا کافی سمجھا ہے، اس لئے اس کتاب سے ان دونوں بزرگوں اور علماء کے مفصل تذکرے بلکہ صحیح تعارف کا مقصد بھی پورا نہیں ہوتا، خصوصاً حضرت مولانا مملوک العلی کے مفصل تذکرے کی ضرورت بدستور باقی رہی۔

حضرت مولانا مملوک العلی کے احوال کا غالباً سب سے پہلے جامع مرتب اور کسی قدر مفصل تذکرہ، ڈاکٹر محمد ایوب قادری (وفات ۱۹ صفر ۱۴۰۴ھ مطابق ۲۵ نومبر ۱۹۸۳ء) نے کیا ہے۔ قادری صاحب نے اپنی کتاب مولانا محمد احسن نانوتوی میں انیس (۱۹) صفحات میں حضرت مولانا

(۱) یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء میں کراچی سے چھپی تھی، بعد میں اس کا عکس ہندوستان میں چھپا۔

مملوک العلی نانوتوی کے حالات لکھے ہیں(۱) جو حضرت مولانا کے احوال پر، اس وقت تک کی سب سے بڑی، سب سے بہتر اور فاضلانہ تحریر ہے۔

قادری صاحب بلکہ حضرت مولانا مملوک العلی کے متعلق دریافت تمام معلومات وروایات پر، ایک وقیع اور مفصل اضافہ پاکستان کے مشہور محقق جناب محمد اکرام صاحب چغتائی کی تالیف ''ایک نادر مجموعۂ مکاتیب'' ہے۔اس کتاب میں حضرت مولانا مملوک العلی اوران کے ہم عہد چند معروف علماء اور متعارف شخصیتوں، خصوصاً دہلی کالج کے استاذوں اور ممتاز طلبہ کے، اسپرنگر کے نام خطوط شامل ہیں۔

جناب محمد اکرام چغتائی صاحب کی، جرمنی کی قومی لائبریری میں، مشہور فاضل اور مستشرق سپرنگر (Sprenger) کے ذاتی کاغذات وخطوط تک رسائی ہوئی، چغتائی صاحب نے وہاں جو چیزیں دیکھیں، پڑھیں، ان میں سپرنگر کے نام آئے ہوئے خطوط کا قیمتی ذخیرہ بھی تھا، سپرنگر علم دوست شخص اور مشرقی نوادر ومخطوطات کا نہایت شائق تھا اوراپنے ہندوستان کے قیام اور ملازمت کے زمانہ میں (۱۸۴۴ء سے فروری ۱۸۴۸ء تک) دہلی کالج کا پرنسپل رہ چکا تھا، سپرنگر کے حضرت مولانا مملوک العلی نیز دہلی کالج کے اساتذہ وطلبہ، دہلی اور نواح دہلی اور لکھنؤ وغیرہ کے ممتاز علماء اور علمی ذخیرے رکھنے والے اصحاب سے قریبی روابط تھے، ان سے کالج کے متعلقات ومسائل اور کتابوں کی تلاش ودریافت کے موضوع پر خط وکتابت رہتی تھی۔ یہ تمام خطوط سپرنگر کے ذخیرہ میں ایک بڑے ڈبہ (Box) میں محفوظ تھے، ان خطوط میں سپرنگر نیز دہلی کالج، علمائے دہلی اوراس عہد کے متعدد علماء کے متعلق ایسی بہت سی نادر اور قیمتی معلومات ہیں کہ جن کے بغیران حضرات کے سوانح اوراحوال مکمل نہیں ہوسکتے۔

چغتائی صاحب نے ان خطوط کو بہت محنت سے نہایت تحقیق، بنیادی ضروری ضمنی اور ثانوی معلومات اوراضافوں کے ساتھ شائع کیا ہے، جس میں مکتوب نگاروں کے مفصل حالات کے علاوہ، سپرنگر سے ان کے روابط کی نوعیت اوران مکتوبات کے مندرجات پر بھی مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس مجموعۂ مکتوبات کا سب سے پہلا اندراج، سپرنگر کے نام حضرت مولانا مملوک العلی کے خطوط ہیں۔ چغتائی صاحب نے ان مکتوبات کے ضمن میں، حضرت مولانا کا مفصل تعارف کرایا ہے، مکتوبات کے مندرجات پر تفصیلی حاشیے لکھے ہیں اور ان کے متعلقات کی وضاحت کی ہے۔

چغتائی صاحب کی یہ دریافت و کاوش انجمن ترقی اردو کراچی کے سہ ماہی مجلہ اردو میں قسط وار چھپی تھی (۱) مگر سہ ماہی اردو کی اشاعت محدود ہے، خصوصاً ہندوستان میں اور دینی حلقوں میں اس کا نام بھی زیادہ متعارف نہیں، اس لئے اس کا ویسا تعارف اور تذکرہ نہیں ہوا، جس کی ضرورت تھی، اگر تعارف و تذکرہ ہوا بھی ہوتا تو چغتائی صاحب کے اس کام کی ترتیب کچھ ایسی ہے کہ اس سے عام کتاب خواں بہت کم فائدہ اٹھا سکتے ہیں، تاہم یہ بہت اہم اور قابل قدر دریافت و اشاعت ہے۔ جس سے حضرت مولانا مملوک العلی، دہلی کالج اور مولانا کے احباب اور معاصرین کے متعلق بہت سی نادر معلومات سامنے آئی ہیں۔ مذکورہ مضامین و تحریرات کے علاوہ حضرت مولانا مملوک العلی کے احوال و سوانح پر کوئی اور قابل ذکر تحریر شائع نہیں ہوئی۔

حضرت مولانا کا ہندو پاکستان بلکہ اس تختی برصغیر پر جو بہت بڑا دینی علمی احسان ہے، اس کا حق اور تقاضا تھا کہ حضرت مولانا کے احوال و سوانح کی جستجو کی جائے اور مولانا کا ایک صحیح اور جامع تذکرہ مرتب ہو۔ آئندہ صفحات میں اسی ضرورت کو کسی درجہ میں پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس موضوع پر بہت سی معلومات چوں کہ بہت ہی کم دستیاب ہیں، اس لئے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس تالیف سے حضرت مولانا کے احوال و سوانح کی ضرورت پوری ہوگئی ہے اور یہ خدمت مکمل طور سے انجام پا گئی ہے، لیکن جہاں تک ناچیز مرتب کی دسترس میں تھا اس نے

(۱) پہلی قسط جس میں حضرت مولانا مملوک العلی کے مکتوبات اور مولانا کے احوال و تعارف درج ہے، سہ ماہی 'اردو' کراچی کی جلد نمبر: ۱۰ کے چوتھے شمارہ (اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۴ء) میں چھپی تھی، بعد میں چھ قسطیں اور شائع ہوئیں۔ وہ بھی میری نظر سے گذری ہیں۔ تاہم ان کے بعد کی قسطیں راقم کو دستیاب نہیں ہوئیں۔

مطبوعہ وغیر مطبوعہ مآخذ سے استفادہ میں غفلت نہیں برتی اور اس مطالعہ سے حضرت مولانا کو جس طرح سمجھا ہے، اُس کو اس طرح جوں کا توں پیش کر دیا ہے، اس میں کسی طرح کی کمی زیادتی اور رنگ آمیزی نہیں کی، کیونکہ:

بہ آب ورنگ وخال وخط چہ حاجت روئے زیبارا

یہاں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ جب میں نے اس کو پہلی مرتبہ لکھا تو یہ بیس بائیس صفحہ کا ایک مضمون تھا، جس کو بعد میں کچھ اور اضافوں کے ساتھ مختصر تذکرہ کی صورت میں مرتب کر لیا تھا، جو صرف سوا سو صفحات پر مشتمل تھا، اس کی اشاعت کا کوئی سروسامان نہیں ہوا تھا کہ اسی دوران ایک قدرداں عالم کی توجہ فرمائی سے، ایک بڑے دینی ادارہ نے اس کی اشاعت کی پیش کش کی، جو ظاہر ہے کہ راقم کے لئے مسرت کی بات تھی، جب اس ادارہ سے اس مختصر تذکرہ کی اشاعت منظور ہوگئی اور اس کا مسودہ طباعت کے لئے طلب کر لیا گیا، اس وقت خیال آیا کہ اس کو مزید بہتر اور جامع بنانے کی کوشش کرنی چاہیے، جس کو اس ادارہ کے ذمہ داران نے بخوشی منظور فرمایا۔ اس اجازت کے ساتھ ہی اس تالیف کے ابتدائی مسودہ کو کالعدم کر کے مکمل اس پر نظر ثانی، ابواب وعنوانات میں ترمیم وتغیر، اور وسیع وکثیر اضافوں کے ایک نئے سلسلہ کا آغاز ہوا، جس میں تقریباً ایک سال صرف ہوا، لیکن تماشہ یہ ہوا کہ جب یہ مجموعہ ہر طرح سے مکمل اور کمپوزنگ ہو کر اشاعت کے لئے حوالہ کیا گیا، تو بعض خاص کرم فرماؤں کے اشارے یا مشورہ پر، اس کو رائے دینے کے لئے ایک ایسے صاحب کے سپرد کیا گیا، جو نہ تو مولانا مملوک العلی سے واقف تھے، نہ ان کے مقام ومرتبہ سے آشنا تھے، نہ ہی تاریخ وتذکرہ پر کچھ نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے جو رپورٹ لکھی وہ معلومات وبصیرت کے فقدان کا ایک نمونہ، علمی موضوعات تک نارسائی کا ایک مرثیہ تھی۔ جی چاہتا کہ علم وفضیلت کی اس گرانمایہ یادگار کے چند اقتباس یہاں نقل کئے جائیں مگر یہ تذکرہ قارئین کو بے کیف کرے گا اس لئے نظر انداز کرتا ہوں۔

اگر چہ خود اسی ادارہ کی فرمائش پر، چند ممتاز اہل علم ونظر نے ان صاحب کی رائے سے صاف اختلاف کیا اور ان کی علمی بے بضاعتی سے بھی علمی تحریری طور پر آگاہ فرمایا مگر اس توثیق وتصدیق کے باوجود اس ادارہ نے اس کتاب کی اشاعت کی پیش کش واپس لے لی۔ کتاب واپس مل گئی تو ناچیز مرتب کو بہت خوشی ہوئی، اس نے حق تعالیٰ شانہ کا بے انتہاء شکر ادا کیا اور کرر ہا ہے کہ یہ مفید کاوش نا اہل اصحاب کے ہاتھوں ضائع ہونے اور: ''شعر مرا بمدرسہ کے برد'' کا مصداق بننے سے محفوظ رہی۔ فلحمدللہ ولہ الشکر دائماابداً

کتاب کیسی ہے، اس کے متعلق کچھ عرض کرنا موزوں نہ ہوگا دیدہ ور قارئین کرام اس کا خود ہی اندازہ فرمالیں گے۔

اس وقت جب یہ کتاب چند ممتاز علماء کی عنایت سے طباعت کے لئے جارہی ہے میرا دل اور پیشانی حق تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہے اور میری زبان اس کی حمد وثنا سے معمور ومسرور ہے۔ یہ اس ذات عالی وبرتر (جل جلالہ) کا محض فضل وکرم ہے کہ اس نے مجھ کم سواد کو اس کی توفیق عطا فرمائی اور میرے ناچیز اور بے حقیقت قلم سے یہ کتاب وجود میں آگئی: اللھم لک الحمد کلہ ولک الشکر کلہ والیک ترجعہ الامور کلہ.

برصغیر ہند کے نامور عالم ومصنف، دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث وصدرالمدرسین حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم اور اردو دنیا کے افاضل شہرۂ آفاق ادیب، شاعر ناقد اور مصنف جناب شمس الرحمٰن فاروقی اور جلیل القدر مصنف، محقق اور مؤرخ جناب ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب (کراچی) کا بھی نیز ڈاکٹر خلیق انجم صاحب اور ناچیز مؤلف ان تمام اساطین علم وادب کا انتہائی ممنون ہے کہ انہوں نے اپنی بے پناہ، ہمہ وقت مصروفیات میں سے، اس کتاب کے مطالعہ کے لئے اپنا قیمتی وقت فارغ کیا اور اپنے گراں قدر تاثرات وتحریرات سے اور تعاون سے نواز کر اس تالیف کی قدر ومنزلت میں اضافہ کیا۔ بہت بہت شکریہ

مرحوم پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب اس پر دس بارہ صفحہ کا مفصل مقدمہ لکھنا چاہتے تھے مگر ان کی جانکاہ بیماری نے اس کا موقع نہیں دیا۔ فاروقی صاحب اپنی بیماری کے آخری دنوں تک اس کا ارادہ کرتے رہے کہ مجھے ذرا سا سکون ملے تو میں اس پر کچھ لکھوں، مگر:

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

امید ہے کہ قارئین کرام خصوصاً اہل علم وذوق اصحاب اپنی رائے، فروگزاشتوں، مزید معلومات واطلاعات کی نشاندہی سے ناچیز مؤلف کو بہرہ ور فرمائیں گے۔

نور الحسن راشد کاندھلوی
مولویان۔ کاندھلہ، ضلع مظفر نگر (یوپی)
انڈیا۔ پن: ۲۴۷۷۷۵
۲۷ر شعبان ۱۴۲۹ھ ۳۰ر اگست ۲۰۰۸ء

4

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مدرسۂ دہلی (دہلی کالج) کے صدر مدرس،

سب سے بڑے معلم،

اور روح رواں

استاذ الکل

حضرت مولانا مملوک العلیؒ نانوتوی

احوال وخدمات، تصانیف وتراجم،

مکتوبات وآثار اور تلامذہ

اور خاندان وغیرہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب (۱)

نانوتہ کی مختصر تاریخ اور نانوتہ کے چند قدیم نامور مشائخ اور علماء

نانوتہ (NANAUTA) مغربی یوپی کے ضلع سہارنپور کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو اپنے محل وقوع، آبادی یا تاریخی عمارات وآثار کی وجہ سے چنداں جاذب توجہ اور لائق ذکر نہیں ہے، مگر نظام قدرت اپنی کارفرمائی اور انقلاب آفریں شخصیات کے وجود میں لانے، پیدا فرمانے اور ان سے کام لینے کیلئے کسی چھوٹی بڑی بستی، اسکے امتیاز وگمنامی، شادابی و ویرانی آبادی کی کمی زیادتی، جگمگ ماحول یا ناپرساں احوال ہونیکی ذرہ برابر بھی پابند اور محتاج نہیں ہے، اسکی تو شان یہی ہے کہ: یخرج الحی من المیت و مخرج المیت من الحی!

اسلئے ایک زمانہ تک نانوتہ کا شمار غیر متعارف بستیوں میں رہا، نہ اسکا اہل علم وکمال کی مجلسوں میں ذکر آتا تھا، نہ مؤرخین و بادیہ پیما اس کو قابل توجہ سمجھتے تھے، مگر رحمت الٰہی کا ایک ہی جھونکا اس کو شاداب و مرکز نگاہ بنا گیا۔ اسوقت سے اس بستی پر (بستی کے اہل کمال کے ذریعہ سے) ایسا رنگ، ایسا نکھار اور ایسی تازگی آئی ہے کہ جہاں بھی برصغیر کی گذشتہ دو سو سال کی علمی دینی تاریخ کا تذکرہ ہوگا نانوتہ کے کاروانِ علم وعمل کی یاد ضرور آئیگی۔

بلاشبہ متاخر عہد میں اس کارواں کے قافلہ سالار استاذ العلماء حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی تھے، لیکن حضرت مولانا سے پہلے بھی نانوتہ میں متعدد علماء، اصحاب درس وافادہ اور مشائخ پیدا ہوئے تھے اور اپنے اپنے دور میں انکی خدمات کے ذریعہ سے دین کا اجالا ہوا اور معرفت وسلوک کی دنیا میں نانوتہ کا نام بلند رہا مگر انکے دینی علمی آثار بہت کم محفوظ رہنے کی وجہ سے ان حضرات کا تذکرہ بھی اب کہیں نہیں آتا۔ اسلئے نانوتہ کے

آخری دور کے اکابر علماء خصوصاً استاذ العلماء مولانا مملوک العلیؒ کے تذکرہ کے وقت یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نانوتہ کی ابتدائی آبادی، قدیم تاریخ اور پرانے دور کے نانوتہ کے علماء وصلحاء اور مشائخ کا کچھ تذکرہ کردیا جائے، کیونکہ انہیں کے نقوش قدم تھے جنھوں نے بعد کے آنیوالوں کو منزل کا راستہ دکھایا، لہٰذا یہاں سب سے پہلے نانوتہ کی تاریخ کا اجمالی تذکرہ ہوگا اسکے بعد نانوتہ کے چند قدیم مشائخ کا ذکر کیا جائیگا، پھر حضرت مولانا مملوک العلی کے احوال درج ہونگے۔

نانوتہ تاریخ کے آئینہ میں

نانوتہ کب آباد ہوا اسکی صحیح تاریخ نہیں ملتی۔ کہا جاتا ہے کہ تقریباً آٹھ نو سو سال پہلے نانو نام کے کسی گوجر یا جاٹ کے نام پر یہ بستی آباد ہوئی تھی (۱) اگر یہ روایت صحیح ہے تو یہ بستی دہلی میں مسلم حکمرانی کے ابتدائی دور (ایبک یا التمش کے عہد) کی یادگار ہے، مگر اس وقت اسکی کیا حیثیت تھی، کس قدر آبادی تھی اور اسکی آبادی کی کیا وجہ تھی، کچھ معلوم نہیں۔ غالباً یہ کسی مقامی سردار یا رئیس (نانو) کی گڑھی تھی جس کی آبادی آہستہ آہستہ بڑھتی گئی اور جس نے ایک مشترک بستی یا قصبہ کی شکل اختیار کرلی۔ اور نویں صدی ہجری تک اس آبادی کی ایک قابل ذکر قصبہ کی حیثیت تھی اور مؤرخین کی نظر میں اپنی کتابوں میں اسکا تذکرہ ضروری معلوم ہوا۔

نانوتہ کے متعلق جو قدیم اور مختصر معلومات دریافت ہیں انکا خلاصہ یہ ہے کہ ۸۰۱ھ (۱۳۹۹ء) میں تیمور نے اس علاقہ کا خونی سفر کیا اور قتل وغارت گری کرتا ہوا یہاں سے گذرا، ۸۱۷ھ (۱۴۱۴ء) میں سلطان خضر خان نے سہارنپور کا علاقہ سید سالم کے تصرف میں دیدیا

(۱) مولانا مناظر احسن گیلانی نے یہ روایت تاریخ سہارنپور لالہ نند کشور (مطبوعہ باندہ) کے حوالہ سے نقل کی ہے اور یہی جغرافیہ ضلع سہارنپور مرتبہ ذاکر بیگ نانوتوی ص ۲۲ (سہارنپور قبل از ۱۹۱۰ء) میں لکھا ہے مگر مولانا کو یہ وجہ تسمیہ پسند نہیں، فرماتے ہیں کہ: ''میرے نزدیک یہ وجہ تسمیہ انواہی روایات چنداں دلآویز نہیں معلوم ہوتی'' (سوانح قاسمی حاشیہ ص ۵۲ ج ۱) مگر مولانا کا یہ ارشاد بے محل ہے، کیوں کہ اس دور کی آبادیوں اور مقامات کے نام عموماً اسی طرح کے ہوتے تھے، اس میں دلآویزی اور پسندیدگی عوام کا خیال ہی نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ اس طرح کی اکثر آبادیوں اور بستیوں کے نام باقاعدہ رکھے اور طے نہیں کئے گئے، بلکہ کسی جگہ چھوٹی موٹی آبادی ہوگئی اور عوام کی زبان پر اس کا ایک نام آگیا، وہی چل گیا اسی کو عام شہرت اور مقبولیت ہوگئی۔

تھا، ان لوگوں نے حکومت اور عدالت کے بڑے عہدوں پر تیزی سے اپنا رسوخ بڑھایا۔

راقم سطور کی معلومات میں نانوتہ کا پہلا باقاعدہ ذکر ابوالفضل نے اپنی مشہور کتاب آئین اکبری میں کیا ہے۔

اکبر بادشاہ کے دور میں علاقہ کی معاشی اور انتظامی ترتیب وتقسیم میں، سرکار سہارنپور کے ماتحت ۳۶ پرگنوں میں سے ایک پرگنہ نانوتہ بھی تھا، ابوالفضل نے لکھا ہے:

''سرکار سہارنپور، سی وشش محل، چہار دستور، دیوبند وغیرہ بست وشش پرگنہ، یک دستور''

اس عنوان کے تحت دیوبند اور سہارنپور کے ساتھ نانوتہ کا بھی ذکر ہے۔ دوسری جگہ پر اس کی کچھ تفصیل بھی لکھی ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے:

''اس پرگنہ کا آباد رقبہ جس میں کاشتکاری ہوتی تھی انتیس ہزار دوسو چوبیس (۲۹۲۲۴) بیگھے پر مشتمل تھا، اور سائرات وغیرہ کی زمین آباد رقبہ سے بہت زیادہ تھی، دستور کے مطابق اس پرگنہ میں بھی حکومت کی طرف سے چالیس سوار اور تین سو پیادے متقرر تھے: جو عموماً افغان تھے(۱)

اس وقت سے اکبر بادشاہ کے دور حکومت تک اس علاقہ کا نظام رقبہ اور تقسیم وترتیب اسی طرز پر رہی جو ۸۱۷ھ (۱۴۱۴ء) کے بعد قائم ہوئی تھی، اکبر کے زمانہ میں یہ علاقہ صوبہ دہلی کے ماتحت آیا، جسکے چھتیس پرگنے تھے، ان پرگنوں میں سے پندرہ پرگنے موجودہ ضلع مظفر نگر کے تھے۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں ان پرگنوں کی تفصیل لکھی ہے، مغلوں کے دور شباب تک یہ نظام اسی طرح قائم رہا، اورنگ زیب عالمگیر کے بعد جب مغل اقتدار میں ابتری آئی اس وقت یہاں کے حالات بھی خراب ہوگئے تھے اور یہ علاقہ جس میں نانوتہ بھی شامل ہے کئی مرتبہ ظالم حملہ آوروں کے حملوں کی وجہ سے برباد وتاراج ہوا تھا، کبھی اسکو جاٹوں گوجروں نے لوٹا، کبھی سکھوں کے حملوں کی زد میں آیا، کبھی مرہٹوں کا نشانہ بنا، غرض اس کو پچاس سال کے قلیل وقفہ میں کئی مرتبہ بیرونی حملہ آوروں اور ظالم وبے حس طالع آزماؤں کے جبر وتشدد کی وجہ سے خاک وخون میں نہانا اور آتش زنی کا شکار ہونا پڑا۔

---

(۱) آئین اکبری، فارسی۔ ۲۹۰ دفتر اول: سرسید ایڈیشن مطبوعہ ۱۲۷۲ھ)

نانوتہ چھوٹی سی بستی اور معمولی آبادی کا رقبہ تھا، یہاں کے رہنے والے بار بار آنے والی ان مصیبتوں اور تباہیوں کی تاب نہ لا سکے، جو لوگ باحیثیت تھے اور اسکی گنجائش رکھتے تھے کہ دوسری جگہ جا کر اپنی رہائش اور معاش کے وسائل کا انتظام کرسکیں وہ نانوتہ سے ترک وطن کر کے چلے گئے تھے، غریب و بے کس افراد میں سے بھی کچھ اپنے والیانِ نعمت کی خدمت کا سہارا لے کر انکے ساتھ ہو گئے اور جو افراد یہاں رہ گئے وہ کمزور و بے مایہ تھے، جسکی وجہ سے اس بستی کی رونق اور تازگی ہمیشہ کیلئے رخصت ہوگئی۔ اہل دولت وثروت کے اچانک بستی سے چلے جانے کی وجہ سے انکی بڑی بڑی حویلیاں اور ڈیوڑھیاں ویران ہوگئیں، اچھے اچھے رئیس اپنے آباد گھر چھوڑ کر جانے پر مجبور ہو گئے۔ مکانات موجود تھے مگر سنسان، ہر وقت ایک سناٹا اور ویرانی سی رہتی تھی، جسکی وجہ سے اور تو اور خود اس قصبہ کے رہنے والے بھی اسکو پھوٹا شہر کہتے تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے بھی اپنے ایک خط میں اسکو اسی شہرت سے یاد کیا ہے

اور جغرافیہ ضلع سہارنپور کے مؤلف ماسٹر ذاکر بیگ نانوتوی نے بھی یہی لکھا ہے، تحریر ہے:

''بہت سے کہنہ مکان منہدمہ غیر آباد پڑے ہوئے ہیں، اس وجہ سے اسکو پھوٹا شہر کہتے ہیں'' (۱)

انگریزوں کی عملداری کے بعد اگرچہ لوٹ مار کے یہ قصے ختم ہو گئے تھے مگر نانوتہ کی پرانی بہار اور آبادی کی شادابی کبھی واپس نہیں آئی، جناب ظ انصاری نے جن کی ننہیال نانوتہ میں تھی اور ان کا بچپن بھی وہیں گزرا ہے، اپنے بچپن کے مشاہدات کا اور نانوتہ کے کھنڈرات اور ویرانی کا اس طرح ذکر کیا ہے:

''پھوپی مجھے ماں سے زیادہ پیاری تھیں، سہارنپور کے اجڑے قصبے نانوتہ میں رہتی تھیں، رام پور، نانوتہ، تھانہ بھون، جلال آباد، کاندھلہ، کیرانہ، یہ مسلم زمینداروں کی گڑھیاں تھیں، جمنا کے کنارے کبھی انھوں نے سرحدی چھاؤنیوں کا کام کیا ہوگا، پنجاب کی سرکشی (سکھ خالصہ

(۱) جغرافیہ ضلع سہارنپور ص ۲۲ مؤلفہ ذاکر بیگ نانوتوی۔ ہیڈ مدرس اسکول سونہ۔ اتحاد پریس سہارنپور (غالباً ۱۹۰۰ء کے قریب کا چھپا ہوا ہے۔)

تحریک) اور فوجی یلغار کا نشانہ بنتی رہیں۔ نانوتہ تو سرہند کی طرح اینٹ مٹی کا ڈھیر ہوکر رہ گیا۔ خون اور خاندان کی حفاظت کرنیوالے چند سیدزادے اور پیرزادے اب تک وہیں پڑے تھے، ساہوکاروں کے مقروض، علم اور حوصلہ سے معذور، انہیں میں سے ایک معزز سید خاندان میں میری پھوپھی بیاہی گئیں۔ بیوگی کی پہاڑسی زندگی انھوں نے کچھ بھائی کی مدد سے کچھ اپنے سگھڑپن سے عزت آبرو کے ساتھ بسر کی اور پانچ بچے پال کر بڑے کردیئے، مجھے اپنے ددھیال کا سیدھا سچا گنوارپن، کھردرا لہجہ، بے تحاشا پیار، بھونڈے اطوار، ٹوٹے پھوٹے کھنڈر مکان، اپنی ننہیال کے نستعلیق طور طریقوں سے، بریلی اور لکھنؤ کے شہری رکھ رکھاؤ سے، نمائشی سلیقے سے کہیں زیادہ پسند تھے‘‘ (۱)

یہ پورا علاقہ ۱۸۰۳ء (۱۲۱۸ھ) دہلی پر (جنرل) قبضہ کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر انتظام آگیا تھا، اس وقت تک سہارنپور کو اس علاقہ کی انتظامی تقسیم میں بنیادی حیثیت حاصل تھی اور موجودہ ضلع میرٹھ و مظفر نگر کا خاصا حصہ سہارنپور کا ماتحت تھا، مگر اس علاقہ اور کول (علی گڑھ) وغیرہ کے ایسٹ انڈیا کمپنی کی مقبوضات میں شامل ہونیکے بعد اس پورے خطہ کی ایک نئی تشکیل عمل میں آئی، اسکو کئی حصوں یا اضلاع میں تقسیم کرکے ابتدائی طور پر اسکا انتظام ریزیڈنٹ (Resedent) کے سپرد کردیا گیا تھا۔ ۱۸۲۴ء تک یہی نظام چلتا رہا، اس میں کوئی بڑی انتظامی تبدیلی نہیں ہوئی، جب ۱۸۲۴ء میں مظفر نگر کو مکمل ضلع کی حیثیت دی گئی، اس وقت سہارنپور کے نانوتہ پرگنہ کے بہت سے گاؤں ضلع مظفر نگر میں شامل کردیئے تھے۔

۱۸۴۲ء میں اس تقسیم میں ایک تبدیلی اور ہوئی، پرگنہ نانوتہ کے متعدد دیہات گنگوہ اور رام پور میں شامل کیے گئے اور سو سے زائد دیہات مظفر نگر کو دے دیئے گئے، اس طرح نانوتہ کی پرگنہ کی حیثیت ختم ہوگئی۔

نانوتہ میں ۱۹۰۵ء (۲۳-۱۳۲۲ھ) میں میونسپل نظام قائم ہوا، ۱۹۱۱ء میں پولیس کا محکمہ قائم کیا گیا تھا، مگر بعد میں کچھ جگہوں کے پولیس تھانے ختم کردیئے گئے، جن میں

(۱) آپ بیتی خودنوشت ظ انصاری (ظل حسنین) انصاری (سہارنپوری)۔ آپ بیتی نمبر۔ ۳۹۱ فن اور شخصیت (بمبئی: ۱۹۸۰ء)

نانوتہ تھانہ بھی شامل تھا۔

نانوتہ میں پرانے زمانہ سے پنچایت کا نظام قائم تھا، جس کی ۱۸۱۶ء میں تجدید کی گئی تھی، ۱۸۶۰ء میں ضلع سہارنپور کے اٹھارہ مقامات پر ترقیاتی اسکیم جاری کی گئی اس کا صدر مقام نانوتہ تھا۔ ۱۹۱۴ء میں نانوتہ کو ٹاؤن ایریا (Tawn area) قرار دیا گیا۔ اور ۱۹۷۳ء میں نوٹیفائڈ ایریا (Notifid area) بنادیا گیا۔ اس وقت نانوتہ کا رقبہ ۲ کلومیٹر مربع تھا۔ نانوتہ کی مردم شماری جو ۱۸۶۵ء میں چار ہزار آٹھ سو ستاسی (۴۸۸۷) تھی ۱۹۷۱ء میں سات ہزار نو سو پینسٹھ (۷۹۶۵) ہوگئی تھی۔ یعنی ایک سو پانچ سال کے طویل عرصہ میں صرف تین ہزار بیاسی (۳۰۸۲) نفوس کا اضافہ ہوا تھا (۱)

نانوتہ کے دو ممتاز خاندان

نانوتہ میں مسلمان کس دور میں آئے اور یہاں مسلمانوں کے آنے اور آباد ہونے کا کیا سبب ہوا، اس کا ذکر نہیں ملتا، مگر قدیم زمانہ سے نانوتہ میں مقیم پرانے خاندانوں میں سے دو خانوادے بطور خاص معروف ہیں، ایک سادات کا، دوسرا صدیقی شیوخ کا۔ یہ دونوں خاندان کئی نسلوں بلکہ صدیوں تک معرفت وارشاد میں ممتاز اور علم وتربیت میں نامور رہے، مغلوں کے ابتدائی عہد میں خاندان سادات کے اصحاب اوجِ کمال پر پہنچے اور مغلوں کے دورِ واپسیں میں صدیقی گھرانہ پر بہار آئی۔

نانوتہ کے چند قدیم نامور جلیل القدر مشائخ اور اہل کمال

سادات یہاں کب وارد ہوئے تھے اس کی تفصیل بھی راقم سطور کو نہیں ملی مگر اکبر کا دور حکومت اس خاندان کے عروج وشہرت کا دور تھا، جس سے یہ تأثر ملتا ہے کہ یہ خاندان دسویں صدی ہجری سے پہلے اس بستی میں آباد تھا۔ اکبر کے دور حکومت میں نانوتہ کے ایک صاحب ارشاد ومعرفت بزرگ سید احمد مدنی علم وعرفان کے حلقوں میں نامور اور مرجع خلائق تھے، سید احمد کے صاحبزادہ سید مصطفیٰ نانوتوی بھی روحانی معنوی کمالات کے جامع

(۱) بعض معلومات کے لئے ملاحظہ ہو: Saharanpur Gusetier, Lucknow 1981

اور والد کی مسند ارشاد کے وارث تھے۔اس خانوادہ سے وابستہ متاخر علماء اور اہل معرفت میں مولانا سید صابر علی، مولانا سید شاہ غلام محمد نانوتوی کے نام ملتے ہیں۔گیارہویں صدی ہجری کی ایک باکمال شخصیت شیخ جیون نانوتوی بھی تھے، رحمہم اللہ تعالیٰ۔

ان بزرگوں کے حالات اور ان کی دینی علمی خدمات کی تفصیل کمیاب ہے، مختلف تذکروں میں اجمالی ذکر ملتا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کا اپنے عہد کی دینی تاریخ اور علمی واصلاحی خدمات میں خاص حصہ رہا ہوگا، جو مختصر بلکہ مجمل معلومات دستیاب ہیں ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مولانا شیخ احمد مدنی یا سید احمد نانوتوی

دسویں صدی ہجری کے مشائخ کبار میں شیخ سید احمد نانوتوی کا بھی ذکر کیا جاتا ہے، کلمات الصادقین کے مؤلف محمد صادق ہمدانی کشمیری دہلوی نے (جو حضرت خواجہ باقی باللہؒ وفات ۱۰۱۲ھ کے مرید اور فیض یافتہ ہیں) ان بزرگ کو سید احمد نانوتوی سے یاد کیا ہے اور ہمدانی کے ہم عہد ایک اور نامور تذکرہ نگار، محمد غوثی شطاری مانڈوی نے گلزار ابرار (مؤلفہ ۱۰۱۴ھ) میں شیخ احمد مدنی نام لکھا ہے، دونوں ہی تذکرہ نگاروں نے شیخ احمد نانوتوی کا بہت محبت اور احترام کیساتھ ذکر کیا ہے، خصوصاً صادق ہمدانی کے الفاظ عقیدت ومحبت میں ڈوبے ہوئے ہیں، دونوں کی کتابوں سے سید احمد نانوتوی کے متعلق مفید اور علیحدہ علیحدہ اطلاعات ملتی ہیں، شیخ احمد نانوتوی، شیخ سلیمان بن عفان مانڈوی دہلوی رحمہم اللہ (وفات ۹۴۴ھ/۱۵۳۷ء) کے خلیفہ اعظم تھے، غوثی شطاری مانڈوی نے لکھا ہے کہ:

''ایک موضع نانوتہ ہے میان دوآبہ، وہاں گوشہ گزیں تھے شیخ سلیمان منڈوالہ کے خلیفہ خاص ہیں، آپ کو سلوک وجذب دونوں مرتبہ تھے، مشہور سلسلوں کے طریقوں پر قدم استحکام کے ساتھ جما ہوا تھا'' (۱)

اور صادق ہمدانی کشمیری کے پُر از محبت الفاظ ملاحظہ ہوں:

''فرزندانِ معنوی حضرت شیخ مانڈوی) (سلیمان قدس سرہ) بسیار اند کہ سلسلہ ولایت

(۱) اذکار ابرار ترجمہ گلزار، تالیف محمد غوثی شطاری مانڈوی۔ ترجمہ فضل احمد جیوری ص ۲۴۴ (لاہور: ۱۳۹۵ھ)

ایشاں را بر پائے دارند، اکمل و افضل ایشاں حضرت سید احمد نانوتہ قدس سرہ بودہ اند کہ در جذب طالبان یگانہ روزگار و در کشف و کرامات نظیر نداشتند، و امروز آثار و برکات ایشاں از فرزندان و طالبان ایشاں ظاہر است۔ نشاط عشق و محبت سوز و گداز، ذوق و سماع در طینت ایں بزگواراں مخمر است، و مہربانی بر خلق اللہ خصوصاً بر فضلاء، و صلحاء از لازمہ فطرت ایں جماعت است۔ حق سبحانہ سالہا بسیار ایشاں را بر جادۂ آباء کرام خود ثابت و مستقیم دارد" (۱)

ترجمہ: اور حضرت شیخ (سلیمان مانڈوی) کے معنوی بیٹے بہت ہیں، جو انکے سلسلہ کو قائم رکھے ہوئے ہیں ان میں سب سے بہتر اور کامل حضرت احمد نانوتوی تھے، قدس سرہ، کہ جو طالبان معرفت کے رجوع (اور اصلاح و تربیت) میں نادر روزگار تھے اور کشف و کرامات میں بھی اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ اس وقت (بھی) انکی قوت تاثیر اور برکات ان کے بیٹوں اور ان سے استفادہ کرنے والوں کے ذریعہ سے ظاہر ہیں۔

عشق و محبت کا سرمایہ سوز و گداز ذوق و سماع ان بزرگوں کی طبیعتوں میں گندھا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق خصوصاً علماء اور نیک لوگوں پر عنایت و کرم اس جماعت کے اصحاب کی طبیعت کا خاص جوہر ہے۔ حق تعالیٰ (انکو) برسہا برس اور زمانہ دراز تک اپنے بڑوں کے طریقہ پر ثابت قدم اور جما ہوا رکھے۔ (۲)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صادق ہمدانی اور غوثی شطاری دونوں ہی سید احمد نانوتوی کے فرزندان اور تربیت یافتہ اصحاب کو دیکھنے جاننے والے ہیں، خصوصاً غوثی شطاری شیخ سلیمان کے پوتے شیخ کمال سے ذاتی طور سے واقف ہے، لکھا ہے:

"چند روز ہوئے کہ بناچاری سپاہیانہ طریقہ اختیار کرلیا ہے"۔ (۳)

---

(۱) کلمات الصادقین۔ صادق ہمدانی۔ (نسخہ مخزونہ خدا بخش لائبریری۔ پٹنہ) ص ۷۰ اس نسخہ کا مکمل فوٹو اسٹیٹ رشید احمد صاحب حیدری، میرٹھ کے پاس موجود ہے۔

(۲) پروفیسر لطیف اللہ صاحب نے اس کا جو ترجمہ کیا ہے اس سے سید احمد نانوتوی کا شیخ سلیمان کے پوتے کا خلیفہ ہونا معلوم ہو رہا ہے، بظاہر ترجمہ میں کچھ فروگذاشت ہوئی اسلئے یہ اطلاع صحیح معلوم نہیں ہوتی، دیکھیے ترجمہ کلمات الصادقین ص ۱۴۷ (کراچی: ۱۹۹۵ء) راقم سطور نے جو ترجمہ کیا ہے وہ نسخہ خدا بخش لائبریری کے مطابق ہے۔ جس کی گلزار ابرار سے بھی تصدیق ہو رہی ہے۔

(۳) ترجمہ اردو، گلزار ابرار ص ۲۴۴

غوثی شطاری مانڈو کا رہنے والا ہے اور علماء و مشائخ سے عقیدت و محبت رکھنے والا اور انکا ہم نشیں ہے، اسلئے اسکی یہ اطلاع درست ہوگی کہ سید احمد مدینہ منورہ کے رہنے والے (مدنی) اور شیخ سلیمان مانڈو کے خلیفہ تھے۔ ہمدانی کے اندراج سے غوثی شطاری کی اطلاع پر یہ اضافہ ہو رہا ہے کہ شیخ احمد مدنی نانوتوی مریدوں کو توجہ دینے میں یکتائے روزگار تھے۔ اور کشف و کرامات میں بے مثل تھے اور مذکورہ دونوں مصنفوں (شطاری و ہمدانی) کے عہد تک سید احمد نانوتوی کی روحانی تربیت و تاثیر کے اثرات انکے متوسلین اور اولاد میں موجود تھے۔

شیخ احمد مدنی نانوتوی شیخ سلیمان کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے نانوتہ رہتے تھے یا بعد میں تشریف لائے تھے، اس کا علم نہیں، مگر بعض قرائن سے یہ تأثر ملتا ہے کہ اس سلسلہ کے اصحاب کمال کی نظر میں اس خطہ (دوآبہ سہارنپور و مظفر نگر) کی کچھ خاص اہمیت تھی اور وہ تبلیغ وارشاد نیز اصلاح و تربیت اور یکسوئی کیلئے اسکو پسند کرتے اور مفید سمجھتے تھے اور سلاسل کے چند اکابر و اصحاب ارشاد کے علاوہ شیخ عثمان مانڈوی سے وابستہ جو دوسرے بزرگ یہاں تشریف لائے وہ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی (وفات ۹۸۲ھ) ہیں، شیخ عبدالقدوس شیخ سلیمان کی خدمت میں عرصہ تک حاضر رہے، استفادہ کیا اور شیخ سلیمان سے قرآن شریف اور تجوید پڑھی تھی (۱) اس لئے ممکن ہے کہ شیخ عبدالقدوس کی اس نواح میں تشریف آوری کا ایک سبب شیخ عبدالقدوس کے سید احمد نانوتوی سے مراسم اور روابط رہے ہوں۔ (۲)

سید احمد مدنی اور انکے صاحبزادے سید مصطفیٰ کے مزارات نانوتہ میں صدیوں تک معروف رہے، نانوتہ میں سید احمد مدنی کے مدفن کو دادا میرانجی کا مقبرہ کہا جاتا ہے۔ (۳)

شیخ مصطفیٰ نانوتوی | سید احمد نانوتوی کے فرزند، تربیت یافتہ، جانشیں اور اپنے

(۱) شیخ عبدالحق نے لکھا ہے: "شیخ عبدالقدوس پیش او (شیخ سلیمان) تجوید کردہ" اخبار الاخیار ص ۲۵۵ (مطبع احمدی، دہلی: ۱۲۷۲ھ)

(۲) اس دور میں اس علاقہ کے مختلف قصبات بڈولی، جھنجھانہ، کیرانہ وغیرہ میں متعدد بڑے مشائخ اپنے اپنے وطن یا مشائخ کی خانقاہوں سے یہاں تشریف لائے اور تا عمر یہیں رہے۔ تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

(۳) تمہید بیاض یعقوبی (مرتبہ حکیم امیر احمد عشرتی نانوتوی) ص ۶ (دہلی: ۱۹۲۹ء)

والد کی مسند ارشاد کی رونق تھے۔ عہد جہانگیری کے معروف علماء اور مشائخ میں تھے، ذاکر بیگ نانوتوی نے لکھا ہے:

''اس کے بیٹے سید مصطفیٰ جہانگیر بادشاہ کے وقت میں معزز درویش تھے''۔(۱)

سید مصطفیٰ شعروسخن کا بھی ذوق رکھتے تھے اور ان کا ایک مجموعہ کلام بھی تھا مگر اب اس کا سراغ نہیں ملتا، سید مصطفیٰ نانوتوی کے متعلق اس کے علاوہ کوئی اور اطلاع راقم سطور کو نہیں ملی، تاہم انکے اخلاف کا فردوسیہ چشتیہ کے مصنف نے ضمناً ذکر کیا ہے۔(۲)

سید شاہ غلام نانوتوی

سید غلام محمد کا بھی غالباً اسی خانوادہ اور گھرانہ سے تعلق تھا، سید غلام محمد بھی اپنے اجداد کی طرح معرفت وسلوک اور ارشاد و تربیت میں مشہور وممتاز تھے، سید غلام محمد کا شاہ کمال سنبھلی نے اپنی کتاب اسراریہ (مؤلفہ ۱۰۶۹ھ) میں ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ سماع کا ذوق رکھتے تھے:

''صاحب ذوق و وجد بود، سماع وذوق او دلکش بودہ'' (۳)

کمال سنبھلی نے ہندی کے وہ چند شعر اور دوہے بھی نقل کئے ہیں، جو شاہ کمال پڑھا اور سنا کرتے تھے۔ شیخ کمال سنبھلی کی سید غلام محمد نانوتوی سے راہ ورسم اور ملاقات تھی، وہ سید صاحب سے ملاقات کیلئے نانوتہ بھی آتے تھے، سید غلام محمد کا درگاہ حضرت نظام الدین (دہلی) میں ۱۰۳۰ھ (۲۱-۱۶۲۰ء) میں انتقال ہوا، اسوقت شاہ کمال سنبھلی وہاں موجود تھے۔

مولانا سید شاہ صابر علی نانوتوی

مولانا صابر، شاہ غلام محمد کے بھائی تھے اور اپنے عہد کے ممتاز ترین علماء اور نامور اہل تقویٰ میں گنے جاتے تھے، شاہ صابر علی کے اپنے دور کے معاصر بڑے علماء اور مشائخ سے روابط تھے، اور شاہ محمد صادق گنگوہی (نبیرہ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی وفات ۱۰۵۱ھ) سے بھی

---

(۱) جغرافیہ ضلع سہارنپور ص ۲۲

(۲) تذکرہ فردوسیہ چشتیہ، خانوادہ شیخ بدرالدین پرتاویؒ (برناوہ ضلع میرٹھ) خلیفہ اعظم شیخ نصیرالدین چراغ دہلویؒ) وفات ۷۸۸ھ کے خلفاء اور اصحاب خاندان کے احوال پر مشتمل مفصل ومعتبر تذکرہ ہے۔ راقم سطور کے سامنے اس نسخہ کا فوٹو اسٹیٹ ہے جس کی غلام محمد نام کے ایک فاضل اور خوش قلم شخص نے ۱۳۱۸ھ میں مصنف کے نسخہ سے تصحیح اور مقابلہ کیا ہے۔ ص ۶:۴

(۳) اسراریہ۔ (نسخہ ندوۃ العلماء لکھنؤ: بلا سنہ) متعلقہ صفحات کا فوٹو اسٹیٹ راقم کے پاس ہے۔

ملاقات و مراسم تھے، شاہ صادق گنگوہی کے وقائع اور ملفوظات کے ایک مرتب نے (جس کا نام معلوم نہیں) سید صابر علی کا ''اعظم علمائے عصر اور اتقیائے دہر'' میں شمار کیا ہے۔

مولانا صابر علی صاحب شاہ محمد صادق گنگوہی کی وفات (محرم ۱۰۵۱ھ) کی تعزیت کے لئے گنگوہ گئے تھے اور شاہ صادق کے صاحبزادگان اور خلفاء کو وعظ و نصیحت فرمائی تھی، شاہ صادق کے ایک تذکرہ نگار نے وہ کلمات نقل کئے ہیں جو مولانا صابر علی نے اس موقع پر فرمائے تھے، شاہ صابر علی نے فرمایا:

''گفت کہ محبوب الٰہی شمارا جامہ خلافت دادہ، برائے آں دادہ کہ بر مسند فیض گستری نشیند وخلق را بخدا خواہند و ہدایت دلالت راہ حق:.....شدآں بکنید، نہ برائے مجاورتِ قبر خود فرمودہ'' (۱)

ترجمہ: فرمایا کہ محبوب الٰہی (شاہ محمد صادق) نے تمہیں خلافت کی خلعت عطا فرمائی ہے یہ اس لئے دی ہے کہ فیض پہنچانے کی مسند پر بیٹھ جائیں اور مخلوق کو خدا تک پہنچائیں اور حق تعالیٰ کی جانب راستہ کی رہنمائی فرمائیں، یہ کام کیجئے! اپنی قبر کا مجاور بنانے کیلئے تمہیں اجازت و خلافت نہیں دی ہے۔

مذکورہ نصیحت وکلمات سے مولانا سید صابر علی کے مزاج و مذاق کا بھی خفیف سا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ مولانا شاہ صابر علی کا اس نواح کے علماء و مشائخ میں کس قدر اونچا مقام تھا، اور ان کا بڑے دینی عرفانی حلقوں میں بھی کس درجہ احترام کیا جاتا تھا۔ شیخ کمال سنبھلی نے بھی مولانا سید صابر علی کی ذہانت وکمال کا ضمناً ذکر کرتے ہوئے، لکھا ہے کہ:

''سید صابر علی برادر وے (سید غلام نانوتوی) کہ از فضلائے وظرفائے وقت خود بود''

لیکن یہ نامور خاندان جس میں صدیوں تک معرفت وارشاد کا غلغلہ اور عالی مرتبہ

(۱) وقائع و ملفوظات شیخ محمد صادق گنگوہی۔ ص ۷۱۔ افسوس ہے کہ اس پر کتاب اور مؤلف دونوں کا نام درج نہیں، اور مؤلف نے ضمناً بھی اس کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ بظاہر اس کا مؤلف کیرانہ کا رہنے والا تھا شاید اسی وجہ سے اس کتاب میں اصحاب کیرانہ سے متعلق وقائع، کیرانہ آنے اور یہاں کے متعلقین کا کثرت سے ذکر ہے۔ یہ رسالہ ۱۳۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک نسخہ جس کی مولانا نورالحسن کاندھلوی (وفات ۱۲۸۵ھ) نے شعبان ۱۲۶۶ھ (جون ۱۸۵۰ء) مصنف کے نسخہ سے تصحیح کی ہے، ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

افراد اور اہل کمال پیدا ہوتے رہے بعد میں اپنے بزرگوں کے راستہ سے دور ہوتا چلا گیا، اکابر و سلف کے محاسن و کمالات سے عاری، علم و معرفت سے بے خبر بلکہ انکے عقیدہ اور دینی راہ سے بھی منحرف ہو گیا تھا اور خدمت دین کے جذبہ سے محروم اور علم کی دولت کے فقدان کی وجہ سے بُری طرح زوال کا شکار ہوا، یہ لوگ دنیاوی فائدوں کے لالچ میں اپنے بزرگوں کے طریقہ سے دور ہوئے، پھر ان کا مذہب چھوڑ کر شیعہ ہو گئے تھے۔ حکیم امیر احمد عشرتی نانوتوی کی اطلاع (ہے کہ تقریباً ۱۹۰۹ء میں)

''نانوتہ میں سید صاحبان کے گروہ ہیں (یا تھے؟) بخاری، ترمذی، سبزواری، بیشتر سب اہل تسنن تھے، زمانہ فرخ سیر سے شیعہ ہونا شروع ہوئے اس وقت جملہ صاحبان شیعہ ہیں'' (۱)

ماسٹر ذاکر بیگ نانوتوی نے بھی اس خاندان کے تغیر و زوال کا ذکر کیا ہے:

''ان (مشائخ نانوتہ) کی اولاد قصبہ میں اور ضلع مین پور (ی) میں بحالت خستہ موجود ہے۔'' (۲)

شیخ جیون نانوتوی

اس خاندان کے مشائخ اور علماء کے علاوہ اس زمانہ میں نانوتہ میں انکے علاوہ اور بھی متعدد اصحاب کمال اشخاص موجود تھے مگر اس نواح کے قصبات اور بستیوں کے مشائخ و علماء اور اہل کمال کے تذکرے بہت کم مرتب ہوئے اسلئے بڑے بڑے حضرات جن کا ایک عالم میں چرچا تھا اور جو اپنے عہد اور خدمت میں مرجع و مسند سمجھے جاتے تھے گمنام اور بے نشاں ہو گئے، ایسے ہی اصحاب میں شیخ جیون نانوتوی بھی تھے۔

شیخ جیون نانوتوی اہل دل اصحاب میں سے تھے، سید طٰہٰ کتانوی (وفات ۱۰۸۴ھ) سے ارادت و بیعت کا تعلق رکھتے تھے (۳) بہت سادگی سے معمولی حال میں رہتے تھے،

(۱) تمہید مکتوبات یعقوبی۔ مرتبہ امیر احمد عشرتی (مطبع احمدی، علی گڑھ)

(۲) جغرافیہ ضلع سہارنپور ص ۲۳ (سہارنپور: تقریباً ۱۹۱۰ء)

(۳) حضرت سید طٰہٰ خلف سید محمود شہید انکا سلسلہ نسب سات واسطوں سے مخدوم جہانیانِ جہاں گشت کے سلسلہ نسب سے مل جاتا ہے، اس خاندان کی ایک شاخ کتانہ (بڑوت ضلع میرٹھ، یوپی) آتی تھی، سید طٰہٰ کی رسمی تعلیم معمولی تھی مگر سینہ علم لدنی سے مالا مال تھا۔ سید طٰہٰ کا وسیع حلقہ ارادت تھا۔ تفسیر سورہ مزمل اور مجموعہ کلام تحریری یادگار ہیں۔ تریسٹھ سال کی عمر میں ۱۰۸۴ھ میں وفات ہوئی۔ مفصل معلومات اور تعارف کیلئے ملاحظہ ہو راقم سطور کا مضمون، سہ ماہی احوال و آثار کاندھلہ جنوری، فروری، مارچ ۱۹۹۸ء

سید طٰہٰ کتانوی کے سلسلہ کے ایک عالم (اور تذکرہ نگار) شیخ عبدالرشید قادری کیرانوی کا مشاہدہ اور اطلاع ہے کہ:

''شیخ جیون متوطن نانوتہ از مریدان خاص بندگی حضرت سید العاشقین سید طٰہٰ قطب الدین گزراں ایشاں مانند گزراں اصحاب صفہ بود''(۱)

ترجمہ: شیخ جیون نانوتہ کے رہنے والے تھے (جو) عاشقوں کے سردار، حضرت سید طٰہٰ قطب الدین (کتانوی) کے خاص مریدوں میں سے تھے، ان کی بسر اوقات حضرات اصحاب صفہؓ کے اوقات و گزراں کی طرح تھی۔

مذکورہ بالا اصحاب اور دوسرے اہل علم و کمال کے علاوہ نانوتہ میں ایک بڑا علمی خاندان اور مقیم تھا، یہ صدیقی خاندان تھا جس میں خاص طور سے آخری دور میں ایک کے بعد ایک متعدد بڑے ممتاز علماء اور صاحب کمال دینی علمی شخصیتیں پیدا ہوئیں، اسی خانوادہ کے گل سر سبد اور گویا آخری عہد کے سب سے بڑے اور مشہور علمی رہنما حضرت مولانا مملوک العلی نانوتویؒ تھے۔

---

(۱) تذکرۃ الصالحین تالیف: شیخ عبدالرشید قادری، کیرانوی (مؤلفہ ۱۱۶۳ھ) ص: ۷ نقل شدہ از نسخہ مؤلف (فوٹو اسٹیٹ مملوکہ راقم سطور)

باب (۲)

صدیقی خاندان کی نانوتہ میں آمد اور قیام

اس خاندان کے چند ابتدائی بزرگ اور مولانا مملوک العلی (وغیرہ) کے اجدادِ کرام

نانوتہ کا صدیقی خاندان جیسا کہ اطلاعات سے اندازہ ہوتا ہے ہندوستان آنے کے وقت بلکہ غالباً اس سے بھی پہلے سے علم وعمل کی دنیا میں اپنی علمی ودینی شخصیتوں کی وجہ سے محترم رہا ہے۔ اس خاندان کی قدیم تفصیلات میری دسترس میں نہیں، مگر اہل نانوتہ کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کے پہلے بزرگ جو ہندوستان تشریف لائے شیخ مظہر الدین تھے، بعد کی اطلاعات میں کچھ اختلاف اور الجھاؤ سا ہے، راقم سطور جو کچھ سمجھ سکا وہ یہ ہے۔

شیخ مظہر الدین کی نویں صدی ہجری کے آغاز پر، ۸۰۵ھ (۳۔۱۴۰۲ء) میں ولادت ہوئی، تعلیم اور اساتذہ کا تذکرہ دریافت نہیں مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قاضی صاحب نے علم وکمال میں بڑا مرتبہ پایا تھا اور وہ اپنے وطن کے علماء میں خاص امتیاز اور احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے، یہاں تک کہ قاضی صاحب کے کمالات علمی اور بلند مقام (اور غالباً دینی رسوخ) کی شہرت ہندوستان پہنچی، اس وقت یہاں بہلول لودھی تخت نشین تھا اور اس کا بیٹا سکندر لودھی شہزادگی کے زمانہ سے علماء اور اہل کمال کی رفاقت وصحبت کا خوگر تھا اور چاہتا تھا کہ ایسے منتخب علماء ہندوستان تشریف لائیں اور وہ ان کی صحبت ومجلس میں وقت گزارے۔ سکندر لودھی کے دینی مزاج اور علماء کی عزت افزائی کی وجہ سے بہت سے اہل کمال خود ہندوستان آگئے تھے، اور بہت سے سکندر لودھی کی دعوت

ودرخواست پر یہاں پہنچے، حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے تحریر فرمایا ہے:

"وزمانہ دولت سکندر زمان صلاح وتقویٰ دیانت وامانت وحلم ووقار بود واورا باعلماء وصلحاء واکابر واشرف میلے عظیم شد، لہٰذا از اکناف عالم از عرب وعجم بعضے بسابقہ استدعا وطلب، وبعضے بے آں درعہد دولتِ اوتشریف آوردہ وتوطن ایں اختیار کردند، چنانچہ اکثر بزرگان کہ دریں طبقہ مذکور می شوند ازاں قلیل اند۔(۱)

ترجمہ: سکندر لودھی کا عہد نیکی، تقوی، دیانت وامانت اور حلم وبرداشت کا زمانہ تھا، اس (سکندر) کو علماء صلحاء اور بڑے اور شریف لوگوں سے خاص لگاؤ اور مناسبت تھی اسی وجہ سے دنیا کے مختلف خطوں سے، عرب سے عجم سے بعض حضرات ان کی درخواست اور بلاوے پر اور بعض اس کے بغیر ان کے زمانہ میں ہندوستان تشریف لائے اور یہاں قیام اختیار کیا، بہت سے وہ حضرات جو اس طبقہ میں ذکر کئے جاتے ہیں اس جماعت کا معمولی سا حصہ ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ سکندر لودھی نے جب شیخ مظہر الدین کے علم وکمالات کی شہرت سنی تو انکو ہندوستان آنے کی دعوت دی، شیخ مظہر الدین تقریباً تہتر سال کی عمر میں ۸۷۸ھ (۷۴-۱۴۷۳ء) میں ہندوستان آئے، سکندر لودھی نے قاضی صاحب کی پذیرائی کی اور انکو جہاں آباد کا قاضی مقرر کردیا، قاضی مظہر کی جہاں آباد میں وفات ہوئی، وہیں دفن ہوئے (۲)

اس خاندان کے اجداد میں سب سے پہلے قاضی مظہر الدین ہندوستان آئے تھے، اس اطلاع پر تو حکیم امیر احمد عشرتی (تمہید بیاض یعقوبی) اور مولانا مفتی محمود احمد نانوتوی متفق ہیں، مگر بعد کی اطلاعات میں اختلاف اور خاصا الجھاؤ پایا جاتا ہے۔

حکیم امیر احمد نے قاضی مظہر کے ہندوستان آنے کا سنہ ۸۷۱ھ لکھا ہے۔ مفتی محمود احمد نے اس کا کچھ ذکر نہیں کیا، حکیم امیر احمد، قاضی صاحب کے جہاں آباد میں تقرر اور مدفن کا ذکر کرتے ہیں مگر مفتی محمود قاضی مظہر کا سنہ وفات ۸۷۸ھ اور مدفن دہلی لکھتے ہیں۔

ایک اور بڑا اختلاف یہ ہے کہ حکیم صاحب کی اطلاع کے مطابق سکندر لودھی نے قاضی

(۱) اخبار الاخیار ص ۲۶۱ (مطبع احمدی دہلی: ۱۲۷۲ھ) ترجمہ راقم سطور نور الحسن راشد۔ نیز ملاحظہ ہو: سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات از ڈاکٹر خلیق احمد نظامی ص ۴۴۷ تا ص ۴۷۰ (دہلی: ۱۹۸۱ء)

(۲) نسب نامہ صدیقیان نانوتہ مفتی محمود احمد نانوتوی، ص: ۲

مظہر کو طلب کیا تھا، مفتی محمود احمد نے لکھا ہے کہ بہلول لودھی نے انکے صاحبزادے میراں بڑے کو مدعو کیا تھا، مفتی محمود نے قاضی میراں بڑے کے جو حالات لکھے ہیں اس کے بعض اور پہلو بھی مشتبہ ہیں، مگر راقم سطور کے خیال میں حکیم امیر احمد عشرتی کی اطلاعات زیادہ صحیح ہوں گی، کیوں کہ وہ مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور انکے معاصر علمائے نانوتہ کے دیکھنے والے اور انکی صحبتوں سے مستفید تھے اور جب حکیم امیر احمد صاحب نے (۱۳۲۷ھ ۱۹۰۹ء میں) یہ تحریر لکھی تھی اس وقت قدیم معلومات، مستند ذرائع معلومات اور پرانے دستاویزات وتحریرات کا بھی خاصا ذخیرہ موجود تھا، مفتی محمود نے اسکے پچاس سال بعد شجرہ مرتب کیا، اس وقت پرانے سب بزرگ اور ۱۹۴۷ء کے حوادثات کی وجہ سے اکثر تحریرات ودستاویزات منتشر اور ضائع ہو چکی تھیں، لہٰذا حکیم امیر احمد عشرتی کی اطلاعات درست ہونی چاہئیں۔(۱)

اس خاندان کی نانوتہ میں آمد اور قیام

اس دور میں نانوتہ اور اسکے اطراف میں جو برادریاں یا قبیلے آباد تھے وہ نہایت سرکش اور حکومت وقت کے باغی تھے، بار بار حکومت کے خلاف سر اٹھاتے رہتے تھے، ایسے قبیلوں کی قوت توڑنے اور انکی سرکشی ختم کرنے کیلئے بادشاہِ وقت نے قاضی مظہر الدین کے صاحبزادہ، قاضی میراں عرف قاضی بڑے کو نانوتہ کا علاقہ سپرد کیا تھا، قاضی میراں بڑے نے یہاں پہنچ کر علاقہ کا انتظام درست کیا اور سرکشوں کا مقابلہ کر کے ان کو بے حیثیت اور کمزور بنایا اور سرکار کا قبضہ اور اقتدار بحال کر دیا۔

قاضی میراں بڑے کی ۱۴؍رجب ۹۰۲ھ (مارچ ۱۴۹۷ء) کو نانوتہ میں وفات ہوئی، نانوتہ کے قبرستان شیخ زادگان میں (جو بھکادالا کے نام سے مشہور ہے) قاضی صاحب کی قبر ہے۔

(۱) یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ بیاض یعقوبی (جو اشرف المطابع تھانہ بھون سے پہلی مرتبہ ۱۹۲۹ء میں چھپی تھی) پر جو تمہید درج ہے وہ مکتوبات مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے اس نسخہ کیلئے لکھی گئی تھی جو مطبع احمدی علی گڑھ سے ۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) میں چھپا تھا وہی اشاعت راقم کے سامنے ہے۔

قاضی میراں بڑے کے پانچ بیٹے تھے۔ نظام الدین عرف عباد اللہ اور عبد الغنی، یہ دونوں تعلیم حاصل کرنے کیلئے پورب (مشرقی یوپی) گئے تھے اور تعلیم کے بعد وہیں رہ گئے تھے اور مفتی محمود احمد نانوتوی کی اطلاع کے مطابق ''(ان کا) بکثرت سلسلہ نسب کڑہ مانک پور، قصارہ، غازی پور وغیرہ میں موجود ہے۔''(۱)

قاضی میراں بڑے کے سب سے چھوٹے بیٹے کمال الدین تھے، جو لکھنوتی (بنگال) چلے گئے تھے۔ انکے حالات بھی معلوم نہیں۔ دو بیٹے قاضی حبیب اللہ اور جمال الدین نانوتہ میں رہے اور ان کی اولاد بھی یہیں آباد ہے۔

چوں کہ یہ خاندان لودھی حکومت کا ہم نوا تھا، اس لئے لودھی خاندان کی حکومت ختم ہونے کے بعد قاضی میراں بڑے کی اولاد کو سخت مصیبتوں کا سامنا ہوا، مخالفین نے جن کی قوت و سرکشی کو قاضی میراں بڑے نے ختم کر دیا تھا، لودھیوں کی حکومت ختم ہونے کے بعد قاضی میراں بڑے کی اولاد سے سخت بدلہ لیا اور اس خاندان کے چھوٹے بچوں تک کو قتل کرا دیا، جس کی وجہ سے اس خاندان کی حیثیت خاصی کمزور ہوگئی تھی، جو کئی سو برس گزرنے کے بعد اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں (رمضان ۱۰۶۸ھ کے بعد) بحال ہوئی (۲) اس زوال و اقتدار کا حکیم امیر احمد عشرتی نانوتوی نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

''بعد زوال حکومت لودھیان قاضی میراں بڑے کی اولاد پر مصائب جانکاہ پیش آئے لیکن انھوں نے اپنی علو ہمتی اور اپنی قدیمی دلیری و جوانمردی کے باعث نہایت صبر و استقلال کے ساتھ ان تمام مصائب کو برداشت کیا۔ منجملہ انکے ایک بڑی مصیبت یہ تھی کہ انھیں اقوام ہنود کا اٹھانے جو بوجہ قدیمی تعصب مذہبی کے مسلمانوں سے عموماً اور متوسلان حکومت لودھیان سے خصوصاً خصومت شدید رکھتے تھے، اولاد قاضی میراں بڑے کے استیصال کرنے میں کوئی دقیقہ نہ رکھ چھوڑا۔ یہاں تک کہ صغیر سن بچوں تک کو قتل کر دیا، اپنے نزدیک انہوں نے ایسا نہیں چھوڑا کہ کوئی متنفس بھی کسی وقت میں مد مقابل ہو سکے۔ لیکن قدرتِ خداوندی اس امر کی مقتضی تھی کہ

(۱) نسب نامہ صدیقیان نانوتہ مرتبہ مفتی محمود احمد نانوتوی، ص ۲

(۲) ملاحظہ ہو، تمہید بیاض یعقوبی مرتبہ حکیم امیر احمد عشرتی نانوتوی، اور نسب نامہ (صدیقیان نانوتہ) مرتبہ مولانا مفتی محمود احمد نانوتوی۔ ص ۲-۳ (طبع اول دہلی، بلا سنہ: غالباً ۱۳۷۹ھ)

اولادِ قاضی میراں بڑے کا سلسلہ مٹنے نہ پائے، کیوں کہ اس کوان سے مولانا محمد یعقوب مرحوم وغیرہم جیسی صورتیں جلوۂ ظہور میں لانی مقصود تھیں۔(۱)

حکیم امیر احمد نے اسی سلسلہ تحریر میں لکھا ہے کہ:

پس ایک عرصۂ دراز بعد انقلابِ زمانہ نے دوسرا دور پلٹا، یعنی شدہ شدہ دورِ حکومت شاہ اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ خلد آشیاں کا آ پہنچا، اس وقت میں ایک صاحب نے اولاد قاضی میراں بڑے سے جو نہایت زبردست خوش الحان حافظ قرآن تھے فریادی بن کر لشکر عالمگیر میں پہنچے اور ایک سردار لشکر کے یہاں رہ کر متلاشیٔ وقت رہے اور کسی فرد بشر پر انکشاف نہ فرمایا کہ میں کون ہوں اور کس واسطے آیا ہوں، حتیٰ کہ ۱۰۶۸ھ کا مہینہ رجب ختم ہو کر شعبان شروع ہو گیا، اس وقت بادشاہ نے سردارانِ لشکر کو جمع فرما کر ارشاد فرمایا، چونکہ ماہ رمضان المبارک قریب ہے اور صعوبت سفر شبانہ روز بدستور قائم ہے، آئندہ سامان قیام بظاہر معلوم نہیں ہوتا، ہم کو نماز تراویح میں کلام مجید کا سننا ضروری امر ہے، اس لئے مناسب ہے کہ بہت جلد ایسا حافظ تلاش کیا جائے جو مابدولت کو صرف ایک شب میں کلام مجید کامل سنا دیوے، چنانچہ بفور استماع ارشاد شاہی تلاش شروع ہوگئی۔

باوجودیکہ اس وقت ہزارہا حافظ قرآن مجید موجود تھے لیکن کسی کو ہمت و جرأت نہ ہوئی کہ شاہ عالمگیر کا پیش امام ہو کر ایک شب میں پورا قرآن شریف سنا دیوے۔ یہاں تک کہ شعبان قریب ختم و رمضان شروع ہونے پر ہوا، اس وقت دوبارہ تاکید شاہی شدید ہوئی جس سے لشکر میں سخت اضطراب و بے چینی پیدا ہوئی، ہر شخص خائف تھا کہ بوجہ نہ ملنے ایسے حافظ کے دیکھئے کیا عتاب شاہی نازل ہوتا ہے۔ اس حالت سراسیمگی میں جبکہ تاریخ ۲۸ رشعبان ۱۰۶۸ھ کو نواح گوالیار چنبل کے کنارے لشکر عالمگیر پڑا ہوا تھا تو ان حافظ صاحب نے اپنے سردار سے عرض کی کہ آپ اس قدر کیوں پریشان ہیں، میں ایک شب کی تراویح میں بادشاہ کو کلام مجید سنا دوں گا، آپ اطلاع کر دیجئے کہ حافظ آ گیا ہے۔ چنانچہ یکم تاریخ کو آپ نے نہایت خوش الحانی کے ساتھ پورا کلام مجید بلا عاید ہونے متشابہ کے بادشاہ کو سنا دیا، بادشاہ نہایت خوش ہوئے، اب وہ موقع

(۱) ملاحظہ ہو، تمہید بیاض یعقوبی مرتبہ حکیم امیر احمد عشرتی نانوتوی، اور نسب نامہ (صدیقیان نانوتہ) مرتبہ مولانا مفتی محمود احمد نانوتوی۔ ص ۲-۳ (طبع اول دہلی، بلا سنہ: غالباً ۱۳۷۹ھ)

جس کی حافظ صاحب کو دشمنوں سے انتقام لینے کیلئے تلاش تھی ہاتھ آیا۔ شاہ عالمگیر سے گذشتہ واقعات راجپوتان و گوجران کا نھا کے ظلم و ستم کا بیان کر کے دادخواہ ہوئے، چنانچہ فی الفور بحکم شاہی ایک دستہ فوج ہمراہ حافظ صاحب آیا اور ان سب کا قلع قمع کیا''۔(۱)

قاضی میراں بڑے کی اولاد کی ترتیب مولوی ہاشم تک

اس واقعہ کے بعد میراں بڑے کی اولاد کو اطمینان و سربلندی ملی اور وہ عزت و آبرو کے ساتھ نانوتہ میں مقیم ہوگئی۔ قاضی میراں بڑے کے فرزند قاضی جمال الدین صاحب تھے جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، انکے بیٹے قاضی امان اللہ، انکے مفتی مبارک، انکے قاضی طہٰ، انکے شاہ محمد اور انکے مولوی محمد ہاشم۔ مولوی ہاشم صاحب علم و کمال شخص تھے، نانوتہ کے آخری دور کے اکثر مشہور اور بڑے علماء ان ہی کی اولاد میں تھے۔

شیخ مولوی محمد ہاشم کی اولاد کی متاخر شاخوں کو اللہ تعالیٰ نے خوب نوازا، شیخ ہاشم کے فرزند عبدالسمیع تھے، ان کے بیٹے شیخ محمد مفتی، ان کے شیخ ابوالفتح، آخرالذکر کے تین صاحبزادے ہوئے: حکیم عبداللہ، شیخ محمد عاقل اور شیخ علاؤالدین، تینوں سے نسل چلی اور تینوں شاخوں میں جید علماء، خادمانِ دین و شریعت، اہل فضل و کمال اور فاضل طبیب پیدا ہوئے جیسا کہ نسب نامہ میں درج فقروں اور کلمات سے اندازہ ہوتا ہے۔

اس خاندان اور شیخ میراں بڑے کی اولاد میں نانوتہ اور نواح کی قضات وغیرہ رہی مگر مغلوں کے عہد زوال میں جب شیعیت کا فروغ ہوا تو قضات پر تقرر کے لئے شیعہ ہونے پر اصرار کیا گیا، اس لئے خاندان کی وہ شاخ جس میں عہدۂ قضات رہتا تھا اس نے شیعہ ہونے سے انکار کر دیا اور عہدۂ قضات سے سبکدوش ہو کر اس منصب سے علیحدہ ہو گئے۔

مگر افسوس اور بے شمار ممتاز علمی گھرانوں کی طرح اس خاندان کے حالات جمع اور مرتب کرنے پر بھی کوئی توجہ نہیں کی گئی، یہی وجہ ہے کہ اس خاندان کی قدیم تاریخ، مستند حالات اور اسکے اکابر و علماء کے تذکرے تقریباً مفقود ہیں، یہاں تک کہ مولانا مملوک العلی

(۱) تمہید مکتوبات یعقوبی، مرتبہ حکیم امیر احمد عشرتی (مطبع احمدی علی گڑھ) نیز مشمولہ بیاض یعقوبی (تھانہ بھون۔ بلاسنہ)

اوران کے زمانہ کے علماء کے حالات بھی قلم بند نہیں کئے گئے مگر اس خاندان کے بڑوں کے مفصل حالات کا نہ ملنا اس کی علامت وشہادت نہیں کہ نانوتہ کے صدیقی خانوادہ میں:

''علم پدر کی طرف زیادہ دنوں تک توجہ باقی نہیں رہی تھی'' (۱)

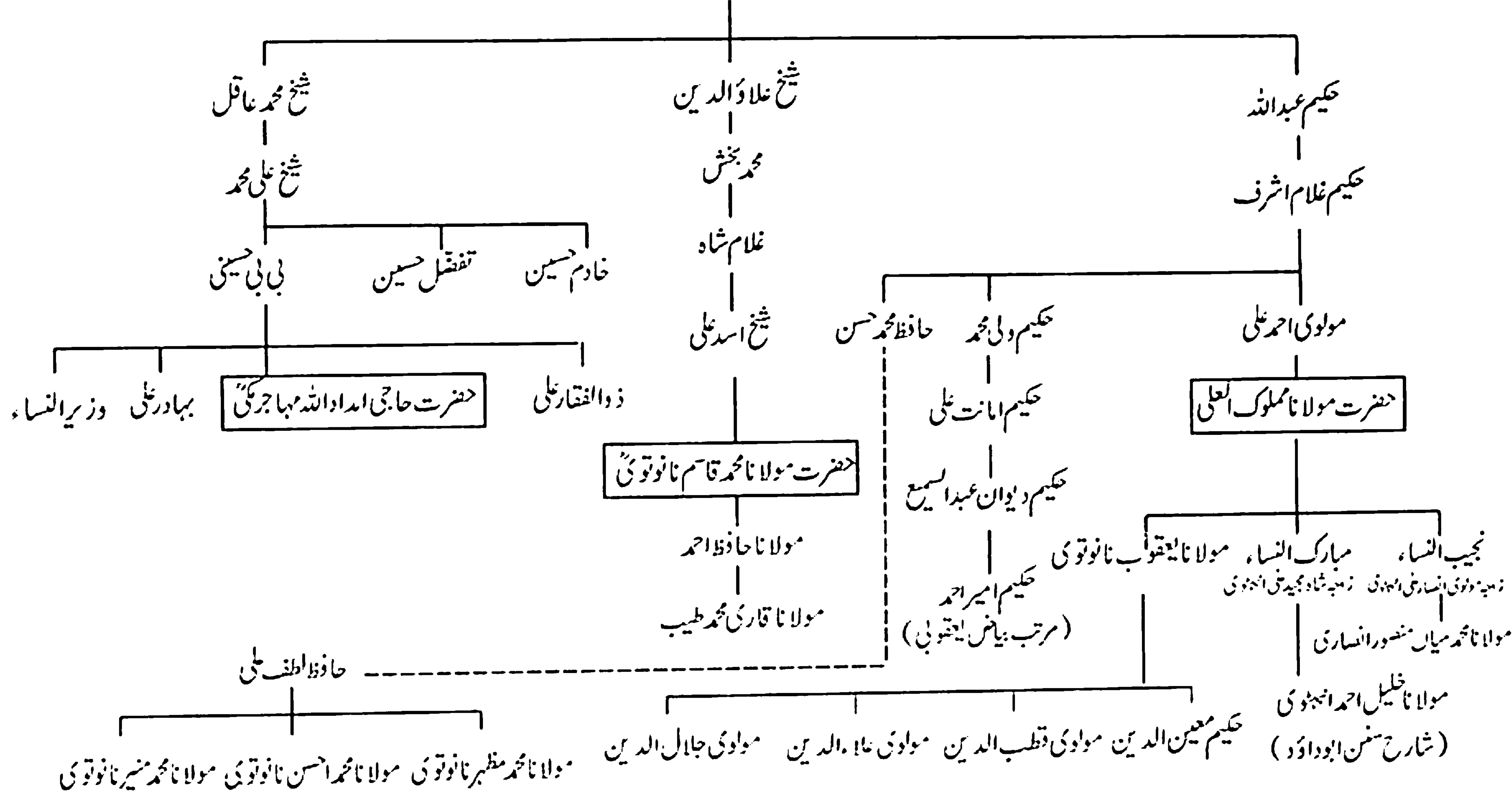
جو مختصر معلومات موجود ہیں وہ اشارہ کر رہی ہیں کہ اس خاندان کی پرانی شاخوں میں علم کی روایت موجود تھی، جس کو مولانا مملوک العلی کے عہد میں حق تعالیٰ نے خاص فضل وکرم سے نوازا، اور اس کو ایسی وسعت اور پذیرائی عطا فرمائی کہ اس کے اثرات وفوائد کل ہند بلکہ عالم گیر ہو گئے۔

خاندان کا شجرۂ نسب

خانوادۂ صدیقیان نانوتہ کے مختصر تعارف کے بعد اس خانوادہ کے مختصر شجرہ کا اندراج مناسب ہوگا جس سے نانوتہ کے متأخر دور کے مشہور علماء کے آباء واجداد کے نام اور انکے آپس میں رشتوں کی تفصیل بیک نظر سامنے آجائے گی۔

[نوٹ: یہ شجرہ مقدسہ بیاض یعقوبی، مرتبہ حکیم امیر احمد عشرتی نانوتوی (جو مولانا مملوک العلی کے بھتیجے اور مولانا محمد یعقوب کے چچازاد بھائی تھے ص: ۴۰ (طبع دوم تھانہ بھون: بلاسنہ) اور تذکرہ مولانا محمد احسن نانوتوی مرتبہ محمد ایوب قادری صاحب ص: ۱۸ (کراچی: ۱۹۶۶ء) نیز شجرہ فاروقیان تھانہ بھون، مرتبہ مولانا ناظر حسن صاحب تھانوی (نسخۂ مولف) سے لیا گیا ہے۔ اگرچہ نسب نامہ (صدیقیان نانوتہ) مرتبہ مفتی محمود احمد نانوتوی (دہلی: ۱۳۷۹ھ) میں بھی اس کا کچھ تذکرہ ہے مگر اس کی اطلاعات میں فروگذاشتیں ہیں اور بعض شاخوں، رشتوں کا ذکر ہی نہیں، اس لئے اس سے استفادہ تو کیا گیا ہے اس کو جوں کا توں نقل نہیں کیا گیا۔]

(۱) یہ فقرہ مولانا گیلانی کی طویل عبارت کا حصہ ہے، مفصل عبارت کے لئے دیکھئے سوانح قاسمی مؤلفہ مولانا مناظر احسن گیلانی ص ۱۷۱ ج ۱۔ (دیوبند: ۱۳۷۳)



شیخ ابوالفتح بن شیخ محمد مفتی بن شیخ عبدالسمیع بن مولوی محمد ہاشم
حکیم عبداللہ
شیخ علاؤالدین
شیخ محمد عاقل
حکیم غلام اشرف
محمد بخش
شیخ علی محمد
غلام شاہ
خادم حسین
تفضل حسین
بی بی حسینی
مولوی احمد علی
حکیم ولی محمد
حافظ محمد حسن
شیخ اسد علی
ذوالفقار علی
حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ
بہادر علی
وزیرالنساء
حضرت مولانا مملوک العلی
حکیم امانت علی
حکیم دیوان عبدالسمیع
حکیم امیر احمد
(مرتب بیاض یعقوبی)
حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ
مولانا حافظ احمد
مولانا قاری محمد طیب
نجیب النساء
زوجہ مولوی انصار علی انبہٹوی
مبارک النساء
زوجہ شاہ مجید علی انبہٹوی
مولانا یعقوب نانوتوی
مولانا محمد میاں منصور انصاری
مولانا خلیل احمد انبہٹوی
(شارح سنن ابوداؤد)
حکیم معین الدین
مولوی قطب الدین
مولوی علاء الدین
مولوی جلال الدین
حافظ لطف علی
مولانا محمد مظہر نانوتوی
مولانا محمد احسن نانوتوی
مولانا محمد منیر نانوتوی

مولانا مملوک العلی اور صدیقیان نانوتہ کا مکمل نسب نامہ

حضرت صدیق اکبر تک

مولانا محمد یعقوب اور مفتی محمود نانوتوی صاحبان نے اپنی اپنی تحریرات ومولفات میں اگرچہ خاندان کے پس منظراور اجداد کا خاصا ذکر کیا ہے، جسکا خلاصہ گذر گیا ہے، مگر دونوں صاحبان نے قاضی مظہر یا قاضی میراں کے اوپر سے اصحاب کا تعارف نہیں کرایا بلکہ تفصیلی نسب نامہ بھی نہیں لکھا، لیکن مولانا مناظر احسن گیلانی نے ایک موقع پر شیخ محمد ہاشم کے اوپر کی تمام کڑیوں کا (حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی ایک تحریر کے حوالہ) سے ذکر کیا ہے، جسکے ذریعہ شجرہ کی روداد مکمل ہوجاتی ہے۔اس سلسلہ میں سے مولانا مملوک العلی سے مولوی محمد ہاشم تک کے واسطے اوپر گذر چکے ہیں مولانا محمد ہاشم سے حضرت صدیق اکبر تک شجرہ اس طرح ہے:

''محمد ہاشم، بن شیخ شاہ محمد، بن قاضی طہٰ، بن شیخ مفتی مبارک، بن امان اللہ، بن جمال الدین، بن قاضی شیخ میراں بڑے، بن قاضی مظہر الدین، بن نجم الدین، بن نورالدین بن حسام الدین، بن ضیاء الدین، بن نورالدین، بن رکن الدین، بن رفیع الدین، بن ضیاء الدین، بن شہاب الدین بن خواجہ یوسف، بن شیخ جلیل، بن صدرالدین، بن شیخ رکن الدین سمرقندی، بن صدرالدین حاجی، بن اسماعیل شہید، بن نورالدین قتال، بن شیخ محمود، بن شیخ بہاء الدین، بن عبداللہ، بن زکریا، بن شیخ نور، بن سراج الدین، ابن شیخ سادھن صدیقی ابن حسیب الدین، ابن مسعود، بن عبدالرزاق، بن قاسم، بن محمد ابی بکر بن ابی قحافہ''۔(۱)

حکیم عبداللہ کے صاحبزادے حکیم غلام شرف تھے، انکے فرزند مولوی احمد علی اور ان کے صاحبزادۂ والا مرتبت حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی تھے۔

(۱) حاشیہ سوانح قاسمی صفحہ ۱۴۷ جلد اول (طبع اول دیوبند ۱۳۷۳ھ)

باب (۳)

مولانا مملوک العلی

ولادت، علاقہ اور وطن کا تعلیمی پس منظر

مولانا کے اساتذہ اور تعلیم کی تکمیل کے لئے دہلی کا سفر

صحیح نام مولانا مملوک العلی کا نام عام طور سے مملوکِ علی لکھا جاتا ہے لیکن صحیح نام مملوک العلی (الف لام کے ساتھ) ہے۔ مولانا زمانۂ طالب علمی میں اپنا نام مملوک علی بھی لکھا کرتے تھے۔ اگر ابتداء میں یہی نام تھا تو اسکی وجہ شیعیت کے بڑھتے ہوئے وہ اثرات تھے جس سے مولانا مملوک العلی کا وطن نانوتہ اور خاندان بھی خاصا متاثر ہوا تھا۔ ذکر آچکا ہے کہ نانوتہ کے متعدد سنی شیعہ ہو گئے تھے اور یہ وہی دور ہے جب مولانا مملوک العلی تولد ہوئے تھے، اسلئے ممکن ہے کہ مولانا کا نام مملوک علی رکھا گیا ہو مگر بعد میں جب مولانا اور ان کے اہل خاندان حضرت شاہ ولی اللہ کے علماء کی صحبتوں سے فیضیاب ہوئے اور تحریک سید احمد شہید کا غلغلہ بلند ہوا تو اس غلطی کا احساس ہوا اسوقت اس غلطی کی اصلاح کر لی گئی تھی، آخر میں مولانا اپنا نام صرف مملوک العلی ہی لکھتے تھے۔ مولانا کے جو چند دستخط اور تحریریں ہمارے ذخیرہ میں موجود ہیں ان میں سے اکثر میں مولانا نے اپنے دستخط مملوک العلی ہی کئے ہیں۔ اور یہ نسبت (جیسا کہ بعض اصحاب کو غلط فہمی ہوئی) حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے نہیں، بلکہ حضرت حق جل مجدہ سے ہے: وھو العلی الکبیر!

مولانا کے سنہ ولادت کے متعلق مولوی کریم الدین پانی پتی کی ایک روایت

مولانا کی تاریخ اور سنہ پیدائش کی صراحت کسی معاصر تحریر و تذکرہ یا مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی بیاض میں نہیں ہے، دریافت مآخذ میں مولانا کی عمر کے حوالہ سے سب سے پہلی اطلاع کریم الدین پانی پتی کی ہے (جو مولانا کا شاگرد اور دہلی کالج کا طالب علم تھا) پانی پتی نے طبقات شعرائے ہند (مؤلفہ ۱۸۴۷ء) میں لکھا ہے کہ:

''عمر اُن کی (۱۸۴۷ء میں) قریب ساٹھ سال کی ہوگی''(۱)

مولانا کے سنہ ولادت کے حوالہ سے فرحت اللہ بیگ کی ایک اطلاع

اگرچہ کریم الدین پانی پتی نے ۱۸۴۷ء (۱۲۶۳ھ) میں مولانا مملوک العلی کی عمر تقریباً ساٹھ سال لکھی ہے اور مرزا فرحت اللہ بیگ نے دہلی کے ایک یادگار مشاعرہ کے انعقاد کے وقت بھی جو طبقات شعرائے ہند کی تالیف سے دو سال پہلے (۱۸۴۵ء-۱۲۶۱ھ میں) منعقد ہوا تھا، مولانا مملوک العلی کی عمر کا یہی اندازہ ساٹھ برس کا کیا ہے۔ (۲)

مگر فرحت اللہ بیگ کی یہ اطلاع ان کا مشاہدہ یا تحقیق نہیں، بلکہ سبھی جانتے ہیں کہ فرحت اللہ بیگ کی تالیف ''دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ'' صرف ایک تمثیل اور ادبی شاہکار ہے تحقیق یا سوانح نہیں، فرحت اللہ بیگ نے کریم الدین پانی پتی اور محمد حسین آزاد کی آبِ حیات کی عبارتوں اور مندرجات کو اپنی اس تالیف کی بنیاد بنایا ہے، مرزا فرحت اللہ بیگ نے دونوں کی کتابوں سے شعراء کے خاکے لئے، دہلی کا ۱۲۶۱ھ کا مشاعرہ دیکھنے والوں سے کچھ قصے سنے اور ان تمام معلومات کو ایک یادگار پیکر میں ڈھال دیا، جس کا فرحت اللہ بیگ نے ان الفاظ میں اعتراف بھی کیا ہے:

---

(۱) طبقات شعرائے ہند ص ۴۶۴ (لکھنؤ: ۱۹۸۳ء) کریم الدین کا یہ تذکرہ ۱۸۴۷ء (۱۲۶۳ھ) میں مرتب ہوا اور ۱۸۴۸ء میں مدرسہ دہلی (دہلی کالج) سے چھپا، راقم سطور کو اس کی پہلی طباعت سے بھی استفادہ کا موقع ملا ہے۔

(۲) کریم الدین نے فرائد الدہر (تذکرۂ شعرائے عرب، مؤلفہ ۱۸۴۷ء) میں بھی مولانا مملوک العلی کا ذکر کیا ہے، مگر اس میں مولانا کی عمر کے متعلق کچھ نہیں لکھا، ص ۴۰۲ تا ص ۴۰۶ (طبع اول: مطبع العلوم، دہلی: ۱۸۴۷ء)۔ اس نہایت کمیاب تذکرہ کا ایک عمدہ نسخہ ہمارے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے۔

''لیکن ادھر تو آزاد مرحوم کے نیرنگ خیال نے دل میں مشاعرے کا خیال ڈالا، ادھر کریم الدین مغفور کی کتاب طبقات شعرائے ہند کے طبقۂ چہارم نے رجب ۱۲۶۱ھ کے ایک مشاعرے کا پتا دیا، اب کیا تھا دونوں کو ملا کر ایک مضمون پیدا کرلیا۔ رہی رنگ آمیزی اس کی تکمیل میں خود کر دیتا ہوں، البتہ اچھے بُرے کی ذمہ داری نہیں لیتا۔ (۱)

واقعہ یہ ہے کہ فرحت اللہ بیگ کی پیکر تراشی غضب کی ہے مگر اسکو تاریخی استناد اور حوالہ کی حیثیت حاصل نہیں، فرحت اللہ بیگ کا ۱۲۶۱ھ کے مشاعرے کے وقت مولانا مملوک العلی کی عمر ساٹھ سال لکھنا، کریم الدین کی روایت کی جوں کی توں نقل ہے، فرحت اللہ بیگ کی تحقیق یا مشاہدہ نہیں ہے اسلئے فرحت اللہ بیگ کی یہ اطلاع لائق استدلال نہیں۔

مولانا کا سنہ ولادت ۱۲۰۴ھ اہل خاندان کی ایک روایت

مولانا مملوک العلی کے سنہ ولادت کے متعلق ایک اور روایت مولانا مفتی محمود احمد نانوتوی کی ہے، مولانا انوار الحسن شیرکوٹی نے لکھا ہے:

''مفتی محمود احمد صاحب نانوتوی ابن مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نانوتوی (رفیق خاص مولانا محمد قاسم صاحب) نے میرے لئے (انوار قاسمی جلد اول کی تالیف کے وقت بوساطت مولانا قاری محمد طیب صاحب) ایک تحریر لکھ کر بھیجی تھی، اس میں مفتی صاحب لکھتے ہیں، مولانا مملوک العلی صاحب سنہ ۱۲۰۴ھ ۱۷۸۹ء میں نانوتہ ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے۔ (۲)

مگر مفتی محمود نے اپنی اس اطلاع کا ماخذ نہیں لکھا، اور کریم الدین پانی پتی نے ۱۲۶۳ھ میں مولانا کی عمر کا اندازہ جو ساٹھ برس کا کیا ہے، وہ بھی اس کے قریب ہی کا ہے، کریم الدین نے مولانا کو دیکھ کر عمر کا اندازہ کرلیا ہے اور لکھ دیا ہے، مولانا یا ان کے گھرانے کے کسی شخص سے دریافت نہیں کیا، اور ایسے اندازہ میں کسی قدر غلطی کا ہمیشہ امکان رہتا ہے، مگر اس صورت میں بھی کریم الدین کی یہ اطلاع مولانا مفتی محمود احمد نانوتوی کی روایت کی

(۱) دہلی کی آخری شمع ص ۱۴۔۲۹

(۲) انوار قاسمی از مولانا انوار الحسن شیرکوٹی ص ۸۴ (لاہور: ۱۳۸۹ھ) نیز، سیرت یعقوب و مملوک از مولانا انوار الحسن شیرکوٹی ص ۲۶ (کراچی: ۱۳۹۴ھ)

گویا تائید کر رہی ہے، اس لئے مولانا مملوک العلی کا سنہ ولادت ۱۲۰۴ھ مطابق ۱۷۸۹ء تقریباً متعین سمجھنا چاہئے۔

تعلیم مولانا کی ابتدائی تعلیم کے متعلق معلومات مفقود ہیں، چونکہ مولانا کے والد مولوی احمد علی (جیسا کہ) نام کے ساتھ مولوی کے لاحقہ سے معلوم ہو رہا ہے(۱) عالم تھے، نیز اس خاندان اور گھرانہ میں اور بھی متعدد اصحاب طب وغیرہ کے فاضل تھے اور یقیناً ایسے اہل علم بھی موجود ہوں گے کہ جن کا اس وقت دستیاب نا تمام تحریری سرمایہ میں ذکر نہیں ہے، اسلئے قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر خاندان کے بزرگوں اور اہل علم سے حاصل کی ہوگی۔

اس علاقہ کا دینی تعلیمی ماحول اور اس علاقہ میں علمی چرچوں کے حقیقی محرکات

تعجب ہے کہ مولانا مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی میں اس علاقہ میں علم کے ذوق اور چرچوں کو حضرت سید احمد شہیدؒ کے دورے کا اثر اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے وابستگی کا ثمرہ بتایا ہے(۲) حالانکہ مولانا گیلانی اس علاقہ کی تاریخ اور علماء سے واقف تھے۔ بیاض مولانا یعقوب نانوتوی اور اس علاقہ کے علماء پر متعدد تالیفات (جو سوانح قاسمی کی تالیف سے برسوں پہلے چھپ گئی تھیں) مولانا کی نظر سے گذری ہونگی، مگر مولانا نے پھر بھی اس بعید خیال کو قابل بحث وگفتگو سمجھا اور اس خانوادہ اور علاقہ میں علم وعمل کا جو ذوق تھا، اس کا اصل منبع اور سرچشمہ کہاں تھا، اس پر مطلق توجہ نہیں فرمائی۔

---

(۱) مقدمہ مکتوبات یعقوبی از امیر احمد عشرتی نانوتوی ص ۴ (طبع اول علی گڑھ: ۱۳۲۷ھ)

(۲) سوانح قاسمی (سوانح مولانا محمد قاسم نانوتویؒ) ص ۸۱۔۹۱ (طبع اول دیوبند: ۱۳۷۳ھ طبع دوم دیوبند: ۱۳۹۵ھ) مولانا کی اس بے بنیاد قیاس آرائی کی ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے تذکرہ مولانا محمد احسن نانوتوی ص ۱۷۰ (کراچی: ۱۹۶۶ء) میں، مولانا محمد انوار الحسن شیرکوٹی فاضل دیوبند نے انوار قاسمی ص ۶۲ ج ۱ (لاہور: ۱۳۸۹ھ) میں اور محمد اکرام چغتائی صاحب نے ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۲۹ (سہ ماہی اردو، کراچی۔ مارچ ۱۹۸۵ء) میں بجا طور پر تردید کی ہے۔

نانوتہ اور اس علاقہ میں علم کی پرانی روایت

واقعہ یہ ہے کہ اس پورے علاقہ (دوآبہ گنگا و جمنا) میں علم کی روایت قدیم تھی اور یہاں کئی سو سال سے تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری تھا، بڈھانہ، تھانہ بھون، جھنجھانہ، دیوبند، گنگوہ، کاندھلہ، کیرانہ، وغیرہ میں سے کون سی جگہ ایسی تھی جہاں ۱۲۰۰ھ سے پہلے علم کے چشمے جاری اور تدریس و تعلیم کا ذوق زندہ نہیں تھا۔ نانوتہ کے شیوخ اور سادات میں بھی علم و مشیخت کا سلسلہ پرانا تھا اور وہ خانوادہ بھی جس سے حضرت مولانا مملوک العلی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد احسن نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی (رحمہم اللہ تعالیٰ) وغیرہ وابستہ ہیں قدیم علمی روایات رکھتا تھا، اس میں متعدد علماء اور تعلیم یافتہ اصحاب گزرے تھے اور آخر تک ان کے اثرات محفوظ تھے، مولانا مملوک العلی کے والد ماجد مولوی احمد علی بھی عالم تھے، اور حضرت مولانا محمد قاسم کے والد بزرگوار شیخ اسد علی بھی دہلی کے تعلیم یافتہ اور فارسی کے فاضل تھے، اس کے علاوہ اطراف و نواح کے قصبات میں بڑے بڑے علماء کی موجودگی اور علمی چہل پہل سے بھی اس خانوادہ کے سعید افراد کے ذوق علم کو مہمیز لگی ہوگی اور اس کے اثر سے بزرگوں کے علم اور خدمت دین کی روایت انکی اولاد اور خاندان میں دوبارہ زندہ اور تازہ ہوئی اور بعد کے لوگوں کیلئے بھی علمی منزلوں کی پہچان آسان ہوگئی۔

اس خطہ میں علم کی آبیاری میں حضرت مفتی الٰہی بخش کا حصہ

خاندان کے ماحول اور قدیم روایات کے علاوہ اس کارواں کے آگے بڑھنے کیلئے دو طاقتور محرکات اور بھی تھے، یہ محرکات حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کا فیضان اور حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کے حلقۂ تعلیم و تربیت اور شاگردوں کا اثر تھا۔

اگرچہ حضرت شاہ ولی اللہ کے دور میں اور اس سے پہلے بھی یہاں علمی روایات جاری اور تعلیم و تعلم کے قافلے آمادۂ سفر رہتے تھے، مگر حضرت شاہ صاحب کی ذاتِ گرامی سے جو اک بے پناہ آبشار پھوٹا اور اس سے علم و عمل کے جو دریا جاری ہوئے، شریعت و سنت کی

کارفرمائی اور طریقۂ نبوت کو چراغِ راہ بنانیکی جو قدیم روایت شدت وقوت سے تازہ ہوئی، اسکی قریب کے دور میں کوئی مثال نہیں تھی۔ پھر یہ علاقہ حضرت شاہ صاحب کی خدمات اور انکے شاگردوں کی علمی تگ وتاز کا خاص مرکز تھا، یہاں کے متعدد قصبات اور بستیوں میں حضرت شاہ ولی اللہ سے براہِ راست مستفید قابل قدر شاگرد (۱) مسند علم بچھائے علم وہدایت کے جام لٹا رہے تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے بعد انکے فرزند جلیل، حضرت شاہ عبدالعزیز کی ذاتِ گرامی سے جو بحر بیکراں جاری ہوا، اس کی وسعت وثروت کا اندازہ بھی آسان نہیں۔ اس علاقہ کی کون سی بستی اور آبادی ایسی تھی، جہاں اسکا براہِ راست اثر نہیں پہنچا اور اس سے بے شمار اصحابِ علم وصلاحیت سیراب نہیں ہوئے۔

اس علاقہ میں حضرت شاہ عبدالعزیز کے (حضرت شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے بعد) سب سے بڑے اور ممتاز ترین شاگرد حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی (ولادت ۱۱۶۲ھ۔ وفات ۱۲۴۵ھ) قیام فرماتے اور ان کے علم کا وسیع فیضان جاری تھا۔

مفتی صاحب کے شاہ عبدالعزیز کے ممتاز ترین شاگرد ہونے کا شاہ صاحب کی حیات سے چرچا تھا، متعدد علماء اور تذکرہ نگاروں نے اس کی صراحت کی ہے۔ سب سے بڑھ کر خود حضرت شاہ عبدالعزیز کے ملفوظات میں اس کا ذکر اور اعتراف ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

''از شاگردانِ من دو کس خوب بودند، چنانچہ مولوی رفیع الدین ومولوی الٰہی بخش زندہ، ومراد علی درکلکتہ، لیکن شغل ایں گذاشتہ درتجارت مشغول است باقی مردند'' (۲)

---

(۱) پھلت، بڈھانہ نیز تھانہ بھون میں حضرت شاہ ولی اللہ کے براہِ راست شاگرد موجود تھے، جو درس وافادہ اور تصنیف وتالیف میں مشغول تھے، منگلور کے بعض اصحاب کی بھی شاہ ولی اللہ سے نسبت ذکر کی جاتی ہے، اور بھی چند علماء تھے جن کے متعلق خیال ہے کہ وہ حضرت شاہ صاحب سے مستفید تھے۔ تفصیلات مفصل مضمون کی طالب ہیں۔

(۲) ملفوظات حضرت شاہ عبدالعزیز۔ فارسی طبع اول مجتبائی، میرٹھ: ۱۳۱۴ھ

اس مجموعۂ ملفوظات کا اکثر حصہ شاہ رفیع الدین کی زندگی میں مرتب ہوا، اس کی ترتیب کے دوران شاہ رفیع الدین کی (۶ رشوال ۱۲۳۳ھ۔ ۱۹ راگست ۱۸۱۸ء) کو وفات ہوگئی تھی...... باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

ترجمہ: میرے شاگردوں میں دو شخص خوب ہوئے ہیں، مولوی (شاہ) رفیع الدین اور مولوی الٰہی بخش، یہ زندہ موجود ہیں اور مراد علی کلکتہ میں، مگر انھوں نے علمی مشغلہ چھوڑ دیا تجارت میں مشغول ہیں، اور اچھے شاگرد انتقال کر گئے۔

جن کی علمی اصلاحی، تربیتی خدمات کا دائرہ اور اثر اور تعلیم و تدریس کا سلسلہ اس علاقہ کے قصبات اور شہروں سے گزر کر اطراف لکھنؤ، راجستھان، بھوپال وغیرہ تک براہِ راست پہنچا ہوا تھا۔

سہارنپور نانوتہ اور اس سے ملحق قصبات اور اس علاقہ میں بھی مفتی الٰہی بخش کے علمی دینی اثرات دور تک پھیلے ہوئے تھے، حضرت موصوف کے فیوض و کمالات کا خاص چرچا تھا، مفتی صاحب سے تلمذ و انتساب کی بہت وقعت و اہمیت تھی اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اس خطہ میں اس وقت جن علماء کے اثرات سب سے وسیع اور ان کا حلقۂ درس بے پناہ تھا ان میں حضرت مفتی الٰہی بخش کا نام نامی سب سے نمایاں اور مرجع کل کی حیثیت رکھتا تھا۔ مفتی صاحب کے حلقۂ درس میں شرکت کیلئے دور دور سے آئے ہوئے طلباء کا ہجوم رہتا تھا نواح کے جو علماء اس وقت درس و تعلم کیلئے معروف اور نمایاں تھے (یا مولانا مملوک العلی کے عہد میں ممتاز ہوئے) وہ بھی زیادہ تر مفتی صاحب کے شاگرد تھے، مثلاً سہارنپور میں (حضرت مولانا احمد علی محدث کے استاد) مولانا وجیہ الدین (۱) اور حکیم مغیث الدین

گذشتہ صفحہ کا بقیہ...... آخری تقریباً ایک تہائی ملفوظات (ص۸۴ تا ص) شاہ رفیع الدین کی وفات کے بعد ارشاد فرمائے اور قلم بند کئے گئے۔ مگر اس مجموعہ کے مرتب کا نام معلوم نہیں اس مجموعۂ ملفوظات کے بعض مندرجات اور دوسرے قرائن سے خیال ہوتا ہے کہ اس کا مرتب میرٹھ کا رہنے والا تھا۔

(۱) مولانا وجیہ الدین سہارنپوری صدیقی محسنی خاندان کے فرد اور قضات سہارنپور سے تعلق رکھتے تھے، حزب ولی اللّٰہی کے بڑے ممتاز عالم، نامور فقیہ، بلند پایہ مصلح اور محدث تھے۔ حضرت مفتی الٰہی بخش کے شاگرد تھے بخاری شریف کا سلسلۂ اجازت وسند مولانا عبدالحی بڈھانوی سے ہے، مولانا احمد علی نے بخاری شریف مولانا وجیہ الدین سے پڑھی، مولانا احمد علی نے مقدمہ صحیح بخاری میں مولانا وجیہ الدین کے حوالہ سے یہ سند تحریر فرمائی ہے۔

"قرأت اکثرهذا الجامع الصحیح للبخاری رحمه الله تعالی، علی الفاضل الفقیه الالمعی ،الشیخ وجیه الدین المحسنی الصدیقی السهارنفوری فی البلدة السهارنفور،صانهاالله عن الآفات. وحصل له الاجازة والقراءة عن الشیخ العالم الربانی ......باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر"

سہارنپوری (۱) نانوتہ میں مولانا عبدالرحیم (۲) (استاذ حضرت حاجی امداداللہ تھانوی

گذشتہ صفحہ کا بقیہ...... مولانا عبدالحی عن الشیخ الماھر فی علم الباطن والظاھر مولانا عبدالقادر ، عن اخیہ الشیخ عبدالعزیز ،عن ابیہ الشیخ ولی اللہ الدھلوی"

ترجمہ: میں نے اس کتاب ،امام بخاری کی جامع صحیح کا اکثر حصہ محقق،فقیہ ،ماہر شیخ وجیہ الدین محسنی صدیقی سہارنپوری سے شہر سہارنپور میں (اللہ تعالیٰ اس کو آفات سے بچائے رکھے) پڑھا،ان کو بخاری شریف کی اجازت اور پڑھنے کی سعادت عالم ربانی مولانا عبدالحیؒ سے ہوئی، انھوں نے علم ظاہر و باطن کے ماہر مولانا عبدالقادر سے پڑھی ،اورانھوں نے اپنے بھائی شیخ عبدالعزیز سے ،انھوں نے اپنے والدشاہ ولی اللہ سے پڑھی۔

مولانا وجیہ الدین کے مفتی صاحب سے تلمذ کے گواہ مولانا وجیہ الدین کے وہ افادات ،حاشیے یاتحریریں ہیں جومفتی الٰہی بخش کی بیاضوں اور بعض تصانیف اورمملوکہ کتابوں پر درج ہیں ۔مفتی صاحب مولانا کومیاں وجیہ الدین لکھتے ہیں مثلاً تحریر ہے،''مرقوم میاں وجیہ الدین''

مولانا وجیہ الدین اپنے عہد کے ممتاز اہل فتویٰ میں تھے،حضرت شاہ محمد اسحاق مولانا وجیہ الدین کے فتوؤں کو اپنے فتاویٰ سے زیادہ لائق اعتماد فرماتے تھے،مولانا کے متعدد فتوے اور مختلف افادات اور تحریریں (بفضلہ تعالیٰ ہمارے ذخیرہ میں) موجود ہیں ۔مولانا وجیہ الدین سید احمد شہید سے بیعت ہوئے اور سید صاحب کے قافلہ کے ساتھ ۱۲۳۷ھ میں حج کی سعادت حاصل کی ۔ربیع الاول ۱۲۶۰ھ (اپریل ۱۸۴۲ء) سے پہلے کسی وقت وفات پائی ۔صحیح تاریخ اور سنہ وفات معلوم نہیں۔

(۱) مولانا حکیم مغیث الدین: بن محمد بخش بن غلام شرف سہارنپور کا صدیقی ،محسنی، قاضی خاندان سے تعلق تھا۔مفتی الٰہی بخش کاندھلوی سے تعلیم حاصل کی ۔حکیم صاحب بڑے عالم،نہایت متقی ،عابدوزاہد،حدودشریعت کا نہایت خیال رکھنے والے اورلوگوں کے ساتھ احسان اور بھلائی کا معاملہ کرنے والے تھے ۔حضرت سید احمد شہید سے بیعت ہوئے اوراپنے علاقے کے نمایاں اصحاب میں شامل تھے ۔سید صاحب سے بیعت کے بعد سید صاحب کی خدمت میں حاضر رہے ۔۱۲۳۷ھ (نومبر ۱۸۲۱ء) میں حضرت شاہ محمد اسمٰعیل وغیرہ کے ساتھ سفر حج کے لئے نکلے ،شاہ محمد اسمٰعیل نے گڑھ مکتیسر سے روانگی کے وقت حضرت سید صاحب کو جو خط لکھا تھا اس میں اپنے ممتاز رفقاء میں حکیم مغیث الدین اور مولانا وجیہ الدین کے نام بھی لکھے ہیں ۔حکیم مغیث الدین کو حضرت سید احمد شہید اورشاہ عبدالرحیم ولایتی سے (جو حضرت میاں جی نور محمد کے بھی پیرومرشد تھے) اجازت بیعت حاصل تھی ۔حج سے واپسی کے بعد سید صاحب کے ہمرکاب اور سفر جہاد میں شریک رہے ،سہارنپور میں جنگ بالاکوٹ (۱۲۴۶ھ ،۱۸۳۰ء) کے بعد وطن واپس آ گئے تھے، سہارنپور میں ۱۲۶۵ھ (۱۸۴۹ء) میں وفات ہوئی ۔مزید معلومات کیلئے ملاحظہ ہو: نزہۃ الخواطر ،مولانا عبدالحیؒ حسنی ص ۵۰۰ ج ۷ (حیدرآباد: ۱۳۹۹ھ) سیرت سید احمد شہید ،مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (لکھنؤ: ۱۳۹۷ھ) اور جسٹر انساب صدیقیان سہارنپور (فوٹو اسٹیٹ نزد راقم سطور) ۔

(۲) مولانا عبدالرحیم نانوتوی: افسوس ہے کہ ان کے والد کا نام ،خاندان اوراحوال دریافت نہیں ۔مولانا عبدالرحیم حضرت مفتی الٰہی بخش کے شاگرد اور حضرت حاجی امداداللہ کے استاد تھے ۔ باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر......

6

مہاجر مکی) رام پور منہیاران (نزد نانوتہ) میں مولانا محمد حسن رامپوری (۱) جلال آباد میں استاذ العلماء مولانا سید محمد قلندر (۲) اور مولانا عبدالرحمٰن خان (۳) تھانہ بھون میں مولانا

گذشتہ صفحہ کا بقیہ...... حاجی امداد اللہ نے فقہ اکبر، حصن حصین مولانا عبدالرحیم سے پڑھی تھیں، حاجی صاحب فرماتے تھے:
''حصن حصین وفقہ اکبر امام الائمہ سراج الامہ امام اعظم ابی حنیفہ نعمان بن ثابت رضی اللہ عنہ قراءۃً حضرت مولانا عبدالرحیم مرحوم نانوتوی سے اخذ کیا اور یہ ہردو بزرگوار ارشد تلامذہ، عارفِ مستغرق حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کے تھے۔ (شمائم امدادیہ ص ۱۱ مرتبہ حاجی مرتضیٰ خاں قنوجی (لکھنؤ: ۱۳۱۴ھ)

(۱) مولانا محمد حسن: بن غلام مصطفیٰ انصاری رام پوری (رام پور منہیاران نزد نانوتہ) ضلع سہارنپور کے باشندے تھے حکیم مغیث الدین سہارنپوری اور حضرت مفتی الٰہی بخش سے تعلیم حاصل کی۔ بڑے عالم اور اپنے عہد کے ممتاز فاضل تھے، درس وافادہ میں مشہور تھے، سید احمد شہید سے بیعت اور مجاز طریقت ہوئے، سید صاحب کے ساتھ جہاد میں گئے، سید صاحب کے قافلہ میں مولانا عبدالحیؒ اور شاہ محمد اسمٰعیل کے بعد مولانا محمد حسن علم وصلاحیت اور حسن انتظام وغیرہ میں سب سے اول اور نمایاں تھے۔ منظورۃ السعداء میں کئی جگہ مولانا محمد حسن کا تذکرہ ہے، ایک جگہ لکھا ہے: ''مولوی محمد حسن رام پوری کہ در خاکساری وعجز وعلم وقابلیت بعد مولانا محمد اسمٰعیل نظیر خود نداشتند'' (ص ۷۰۷۔ نسخہ قلمی مخزونہ، ندوۃ العلماء لکھنؤ) ایک اور موقع پر تحریر ہے: ''مولانا محمد اسمٰعیل ومولوی محمد حسن رام پوری بجائے وزیر آنجناب بودند'' (ص ۷۵۰)۔

مولانا محمد حسن، سید صاحب کے اہم مشوروں میں بطور خاص شریک کئے جاتے تھے، چند موقعوں پر سید صاحب کے نمائندے اور سفیر بھی رہے، پھولڑہ کی جنگ میں شہید ہوئے۔ مولانا محمد حسن کو شاہ احسان علی پٹنی اور مفتی الٰہی بخش سے بھی اجازت بیعت حاصل تھی۔ مزید معلومات کے لئے ملاحظہ ہو: سیرت سید احمد شہید مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (لکھنؤ: ۱۹۷۷ء) کاروانِ ایمان وعزیمت: مولانا ابوالحسن علی ندوی ص ۱۱۹ (لاہور: ۱۹۹۰ء) جماعت مجاہدین ص ۲۷۲۔ مولانا غلام رسول مہر (لاہور: ۱۹۵۵ء) بیاض دلکشا: مولانا نصر اللہ خویشگی ص ۱۲۷ (فتح الاخیار: کول)

(۲) مولانا سید محمد قلندر جلال آبادی: بہت بڑے عالم، عارف، محدث، متبع سنت اور غیر معمولی کمالات کے بزرگ تھے کسی قدر تعارف عنقریب آرہا ہے۔

(۳) مولانا عبدالرحمٰن خاں جلال آبادی: حضرت مفتی الٰہی بخش کے شاگرد اور بلند پایہ عالم تھے، حضرت حاجی امداد اللہ نے ان کے فضل وکمال کا ذکر فرمایا ہے اور مولانا نصر اللہ خویشگی نے مولانا عبدالرحمٰن خاں کا نام بہت ادب واحترام اور القاب وآداب کے ساتھ اس طرح لکھا ہے:
''علامہ زماں، فہامہ دوراں، جامع علوم عقلیہ، مجمع فنون نقلیہ، صوفی باصفا، عالم بے ریا، صراف نقود توحید، نقاد مبالغ تفرید، مقبول حضرت سبحان مولوی عبدالرحمٰن جلال آبادی''

مولانا عبدالرحمٰن خاں شاہ احسان علی پٹنی کے خلیفہ اول تھے، اور شاہ احسان علی اپنے دور کے بہت ممتاز مشائخ اور عارفین میں تھے۔ حضرت میاں جی نور محمد سب سے پہلے ان ہی سے بیعت ہوئے۔ تفصیلات کیلئے ملاحظہ ہو راقم سطور کا مضمون: سہ ماہی احوال آثار کاندھلہ (شمارہ جنوری فروری مارچ ۱۹۹۵ ص ۳۸ تا ۷۹) باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر..

عبدالرحیم (۱) (استاد مولانا شیخ محمد تھانوی) لوہاری میں مولانا محمد صادق (۲) جھنجھانہ میں مولانا عبدالرزاق (۳) یہ بھی حضرت حاجی امداداللہ کے استاذ ہیں)۔

کاندھلہ اور اطراف میں ان حضرات کے علاوہ حضرت مفتی صاحب کے اور بھی کئی شاگرد اور خاص تربیت یافتہ اصحاب موجود تھے جن کے دم سے علم کی شمع روشن اور تعلیم و

گذشتہ صفحہ کا بقیہ...... مولانا عبدالرحمٰن کے مختصر تعارف کیلئے دیکھئے: بیاض دلکشا ص ۴۹، ۵۰۔
مولانا عبدالرحمٰن آخر میں جمال شاہ نامی ایک مجذوب کے معتقد ہو گئے تھے، ان کی توجہ سے مجذوبیت کا کچھ اثر ہو گیا تھا اسی کیفیت میں وفات پائی۔ شمائم امدادیہ (ملفوظات حضرت حاجی امداداللہؒ) مرتبہ حاجی مرتضیٰ خان۔ ص ۱۵۴۔۱۵۵ (لکھنؤ: ۱۳۱۴ھ)

(۱) مولانا عبدالرحیم تھانوی: خلف عبدالحکیم (بن غلام فرید بن مالک بن محمد رضا)۔ مولوی عبدالرحیم صاحب بھی مفتی الٰہی بخش کے شاگرد، جامع معقول و منقول عالم، نہایت متقی و پرہیزگار شخص تھے، دنیا کے معاملات اور قصوں سے کچھ سروکار نہیں رکھتے تھے۔ طویل عمر پائی۔ ۱۸۵۷ء میں تھانہ بھون پر انگریز دستوں کی یلغار کے وقت شہید کر دیئے گئے تھے۔ (استفادہ از تاریخ تھانہ بھون، قلمی)

(۲) مولانا محمد صادق لوہاروی: مفتی الٰہی بخش کے شاگرد، معقول اور منقول کے جامع اور معرفت و سلوک میں کامل تھے۔ مولانا صادق اور میانجیو نور محمد صاحب کی چالیس سال سے زیادہ دوستی اور رفاقت تھی اور میانجیو صاحب مولانا صادق سے مراسم کی وجہ سے مولانا کی طلب پر لوہاری گئے تھے، نامور عالم و مرشد مولانا شاہ عبدالعلیم لوہاروی مولانا محمد صادق کے شاگرد تھے۔

(۳) مولانا عبدالرزاق: (خلف شیخ امام بخش بن شمس الدین) جھنجھانوی، مفتی الٰہی بخش کے نواسے اور عزیز شاگرد تھے، علوم درسیہ میں کمال حاصل کیا، طب پڑھی اور مثنوی مولانا روم کے اسرار و رموز کی گرہ کشائی فرمائی اور اس کے مرجع و امام سمجھے گئے، خطاطی کا فن محمد امیر پنجہ کش دہلوی سے حاصل کیا، فنون سپہ گری بنوٹ وغیرہ میں بھی غیر معمولی دسترس تھی۔ تمام عمر مثنوی شریف کی تعلیم دی، تقریباً ساٹھ سال تک درس مثنوی کی خدمت جاری رہی، بقول حکیم الامت مولانا تھانویؒ ''کم سے کم سو مرتبہ تو پڑھائی ہوگی بلکہ زیادہ'' حضرت حاجی امداداللہ تھانوی نے تین مرتبہ پوری مثنوی شریف مولانا عبدالرزاق سے پڑھی، حاجی صاحب نے فرمایا: ''میں نے تین مرتبہ مثنوی شریف حضرت مولانا عبدالرزاق جھنجھانوی پر عرض کی'' شمائم امدادیہ ص ۱۰۰۔ حضرت حاجی صاحب کی اہلیہ بی بی خیرا، نیز مولانا فتح محمد تھانوی اور ان کے علاوہ اندازاً کئی سو علماء اور اہل معرفت نے مولانا عبدالرزاق صاحب سے مثنوی پڑھی تھی۔ مولانا عبدالرزاق کو حضرت مفتی الٰہی بخش سے اجازت بیعت حاصل تھی۔ مولانا عبدالرزاق مفتی صاحب کی ہدایت پر شاہ احسان علی پٹنی سے بیعت ہوئے اور استفادہ کیا۔ مولانا عبدالرزاق کی ربیع الاول ۱۲۹۳ھ اپریل ۱۸۷۵ء میں کاندھلہ میں وفات ہوئی۔ مفتی الٰہی بخش وغیرہ کے قریب ان کے خاندانی قبرستان میں دفن کئے گئے۔ مزید معلومات کیلئے ملاحظہ ہو راقم سطور کا مضمون: مولانا عبدالرزاق جھنجھانوی، ضمیمہ امداد المشتاق (مکتبہ برہان، دہلی: ۱۹۸۱ء)

تربیت کے حلقے شاداب و پر بہار تھے، پھران شاگردوں کے متوسلین کا سلسلہ جاری ہوا۔
اس طرح مفتی صاحب کے وابستگان کا سلسلہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ حضرت مفتی صاحب کے چند شاگردوں کی خدمات ممتاز ترین تلامذہ کی طویل فہرست اوران سے مستفیدین کے درج بالا چند نام ہمارے اس خیال کی تصدیق کررہے ہیں (۱)
مذکورہ تفصیلات سے یہ بھی واضح ہوگیا ہے کہ اس علاقہ میں دینی علمی ماحول بنانے اور گھر گھر عام کرنے میں حضرت شاہ ولی اللہ کے خانوادۂ گرامی کے بعد سب سے بڑا حصہ حضرت مفتی الٰہی بخش کی خدمات واثرات اور شاگردوں کا ہے۔ مفتی صاحب کے وسیع اور طویل حلقۂ درس نے اس علاقہ کی ایک ایک بستی میں علم وفضل کے چرچے، تعلیم وتدریس کے حلقے عام کردیئے تھے اوراطراف کے بڑے بڑے علماء اوراہل درس وافادہ، مفتی صاحب کے فیض یافتہ تھے، ان علماء سے استفادہ کے بعد باذوق طلبہ حضرت مفتی الٰہی بخش کی خدمت میں حاضری کوسعادت سمجھتے تھے اس وقت کے طلبہ کے اس معمول کے مطابق مولانا مملوک العلی نے بھی پاسداری کی، ابتدائی یا متوسط تعلیم کے بعد مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مفتی صاحب سے استفادہ کیا۔
گذر گیا ہے کہ مولانا مملوک العلی کے زمانہ تعلیم میں حضرت مفتی الٰہی بخش کے سلسلہ درس وافادہ کی شہرت ومقبولیت عام تھی، مولانا مملوک العلی کے وطن نانوتہ اوراس کے اطراف میں بھی مفتی صاحب کے متعدد شاگرد موجود اور طلبہ کی تعلیم وتربیت میں مشغول تھے، نانوتہ میں مولانا عبدالرحمٰن اور مولانا عبدالرحیم کی مسند درس بچھی ہوئی تھی (نانوتہ سے ملحق قصبہ) رام پور منہیاران میں بھی مفتی صاحب کے ممتاز شاگرد مولانا محمد حسن تبحر عالم، صاحبِ درس وتحقیق شخص اور مرجع طلبہ تھے۔ عین ممکن اور ہر طرح سے قرین قیاس ہے کہ مولانا مملوک العلی صاحب نے ابتدائی تعلیم کے لئے سب سے پہلے مقامی علماء خصوصاً مذکورہ حضرات میں سے کسی سے رجوع کیا ہوگا، اور بظاہر خاندان کے اہل علم اور مقامی علماء سے تعلیم کے بعد وطن سے نکلے ہوں گے۔

(۱) مفتی صاحب کے براہِ راست شاگردوں اوران کے چند مستفیدین کے متعلق اجمالی معلومات کے لئے ملاحظہ ہو: ''شجرۂ فیض علم وکمال حضرت مفتی الٰہی بخش'' مرتبہ نورالحسن راشد کاندھلوی۔

مولانا کا تعلیم کے لئے سفر اور اساتذہ

اگر چہ مولانا مملوک العلی کے زمانۂ تعلیم اور اساتذہ کی تفصیل دستیاب نہیں، مگر یہ طے ہے کہ مولانا مملوک العلی نے حضرت مفتی الٰہی بخش اور ان کے ممتاز شاگرد (عارف باللہ) مولانا سید محمد قلندر جلال آبادی کی خدمت میں وقت گذارا ہے اور دونوں سے تعلیم حاصل کی ہے اور مختلف علوم وفنون میں دونوں کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا ہے۔ اور ان دونوں کے علاوہ مولانا مملوک العلی کے کم سے کم تین استادوں کے نام اور دستیاب ہیں، اس لئے مولانا مناظر احسن گیلانی کی یہ اطلاع صحیح نہیں کہ مولانا مملوک العلی نے صرف مولانا رشید الدین خاں سے تعلیم پائی ہے اور مولانا رشید الدین خاں کے علاوہ مولانا مملوک العلی کا کوئی اور استاذ نہیں ہے۔ مولانا گیلانی نے لکھا ہے کہ:

''مولانا مملوک العلی کے سوانح نگاروں کا اس پر اتفاق ہے کہ انھوں نے اول سے آخر تک جو کچھ بھی پڑھا ان ہی مولانا رشید الدین خاں صاحب سے پڑھا'' (۱)

اسی سلسلہ گفتگو میں چند سطروں کے بعد مزید تحریر ہے:

''اس کے بعد اول سے آخر تک مولانا مملوک العلی نے سب کچھ مولوی رشید الدین خاں صاحب سے پڑھا'' (۲)

آئندہ تفصیلات سے واضح ہوگا کہ مولانا گیلانی کا یہ قول قطعاً درست نہیں۔

ایک اور بے ثبوت روایت

مذکورہ معلومات اور اس نواح کی نہایت تر وتازہ وسیع علمی فضا کی موجودگی میں اس روایت کی کیا حقیقت باقی رہ جاتی ہے جو مولانا مفتی محمود احمد نانوتوی نے بعض بزرگوں کے حوالہ سے نقل کی ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ:

''مولانا جب قریب البلوغ تھے کوئی نیک مرد بزرگ مسافرانہ انداز میں نانوتہ وارد ہوئے جن کی نظر مولانا پر پڑی جو مسجد سے باہر کھیل میں مشغول تھے، بزرگ مسافر نے دریافت فرمایا کہ: صاحبزادہ کیا پڑھ رہے ہو؟ یہ جواب میں خاموش رہے۔ انہوں نے فرمایا تعجب ہے کہ

(۱) سوانح قاسمی ص ۹۲ ج ۱ (۲) سوانح قاسمی ص ۹۳ ج ۱

کوئی شریف زادہ پڑھنے کے استفسار پر خاموش رہے، انہوں نے عرض کیا کہ کوئی پڑھانے والا قصبہ میں نہیں، مسافر نے فرمایا پڑھنے والا ہو تو پڑھانے والوں کی کمی، آؤ چلو میں پڑھواؤں، یہ ساتھ ہولئے، دہلی پہنچ کر کسی مدرسہ میں داخل کرادیئے گئے اور تمام علوم کی تحصیل سے فارغ ہوکر ہی نانوتہ ایک عالمانہ شان میں واپس ہوئے'' (۱)

مفتی محمود احمد کی اس روایت کی مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی اس صراحت سے بھی ضمناً تردید ہورہی ہے کہ:

''مولوی صاحب (مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی) کے والد شیخ اسد علی صاحب ہر چند جناب والد مرحوم کے ساتھ دہلی گئے تھے اور شاہنامہ وغیرہ کتابیں پڑھی تھیں اور اپنے پڑھنے کے زمانے کی ہمارے سامنے حکایات بیان فرمایا کرتے تھے، مگر حال ایسا تھا گویا علم سے کچھ مناسبت نہیں'' (۲)

کیا شیخ اسد علی بھی مولانا مملوک العلی کے ساتھ راستے میں کہیں کھڑے ہوئے تھے جن کو وہ درویش بغیر کسی اطلاع کے اچانک پکڑ کر دہلی لے آئے تھے؟ اس لئے مولانا گیلانی کی اطلاع اور مفتی محمود احمد کا یہ اندراج صحیح نہیں، حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک دریافت معلومات کے مطابق حضرت مولانا مملوک العلی نے اپنے خاندان کے علماء اور افراد کے علاوہ کم سے کم درج ذیل پانچ حضرات سے تعلیم حاصل کی تھی۔

مولانا کے کل اساتذہ اور ان سے تعلیم کی ترتیب

(۱) حضرت شاہ عبدالعزیز (ایک سبق تبرکاً)

(۲) حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ

(۳) حضرت مولانا سید محمد قلندر جلال آبادیؒ

(۴) حضرت مولانا عبداللہ خاں علوی، مرشد آبادی، دہلویؒ

(۵) حضرت مولانا رشید الدین خاں کشمیری دہلویؒ

---

(۱) نسب نامہ صدیقیان نانوتہ ص:۴

(۲) تذکرہ مولانا محمد قاسم نانوتوی مصنف مولانا محمد یعقوب نانوتوی ص ۳ (بھاول پور: ۱۲۹۷ھ)

حضرت مفتی الٰہی بخش سے تلمذ

حضرت مولانا مملوک العلی کے احوال وسوانح پر اس وقت تک دریافت کسی بھی تحریر میں حضرت مولانا کے اساتذہ میں حضرت مفتی الٰہی بخش کا تذکرہ نہیں، مگر خود مولانا مملوک العلی کی تحریروں سے یہ بات واضح اور عیاں ہورہی ہے کہ مولانا مملوک العلی حضرت مفتی الٰہی بخش کے شاگرد تھے، مولانا نے مفتی صاحب کی خدمت میں وقت گذارا ہے، اور مفتی صاحب سے تلمذ واستفادہ کیا ہے۔

مولانا کے، حضرت مفتی الٰہی بخش سے تلمذ کے شواہد وآثار

مولانا مملوک العلی مفتی صاحب کی خدمت میں کب حاضر ہوئے کس قدر قیام کیا اس کی واضح شہادت تو نہیں ملی مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کا تقریباً ۱۲۲۰ھ (۱۸۰۶ء) میں یا اس کے بعد مفتی صاحب کے کاندھلہ اور تھانہ بھون میں قیام کے زمانہ میں، (یا نواب احمد خاں سہارنپور کے یہاں ملازمت کے دوران جس کا تقریباً ۱۲۲۲ھ، ۱۸۰۸ء میں آغاز ہوا تھا) حضرت مفتی صاحب سے تلمذ ہوا ہے۔ مفتی صاحب کی ایک بیاض (۱) میں رام پور منہیاران (۲) میں اپنا سامان چھوڑنے اور وہاں کے چند افراد کے پاس قرض کی یادداشت لکھی ہے، جس سے یہ تأثر ملتا ہے کہ مفتی صاحب کا رام پور میں بھی کچھ قیام رہا ہے، ہوسکتا ہے کہ اس دوران مولانا مملوک العلی مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر رہے ہوں، بہرحال دہلی جانے سے پہلے مولانا مملوک العلی مفتی الٰہی بخش کی خدمت میں حاضر اور مفتی صاحب کے زمرۂ خدام ومستفیدین میں شامل تھے، جس کی مفتی صاحب کی ایک بیاض سے صاف تصدیق ہورہی ہے۔

ممتاز علماء اور مدرسین کا ہمیشہ یہ معمول رہا ہے جو اَب بھی جاری ہے کہ وہ اپنے خاص شاگردوں اور زیر تربیت طلبہ کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کیلئے، انکی حیثیت وصلاحیت

---

(۱) اس بیاض کا مفصل تعارف مفتی صاحب سے مولانا مملوک العلی کے تلمذ کے تذکرہ میں ملاحظہ ہو۔

(۲) رام پور منہیاران ضلع سہارنپور نانوتہ کا قریب ترین قصبہ ہے۔

کے مطابق، ان سے مختلف علمی کام اور خدمات کراتے رہتے ہیں، جس میں مختلف مضامین ومؤلفات، مسائل وفتاویٰ کی نقل، ان کی شرح یا ترجمہ وغیرہ بھی شامل ہوتے ہیں۔ اسی طرح مفتی صاحب بھی اپنے خاص طلبہ سے اس قسم کے کام لیتے رہتے تھے، مختلف کتابوں کے اقتباسات، فتاویٰ اور ضروری تحریریں طلبہ سے اپنی بیاضوں میں یا علیحدہ نقل کرایا کرتے تھے، مفتی صاحب کے ممتاز شاگردوں کے قلم سے مفتی صاحب کی بیاضوں میں اس طرح کی متعدد تحریریں اور منتخبات درج ہیں۔

ایسے شاگردوں جن کی تحریریں مفتی صاحب کی بیاضوں میں راقم سطور کی نظر سے گذری ہیں حضرت مولانا سید محمد قلندر جلال آبادی (۱) مولانا محمد حسن رام پوری (۲) مولانا وجیہ الدین محدث سہارنپوری (۳) مولانا غلام حسین سہارنپوری (۴) مولانا غلام حسن (۵) خلف نور محمد تھانوی، مولانا غلام نبی انبھٹوی کے نام اسوقت سامنے ہیں۔ (٦) اسی فہرست کا ایک اور اہم اور خاص نام مولانا مملوک العلی نانوتوی کا ہے۔ مفتی

---

(۱) مولانا قلندر کے مختصر حالات مولانا مملوک العلی کے مولانا سے تلمذ کے تذکرہ میں آرہے ہیں۔

(۲،۳) دونوں علماء کا مختصر تعارف گذر چکا ہے۔ مولانا سید محمد قلندر کے مفصل حالات آئندہ صفحات میں آرہے ہیں۔

(۴) مولانا قاضی غلام حسین: اسلام نگر ضلع سہارنپور کے رہنے والے تھے، مفتی الٰہی بخش سے تعلیم حاصل کی، مفتی صاحب کی بیاضوں میں ان کے قلم کی نقل کی ہوئی درجنوں تحریریں اقتباسات وغیرہ موجود ہیں اور مولانا کا مفتی صاحب کے نام ایک خط بھی مفتی صاحب کی ایک بیاض میں چپکا ہوا ہے۔ مولانا غلام حسین نے شاہ احسان علی پٹنی سے بیعت کی اور ان کے خلیفہ مجاز ہوئے۔ مولانا نصر اللہ خاں خویشگی نے بیاض دلکشا (مولفہ ١٢٦٦ھ) میں لکھا ہے کہ چار سال گزرے (یعنی تقریباً ١٢٦٢ھ میں) قاضی صاحب نے انتقال فرمایا۔ اور اسلام نگر میں دفن کئے گئے۔ بیاض دلکشا ص٦١ مولانا نصر اللہ خاں خویشگی (طبع اول: ١٢٧٢ھ)

(۵) مولانا غلام حسن: خلف نور محمد تھانوی، ان کے حالات معلوم نہیں مگر مفتی الٰہی بخش کی متعدد بیاضوں اور بعض کتابوں پر مختلف یادداشتوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا غلام حسن مفتی صاحب کے چہیتے اور عزیز شاگرد تھے، غالباً انھوں نے مفتی صاحب کی خدمت میں کئی سال گذارے ہیں، مفتی صاحب کی بیاضوں میں مفتی صاحب کے جن شاگردوں کی تحریریں ہیں ان میں سب سے زیادہ تحریریں مولانا غلام حسن کی ہیں۔ مولانا، مفتی صاحب کے خادم خاص اور سفر وحضر کے رفیق بھی معلوم ہوتے ہیں۔ مفتی صاحب کے ذاتی گھریلو معاملات کی جو یادداشتیں اور اپنا سامان کہیں رکھنے چھوڑنے کی جو تحریریں لکھی ہیں اس میں بھی مولانا غلام حسن کا جگہ جگہ نام آیا ہے۔ باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر۔۔

صاحب کی متفرقات اندراجات کی ایک بیاض میں حضرت موصوف کے اور شاگردوں کے علمی باقیات و آثار کے ساتھ مولانا مملوک العلی کے قلم سے بھی متعدد تحریرات و اوراق (خاص طور سے عربی ادب کے قصائد و منتخبات) لکھے ہوئے ہیں، جو اس بات کی یقینی علامت ہے کہ مولانا مملوک العلی بھی حضرت مفتی الٰہی بخش کی خدمت کے حاضر باش اور ایسے معتمد اور خاص شاگردوں میں سے تھے جن پر حضرت مفتی صاحب اعتماد کرتے تھے اور ان سے اپنے تحریری تصنیفی کاموں اور نقل واقتباس وغیرہ میں مدد لیتے تھے اور استاذ کا اپنے کسی شاگرد سے اس قدر گہرا ربط اسی وقت ممکن ہے جب یہ طالب علم متعلقہ استاذ یا عالم سے خاص طور سے وابستہ اور مانوس ہو، استاذ کی خدمت میں اکثر حاضر رہتا ہو، اور استاذ کے سپرد کئے ہوئے کاموں کو انجام دینے میں سعادت و مسرت محسوس کرتا ہو، اور ایسے کاموں کیلئے استاذ کو اس طالب علم کی لیاقت اور صلاحیت پر کسی قدر اعتماد بھی ہو اور استاذ اس شاگرد کو اس کام کیلئے موزوں بھی سمجھتا ہو، اپنے استادوں کے پاس کبھی کبھی کے آنے جانے والے غیر معتمد طلبہ کو علماء اور اساتذہ اس طرح کی خدمات کب سپرد فرماتے ہیں؟ اس لئے حضرت مفتی الٰہی بخش کی یہ بیاض اور اس میں مولانا مملوک العلی کے قلم سے لکھے ہوئے اوراق اس کا ثبوت ہیں کہ مولانا مملوک العلی کو حضرت مفتی صاحب سے تلمذ حاصل تھا اور مولانا نے اچھا وقت مفتی صاحب کی خدمت و تلمذ میں گذارا تھا۔

گذشتہ صفحہ کا بقیہ...... مولانا غلام حسن کے قلم سے نقل آٹھ کتابیں ہمارے ذخیرہ میں اور متعدد کتابیں اور کتب خانوں میں بھی موجود ہیں۔ مولانا غلام حسن کا خوبصورت پاکیزہ قلم تھا وہ بہت صحت اور اہتمام سے نقل کرتے تھے۔ مولانا کی نقل کی ہوئی جو کتابیں راقم سطور کی نظر سے گذری ہیں وہ سنہ ۱۲-۱۱-۱۲۱۰ھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ افسوس ہے کہ مولانا کے حالات نہیں ملتے۔

(۶) مولانا غلام نبی انبہٹوی: کی بہت سی تحریریں مفتی الٰہی بخش کی بیاضوں میں موجود ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کو بھی حضرت مفتی صاحب سے بہت قربت ہے اور وہ بہت توجہ اور کثرت سے مفتی صاحب کی تحریریں اور افادات قلم بند کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔ مولانا غلام نبی کی تحریر بھی بہت پاکیزہ اور خوبصورت ہے، ان کے لکھے ہوئے بھی متعدد رسائل موجود ہیں۔ غلام نبی (خلف عبد الصمد بن عبد الواحد بن قاضی محمد زاہد) انصاری انبہٹوی، کا نام و نسب تحفہ صادقیہ (نسب نامہ انصاریان انبہٹہ) مرتبہ مولانا مشتاق احمد انبہٹوی میں درج ہے۔ ص ۷ و ما قبل (لاہور: ۱۳۲۹ھ)

مفتی صاحب کی بیاض میں درج مولانا مملوک العلی کی تحریروں کا تعارف

یہ بیاض جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے مفتی صاحب کی اور بیاضوں کی طرح ایک جامِ جہاں نما اور گنجینۂ علوم ہے، جس میں مختلف ذاتی یاد داشتوں کے علاوہ فقہ، حدیث وتفسیر، نحو، معانی، بدیع وکلام، تاریخ، رجال شخصیات نیز طب وعملیات کے علاوہ اور موضوعات پر بھی درجنوں کتابوں کے سینکڑوں اقتباسات اور منتخبات درج ہیں۔ اس بیاض میں اور مآخذ کے علاوہ قاضی القضات قاضی نجم الدین خاں کاکوری (وفات ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۳ء) کی بیاض سے بھی کثرت سے استفادہ کیا گیا ہے۔ جس میں اگرچہ اکثر کام مفتی صاحب کے قلم سے ہے، مگر مفتی صاحب کے شاگردوں کے قلم سے بھی مختلف صفحات لکھے ہوئے ہیں (۱) اور یہ سب انتخابات واقتباسات یقیناً مفتی صاحب کی ہدایات کے مطابق اور مفتی صاحب کی رہنمائی میں درج کئے گئے ہوں گے۔

اس بیاض میں مولانا مملوک العلی کی جو تحریریں موجود ہیں ان کو تین حصوں پر تقسیم اور متعارف کرایا جا سکتا ہے۔

اول: وہ کہ انکے اختتام پر کاتب (یعنی مولانا مملوک العلی) کا نام صاف لکھا ہوا ہے۔

دوم: وہ کہ اگرچہ ان پر مولانا مملوک العلی کا نام درج نہیں، لیکن ان میں مولانا کی تحریر کی وہ خصوصیات اور نشانات وکلمات صاف موجود ہیں جو مولانا کی تحریروں کی پہچان اور امتیاز ہیں۔

سوم: وہ تحریریں کہ جن کے آخری صفحات موجود نہیں مگر طرز تحریر وغیرہ سے خیال ہوتا ہے کہ وہ بھی مولانا مملوک العلی کے قلم سے ہیں۔

---

(۱) یہ بیاض خاصی ضخیم تھی مگر اس وقت اس کا جو حصہ موجود ہے، اس میں صفحات کا شمار کا آخری اندراج (مفتی صاحب کے شمار کے مطابق) ۲۴۳ ہے، مگر افسوس ہے کہ پیش نظر نسخہ خاصا ناقص ہے، جگہ جگہ سے اوراق غائب ہیں (جو ممکن ہے کہیں موجود ہوں، یا ضائع ہو گئے ہوں۔ بہر حال راقم سطور کو ان کا علم نہیں) اس وقت مذکورہ دو سو پینتالیس اوراق میں سے ایک سو پچاس ورق محفوظ ہیں، نوے ورق غائب ہیں۔ لیکن یہ اوراق اپنی افادیت اور امتیازات کے علاوہ اس وجہ سے بھی قابل قدر ہیں کہ ان کے متعدد حصے مولانا مملوک العلی کے قلم سے ہیں۔

اول قسم کی دو تحریریں ہیں جن پر مولانا کے دستخط موجود ہیں:

الف: حضرت مفتی صاحب نے محمد مؤمن شیرازی (وفات ۱۱۱۸ھ ۱۷۰۶ء) کی شرح طیف الخیال سے بدیع کا ایک انتخاب کیا تھا، جس کا عنوان یہ ہے:

''فهذا مائة وثمانون نوعاً من البدائع ،يحلىٰ بهاالكلام والعيوب التى يحترز عنها معرفت جميع ذاک للارتكاب والاجتناب''

یہ انتخاب مفتی صاحب کی اس بیاض کے دس اوراق پر مشتمل ہے (۱۷۸ سے ۱۸۸ تک) اسکے بعد تین مضمون متفرق معلومات کے ہیں، ایک صفحہ پر فقہی مسائل ہیں، دوسرے صفحہ پر تفصیل بست وشش باب وزن جمع مکسر، تیسرے صفحہ پر نفحۃ الیمن (تالیف شیخ احمد بن محمد یمنی) اقتباسات ہیں۔ اس کے بعد درمیان میں عربی ادب کے بعض اور منتخبات ہیں (۱) ورق ۱۹۴ سے ۱۹۶ تک صلاح الدین صفدی کا لامیہ ہے، جس کا پہلا شعر یہ ہے:

الجد فی الجد والحرمان فی الكسل　　فانصب تصب عن قريب غاية الامل

یہ تمام اوراق خصوصاً لامیۂ صفدی شروع سے آخر تک مولانا مملوک العلی کے قلم سے ہے، آخر میں لکھا ہے:

''تمام شد، الراقم مملوک علی۔ نقل من نفحۃ الیمن''

اس کے بعد اسی قلم سے شرح طیف الخیال کا ایک اقتباس اور ہے۔

ب: اسی مجموعہ میں عربی کا رسالہ امثال حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ نقل ہے، جس کا مکمل نسخہ چھبیس اوراق پر مشتمل تھا (جیسا کہ مفتی صاحب کے لکھے ہوئے صفحات سے معلوم ہو رہا ہے) مگر اب اس کتاب کے ابتدا کے صرف دو (۱۹۷ تا ۱۹۸ ب) اور آخر کے صرف تین ورق (ورق ۲۱۹، الف ۲۲۱ ب تک) موجود ہیں، اختتام پر یہ الفاظ درج ہیں:

(۱) ورق (۱۹۱ ب قدیم) سے طغرائی (ابی اسماعیل حسن بن علی الطغرائی) کا لامیۃ العجم ہے جو ۱۹۳ ب پر قاضی القضاۃ قاضی نجم الدین کا عربی کا ایک منظوم خط ہے، اس کے نیچے تمام شد تحریر ہے۔ (ورق ۱۹۴۔ الف) پر جواد ساباط اللطفی بن ابراہیم ساباط آلساباطی (جو ۱۲۲۳ھ میں کلکتہ میں مقیم تھا) کے عربی اشعار ہیں۔

''تمت تمام شد۔نوشتہ مملوک الطلباءمملوک علی''

قسم دوم: جن پر وہ خاص علامتیں اور کلمات لکھے ہوئے ہیں جو مولانا کی اکثر تحریروں میں آئے ہیں، یہ دو قسم کی علامتیں ہیں: مولانا کی نقل کی ہوئی کتابوں میں پہلے صفحہ کی پیشانی پر سب سے اوپر درود شریف لکھا ہوا ہوتا ہے، جس کے یہ خاص الفاظ ہیں:

''اللہم صل علی محمد وعلیٰ آل محمد واصحاب محمد وبارک وسلم''

اس کے نیچے دوسری سطر میں: یافتاح

تیسری سطر میں: بسم اللّٰہ الرحمٰن الرَّحیم

اس کے بعد کتاب کا آغاز ہوتا ہے، مذکورہ بالا درود شریف سب سے پہلے صفحہ کے علاوہ ایک دو متفرق مقامات پر بھی پہلے صفحہ کی طرح صفحات کی پیشانی پر درج رہتا ہے، مولانا مملوک العلی اپنی لکھی تحریروں یا کتاب کے آخر میں ''تمت ھذہ القصیدۃ'' یا ''تمت بعون الملک الوھاب'' لکھتے ہیں۔مؤخر الذکر فقرہ لکھنے کا بھی ایک خاص انداز ہے جو اس طرح ہے:

یعنی! تمت بعون الملک الوھاب ،ھذہ القصیدۃ بعون تمت.

اس بیاض میں اس طرح کی کئی تحریریں جن پر اگرچہ مولانا کے دستخط نہیں مگر یہ اشارات موجود ہیں، جو اوپر ذکر ہوئے۔ان تحریروں کا مختصر احوال درج ذیل ہے:

الف: سب سے پہلی تحریر حضرت مفتی الٰہی بخش کی تالیف شرح رسالہ بہاء الدین عاملی کی نقل ہے، یہ رسالہ عربی میں ہے اور اس بیاض کا (جس کا ذکر ہو رہا ہے) سب سے پہلا اندراج ہے۔ورق ۲ب سے اصل رسالہ خود حضرت مؤلف (مفتی الٰہی بخش) کے قلم سے درج ہے، یہ نسخہ غالباً ورق ۴ مکمل ہوا ہوگا۔مگر اس وقت اس بیاض میں ورق چار موجود نہیں، ۳ اور ۵ موجود ہیں۔چند اوراق کے بعد (اسی بیاض میں) اس رسالہ کی صاف نقل

مولانا مملوک العلی کے قلم سے ہے، اس نسخہ کے پہلے صفحہ کی پیشانی پر وہ تینوں خاص عبارتیں درج ہیں جو مولانا کی تحریر کا نشانِ امتیاز ہیں:

اللهم صل علی محمد وعلی آل محمد وعلی اصحاب محمد و بارک وسلم.

یافتاح. بسم الله الرحمن الرحیم.

یہ نسخہ ورق ۴اب سے آغاز ہوکر ورق ۸۱ پر مکمل ہوا ہے، مگر عجب اتفاق ہے کہ اس نسخہ کا بھی آخری ورق (۸) غائب ہے، ۱۷اور ۱۹ موجود ہیں۔

ب: قصیدہ بائیہ ذی الرمہ

اس کی پیشانی پر بھی درود شریف، یافتاح اور بسم الله الرحمن الرحیم درج ہے اور آخر میں محولہ بالا انداز میں 'تمت هذه القصیدة لکھا ہوا ہے (ورق ۶۶ الف تا ۷۲ب)۔

قسم سوم: میں وہ تحریریں آتی ہیں کہ ان پر نہ یہ اشارات درج ہیں نہ مولانا مملوک العلی کا نام لکھا ہے، مگر یہ تحریرات مولانا مملوک العلی کی اور تحریروں سے اس قدر ہم آہنگ ہیں کہ ان کو بلا تأمل مولانا مملوک العلی کی تحریریں کہا جاسکتا ہے۔

بہرحال مفتی صاحب کی اس بیاض میں مولانا مملوک العلی کی یہ تحریرات ضمناً اس حقیقت کو واضح کررہی ہیں کہ مولانا مملوک العلی حضرت مفتی صاحب کے شاگردوں میں شامل اور مفتی صاحب کے حلقۂ درس کے حاضرین میں سے تھے۔

مفتی صاحب سے کیا پڑھا؟

مولانا مملوک العلی نے مفتی صاحب کی خدمت میں کیا کیا پڑھا اور کن علوم میں کس قدر استفادہ کیا اور کس قدر وقت مفتی صاحب کی خدمت میں گذارا، مجھے اسکی کوئی وضاحت یا اشارہ نہیں ملا، مگر محولہ بالا بیاض میں درج تمام نقول وتحریرات مولانا مملوک العلی کے عربی کے اعلیٰ ادبی سرمایہ سے دلچسپی اور مناسبت کی مظہر ہیں، اس لئے قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ اس

بیاض میں درج تحریرات نقل کرنے کے زمانہ میں مولانا مملوک العلی حضرت مفتی صاحب سے عربی ادب کی اعلیٰ درجہ کی کتابیں خصوصاً عہد اول کے شعراء اور ادیبوں کی مصنفات ومنظومات پڑھ رہے ہوں گے۔

مولانا سید محمد قلندر جلال آبادی سے تلمذ

مولانا مملوک العلی کا مفتی الٰہی بخش سے تلمذ بلا واسطہ بھی ہے (جیسا کہ مذکورہ بالا تحریروں سے عیاں ہے) اور واسطہ سے بھی، یہ ذریعہ مفتی صاحب کے ایک نہایت ممتاز شاگرد، اپنے عہد کے جلیل القدر عالم، عارف، اور محدث ومدرس مولانا سید محمد قلندر جلال آبادی کا ہے۔ مولانا سید قلندر مفتی صاحب کے شاگردوں میں اپنی علمی حیثیت اور درس وافادہ میں ممتاز تھے، خصوصاً مولانا کا درس حدیث مشہور تھا، بعد کے زمانہ کے متعدد بلند پایہ علما اور اصحابِ درس وتالیف کو مولانا محمد قلندر کی خدمت میں حاضری اور تلمذ کی سعادت میسر آئی ہے جس میں حضرت قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتی، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا شیخ محمد تھانوی، مولانا غوث علی قلندر پانی پتی (۱) کے علاوہ حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی کا نام نامی بھی آتا ہے۔ مولانا مملوک العلی نے مولانا محمد قلندر سے کیا تعلیم پائی، اس کی تفصیل نہیں ملی لیکن مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کی ایک عبارت سے اس روایت کی مجمل تصدیق ہورہی ہے، مولانا لکھتے ہیں:

> ''نیز سنا ہے کہ آپ نے معقول کا کچھ حصہ مولوی قلندر بخش صاحب سے بھی پڑھا ہے'' (۲)

مولانا محمد قلندر کا حلقۂ درس پرانے جید علماء اور مدرسین کی طرح ہمہ جہت اور وسیع درس تھا جس میں ابتدائی کتابوں سے اعلیٰ کتابوں تک تمام درسیات اور جملہ علوم وفنون کے اسباق جاری رہتے تھے، جس میں نحو وصرف کی ابتدائی کتابیں اور معقولات (منطق،

---

(۱) حوالے مولانا سید محمد قلندر کے تعارف میں آئیں گے۔

(۲) تذکرۃ الرشید، حاشیہ ص ۲۷ ج ۱ (سہارنپور: ۱۹۷۷ء) مولانا محمد قلندر صاحب (غالباً تحریک سید احمد شہید سے وابستگی سے) پہلے اپنا نام قلندر بخش بھی لکھتے تھے، حضرت تھانوی کے بعض ملفوظات میں بھی مولانا کا نام قلندر بخش آیا ہے، نیز مولانا عبدالحی حسنی نے بھی مولانا محمد قلندر کو قلندر بخش لکھا ہے، ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر تذکرہ مولانا شیخ محمد تھانوی ص: ۴۲۲ ج ۷۔ اور تذکرہ حاجی امداد اللہ ص ۷۰ ج ۸۔

فلسفہ اور کلام وغیرہ) بھی شامل تھی، مگر مولانا سید محمد قلندر کا اصل مشغلہ اور ذوق درس حدیث کا تھا۔ متعدد علماء او اہل کمال نے اپنی اپنی صلاحیت اور ترتیب کے مطابق مولانا سے استفادہ کیا، مولانا عاشق الٰہی کی اطلاع کے مطابق مولانا مملوک العلی نے مولانا محمد قلندر سے معقول کا بھی کچھ حصہ پڑھا تھا، اس اطلاع کی (شیخ الہند کے ایک معتمد شاگرد) مولانا احمد اللہ صاحب کیرانوی بھی توثیق فرمایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ:

''میں نے اپنے استاذ حضرت شیخ الہند سے سنا ہے کہ مولانا مملوک العلی نے حدیث کی چند کتابیں مولانا محمد قلندر سے پڑھی تھیں''۔(۱)

مزید تعلیم کیلئے دہلی کا سفر اور اس کا قیاسی سنہ

مولانا مملوک العلی نے حضرت مفتی الٰہی بخش اور مولانا محمد قلندر سے کسب کمال کے بعد علمائے دہلی سے استفادہ اور تکمیل علوم کیلئے دہلی کا سفر کیا، یہ سفر کب ہوا اس کی صراحت مجھے نہیں ملی، مگر بعض قرائن سے تأثر ملتا ہے کہ حضرت مفتی صاحب یا مولانا محمد قلندر سے استفادہ کے بعد (غالباً مولانا کی اجازت و مشورے سے) تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر یوپی) سے دہلی کا سفر ہوا ہوگا، ممکن ہے کہ مولانا مملوک العلی کے اس سفر کے وقت مفتی صاحب یا مولانا محمد قلندر تھانہ بھون میں مقیم ہوں۔ یہ تأثر حضرت مفتی صاحب کی بیاض کے ایک اور اندراج سے ملتا ہے، اسی بیاض میں مفتی صاحب کی تالیف شرح رسالہ بہاء الدین عاملی کے پہلے صفحہ پر ایک یادداشت تحریر ہے جس کا عنوان یہ ہے:

''یادداشت اسباب کہ در تھانہ بھون گذاشتہ بوقت رفتن دہلی''

اس یادداشت میں جس سامان کا ذکر ہے، وہ ہر وقت کی ضرورت کی چند چیزیں اور پہننے اوڑھنے کے نئے اور پرانے کپڑے ہیں۔ اور اس کے الفاظ سے جھلکتا ہے کہ یہ

(۱) یہ روایت راقم سطور نے جناب توفیق احمد علوی کیرانوی مرحوم سے بارہا سنی، وہ بچپن سے مولانا احمد اللہ کی خدمت کے حاضر باش، خاص خادم اور گویا شاگرد بھی تھے۔ ملاحظہ ہو راقم سطور کا مضمون: مولانا سید محمد قلندر جلال آبادی شمولہ، حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکیؒ کے اساتذہ (ضمیمہ امداد المشتاق تالیف مولانا تھانوی دہلی: ۱۹۸۰ء)

یادداشت دہلی کے طویل قیام کے ارادے سے سفر کے موقع پر لکھی گئی ہے، چند روزہ سفر یا قیام کے لئے اس قسم کی یادداشت لکھنا یوں بھی غیر ضروری سا معلوم ہوتا ہے۔

دوسرے اس زمانہ میں تقریباً ۱۲۲۰ھ کے بعد سے مفتی صاحب کے دہلی میں طویل قیام کی کوئی اطلاع راقم کے علم میں نہیں ہے، اس لئے خیال ہے کہ یہ یادداشت مولانا مملوک العلی نے اس وقت لکھی ہوگی جب وہ اعلیٰ تعلیم کیلئے تھانہ بھون سے دہلی جارہے تھے، مگر افسوس ہے کہ اس یادداشت پر اس روانگی کی تاریخ درج نہیں، اس لئے سفر دہلی کی تاریخ اور سنہ دریافت طلب ہے۔

مولانا مملوک العلی کے تعلیم حاصل کرنے کیلئے دہلی کے سفر کی تاریخ کا اندازہ کرتے ہوئے (پاکستان کے مشہور محقق) جناب محمد اکرام چغتائی صاحب نے لکھا ہے کہ:

''سوانح مملوک (مولانا مملوک العلی) کے مآخذ میں کوئی ایسی روایت منقول نہیں ملی جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ مولانا کی دہلی میں آمد کون سے سنہ میں ہوئی، قرین قیاس یہی ہے کہ وہ ۱۸۱۵ء (۱۲۳۰ھ) کے لگ بھگ دہلی آئے''۔(۱)

مگر چغتائی صاحب نے بھی کوئی ایسا قرینہ یا حوالہ ذکر نہیں کیا جس سے ان کے اس خیال کی تائید ہو سکتی، راقم سطور کے خیال میں یہ فیصلہ درست نہیں کہ مولانا مملوک العلی ۱۸۱۵ء (۱۲۳۰ھ) میں تعلیم کیلئے دہلی گئے تھے، صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا شروع ۱۸۱۵ء ۱۲۳۰ھ میں دہلی میں موجود تھے۔ اس کی تصدیق مولانا کی ایک اور علمی یادگار سے ہورہی ہے، جو مولانا نے دہلی میں اسی زمانہ میں نقل کی تھی۔ یہ عربی ادب کی مشہور تالیف سبعہ معلقات اور اس کی مشہور شرح زوزنی (تالیف حسین ابن احمد بن حسین زوزنی) ہے۔ اسکے آخر میں مولانا مملوک العلی کے قلم سے یہ الفاظ درج ہیں:

''تمت هذه القصائد السبعة المعلقة على باب الكعبة الشريفة المعروفة بالفصاحة والبلاغة بين الناس ،مع تحشيتها من شرحها القاضي الامام ابى

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب (مکتوبات مشاہیر) بنام اسپرنگر، مرتبہ محمد اکرام چغتائی ص ۲۹۱ (سہ ماہی اردو، کراچی: جنوری، مارچ ۸۴ء)

عبدالله الحسن بن احمد الزوزنی رحمهم الله (۱) فی حدود سنة الف ومائتین وثلثین فی شهرصفرفی بلدة الدهلی صانه الله عن الآفات. بیدالفقیرالمذنب الراجی الی رحمة الله العلی ،المدعوبه مملوک العلی غفرالله له ولوالدیه‘‘(۲)

صفر۱۲۳۰ھ جنوری فروری ۱۸۱۵ء کے مطابق ہے، جس سے معلوم ہورہا ہے کہ مولانا اس وقت دہلی میں موجود تھے مگراس تحریر سے اس سلسلہ میں کچھ رہنمائی نہیں ملتی کہ مولانا دہلی کب پہنچے تھے اوراس وقت وہاں مولانا کی کیامصروفیات تھیں۔

مولانا مملوک العلی کے سفر دہلی کے متعلق مولانا گیلانی کی اطلاع صحیح نہیں

تعجب ہے کہ مولانا مناظراحسن گیلانی نے یہ لکھا ہے کہ:

’’۱۷۹۲ء میں جومولوی عبدالحق کی تحقیق کی روسے اس کالج کے قیام کا سنہ ہے اس وقت مولانا مملوک العلی کی عمر تقریباً پانچ سال کی تھی۔اس لئے تسلیم کرنا چاہئے کہ دہلی پہنچ کر مولانا رشید الدین خاں کے حلقہ درس میں مولانا مملوک العلی اسی زمانہ میں شریک ہوئے ، جب دہلی کالج میں مولانا رشید الدین کام کررہے تھے۔(۳)

افسوس ہے کہ مولانا گیلانی کی اس اطلاع کے تمام مندرجات مشتبہ ہیں۔وجوہات درج ذیل ہیں:

الف: مولوی عبدالحق نے دہلی کالج کے قیام کا سنہ ۱۷۹۲ء(۷-۱۲۰۶ھ) ہرگزنہیں

(۱) مولانا مملوک العلی کے قلم سے زوزنی (شرح سبعہ معلقہ) کے مؤلف کا نام حسن بن احمد لکھا ہوا ہے،مگرصحیح نام حسین بن احمد (متوفی ۴۸۶ھ ۱۰۹۳ء) ہے۔زوزنی کے صحیح نام اورتعارف کے لئے ملاحظہ ہو:

بغیة الوعاة فی طبقات اللغویین والنحاة. علامہ جلال الدین سیوطی تحقیق :ابوالفضل ابراہیم۔ص ۵۳۱ ج ۱ بیروت:۱۳۹۹ھ) ب:الاعلام۔خیرالدین الزرکلی۔ص ۲۳۱ ج ۲ بیروت:۱۹۷۹ء) ج:شرح المعلقات السبع للزوزنی۔ (دارصادر بیروت:۱۳۸۲ھ)

(۲) یہ قیمتی اوراہم نسخہ ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے۔

(۳) سوانح قاسمی: مولانا مناظراحسن گیلانی ص ۱۰۱ ج ۱ (طبع اول،دیوبند:۱۳۷۳ھ)

لکھا، یہ سنہ مدرسہ غازی الدین خاں کی تعمیر کا ہے۔ (۱) مولوی عبدالحق اور دیگر اہل نظر کی تصریح کے مطابق دہلی کالج سنہ ۱۸۲۵ء (۱۲۴۰ھ) میں قائم اور شروع ہوا تھا (۲) اس سے پہلے اس کالج کے وجود کی اگر کوئی روایت ہے تو وہ بے بنیاد ہے۔

ب: مولانا رشید الدین خاں مدرسہ غازی الدین حیدر میں کبھی ملازم و مدرس نہیں رہے۔

ج: اور یہ بات بھی ناقابل تسلیم ہے کہ مولانا مملوک العلی پانچ سال کی عمر میں پڑھنے کے لئے دہلی آگئے ہوں اور اسی وقت ان کا مدرسہ غازی الدین میں داخلہ ہو گیا ہو، اور وہ کم سنی بلکہ طفولیت کے زمانہ میں ملک کے ایک ممتاز عالم مولانا رشید الدین خاں کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے ہوں۔ اسلئے مولانا گیلانی کی یہ اطلاع قابل قبول نہیں ہے۔

د: ۱۷۹۳ء میں مولانا مملوک العلی کی عمر تقریباً تیرہ سال تھی (ولادت ۱۲۰۴ھ، ۱۷۷۹ء) اس وقت تک دہلی کالج کے قیام کا ارادہ بھی نہیں ہوا تھا، کالج کا آغاز تو بہت بعد کی بات ہے۔ مولانا مملوک العلی اس زمانہ میں غالباً اپنے وطن میں یا نواح کے علماء سے پڑھ رہے ہوں گے۔

تعلیم کیلئے دہلی کے سفر میں اور دہلی میں مولانا مملوک العلی کے رفقاء

دہلی کے تعلیمی سفر کے موقع پر مولانا کے اور رفقاء کون کون تھے اس کا بھی تذکرہ نہیں ملتا، صرف شیخ اسد علی (والد گرامی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی) کا ذکر آتا ہے کہ وہ اس سفر میں مولانا کے ساتھ تھے۔ (مولانا مملوک العلی کے نامور خلف الرشید) مولانا محمد یعقوب صاحب نے لکھا ہے:

"مولوی صاحب (مولانا محمد قاسم) کے والد شیخ اسد علی ہر چند جناب والد

---

(۱) ملاحظہ ہو: سیر المنازل، مرزا سنگین بیگ۔ ص ۱۱۹ مرتبہ ڈاکٹر شریف حسین قاسمی (دہلی: ۱۹۸۲ء)

ب: آثار الصنادید، سر سید احمد ص ۷۳ باب سوم (دہلی: ۱۸۴۷ء)

(۲) مرحوم دہلی کالج ص ۶۔۷۳ (دہلی: ۱۹۴۵ء) قدیم دہلی کالج، مالک رام ص ۲۴ (دہلی: ۱۹۷۶ء) مسٹر رام چندر، ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی۔ ص ۱۲ (دہلی: ۱۹۶۱ء)

مرحوم کے ساتھ دہلی گئے تھے اور شاہنامہ وغیرہ کتابیں پڑھی تھیں اور اپنے پڑھنے کے زمانہ کی ہمارے سامنے حکایات بیان فرمایا کرتے تھے''۔(۱)

دہلی کے زمانۂ تعلیم میں مولانا کے کئی ہم جماعت اور دوست ہونگے مگر تذکرہ مولانا محمد قاسم اور موجودہ تحریری ذرائع میں انکا ذکر موجود نہیں، تاہم ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کا قول ہے کہ انکی دادی کے والد (مولانا وزیر علی بجنوری) مولانا مملوک العلی کے ہم سبق تھے۔(۲)

دہلی میں تعلیم کی ابتدائی مشکلات اور حضرت شاہ عبدالعزیز کی دعاء اور توجہ سے اس کا علاج

مولانا مملوک العلی نے دہلی میں کئی علماء اور مدرسین سے پڑھنا چاہا مگر جس عالم کی خدمت میں بھی جاتے، وہ ایک سبق پڑھانے کے بعد آئندہ کے لئے تعلیم کی خدمت سے انکار کردیتے تھے، مولانا مملوک العلی اس بات سے بہت پریشان تھے کہ اگر یہی حال رہا تو میری تعلیم کا کیا ہوگا؟ اس پریشانی میں مولانا، حضرت شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض حال کیا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کل آنا، مولانا مملوک العلی دوسرے دن خدمت میں پہنچے، اسکے بعد کیا ہوا اس کو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے الفاظ میں پڑھیے، حضرت مولانا گنگوہی اس کا یوں تذکرہ فرماتے تھے کہ:

''حضرت شاہ صاحب نے ہدایۃ النحو کا ایک سبق پڑھا دیا اور فرمایا کہ جاؤ! اب جس استاذ سے پڑھو گے وہ پڑھانے سے انکار نہ کرے گا''(۳)

اس سبق یا دعاء اور توجہ سے مولانا مملوک العلی کیلئے تعلیم کا دروازہ کھل گیا۔ اسکے بعد مولانا پھر جس عالم کے پاس گئے اس نے پڑھانے سے انکار نہیں کیا، مگر یہ علماء کون کون تھے اسکی تفصیل دریافت نہیں، صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ مولانا مملوک العلی نے اس وقت دہلی

(۱) حالات طیب مولانا محمد قاسم ص۳ (بھاول پور: ۱۲۹۷ھ)

(۲) عمر رائیگاں۔ آپ بیتی خواجہ احمد فاروقی۔ مشمولہ، نذر فاروقی۔ مرتبہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ص ۳۲۔۳۱ (دہلی: ۱۹۸۷ء)

(۳) ارواح ثلاثہ۔ (بحوالہ روایات الطیب) (طبع اول، امداد الغربا، تھانہ بھون ص ۹۲ طبع جدید ص ۱۸۹-۱۹۰۔ مگر یہ حکایت روایات الطیب تالیف مولانا قاری محمد طیب (تاج المعارف، دیوبند: ۱۹۴۵ء) میں موجود نہیں۔

میں موجود علماء میں سے دو بڑے اور نامور اساتذہ یعنی مولانا عبداللہ خاں علوی اور رشید الدین خاں دہلوی سے پڑھا، اول الذکر سے غالباً کم اور عارضی دوسرے سے طویل اور مسلسل۔

مولانا عبداللہ خاں علوی

مولانا مملوک العلی کے مولانا عبداللہ خاں سے تلمذ کا صرف امیر شاہ خاں خورجوی کی ایک روایت میں ذکر آیا ہے۔ امیر شاہ خاں صاحب نے تقویۃ الایمان (حضرت شاہ اسماعیل شہید) کی تالیف کا واقعہ نقل کرتے ہوئے مولانا عبداللہ خاں علوی (وفات ۱۲۶۲ھ) کو مولانا مملوک العلی کا استاذ کہا ہے۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"مولوی اسماعیل صاحب نے تقویۃ الایمان اول عربی میں لکھی تھی، چنانچہ اس کا ایک نسخہ میرے پاس اور ایک نسخہ مولانا گنگوہی کے پاس اور ایک نسخہ مولانا نصر اللہ خاں خورجوی کے کتب خانہ میں بھی تھا۔ اسکے بعد مولانا نے اسکو اردو میں لکھا اور لکھنے کے بعد اپنے خاص لوگوں کو جمع کیا جن میں سید صاحب، مولوی عبدالحئیؒ صاحب، شاہ اسحاق صاحب، مولانا محمد یعقوب صاحب، مولوی فریدالدین صاحب مرادآبادی، مؤمن خاں، عبداللہ خاں علوی (استاذ امام بخش صہبائی و مولانا مملوک العلی صاحب) بھی تھے اور ان کے سامنے تقویۃ الایمان پیش کی اور فرمایا۔ (۱)

اگرچہ اس حکایت میں ایک بڑی غلطی ہے اور اسکے حوالہ سے تقویۃ الایمان کا جو سنہ تالیف متعین کیا جاتا ہے وہ صحیح نہیں، کیوں کہ امیر شاہ خاں جس وقت کا یہ واقعہ نقل کر رہے ہیں تقویۃ الایمان اس سے بہت پہلے لکھی جاچکی تھی، تاہم یہ ممکن ہے کہ مولانا عبداللہ خان مولانا مملوک العلی کے استاد ہوں اور مولانا مملوک العلی نے مولانا سے کچھ پڑھا ہو۔

مدرسہ غازی الدین حیدر میں مولانا عبداللہ سے تلمذ؟

مولانا مملوک العلی کی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مناظر احسن گیلانی نے لکھا ہے کہ مولانا مملوک العلی نے مولانا رشید

(۱) امیر الروایات مجموعہ قصص و حکایات (روایات امیر شاہ خان خورجوی) مرتب مولانا حبیب احمد کیرانوی ص ۸۹، ۴۷ طبع اول، ماہنامہ الہادی جمادی الثانی ۱۳۴۵ھ (جنوری ۱۹۲۷ء) نیز ارواح ثلاثہ طبع اول ص: ۶۱، (امداد الغرباء، سہارنپور بلا سنہ) طبع جدید ص ۸۰

الدین خاں سے دہلی کالج میں پڑھا ہے، تحریر ہے:

''۱۷۹۲ء میں جو مولوی عبدالحق کی تحقیق کی رو سے اس کالج کے قیام کا سنہ ہے اس وقت مولانا مملوک العلی کی عمر تقریباً پانچ سال کی تھی۔ اسلئے تسلیم کرنا چاہئے کہ دہلی پہنچ کر مولانا رشید الدین خاں کے حلقۂ درس میں مولانا مملوک العلی اسی زمانہ میں شریک ہوئے، جب دہلی کالج میں مولانا رشید الدین کام کررہے تھے۔(۱)

مگر اس اطلاع کا یہ پہلو تو قطعاً درست نہیں کہ مولانا مملوک العلی نے مولانا رشید الدین خاں سے دہلی کالج میں پڑھا ہے، کیونکہ دہلی کالج کا آغاز وافتتاح رمضان المبارک ۱۲۴۰ھ (جنوری ۱۸۲۵ء) میں ہوا تھا، اس سے پہلے کالج کیلئے مدرس اول (یعنی صدر مدرس اور نائب صدر مدرس) کا انتخاب ہو چکا تھا، مدرس اول کیلئے مولانا رشید الدین خاں اور نائب مدرس کے عہدہ پر مولانا مملوک العلی کا تقرر ہوا تھا۔ جس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اس وقت مولانا مملوک العلی کا تعلیمی دور ختم ہو چکا تھا، وہ جید فاضل تھے، ایسے کہ دہلی کے حلقوں میں ان کا ذکر اور چرچا تھا اور ان کو دہلی کالج کے مدرسِ دوم کے موقر عہدہ پر بے تکلف مقرر کردیا گیا۔

ہوسکتا ہے کہ مولانا مملوک العلی کا کسی وقت مدرسہ غازی الدین حیدر سے تلمذ اور استفادہ کا رشتہ رہا ہو، مگر اس کی تفصیلات دریافت نہیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ مولانا عبداللہ خان علوی مدرسہ غازی الدین حیدر میں پڑھاتے ہوں مگر اس کی تفصیلات بھی مفقود ہیں۔ صرف یہ معلوم ہے کہ دہلی کالج شروع ہونے سے ایک سال پہلے (۱۲۳۹ھ ۱۸۲۴ء) میں مدرسہ غازی الدین حیدر میں مولانا عبداللہ نام کے ایک عالم سبق پڑھاتے تھے، ان کے طلبہ میں مولانا مملوک العلی بھی ہوں یہ تو قرین قیاس نہیں، مگر ممکن ہے کہ اس سے پہلے کسی وقت مولانا مملوک العلی اس مدرسہ کے طالب علم رہے ہوں۔

مولانا رشید الدین خاں دہلوی سے تکمیل علوم

جسوقت مولانا مملوک العلی تعلیم حاصل کرنے کیلئے

(۱) سوانح قاسمی: مولانا مناظر احسن گیلانی ص ۱۰۱ ج ۱ طبع اول، دیوبند: ۱۳۷۳ھ

دہلی گئے تھے اس وقت خانوادۂ حضرت شاہ ولی اللہ کے فیضان سے دہلی علم وکمال کا ایک گلستاں بنی ہوئی تھی، جہاں ہر طرف علم وعمل کے گل بوٹے کھلے ہوئے تھے، اور درس وتعلیم کے زمزمے جاری تھے، حضرت شاہ عبدالعزیز ان کے بھائیوں کے دریائے علوم کے علاوہ (جوایک عالم کا مرجع تھا) متعدد اکابر علماء کے درس اور تعلیم کی شہرت تھی اور حضرت شاہ صاحب کے خاندان کے متعدد شاگرد بھی اپنے اپنے طور پر علم کی جوت جگائے ہوئے تھے ان میں سے ہر ایک کی ذات مجمع علماء اور مرکز علوم تھی، یہاں بھی درس ہورہا ہے، وہاں بھی سبق جاری ہے، ادھر بھی طلباء کا جمگھٹا ہے، ادھر بھی اہل ذوق جوق درجوق جارہے ہیں۔ شاہ صاحب کے ایسے ہی ممتاز شاگردوں اور اصحاب درس میں سے ایک ممتاز نام مولانا رشید الدین خاں کشمیری دہلوی کا ہے۔ مولانا رشید الدین حضرت شاہ عبدالعزیز کے اہم شاگردوں میں شمار کیے جاتے تھے، اوران کا خانوادۂ ولی اللہی اور مدرسہ شاہ عبدالعزیز سے علیحدہ اپنا حلقۂ درس تھا، مولانا مملوک العلی نے اعلیٰ ترین درسیات مولانا رشید الدین سے مکمل کیں، مگر گذشتہ معلومات کی طرح مولانا رشید الدین سے پڑھی ہوئی کتابوں کی تفصیل اور مولانا سے پڑھنے کا زمانہ بھی معلوم نہیں ہے۔

کیا مولانا مملوک العلی کو مولانا رشید الدین سے اجازتِ حدیث حاصل تھی؟

مولانا مملوک العلی نے مولانا رشید الدین کے حلقۂ درس میں اعلیٰ ترین کتابوں کا درس لیا اور جو علوم اب تک پڑھے تھے ان میں خاص مہارت بہم پہنچائی، مگر مولانا مملوک العلی کے مولانا رشید الدین خاں سے تلمذ کے تذکرہ میں یہ سوال بہت اہم ہے کہ مولانا مملوک العلی کو مولانا رشید الدین خاں سے اجازت وسند حدیث حاصل تھی یا نہیں، اس کی صراحت مجھے نہیں ملی۔ اوراس کا بھی ذکر نہیں ملتا کہ مولانا رشید الدین نے کسی اور عالم سے حدیث پڑھی ہو یا حدیث کی سند اور اجازت لی ہو۔ اور تا حال اسکا بھی کوئی ثبوت دریافت نہیں ہوا کہ مولانا مملوک العلی نے اپنے کسی شاگرد کو حدیث کی اجازت وسند عطا فرمائی ہو۔ کیا

مولانا مملوک العلی کا سلسلۂ حدیث مولانا رشید الدین کے علاوہ کسی اور عالم سے متصل ہے جس کا ہمیں علم نہیں یا اس کا کوئی اور سبب ہے۔ بہر حال اس وقت تک معلوم مولانا کے عام و خاص شاگردوں میں سے کسی ایک شاگرد کی بھی سند حدیث مولانا کے واسطہ سے نہیں ہے(۱) اور یقیناً اس کا بھی کوئی سبب ہے کہ مولانا کے عزیز ترین شاگردوں نے بھی (جن میں سے چند مولانا کے خانوادہ کے بھی ہیں) مولانا سے حدیث نہیں پڑھی، اور یہ سب حضرت شاہ عبدالغنی مجددی کے حلقۂ درس میں اجازتِ حدیث کے لئے حاضر ہوئے، حالاں کہ یہ بھی محقق ہے کہ دلی کالج میں حدیث کی تعلیم ہوتی تھی، پہلے باقاعدہ درس ہوتا تھا، بعد میں خطبات ہونے لگے تھے۔(۲)

(۱) علمائے دیوبند کی سندات کے مجموعوں میں مولانا مملوک العلی سے اجازت حدیث کا کہیں ذکر نہیں ہے، اور دوسرے مآخذ میں بھی اس کی صراحت نہیں ملی۔ اس وقت ایسی تقریباً تیس کتابیں راقم سطور کے سامنے ہیں، جن میں مولانا مملوک العلی کا مفصل یا مجمل تذکرہ ہے، حضرت مولانا کے شاگردوں کے احوال و مؤلفات پر درجنوں مضامین و تالیفات کا ذخیرہ علیحدہ ہے۔ مگر مولانا مملوک العلی سے اجازت حدیث کی کوئی روایت و اطلاع مذکورہ مآخذ اور اس وقت تک دستیاب معلومات میں موجود نہیں ہے۔

اگرچہ التمہید میں مولانا مملوک العلی کے واسطے سے اکابر علمائے دیوبند کی چند سندیں ذکر کی گئی ہیں مگر وہ سب معقولات وفنون کی ہیں، حدیث شریف کی سند و اجازت کا ان میں اشارہ تک نہیں۔ بلکہ مولانا سندھی اور مولانا مفتی محمد شفیع دونوں نے صراحت کی ہے کہ مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد گنگوہی نے مولانا مملوک العلی (رحمہم اللہ تعالیٰ) سے صرف ادب، معقولات اور فقہ پڑھا تھا، حدیث نہیں پڑھی۔ التمہید میں ہے:

"ان شیخ الاسلام مولانا محمدقاسم وشیخ الاسلام رشیداحمد کانا متحدین فی الطریقة الولی اللٰهیة اخذوا الفنون الادبیة والعقلیة والفقهیة عن شیخ واحد مولانا مملوک العلی النانوتوی الدهلوی" (ص۱۵۴)

اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی یہی کہا ہے:

"وهما (ای النانوتوی والگنگوهی) قداخذسائر الفنون والکتب الدرسیة خلاعلم الحدیث"

(سلسلۃ الزبرجد فی اسناد الشیخ حسین احمد ص ۱۱)

مزید معلومات کے لئے رجوع فرمائیے۔

الف: التمهید لتعریف ائمة التجدید لمولانا عبیدالله سندهی المؤلفه بعد ۱۳۴۵ھ تصحیح و حواشی مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی (جام شورو سندھ: ۱۳۹۶)

باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر......

مولانا مملوک العلی دہلی کالج کی خدمت سے فارغ تمام وقت (بلکہ رات کے بڑے حصہ میں) طلبہ کو گھر پر پڑھاتے تھے، جس میں حدیث کے اسباق کا معمول اگرچہ متوقع اور قابل قبول ہے، لیکن مولانا کے شاگردوں کے معلوم حالات اور تحریرات میں مولانا مملوک العلی کے حوالہ سے اجازت حدیث کا ذکر نہ ہونا حیرت انگیز ہے اور یہ صرف اتفاق نہیں۔

مولانا مملوک العلی پر مولانا رشید الدین خاں کی شفقت، ربطِ دلی اور عنایات

مولانا مملوک العلی کے مولانا رشید الدین سے تلمذ کی مدت اور تفصیل جو بھی رہی ہو مگر مولانا رشید الدین کی مولانا کے حال پر ہمیشہ شفقت وعنایت کی نظر رہی اور مولانا بھی ہمیشہ استاد محترم کی خدمت میں حاضر رہے، مولانا رشید الدین مولانا مملوک العلی کی اعلیٰ صلاحیت اور نیازمندی کے رشتہ کی وجہ سے مولانا

گذشتہ صفحہ کا بقیہ۔ ب: مجموعہ اسانید (علمائے دیوبند) مرتبہ ومکتوبہ مولانا محمد ناصر بلیاوی ص ۱۷ (شاگرد علامہ انور شاہ کشمیریؒ مکتوبہ ومؤلفہ رجب ۱۳۵۰ھ) اس میں بھی مولانا مملوک العلی کے واسطہ سے حدیث کی کوئی سند موجود نہیں۔

ج: الازدیاد السنی علی الیانع الجنی جو مولانا مفتی محمد شفیع کے ان چار رسائل کا مجموعہ ہے: (۱) الدر المنضود فی اسانید شیخ الہند محمود (۲) المسک الازفر فی اسانید الشیخ محمد انور (۳) سلسلۃ الزبرجد فی اسانید الشیخ حسین احمد (۴) الاعرف الجلی من اسانید شیخ اشرف علی۔

طبع اول (جو کشف الاستار عن رجال معانی الآثار کے ساتھ چھپی تھی) دارالاشاعت دیوبند: ۱۳۴۹ھ طبع دوم دارالاشاعت دیوبند: ۱۳۶۰ھ

مولانا محمد ثانی حسنی نے لکھا ہے کہ:

مولانا خلیل احمد کے استاذ حضرت مولانا مظہر صاحب نانوتوی ہیں، انھوں نے استاذ الکل مولانا مملوک العلی سے حدیث پڑھی اور انھوں نے مولانا رشید الدین خاں سے۔ (حیاتِ خلیل ص ۸۴ لکھنؤ: ۱۳۹۶ھ)

اور اس کے لئے مسلسلات شاہ ولی اللہؒ پر مولانا خلیل احمد کی تمہید کا حوالہ دیا ہے، مگر یہ اطلاع صحیح نہیں، مولانا خلیل احمد صاحب نے مولانا مظہر کے حوالہ سے اپنی جو سند نقل کی ہے وہ مولانا مظہر از شاہ محمد اسحاق ہے، اس میں، بلکہ مسلسلات کی کسی سند میں بھی مولانا مملوک العلی کا نام نہیں آیا، ملاحظہ ہو: مسلسلات مقدمہ مرتبہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ (شائع کردہ مولانا بدر عالم میرٹھی۔ از سہارنپور قبل ۱۳۵۸ھ)

(۲) مکتوب کریم الدین پانی پتی بنام اسپرنگر، محررہ ۴؍ جولائی ۱۸۵۲ء (رمضان ۱۲۶۸ھ) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۱۷۹ (مجلہ اردو کراچی: ۱۹۸۵ء) نیز، مرحوم دہلی کالج ص ۳۰، ۴۳ (دہلی: ۱۹۴۵ء)

مملوک العلی کی فرمائشوں (یا گذارشات) کی تعمیل کرتے اور مولانا مملوک العلی کیلئے بہتر سے بہتر موقعوں اور ذرائع معاش کی جستجو میں رہتے تھے۔ مولانا رشید الدین خاں کو اپنے اس شاگرد سے کیسی انسیت و محبت تھی اور وہ انکا کس قدر خیال رکھتے تھے اس کا مولانا مملوک العلی کو نائب مدرس دہلی کالج میں تقرر کرانے بلکہ اپنا نائب نامزد کرنے کے علاوہ اس سے بھی خوب اندازہ ہوجاتا ہے کہ مولانا رشید الدین نے ردِ متعہ میں اپنی اہم تالیف ''صولتِ غضنفریہ'' (۱) مولانا مملوک العلی کی فرمائش پر لکھی تھی۔ کریم الدین پانی پتی کا قول ہے:

''صولت الضیغم مولانا مملوک العلی مدرس اول حال مدرسہ دہلی کے پاس خاطر سے تصنیف کی تھی'' (۲)

اس تالیف کے تین سال بعد جب دہلی کالج کا قیام ہوا اور اس میں مولانا رشید الدین کا مدرس اول کی حیثیت سے تقرر ہوا تو اسی وقت مدرس دوم کے عہدہ پر مولانا مملوک العلی فائز کئے گئے، ظاہر ہے کہ یہ تقرر مولانا رشید الدین کی ہدایت بلکہ کوشش کے بغیر نہ ہوا ہوگا۔

---

(۱) صولت غضنفریہ (بجواب بارقہ ضیغمیہ) مولانا کی اہم تصانیف میں شمار کی جاتی ہے اور ایک مرتبہ مطبع دارالسلام دہلی سے چھپی تھی، اس طباعت کا ایک صاف نسخہ جو بڑے سائز کے ص ۳۶۴ پر مشتمل ہے، راقم کی نظر سے گذرا ہے اور اس کے قلمی نسخے بھی مختلف کتب خانوں (خدابخش لائبریری پٹنہ) مولانا آزاد علی گڑھ اور رضا رام پور میں موجود ہیں، ملاحظہ ہو: فہرست مخطوطات فارسی رضا لائبریری ص ۹۶ جلد اول (رام پور: ۱۴۱۷ھ) نیز فہرست ذخیرہ شیفتہ گلگشن علی گڑھ، مرتبہ محمود حسن قیصر امروہی۔ اندراج نمبر ۴۴ وغیرہ۔

(۲) فرائد الدہر کریم الدین پانی پتی ص ۴۰۱ (مطبع العلوم مدرسہ دہلی: ۱۸۴۷ء) مگر فرائد الدہر میں مولانا رشید الدین کی اس تالیف کا نام غلطی سے صولت الضیغم لکھا گیا ہے، صحیح صولتِ غضنفریہ ہے۔

ایک وضاحت اور: مولوی عبدالقادر چیف رام پوری سفر اجمیر سے واپسی پر دہلی آئے تھے اور دہلی کے ممتاز علماء سے جن میں مولانا رشید الدین خاں بھی شامل ہیں ملاقاتیں کی تھیں، مولانا رشید الدین اس وقت صولت غضنفریہ کی تردید کا جواب لکھ رہے تھے جس کا مولانا رشید الدین نے عبدالقادر رام پوری سے ذکر کیا تھا، ملاحظہ ہو: علم و عمل (ترجمہ وقائع عبدالقادر خاں) بحواشی محمد ایوب قادری ص ۲۴۹ ج ۱ (کراچی: ۱۹۷۰ء)

مگر اسکے حاشیہ میں قادری صاحب نے اس ملاقات کے وقت مولانا کی ......باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر......

باب (۴)

مولانا کے اساتذہ کے مختصر حالات

مولانا مملوک العلی کے تعلیمی سفر کے مشتملات سے معلوم ہوگیا ہے کہ مولانا نے چار نامور علماء سے تعلیم حاصل کی تھی اور برکت کیلئے ایک سبق حضرت شاہ عبدالعزیز سے بھی پڑھا تھا اسلئے حضرت شاہ صاحب کا نام نامی بھی مولانا کے اساتذہ میں شامل ہے۔

حضرت شاہ صاحب کے علاوہ حضرت مولانا محمد قلندر جلال آبادی، حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی، مولانا عبداللہ خان مرشدآبادی دہلوی اور حضرت مولانا رشید الدین کشمیری دہلوی (رحمہم اللہ) مولانا کے استاذ ہیں۔ مذکورہ بالا علماء کرام کے علاوہ مولانا مملوک العلی کے کسی اور استاد کا نام اس وقت تک معلوم نہیں اور ان اساتذہ سے تعلیم وافادہ کی صحیح ترتیب اور زمانۂ تعلیم بھی محقق نہیں، مگر قیاس چاہتا ہے کہ پہلے مولانا سید محمد قلندر جلال آبادی سے پڑھا ہو، اس کے بعد حضرت مفتی الٰہی بخش کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا ہوگا، اور مفتی صاحب سے کسب فیض کے بعد دہلی کا سفر ہوا ہوگا، دہلی میں دو علماء سے

گذشتہ صفحہ کا بقیہ...... زیر تالیف کتاب کا نام صولت غضنفریہ لکھ دیا ہے اور اس کے ضمن میں شیفتہ گلکشن کے مندرجہ بالا نسخہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ مگر یہ دونوں باتیں صحیح نہیں، جیسا کہ ذکر ہوا، یہ واقعہ عبدالقادر رام پوری کی صراحت کے مطابق ۲۶ شوال ۱۲۳۸ھ ۶ جولائی ۱۸۲۳ء کا ہے اور صولت غضنفریہ ۱۲۲۷ھ میں لکھی جا چکی تھی، جیسا کہ قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں صراحت ہے۔ جس کتاب کا مولانا رشید الدین نے عبدالقادر چیف سے ذکر کیا ہوگا وہ صولت غضنفریہ کے جواب کا جواب یا کوئی اور تالیف ہوگی۔

یہاں یہ اطلاع بے محل نہ ہوگی کہ مولانا رشید الدین کی اکثر تالیفات کے قلمی نسخے خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہیں ملاحظہ ہو: "مراۃ العلوم، فہرست مخطوطات فارسی خدا بخش لائبریری: پٹنہ۔

اور مختلف کتب خانوں اور ذخیروں میں مولانا رشید الدین خاں کی تالیفات کے متعدد نسخے موجود ہیں۔

پڑھا ہے آخری استاد مولانا رشید الدین خاں معلوم ہوتے ہیں اور یہ چاروں استاد خاندان ولی اللّٰہی کے فیض یافتہ اور دامن گرفتہ ہیں، ان بزرگوں سے تلمذ و نیاز مندی کے علاوہ حضرت شاہ عبدالعزیز سے براہِ راست اجمالی تلمذ بھی حاصل ہوا، اور اس گھرانہ کی محبت وعظمت کا پودا دل میں اگا ہوگا، اور یہی نسبت و نیازمندی مولانا کو لے گئی ہوگی۔ یہاں مولانا کے مذکورہ بالا چاروں استاذوں کے مختصر حالات ذکر کئے جا رہے ہیں جس کی ابتدا حضرت شاہ عبدالعزیز کے مبارک تذکرہ سے ہو رہی ہے۔

مسند ہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ

مسند ہند، مرجع کل، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ امام ہمام حضرت شاہ ولی اللہؒ کے فرزند والاشان تھے، ۲۵ ر رمضان المبارک ۱۱۵۹ھ (۱۲/۱اکتوبر ۱۷۴۶ء) کی شب میں ولادت ہوئی، غلام حلیم تاریخی نام ہے۔ والد ماجد اور مولانا شاہ نوراللہ بڈھانویؒ سے تعلیم حاصل کی، والد ماجد کی وفات کے بعد درسیات کی چند کتابوں کی حضرت شاہ محمد عاشق پھلتی سے تکمیل فرمائی اور سلوک میں بھی شاہ محمد عاشق پھلتی کی رہنمائی اور سرپرستی مشعل راہ بنی، علم وسلوک کے آخری مرحلوں کی تکمیل جاری تھی کہ حضرت شاہ ولی اللہ (۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) میں رحلت فرما گئے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی وفات کے بعد حضرت شاہ عبدالعزیز آبائے کرام کی مسند علم وارشاد پر جلوہ افروز ہوئے اور اپنی غیر معمولی صلاحیت وکمال اور مسلسل کوشش سے اس مسند کی حرمت وعظمت کو غیر معمولی بلندیوں تک پہنچا دیا اور اس میں اس قدر بے پناہ اضافہ فرمایا کہ اس کو قیامت تک کیلئے جاوداں کر دیا اور اس کی بدولت پورا ملک بلکہ سارا برصغیر علم ولی اللّٰہی، افادات ولی اللّٰہی، فکر ولی اللّٰہی اور طریقۂ ولی اللّٰہی کا نام لیوا اور دست گرفتہ ہوگیا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز نے علم وسلوک نیز رجالِ اصلاح وتربیت کی ایسی بڑی جماعت تیار فرمائی اور درس وتعلیم کے حلقوں کو ایسی آب وتاب بخشی اور تربیت وسلوک اور اصلاحِ رسوم ومعاشرہ اور مدارس اسلامیہ کی ایسی جاندار اور شاندار تحریک چلائی اور تعمق ورسوخ فی الدین کا ایسا نعرہ بلند کیا کہ مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک

سلسلہ ولی اللّٰہی کا نام سورج کی طرح منور وتاباں ہوگیا اور یہ حضرت شاہ عبدالعزیز کے کمال علم اور خدمت ومحنت کا ہی اثر ہے کہ برصغیر ہند میں علم ومعرفت کے تمام سلسلے اور خدمت حدیث کے تمام حلقے اسی کے اسیر اور خادم بنے ہوئے ہیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز مسند درس کی ثروت ووسعت اور اس کی ہمہ گیری میں منفرد اور علم وفضل کے تمام موضوعات ومباحث بلکہ ایک ایک پہلو اور گوشہ پر بے مثال نادر روزگار نظر رکھنے والے ایسے برگزیدہ علماء میں سے تھے کہ جن کی مثال ہر دور میں انگلیوں پر گنی گئی ہے اور جن کے فیوض وکمالات سے عالم کا عالم ہمیشہ بہتے دریاؤں کی طرح سیراب ومستفید ہوا ہے۔

حضرت شاہ صاحب کے علوم وکمالات کا دائرہ اس قدر وسیع ہے اور اس طرح صدرنگ پہلوؤں پر پھیلا ہوا ہے کہ اس کا صحیح تذکرہ اور مکمل تصویر کشی تقریباً ناممکن ہے، علوم میں وہ دسترس کہ اللہ اکبر! بڑوں بڑوں کی وہاں رسائی نہ ہو، فیض آبی اور درس وافادہ کی وسعت کا یہ عالم کہ برصغیر کے اس کونہ سے اس کونہ تک ہی نہیں ہندوستان کی سرحدوں سے گذر کر افغانستان، ترکستان، بخارا اور ماوراء النہر بلکہ مصر وشام تک اس کے قلمرو میں شامل تھے، اور دنیا کے ایک بڑے حصہ پر حضرت شاہ صاحب کی علمی حکمرانی کا پرچم لہرارہا تھا، اور اک دنیا حضرت شاہ صاحب کے تبحر علمی اور وسعت نظر سے حیران تھی۔ حضرت شاہ صاحب علم وکمال کی جن رفعتوں پر فائز تھے اس کا احاطہ ہی نہیں بلکہ تذکرہ بھی بڑے بڑے اہل نظر کے لئے آسان نہیں۔ حضرت شاہ صاحب کس مرتبہ کے عالم تھے اس کا اس سے اندازہ کیجئے کہ شاہ صاحب خود فرماتے تھے کہ جن علوم کا میں نے مطالعہ کیا ہے اور اپنی بساط کے مطابق ان کو یاد بھی رکھتا ہوں، ایک سو پچاس علوم ہیں۔ ارشاد ہے:

"(علمے کہ دیدہ ام ویاد ہم بقدر خود دارم یک صد وپنجاہ علم است کہ ونصف آں مردمان سابق ونصفش دریں است تصنیف شدہ" (۱)

یعنی شاہ صاحب کو ایک سو پچاس علوم پر ایسی دسترس تھی کہ وہ گویا نوکِ زبان تھے جب ان علوم میں سے کسی علم کے متعلق کوئی مسئلہ یا بحث سامنے آئی اس کے تمام مباحث

(۱) ملفوظات شاہ عبدالعزیز ص ۳۶ مرتبہ ۱۲۳۳ھ (طبع اول میرٹھ: ذی قعدہ ۱۳۱۴ھ)

اور تحقیقات یکلخت زبان پر جاری اور گویا دست بستہ حاضر ہو جاتی تھیں۔ حافظہ کی قوت اور ذہن کی برّاقی کا یہ حال اس وقت کا ہے جب شاہ صاحب کی عمر چوہتر (۷۴) سال تھی اور وہ اپنے بھائیوں کی وفات کے صدمات اور بے شمار بیماریوں کی وجہ سے زار و نزار ہو چکے تھے اور اس کے صرف چھ سال بعد وفات پا گئے تھے۔ جب اس عمر میں اور ایسے حالات میں ذہن کی یہ کیفیت تھی اور علوم کے استحضار کا یہ عالم تھا تو جوانی میں وہ ذہن کیسا ہوگا، اس کے بارے میں سوچنا بھی آسان نہیں ہے۔

حضرت شاہ صاحب کا حلقۂ درس حضرت شاہ ولی اللہ کی وفات (۱۱۷۶ھ) کے فوراً بعد شروع ہو گیا تھا، اسوقت شاہ عبدالعزیز کی عمر صرف سولہ سال تھی، یہ حلقۂ درس اس وقت سے شاہ عبدالعزیز کی زندگی کے آخری ایام (تقریباً چونسٹھ سال) تک جاری رہا، جس کی نوعیت اگر چہ ہمیشہ یکساں نہیں رہی مگر اس خدمت میں کبھی وقفہ بھی نہیں ہوا۔ شاہ صاحب سے جن اکابر علماء نے استفادہ کیا ان کی علمی قدر و منزلت اور خدمت و کمال کا تذکرہ آسان نہیں ہے، یہ ایک بڑا دریا تھا جو ایک زمانہ تک پوری محنت و قوت سے نہایت روانی اور پورے جوش و خروش سے بہتا رہا اور اس کے قطروں سے سیراب افراد و علماء آج تک امت کی پیاس بجھا رہے ہیں۔

اس کے علاوہ برصغیر میں علم دین کے جس پہلو کو دیکھئے اس کا رشتہ حضرت شاہ صاحب کی ذاتِ گرامی سے جڑا ہوا ہے اور جس اسلامی ملی کام پر نظر ڈالئے وہ حضرت شاہ صاحب کا اثر اور فیضان معلوم ہوتا ہے۔ جس کی روشنی آج تک اسی طرح منور و تابناک ہے اور امید ہے کہ انشاء اللہ آئندہ صدیاں اور نسلیں بھی حضرت شاہ صاحب کے علوم و برکات سے یوں ہی فیضیاب و سیراب رہیں گی۔

علم و فن کی کونسی وادی ہے جس میں شاہ صاحب کے نقوشِ قدم عیاں نہیں، تبلیغ دین، اصلاحِ معاشرہ، تربیت و اخلاق، تعلیم و تدریس، تصنیف و تالیف، شعر و انشاء، وعظ و تقریر، بحث و تحقیق اور جدل و مناظرہ کا کونسا پہلو ایسا ہے جو حضرت شاہ صاحب کی سرپرستی اور ان کے علوم کا ممنون و احسان نہیں۔ بلاشبہ حضرت شاہ صاحب کی ذاتِ گرامی برصغیر کی

علمی دینی تاریخ میں ایک سرچشمۂ ہدایت اور منارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں آج بھی ویسی ہی فیض تابی، ویسی ہی کشش اور تربیت و اصلاح کی ویسی ہی قوت موجود ہے جیسی سوا دو سو برس پہلے تھی۔

حضرت شاہ صاحب کی ایک اور بہت بڑی خدمت اور کارنامہ یہ ہے کہ شاہ صاحب نے اسلامی اصول وعقائد کے خلاف اٹھنے والی تمام آوازوں اور فتنوں کا برملا مقابلہ کیا اور ردشیعیت پر جو اس زمانہ میں ایک بڑا امتحان اور دینی خدمت تھی خاص طور سے توجہ کی اور شیعوں کی تردید میں بہت سی تحریرات وفتاویٰ کے علاوہ تحفہ اثنا عشریہ جیسی بے نظیر کتاب تصنیف فرمائی، جو آج تک قوتِ استدلال کے علاوہ علمی وزن اور حسن تحریر میں بھی بے نظیر ہے۔

نیز اس زمانہ میں مسلمانوں کے معاملات ومعاشرت میں جو بہت سی خرابیاں درآئیں تھیں، ان کی اصلاح کی بھی مسلسل کوشش فرمائی اور یہی تحریک اصلاح وتربیت تھی جو حضرت سید احمد شہید اور شاہ محمد اسماعیل شہید کیلئے نمونہ اور مشعل راہ بنی۔

شاہ صاحب کی تصنیفات اور مؤلفات کا بھی ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے، سب کتابیں عربی فارسی میں تھیں، اب ان میں سے اکثر کے اردو ترجمے اور توضیحات وحواشی شائع ہو چکے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب کی اسی سال کی عمر میں ۷؍شوال ۱۲۳۹ھ (۶؍جون ۱۸۲۴ء) کو دہلی میں وفات ہوئی، قبرستان مہندیان میں حضرت شاہ ولی اللہ کے پہلو میں دفن کئے گئے۔ رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی

قصبہ کاندھلہ ضلع مظفرنگر کے ایک پرانے دینی علمی خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں، جس کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے اور جس کی ابتدائی کڑیاں اس طرح ہیں:

''مولانا مفتی الٰہی بخش، خلف مولانا حکیم محمد عرف شیخ الاسلام، بن حکیم قطب الدین بن حکیم عبدالقادر بن مولانا محمد شریف بن مولانا محمد اشرف''

۱۱۶۲ھ (۴۹-۱۷۴۸ء) میں پیدائش ہوئی۔ ابتدائی تعلیم و درسیات کی تکمیل کے بعد متوسطات اور اعلیٰ درسی کتابوں کی تعلیم و تکمیل کے لئے تقریباً چودہ سال کی عمر میں دہلی پہنچے، یہ حضرت شاہ ولی اللہ کی زندگی کے غالباً آخری ایام تھے اسلئے حضرت شاہ صاحب سے براہِ راست تعلیم واستفادہ کا موقع نہیں ملا، لیکن حضرت شاہ صاحب کی وفات کے بعد جب حضرت شاہ عبدالعزیز نے درس کا آغاز کیا تھا، اس وقت جو پانچ طالب علم سب سے پہلے تعلیم حاصل کرنے کیلئے شاہ عبدالعزیز کی مجلس درس میں بیٹھے ان میں حضرت مفتی الٰہی بخش بھی شامل تھے۔ مفتی صاحب نے متوسطات سے اعلیٰ ترین کتابوں تک سب کتابیں حضرت شاہ عبدالعزیز سے پڑھیں، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر متعدد جماعتوں اور سبقوں میں ساتھ تھے، دونوں برادران ساتھ ہی درسیات سے فارغ ہوئے اور حضرت شاہ صاحب نے اعلیٰ درجہ کی سند سے نوازا۔ غالباً تعلیم کے آخری دور میں شاہ عبدالعزیز سے بیعت ہو گئے تھے۔ شاہ صاحب کی خدمت میں رہ کر تصفیۂ باطن اور ارشاد وسلوک میں بھی کمال حاصل کیا اور اجازت وخلافت سے نوازے گئے۔

مفتی صاحب نے حضرت سید احمد شہید سے بھی استفادہ کیا اور اجازت وخلافت سے نوازے گئے اور ایک کامل شخص کی رہنمائی اور خاص مشورہ کے بعد اپنے چھوٹے بھائی مولانا کمال الدین سے بھی بیعت ہو کر استفادہ کیا اور اجازت وخلافت سے بہرہ ور ہوئے۔ اس طرح مفتی صاحب کی ذات میں تصوف کے متعدد سلسلوں اور خانوادوں کے کمالات یکجا ہو گئے تھے، جس کے بے حد منافع واثرات ظاہر ہوئے، مفتی صاحب کی علمی تدریسی زندگی کا آغاز نواب ضابطہ خاں (خلف نواب نجیب الدولہ) کے مرکز حکومت غوث گڑھ میں ملازمت وقیام سے ہوا، حضرت شاہ عبدالعزیز نے ضابطہ خاں کے اصرار پر مفتی صاحب کو غوث گڑھ جانے کی اجازت عطا فرمائی تھی، مفتی صاحب ضابطہ خاں کی ریاست میں صدر مفتی کے عہدہ پر فائز رہے، اس عہدہ ومنصب کی وجہ سے مفتی کا جو خطاب ملا تھا وہ مفتی صاحب کے نام کا گویا ایسا جز بن گیا ہے کہ اب اس کو مفتی صاحب کے نام اور تعارف سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں۔

مفتی صاحب نواب ضابطہ خاں کی ملازمت سے علیحدہ ہونیکے بعد کوٹہ، راجستھان، بھوپال اور سہارن پور میں متعدد ملازمتوں پر فائز رہے اور مختلف دینی علمی خدمات انجام دیتے رہے، وطن کے آس پاس چند بستیوں، تھانہ بھون، امیر نگر وغیرہ میں بھی کم یا زیادہ قیام رہا۔ آخر عمر (تقریباً سنہ ۱۲۳۰ھ ۱۸۱۵ء) میں وطن آ گئے تھے پھر وفات تک یہیں رہے، تعلیم و تدریس، ارشاد و تبلیغ، تصنیف و تالیف، وعظ و تلقین وغیرہ دینی مشاغل جو زندگی کا مقصد اور تمام ملازمتوں کے باوجود ہمیشہ سب سے بڑی مصروفیت رہی، اس میں ہمہ وقت انہماک رہا اور اسی میں مشغول رہتے ہوئے وفات پائی۔

تعلیم و سلوک سے فارغ ہو کر اپنے وطن اور علاقہ میں وعظ و تلقین اور تحریرات و رسائل و فتاویٰ کے ذریعہ سے طریقۂ سنت کی ترویج، رسوم و بدعات کی تردید اور صحیح اسلامی معاشرہ کے قیام کیلئے متواتر اور سخت جد و جہد کی، جس کے نہایت مفید اور دوررس نتائج و اثرات ظاہر ہوئے۔ اس علاقہ میں تعلیم کے احیاء، دینی مراکز کی تجدید اور تعلیم و تدریس کے حلقے عام ہونے میں حضرت مفتی صاحب کا بہت بڑا اور خاص حصہ ہے، اور یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس خطہ ضلع سہارنپور و مظفرنگر اور اس کے قصبات اور بستیوں) میں ۱۸۵۷ء سے پہلے اور بعد میں جو بڑے علماء، اہل کمال اور مصلحین اٹھے اور گویا برصغیر کے دینی افق پر چھا گئے اور ابر رحمت کی طرح پوری دنیا ان سے فیضیاب ہوئی، ان میں بہت سے حضرت مفتی الٰہی بخش صاحب کے حلقۂ درس کے پروردہ یا مفتی صاحب کے شاگردوں کے تربیت یافتہ اور شاگرد ہیں، اسلئے ہمیں یہ کہنے میں کچھ تأمل نہیں کہ اس خطہ سے احیائے دین اور فروغ و اشاعتِ علم کی جو طاقتور اور نہایت شاندار اور بھرپور آواز اٹھی اس کے بنیادی مراجع اور سرچشموں میں سے ایک خاص بلکہ اہم ترین سرچشمہ مفتی صاحب کی ذاتِ گرامی تھی، مفتی صاحب کے منجملہ اور بہت سے ممتاز اور اصحابِ فیض علماء کے ایک خاص اور ممتاز شاگرد مولانا مملوک العلی صاحب بھی تھے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

حضرت مفتی صاحب نے غالباً حضرت شاہ عبدالعزیز سے تعلیم کے زمانہ میں ابتدائی اور اوسط کتابیں پڑھانے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، یہ حلقۂ درس بعد میں بذاتِ خود ایک

بڑے مرکزِ علم اور دار العلوم کی صورت اختیار کر گیا تھا، جس میں معمول و مروج نصاب کی درسیات کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم کے علاوہ فقہ، تصوف اور طب کے اسباق نیز ان کی عملی مشق اور ان کے مطابق مزاج کی تربیت اس حلقۂ درس کا خاص امتیاز اور اہم حصہ تھی۔

درس و تعلیم اور ارشاد و تربیت کی مصروفیت کے علاوہ مفتی صاحب کی تحریرات و تالیفات کا بھی ایک خاصا بڑا اور وسیع سرمایہ یادگار ہے، جو متنوع موضوعات اور تینوں مشہور اسلامی زبانوں، عربی، فارسی، اردو پر مشتمل ہے۔ مفتی صاحب کو اردو شعر و سخن کا بھی اعلیٰ درجہ کا ذوق تھا، کئی کتابوں کے عربی فارسی اردو میں منظوم ترجمے، تینوں زبانوں میں قصائد و منظومات اور دوسرے عنوانات پر وقیع سرمایہ اور کلام کے مجموعے موجود ہیں۔

اس وقت تک حضرت مفتی صاحب کی ایک سو پانچ تالیفات و مصنفات دریافت ہوئی ہیں، جن میں سے سینتیس (۳۷) عربی میں، انسٹھ (۵۹) فارسی میں اور آٹھ (۸) اردو میں ہیں، مگر یہ مفتی صاحب کی کل تالیفات نہیں، خیال ہے کہ مفتی صاحب کی متعدد تالیفات و تراجم وغیرہ ضائع ہو چکے ہیں، اس ذخیرہ میں سے صرف گیارہ کتابیں اب تک چھپی ہیں، جس میں سے اختتام مولانا روم کو سب سے زیادہ شہرت و اہمیت حاصل ہے، حضرت مولانا روم کی مثنوی معنوی جس کو ''ہست قرآن در زبانِ پہلوی'' تک کہا گیا ہے نا تمام رہ گئی تھی۔ مولانا روم نے مثنوی کے چھٹے دفتر کو ایک قصہ بیان کرتے کرتے اسکا مقصد اور انجام ذکر کئے بغیر اچانک ختم کر دیا تھا اور اپنے خاص مخاطب شیخ بہاء الدین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا، اس داستان کا باقی حصہ ایسے شخص کی زبان اور قلم سے پورا ہوگا جو زندہ و بیدار دل رکھتا ہوگا، اور معرفت میں کامل و مکمل ہوگا، فرمایا:

باقیٔ ایں گفتہ آید بے زباں در دلِ آں کس کہ دارد نور جاں

مولانا روم کی وفات (۶۷۲ھ) کے تقریباً ساڑھے پانچ سو سال بعد حضرت مفتی صاحب کے ذریعہ یہ نا تمام قصہ اپنے انجام کو پہنچا اور مثنوی مولانا روم کے چھٹے دفتر کی اعلیٰ درجہ میں تکمیل ہوئی، یہی حصہ یا دفتر اختتام یا تکملہ مثنوی مولانا روم کے نام سے مشہور و معروف ہے اور تقریباً پونے دو سو سال سے متواتر شائع ہو رہا ہے۔

کبرسنی کے باوجود مفتی صاحب کے اوقات دینی علمی خدمات سے گھرے ہوئے تھے کہ اسی میں مولانا کا اچانک وہ وقت آ گیا جس سے کسی ذی روح کو نجات نہیں، مفتی صاحب کی اتوار کی شام ۱۵/جمادی الاخریٰ ۱۲۴۵ھ (۱۳/دسمبر ۱۸۲۹ء) کو مغرب کے وقت وفات ہوئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ دوشنبہ ۱۶/جمادی الاخریٰ مطابق ۱۴/دسمبر کو خاندانی قبرستان میں، جو کاندھلہ کی موجودہ عیدگاہ سے ملحق ہے، اپنے بھائیوں مولانا امام الدین، شاہ کمال الدین اور والد ماجد کے پہلو میں دفن ہوئے۔ رحمہ اللہ ورضی عنہ

حضرت مولانا سید محمد قلندر محدث جلال آبادی

حضرت مولانا محمد قلندر جلال آبادی کے حالات بہت کم معلوم ہیں راقم نے کئی سال پہلے مولانا پر ایک مضمون لکھا تھا جس پر کوئی اضافہ نہیں ہوا اس لئے وہی یہاں بھی درج کیا جا رہا ہے۔ نور

ایک زمانہ تھا کہ نجیب آباد (جو آج کل ضلع بجنور یوپی کا ایک قصبہ ہے) مجمع علوم اور مرکزِ علماء تھا، نواب نجیب الدولہ کی علم پروری اور قدر دانی کی وجہ سے دور دراز سے علماء اور شریف خاندانوں نے نجیب آباد کا رخ کیا۔ اور انہیں معزز خانوادوں میں ایک گھرانا سادات کا بھی تھا جو نجیب الدولہ کی وفات اور ضابطہ خاں کے غوث گڑھ کو مستقر بنا لینے کے بعد غوث گڑھ منتقل ہوا، غوث گڑھ کی تباہی کے بعد یہ خاندان جلال آباد پہنچا اور وہیں کا ہو رہا۔ اسی خاندان کے ایک فرد فرید حضرت مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادی ہیں۔

مولانا محمد قلندر کی ولادت وطفولیت کی نسبت معلومات دستیاب نہیں۔ تعلیم شروع سے آخر تک خاتم مثنوی مولانا روم، حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی سے حاصل کی۔ تمام علوم میں اپنے استاذ کا عکس اور ثنی تھے۔

مولانا محمد قلندر کے یہاں بھی ہر وقت درس وتدریس کا سلسلہ رہتا تھا، خصوصاً مولانا کا سلسلۂ درسِ حدیث اس دور کا ممتاز ترین حلقۂ درس تھا، جس میں دور دراز علاقوں کے طلباء

بھی شریک رہتے تھے۔ مولانا محمد قلندر علم و فضل، سلوک و معرفت اور اصلاح و تذکیر میں یکساں بلند پایہ رکھتے تھے اور کشف و کرامات میں شہرۂ آفاق تھے۔

مولانا محمد قلندر کا ایک خاص وصف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبتِ حضوری ہے، مولانا محمد قلندر ہر روز شب میں اور بیداری میں بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوتے تھے۔ مولانا محمد قلندر کی علمی و روحانی صلاحیتوں اور دربارِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں شرفِ حضوری کی وجہ سے اس دور کے علماء و مشائخ کی نظر میں خاص احترام اور بے حد وقعت تھی۔

مؤلف تذکرۂ رحمانیہ لکھتے ہیں:

"یہ بزرگ بڑے پایہ کے عالم تھے۔ حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کو نسبتِ حضوری حاصل تھی۔ خواب میں زیارت سے مشرف ہوتے تھے۔ اپنے علاقہ میں نہایت صاحب کشف و کرامات مانے جاتے تھے، علم و فضل کے ساتھ تقوی، نیکی اور پرہیزگاری میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔" (۱)

مولانا محمد قلندر نے طویل علالت کے بعد ۱۲۶۰ھ میں وفات پائی۔ مولانا ابوالحسن حسن کاندھلوی نے بطریق تخرجہ تاریخ کہی:

جو سید محمد قلندر مرا ۔۔۔ تو دل غم سے ٹکڑے مرا ہو گیا
وہ تھا سیدِ پاک مقبول حق ۔۔۔ ہوا اس کے غم میں ہر اک مبتلا
حسن جب گیا فکر تاریخ میں ۔۔۔ تو ہاتف نے بس اس سے اتنا کہا
"فقد فاز فوزاً عظیما" حسن ۔۔۔ یہ تاریخ ہے اس کی نص خدا
بشرطیکہ اعداد الفاظ نزع ۔۔۔ کرے لفظ آیت سے لکھ کر جدا (۲)

آخر میں مولانا سید محمد قلندر کے ان تلامذہ کا ذکر کیا جاتا ہے جن کی علمی و عرفانی

(۱) تذکرہ رحمانیہ۔ تالیف مولانا عبدالحلیم انصاری، ص ۳۵ (پانی پت ۱۳۵۷ھ)

(۲) بیاض مولانا ابوالحسن ورق ۱۹ اب فقد فاز فوزاً عظیما کے کل عدد ۱۳۸۷ ہوتے ہیں اگر لفظ نزع کے اعداد ۱۲۷، اس میں سے نکال دے جائیں تو کل ۱۲۶۰ باقی رہ جاتے ہیں اور یہی مولانا قلندر کا سنہ وفات ہے۔

خدمات کے گہرے نقوش ہماری ملی تاریخ میں اس طرح مرتسم ہیں کہ ان کا ذکر کئے بغیر ہندوستان میں مسلمانوں کی علمی، مذہبی اور روحانی تاریخ کا ہر جائزہ ناتمام و نامکمل رہے گا۔ یہ نامور تلامذہ ہیں، استاذ العلماء مولانا مملوک العلی نانوتوی، مولانا قاری عبدالرحمٰن پانی پتی، حضرت حاجی امداداللہ تھانوی مہاجر مکی، مولانا شیخ محمد محدث تھانوی اور مولانا غوث علی شاہ قلندر پانی پتی۔

مولانا مملوک العلی نے مولانا محمد قلندر سے کیا تعلیم حاصل کی اس کی کوئی تفصیل نہیں ملتی، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کی ایک عبارت سے مجمل اطلاع ملتی ہے، مولانا لکھتے ہیں:

نیز سنا ہے کہ آپ (مولانا مملوک العلی) نے معقول کا کچھ حصہ مولوی قلندر بخش سے بھی پڑھا ہے۔(۱)

راقم سطور کو مولانا احمد اللہ کیرانوی کی روایت پہنچی ہے، وہ اپنے استاذ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی سے نقل کرتے ہیں کہ مولانا مملوک العلی نے حدیث کی چند کتابیں مولانا محمد قلندر سے پڑھی تھیں۔

مولانا قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتی نے چند اعلیٰ درسی کتابیں اور صحیح بخاری کا ایک تہائی حصہ مولانا محمد قلندر سے پڑھا تھا۔ مؤلف تذکرۂ رحمانیہ لکھتے ہیں:

صاحب سوانح (مولانا قاری عبدالرحمٰن) کو تحصیل علوم کا شوق آپکے پاس لے گیا۔ حضرت ممدوح سے آپ نے ثلث صحیح بخاری اور بعض دیگر کتب دینیات پڑھیں۔(۲)

حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ نے مشکوۃ کا چوتھائی حصہ مولانا محمد قلندر سے پڑھا، حضرت حاجی صاحب نے ایک مجلس میں اس تلمذ کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا:

بعدازاں بالہام غیبی و بجذبۂ لذت کلام نبوی مشکوۃ شریف کا ایک ربع قراءۃً عاشق زار رسولِ انور حضرت مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادی پر گزرانا۔(۳)

---

(۱) تذکرۃ الرشید مولانا عاشق الٰہی میرٹھی ص ۲۷ ج ۱ (طبع اول میرٹھ)

(۲) تذکرہ رحمانیہ ص ۳۶

(۳) شمائم امدادالمشتاق ص ۱۰

حضرت میانجیو نور محمد صاحب کی خدمت میں حضرت حاجی امداد اللہ کے حاضر ہونے اور حضرت میانجیو صاحب سے پہلی ملاقات کا ذریعہ بھی مولانا محمد قلندر صاحب ہی تھے، حضرت حاجی صاحب نے میانجیو نور محمد صاحب کی خدمت میں پہلی حاضری (۱) کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''ایک دن حضرت استاذی مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادی رحمہ اللہ تعالیٰ نے میرے اضطرار کو دیکھ کر بکمال شفقت وعنایت فرمایا کہ تم کیوں پریشان ہوتے ہو، موضع لوہاری یہاں سے قریب ہے وہاں جاؤ اور حضرت میانجیو صاحب سے ملاقات کرو شاید مقصودِ دلی کو پہنچو اور اس حیث و بحث سے نجات پاؤ۔ جناب ایشان فرماتے ہیں کہ جس وقت حضرت مولانا سے میں نے یہ سنا متفکر ہوا اور دل میں سوچنے لگا کہ کیا کروں، آخر بلالحاظ سواری وغیرہ میں نے فوراً راہ لوہاری کی لی''۔ (۲)

مولانا شیخ محمد تھانوی موصوف نے معقولات کی کتابیں مولانا محمد قلندر سے پڑھیں تھیں، مولانا شیخ محمد تحریر فرماتے ہیں:

''اما درفن معقول ہم ازیں خاندان عالیشان بذریعہ مولانا الحاج المدرس مولوی مملوک العلی نانوتوی مرحوم ومولانا الحاج محمد قلندر جلال آبادی مغفور''۔ (۳)

مولانا محمد عمر چرتھاؤلی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا شیخ محمد نے نحو وصرف کی تمام کتابیں مولانا عبدالرحیم تھانوی اور مولانا محمد قلندر سے پڑھیں تھیں۔ (۴)

---

(۱) راقم سطور کا خیال ہے کہ حضرت میانجیو نور محمد صاحب کی خدمت میں حضرت حاجی صاحب کی پہلی حاضری غالباً ۱۳۵۸ھ کے آخر میں ہوئی، اس کا قرینہ یہ ہے کہ ۱۲۵۶ھ تک حضرت حاجی صاحب کے پہلے شیخ حضرت مولانا نصیرالدین نقشبندی حیات تھے انکی زندگی میں کسی دوسرے شیخ سے رجوع ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ کئی سال حضرت میانجیو صاحب کی تلاش وجستجو میں رہے (شمائم امدادیہ ص ۱۴) اور رمضان ۱۲۵۹ھ میں حضرت میانجیو صاحب کا وصال ہوجاتا ہے، میانجیو کا وصال کے وقت یہ فرمانا کہ ''میرا ارادہ تھا کہ تم سے مجاہدہ و ریاضت لونگا مشیت باری سے چارہ نہیں ہے عمر نے وفا نہ کی'' شمائم ص ۱۶۰ اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ حضرت حاجی صاحب میانجیو صاحب کی خدمت میں چند ماہ رہے۔

(۲) شمائم امدادیہ ص: ۱۱، امداد المشتاق ص: ۱۰

(۳) دلائل الاذکار فی اثبات الجہر والاسرار ص ۳۷، (دہلی ۱۲۷۰ھ)

(۴) نشر حالات محمدیہ ص ۵، عثمانی میرٹھ ۱۲۹۷ھ

مولانا غوث علی شاہ قلندر پانی پتی نے مثنوی مولانا روم کا دفتر اول مکمل اور دوسرے دفتر کا کچھ حصہ مولانا محمد قلندر سے پڑھا، اسکا مولانا غوث قلندر نے خود ذکر کیا ہے۔(۱)

مولانا عبداللہ خاں علوی

مولانا عبداللہ خاں علوی کے متعلق تفصیلی معلومات کمیاب ہیں، مختلف تذکروں اور اطلاعات سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا موضع شمس آباد، ضلع فرخ آباد، یوپی کے ایک پٹھان خاندان سے نسبت رکھتے تھے، والد کا نام قاسم علی خاں تھا، سنہ ولادت معلوم نہیں۔

حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید کے علاوہ اور متعدد علماء سے تعلیم حاصل کی۔ مختلف علوم وفنون میں ماہر ہوگئے تھے، خصوصاً فارسی ادب وانشاء میں فخر روزگار، اردو کے اپنے دور کے مرجع اور فارسی کے بڑے شاعر بھی تھے، کبھی کبھی اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔

قادر بخش صابر دہلوی نے (گلستانِ سخن میں) مولانا کے اردو کے چند شعر اور فارسی کلام کا مفصل انتخاب درج کیا ہے۔(۲)

مولانا عبداللہ خاں علوی طب میں بھی خاص دستگاہ رکھتے تھے، متعدد طلباء نے طب مولانا سے پڑھی جن میں حکیم اصغر حسین فرخ آبادی اپنے عہد کے ممتاز طبیب تھے، امیر شاہ خاں خورجوی کی ایک روایت کے مطابق مولانا مملوک العلی بھی مولانا کے شاگرد تھے۔

مولانا عبداللہ خاں کی زندگی کا بڑا حصہ دہلی میں گزرا اور تعلیم وتدریس میں مشغول رہے، آخر عمر میں نواب محمد علی خاں کے اصرار پر شمس آباد چلے گئے تھے، نواب صاحب نے مولانا کیلئے معقول وظیفہ جاری کردیا تھا، آخر تک وہیں رہے، مولانا کی شمس آباد میں ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۸ء) میں وفات ہوئی، مولانا کے خاص شاگرد امام بخش صہبائی نے قطعۂ تاریخ کہا ہے۔(۳)

---

(۱) تذکرہ غوثیہ منسوب بہ مولانا گل حسن ص:۴۳

(۲) گلستان سخن قادر بخش صابر ص۲۲۲، تا ۲۴۱ جلد دوم مرتبہ خلیل الرحمن داؤدی (لاہور:۱۹۶۶ء)

(۳) مولانا عبداللہ خان علوی کے متعلق مزید معلومات کیلئے ملاحظہ ہوں: گوہرین نامہ احسن اللہ خاں ثاقب (لکھنؤ:۱۳۴۱ھ)۔ نزہۃ الخواطر مولانا عبدالحی حسنی ص۳۱۴ ج ۷ (حیدرآباد:۱۳۹۹ھ)۔ ارواحِ ثلاثہ ص۸۰ (مکتبہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون)۔

علوی کہ جو او نداد کس داد سخن | چوں او نہ رسیدہ کس بہ فریاد سخن
ناگہ زجہاں رخت اقامت بربست | ہاتف گفتہ فتاذ بنیاد سخن (۱)

مولانا رشید الدین خاں کشمیری

مغلوں کے آخری دور میں کئی معزز کشمیری خاندان یا افراد تعلیم و تربیت یا تجارت کے خیال سے دہلی آئے تھے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے تھے۔ (۲) ایسے خانوادوں میں سے ایک معزز خاندان وہ تھا جس کا دو تین نسلوں تک دہلی کے علماء اور مشائخ خصوصاً حضرت شاہ ولی اللہ اور انکے صاحبزادگانؒ سے تعلیم و تلمذ اور عقیدت و استفادہ کا خاص تعلق رہا۔ اس خاندان کے چند اصحاب حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ سے تلمذ کا فخر رکھتے تھے۔ (۳) چند اصحاب نے حضرت شاہ عبدالعزیز اور ان کے بھائیوں سے تعلیم حاصل کی اور ان کی صحبتوں سے مسلسل استفادہ کیا، ایسے ہی نامور علماء میں سے ایک بڑی شخصیت مولانا رشید الدین خاں کشمیری دہلوی کی تھی۔ اس خانوادہ کے لوگ کب دہلی آئے، یہاں انکے کیا کاروبار تھے اور اس خانوادہ کی عمومی خدمات کیا کیا ہیں، اسکا ذکر نہیں ملا، نسب کی تفصیلات بھی مفقود ہیں، تاہم مولانا عبدالحیؒ حسنی نے مولانا رشید الدین کے والد، دادا، پردادا کے نام لکھے ہیں، جو اس طرح ہیں:

''مولانا رشید الدین، بن امین الدین، بن وحید الدین، بن عبدالسلام کشمیری''(۴)

مولانا کا سنہ ولادت محقق نہیں، لیکن سر سید احمد نے مولانا رشید الدین کی کل عمر ساٹھ سال (۵) لکھی ہے (وفات ۱۲۴۳ھ) اس اطلاع کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ مولانا

(۱) گلستان سخن قادر بخش صابر ص ۲۲۶ جلد دوم مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی (لاہور: ۱۹۶۶ء)

(۲) ایسے افراد کی لمبی فہرست ہے جن میں سے چند اصحاب کا مرزا محمد رستم بدخشی نے اپنی تالیف تاریخ محمدی میں ذکر کیا ہے۔ مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی رام پور ۱۹۶۰ء۔

(۳) حضرت شاہ ولی اللہ کے کشمیری منتسبین کے نام شاہ صاحب کے متعدد مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ کے مکتوبات میں درج ہیں۔

(۴) نزہۃ الخواطر، مولانا عبدالحیٔ حسنی ص ۱۸۰ جلد ۷ (حیدرآباد: ۱۳۹۹ھ)

(۵) آثار الصنادید سر سید احمد ص ۵۱-۵۲ باب چہارم (نول کشور لکھنؤ ۱۳۱۸ھ)

رشید الدین کی تقریباً ۱۱۸۳ھ (۷۰-۱۷۶۹ء) میں ولادت ہوئی ہوگی۔

مولانا رشید الدین نے ابتدائی کتابیں اور درسیات مولانا مفتی علی کبیر بناری سے اور متوسطات سے فقیہانہ کتابوں تک حضرت شاہ رفیع الدین سے پڑھیں، نیز حضرت شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر (رحمہم اللہ تعالیٰ) سے بھی استفادہ کیا، مگر اصل تلمذ اور استفادہ شاہ رفیع الدین سے تھا۔ سرسید احمد نے لکھا ہے کہ شاہ رفیع الدین، مولانا رشید الدین کی تعلیم وتربیت میں ہمیشہ اس طرح مشغول رہتے تھے جس طرح باپ بیٹے کی تعلیم وتربیت میں مصروف رہتا ہے۔(۱)

مولانا رشید الدین خاں نے ان بزرگوں کے علمی کمالات کو اپنے اندر سمو لینے کی بھرپور کوشش فرمائی یہاں تک کہ خود ایک بڑے عالم اور علماء کے مرکز نگاہ بن گئے، مولانا کا حضرت شاہ عبدالعزیز کی حیات میں دہلی کے بڑے علماء اور اہل درس اصحاب میں شمار کیا جاتا تھا اور جاننے دیکھنے والے مولانا کے کمالاتِ علمی کے معتقد اور مداح تھے۔

مولوی عبدالقادر چیف رامپوری جو حضرت شاہ عبدالعزیز کی حیات میں دہلی آتے رہتے تھے اور دہلی کے اکابر علماء نیز مولانا رشید الدین خاں سے بھی خاصا تعارف اور ملاقات رکھتے تھے (اور ان کی غالباً مولانا سے بے تکلف گفتگو بھی رہتی تھی) مولوی عبدالقادر کی (آخر شوال ۱۲۳۸ھ جولائی ۱۸۲۳ء میں) دہلی میں مولانا سے جو ملاقات ہوئی تھی اس کا رام پوری نے اپنے روزنامچہ میں خاصا مفصل ذکر کیا ہے۔ یہاں مولوی عبدالقادر کی پوری عبارت اور اس کا اردو ترجمہ نقل کیا جاتا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا رشید الدین کے معاصر مولانا کے متعلق کیا رائے رکھتے تھے۔ عبدالقادر چیف رامپوری نے لکھا ہے کہ:

”از تلامذۂ رشید ایں بزرگواران رشید الدین خاں بود اگر چہ چنداں تیز نبود، مگر مشق افادہ واستفادہ خوب داشت، وقصد پیروی اساتذہ در ہر باب می کرد مگر در مناظرہ زود تر رنجیدہ می شد، وپابند نمود از اندازہ زیادہ بود۔ معلومات فرواں ہر فن می

(۱) آثار الصنادید سرسید احمد ص ۵۱-۵۲ باب چہارم (نول کشور لکھنؤ ۱۳۱۸ھ)

داشت، و ہر چہ نوشتی بہ بسط و تفصیل نوشتی، علی الخصوص در مباحث دینیہ اختلافیہ، و گمان بردی کہ حالا جانب مقابل راجائے رد وقدح نماندہ۔

با بندہ ربط شفیقانہ داشت، بملاقات اخیرش کہ ہنگام مراجعت اجمیر نصیب ایں بے ہیچ شد، آنچہ در مسئلہ متعہ بجواب فضلائے امامیہ لکھنؤ می نوشت، مقدمہ آں را کہ چند اجزا بود وہنوز بانجام نرسیدہ نمود وگفت کہ ہرگاہ ایں کتاب بہ شرح وبسط کہ میخواہم صورت اختتام پذیرفت و بہ لکھنؤ رسید، علمائے آں طرف درفکر جواب خواہند مرد، وسراز جیب نخواہد برآورد۔ گفتم نامش جناب لوح محفوظ نہند تا اسم با مسمی باشد۔

اکنوں دراں شہر ہمچو او دیگرے نیست...... با مولوی محمد اسماعیل، و مولوی عبدالحیٔ آنجہانی درمجلس وعظ بہ مسجد جامع شاہ جہاں آباد بطوری کہ پیش آمد نہ شایان وضع شریفش بود ونہ زیبا بعلاقہ وربط کہ باآں خاندان داشت۔(۱)

ترجمہ: ان سب بزرگوں کے شاگرد رشید الدین خاں تھے جو اگر چہ اتنے تیز فہم نہ تھے مگر تعلیم و تعلم کی خوب مشق تھی، ہر بات میں اساتذہ کی پیروی کرتے تھے مگر مناظرے میں بہت جلد رنجیدہ ہو جاتے تھے، نمائش کے بہت زیادہ پابند تھے، ہر فن کی بہت کچھ معلومات رکھتے تھے، جو کچھ لکھتے بسط و تفصیل سے اور جو کچھ کہتے دراز وطویل، بالخصوص مباحثہ اختلافیہ دینیہ میں یہی طریقہ تھا اور یہ سمجھتے تھے کہ اب مقابل میں ردّ وقدح کی گنجائش نہیں رہی۔

بندے (مولوی عبدالقادر) سے بہت شفقت فرماتے تھے، ان سے آخری ملاقات اس

(۱) عبدالقادر چیف کے فارسی روزنامچہ کا یہ اقتباس مولانا امتیاز علی عرشی نے (رضالائبریری رام پور کے قلمی نسخہ کے ص ۶۵ ب سے) فہرست مخطوطات اردو، رضا لائبریری رامپور میں کتاب رشید المومنین کے تعارف میں نقل کیا ہے۔ فہرست ص ۱۶۶ (رام پور ۱۹۶۷ء)۔ مگر رشید المومنین مولانا رشید الدین خاں کی تالیف نہیں ہے، اس میں مولانا عرشی کو مغالطہ ہوا۔ رشید المومنین اور اس بحث میں ضمناً ذکور ایک اور کتاب نور الایمان، دونوں مولانا سلطان حسن خاں شاہ جہاں پوری، مؤلف تذکیر الاخوان کی تالیف میں سے ہیں، اس پر مولانا رشید الدین کا نام کسی کاتب ناواقف کی غفلت سے درج ہوگیا ہے، مولانا کے تعارف کیلئے ملاحظہ فرمائیں راقم سطور کی ناتمام تالیف ''تقویۃ الایمان اور اس کے خلاف برپا شورش، تاریخ وحقیقت کے آئینہ میں'' کی پندرھویں قسط، مولانا سلطان حسن خاں شاہ جہانپوری اور ان کی تالیفات۔ ماہنامہ الفرقان لکھنؤ (اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۳ء)

وقت ہوئی جب کہ بندے کو اجمیر سے واپسی نصیب ہوئی (۱) مسئلہ متعہ کے متعلق لکھنؤ کے شیعہ علماء کے جواب میں جو کتاب لکھ رہے تھے اس کا مقدمہ کئی جزو ہو گیا تھا اور ابھی پورا نہیں ہوا تھا، مجھے کتاب دکھا کر کہا کہ جب یہ کتاب اس شرح وبسط کے ساتھ جو میں چاہتا ہوں، پوری ہو جائے گی اور لکھنؤ پہنچے گی تو وہاں کے علماء اس کے جواب کی فکر میں مر جائیں گے اور گریبان سے سر نہ اٹھا سکیں گے۔ میں (مولوی عبدالقادر) نے کہا کہ جناب اس کا نام "لوحِ محفوظ" رکھیں کہ اسم بامسمّٰی ہو جائے۔ اب اس شہر میں ان جیسا دوسرا نہیں ہے اور وہ بھی غالباً ۱۲۴۰ھ یا ۱۲۴۱ھ میں اس دارِ پُر شور شغب سے اپنے باکمال اساتذہ کے پاس چلے گئے۔

مولوی رشید الدین خاں اور مولوی محمد اسماعیل نیز مولوی عبدالحیؒ سے وعظ جامع مسجد شاہ جہاں آباد میں جو صورت پیش آئی، نہ ان کی شریف وضع کے شایاں تھی نہ اس خاندان سے علاقہ رکھنے والوں کے لئے زیبا تھی۔ (۲)

مولانا رشید الدین خاں علوم دینیہ، فقہ وحدیث اور درسیات کے علاوہ معقولات نیز مناظرہ وکلام کے بھی جید فاضل اور محقق تھے اور ان کے علاوہ اپنے استاذ خاص (مولانا شاہ رفیع الدین کے فیض صحبت سے ریاضی میں بھی بڑا دست قدرت رکھتے تھے۔ عربی تحریر وانشاء میں اپنے معاصرین اور اقران سے ممتاز اور اپنے دور کے نامور عربی انشاء پردازوں میں سے تھے، مولانا اپنی عربی تحریروں میں حضرت شاہ عبدالعزیز کے طرز کی پیروی کرتے تھے اور مولانا کی عربی تحریرات شاہ صاحب کا عکس اور مثنیٰ سمجھی جاتی تھیں۔ مولانا کی اس خوبی اور کمال کا حضرت شاہ صاحب کو بھی اعتراف تھا، ایک موقع پر فرمایا:

"میری تقریر اسماعیل نے لے لی تحریر رشید الدین نے اور تقویٰ محمد اسحاق نے" (۳)

---

(۱) اس فقرہ پر ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم نے یہ ۱۲۴۰ھ ۱۸۲۵ء متعین کیا ہے جو صحیح نہیں، عبدالقادر چیف نے اسی کتاب میں چند صفحات پہلے وضاحت کی ہے کہ انکا دہلی کا سفر جس میں علماء دہلی سے یہ ملاقاتیں ہوئیں تھیں ۲۶ رشوال ۱۲۳۸ھ (۶ رجولائی ۱۸۲۳ء) کو ہوا تھا، دیکھئے علم وعمل ترجمہ وقائع عبدالقادر خاں ص ۱۸۵ جلد اول (کراچی)۔

(۲) ترجمہ وقائع عبدالقادر خاں از مولوی معین الدین افضل گڑھی ص ۲۴۹-۵۰، جلد اول (کراچی ۱۹۷۰ء)

(۳) مقالاتِ طریقت، عبدالرحیم ضیاء ص ۲۳۷۔ (حیدرآباد، ۱۲۹۲ھ)

مدرسہ دہلی یا دہلی کالج کی ملازمت

دہلی کالج اپنی ابتداء اور آغاز کے پہلے تین سال تک دینی مدرسوں کے طرز پر ایک مدرسہ تھا، مولانا رشید الدین خاں مدرسہ کے مدرس اعلیٰ تھے۔ مگر افسوس کہ مدرسہ دہلی کی اس وقت کی خدمات، تعلیمی سفر اور مدرسہ کی سرگزشت کی تفصیل دریافت نہیں، اسلئے یہ بھی معلوم نہیں کہ مدرسہ دہلی میں مولانا رشید الدین کیا کیا خدمات انجام دے رہے تھے، مدرسہ میں مولانا کی تعلیمی تدریسی اور انتظامی مصروفیت کس قدر رہتی تھی، مدرسہ میں کس قدر جماعتوں اور طلبہ نے مولانا سے استفادہ کیا، اس کے کیا نتائج سامنے آئے، دہلی کالج میں مولانا کے طلبہ کی صلاحیت واستعداد کس درجہ کی تھی اور بعد میں ان طلبہ نے کیا خدمات انجام دیں، اس کا کچھ پتہ نہیں ملتا۔ لیکن معلومات واطلاعات کی کمی کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مدرسہ دہلی یا دہلی کالج کے یہی ابتدائی سال اس کے باقی رہنے، علمی ترقی کرنے اور روشن مستقبل کے ضامن بنے، اگر دہلی کالج کو شروع سے مولانا رشید الدین خاں جیسے نامور عالم (اور انکی وفات کے بعد انکے خاص شاگرد اور تربیت یافتہ مولانا مملوک العلی نانوتوی) کا بھرپور تعاون اور سرپرستی حاصل نہ ہوتی تو شاید مدرسہ دہلی یا دہلی کالج کبھی اس طرح ترقی نہ کرسکتا جو اس نے کی، اور وہ شمالی ہند کا سب سے اہم تعلیمی ادارہ سمجھا گیا، مدرسہ دہلی یا دہلی کالج کی تاسیس، توسیع اور اس پر عوام خصوصاً مسلمانوں کے مختلف طبقوں کے بھروسہ اور اس میں اپنے بچوں کی تعلیم کیلئے داخل کرنے کی سب سے بڑی وجہ مولانا رشید الدین خاں اور مولانا مملوک العلی نانوتوی کی اس ادارہ سے وابستگی تھی اور کچھ نہیں۔

مولانا رشید الدین خاں اور مولانا مملوک العلی کی اس کالج سے وابستگی نے مدرسہ دہلی یا دہلی کالج کو جو خاص وقار اور اعتبار بخشا اور اسکے ذریعہ سے ایک نئی طرح کی تعلیمی سلسلہ کی نمود ہوئی اور کالج طویل عرصہ تک علمی تدریسی ادبی تصنیفی خدمات انجام دے سکا۔ اگر اس کالج کو علماء کا بھرپور تعاون اور سرپرستی نصیب نہ ہوئی ہوتی تو مشکل تھا کہ کالج آگے بڑھتا اور دینی علمی دنیا میں کوئی قابل ذکر کام کرسکتا اور اس کو عام مسلمانوں اور

استادوں کا تعاون حاصل ہو جاتا۔

شیعوں کی کتابوں کے جوابات اور اس موضوع پر مولانا کی تصانیف

مولانا رشید الدین خاں نے خاندان حضرت شاہ ولی اللہ کے علماء کی صحبتوں سے علم اور کمال حاصل کیا تھا، ان بزرگوں نے برصغیر ہند میں ہر گوشہ پر دینی خدمات کے نقوش رقم کئے، جس میں سے ایک بڑی خدمت اور خاصا اہم عنوان برصغیر ہند میں شیعیت کے گہرے اور غیر معمولی اثرات کو ختم کرنے، نیز شیعیت کے صحیح چہرہ اور تعلیمات کو عوام کے سامنے پیش کرنے کا تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ اور شاہ عبد العزیز دونوں نے اس منصوبہ پر جس طرح مسلسل کام کیا اور شیعیت پر علمی استدلالی حیثیت سے جو ضرب لگائی اس کی اہمیت و معنویت اور ان کے دلائل کے وزن اور قوت سے صرف نظر کرنا آسان نہیں، بلاشبہ اس موضوع کی جملہ تصانیف میں ازالۃ الخفاء، قرۃ العینین فی تفضیل الشیخینؓ اور تحفہ اثنا عشریہ منفرد تصانیف ہیں۔

مولانا رشید الدین خاں ان کتابوں کے پس منظر، انکے منافع وفوائد، مقبولیت و پذیرائی اور برصغیر میں شیعیت کی ترقی پر ان کتابوں کے اثرات یا ضرب سے اچھی طرح واقف تھے بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، مولانا نے محسوس کر لیا تھا کہ مذکورہ بالا کتابوں کی تصانیف واشاعت سے اگرچہ اس طوفان کے سامنے بند لگ گیا ہے مگر ابھی کئی سوراخ اور گوشے ایسے ہیں جہاں سے شیعیت کے فروغ، ترقی یا علمی اعتراضات کا موقع ہوسکتا ہے، مولانا نے ان راستوں کو بھی بند کرنے کی کوشش کی اور تحفہ اثنا عشریہ کی تصنیف کے بعد اس سلسلۂ بحث میں جو نئے مباحث پیدا ہو گئے تھے اور شیعہ علماء نے جس طرح تحفہ کے مندرجات اور اسکے دلائل کے جوابات لکھنے کی ایک بڑی اور مسلسل مہم کا آغاز کیا تھا (جس میں ضمناً اور پہلو بھی زیر بحث آجاتے تھے) مولانا رشید الدین نے ان جوابات کا ارادہ فرمایا اور شیعہ علماء کی طرف سے اہل سنت کی تردید میں جو کچھ لکھا جا رہا تھا خود کو اس کے جوابات کیلئے گویا وقف کر دیا تھا، مولانا رشید الدین خاں کی اکثر

تصانیف کا یہی موضوع ہے۔اس وقت چونکہ عام علمی تصنیفی زبان فارسی تھی اسلئے مولانا کی اکثر تصانیف بھی فارسی میں ہیں، شیعیت کی تردید اور جواب میں مولانا کی معروف تصانیف کی فہرست درج ذیل ہے:

۱۔ایضاح لطافۃ المقال ۲۔صولت غضنفریہ ۳۔شوکت عمریہ
۴۔عزۃ الراشدین ۵۔جواب نزھۃ اثناعشریہ ۶۔حسام الاسلام
۷۔ردصوارم الٰہیات ۸۔حق المبین ۹۔تفضیل الاصحاب
۱۰۔مکتوبات بنام دلدار علی خاں مجتہد(۱)

دیگر مؤلفات

ردشیعیت کے علاوہ اور موضوعات پر بھی مولانا کی متعدد تالیفات تھیں۔جن میں سے چند یہ ہیں:

(۱) مولانا کی ایک بڑی علمی یادگار (جس کا مولانا کی مؤلفات وتصانیف میں اس وقت تک غالباً کہیں ذکر نہیں آیا) حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے عربی مکتوبات وتحریرات کے ایک مجموعہ کی ترتیب یانقل ہے، یہ مجموعہ بڑے سائز کے ایک سو نوے (۱۹۰) صفحات پر مشتمل ہے۔

(۲) اعانۃ الموحدین واھانۃ الملحدین (رسالہ ردِّ راجہ رام موہن رائے) مولانا کے عہد کے غیر مسلم زعماء میں سے رام موہن رائے نے ہندوستان میں ایک نئے فرقہ یاتحریک کی بنیاد ڈالی تھی ؛ جس میں بعض خیالات ونظریات اسلامی تعلیمات وعقائد سے بھی لئے گئے تھے اور اس تحریک کو برہموسماج کے نام سے موسوم کیا تھا، راجہ رام موہن رائے نے اپنے نظریات کی اشاعت کیلئے فارسی میں دوتین رسالے لکھے تھے، جن کے علمائے اسلام نے جوابات لکھے، مولانا رشید الدین نے بھی اس کی تردید میں ایک رسالہ لکھا، جس کو خاصی شہرت ملی، یہ رسالہ شائع بھی ہوا ہے۔(۲)

(۱) ایضاح لطافت المقال، شوکت عمریہ، صولت غضنفریہ اور عزۃ الراشدین ۱۸۵۷ء سے پہلے چھپ گئی تھیں، ایضاح، شوکت، اور عزۃ کے مطبوعہ نسخے راقم سطور نے دیکھے ہیں اور ان سب کتابوں کا ایک ایک یا دو دو قلمی نسخے خدابخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہیں، تفصیلات کے ملاحظہ ہو مراۃ العلوم (فہرست مخطوطات فارسی) جلد دوم (پٹنہ: ۱۹۴۲ء)

...... باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر......

(۳) معقولات منطق فلسفہ کی متعدد درسیات پر مولانا کے مفصل ومختصر حاشیے یادگار تھے، جن میں سے بعض کی موجودگی کا سراغ ملتا ہے، اسی سلسلہ کی ایک کڑی رسالہ تصریح کا حاشیہ ہے جو شائع ہو چکا ہے۔ (۱)

(۴) ایک اور تالیف شرح تشریح الافلاک کی شرح ہے، یہ شرح مولوی کریم الدین پانی پتی نے دیکھی تھی، پانی پتی نے لکھا ہے کہ:

ایک شرح تشریح الافلاک کی علم ہیئت میں انہوں نے لکھی ہے، بندہ نے بھی اسکی خوب سیر کی، معلوم ہوتا ہے کہ یہ شرح خلاصہ شرح مولوی عصمت (اللہ) سہارنپوری کی ہے جو بہت بڑی ایک شرح ہے، بعد تطبیق عبارت سے معلوم ہوا کہ یہ شرح عصمت سے اس فاضل نے مختصر کی ہے۔ (۲)

مولانا کی ایک اور علمی ادبی یادگار مولانا کے خطوط ہیں، مولانا کی اپنے دوستوں اور معاصر اہل علم سے خط وکتابت رہتی تھی جو اکثر عربی میں ہوتی تھی، یہ خطوط ادب وانشاء کا نمونہ سمجھے جاتے تھے۔ ان مکتوبات میں سے شیخ احمد بن محمد یمانی (مؤلف تحفۃ الیمن) کے نام خطوط ایک مجموعہ کی صورت میں چھپے ہیں۔ (۳) مولانا فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدر الدین آزردہ کے نام چند خط دریافت ہیں۔ (۴) نیز آزردہ کے نام مولانا کا ایک ایک خط

گذشتہ صفحہ کا بقیہ...... نیز ردشیعیت میں مولانا کی ایک ضخیم تالیف کا قلمی نسخہ جو مصنف کے مسودہ سے مولانا نورالحسن کاندھلوی نے نقل کرایا تھا ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے، مگر اسکے ابتدائی صفحات موجود نہیں، اسلئے تحقیق نہیں کہ یہ کونسی کتاب ہے بظاہر صولت الضیغم ہے۔

(۲) اس رسالہ کا ایک قلمی نسخہ جو ۱۲۴۷ھ (۳۲-۱۸۳۱ء) میں مولانا نورالحسن کاندھلوی وفات (۱۲۸۵ھ - ۱۸۶۸ء) نے نقل کیا تھا ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے۔ اور خود راجہ رام موہن رائے کی تالیف رسالہ مناظرۃ الادیان کا بھی ایک نسخہ مولانا نورالحسن کاندھلوی کے قلم سے ۱۲۴۷ھ کا لکھا ہوا موجود ہے۔

(۱) اس کا بھی ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے۔

(۲) تذکرہ فرائد الدہر مؤلفہ ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۷ء ص ۴۰۰ (مطبع العلوم دہلی: ۱۸۴۷ء)

(۳) یہ مجموعہ ''المکاتیب'' کے نام سے مطبع مجتبائی دہلی سے ۱۳۱۱ھ (جنوری ۱۸۹۴ء) میں چھپا تھا۔ اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہے اور ہمارے ذخیرے میں موجود ہے۔

(۴) مفتی صدرالدین آزردہ اور مولانا فضل حق خیرآبادی کے نام خطوط مولانا خیرآبادی کی بیاضوں میں درج ہیں۔

...... باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر......

مولوی کریم الدین نے فرائد الدھر میں اور سر سید احمد نے آثار الصنادید میں نقل کیا ہے۔

مولانا کے چند فتاویٰ بھی ملے ہیں جن میں سے بیشتر فارسی میں ہیں، فقہی اختلافی موضوعات پر ایک دو تقریریں بھی موجود ہیں جو عربی میں ہیں۔ یہ مولانا کے معلوم علمی دینی ادبی آثار کا مختصر تعارف ہے، تلاش کیا جائے تو مولانا کی اور بھی متعدد تالیفات و تحریرات ملیں گی۔

مولانا کے چند تلامذہ

حضرت مولانا تقریباً پینتیس چھتیس سال تک درس و تعلیم میں مشغول رہے جس کے آخری تقریباً دو سال مدرسہ دہلی یا (دہلی کالج) کے عہدۂ صدارت پر گزرے، مگر اس دور کے اکثر علماء کی طرح مولانا کے بھی بہت کم شاگردوں کے نام معلوم ہیں۔ راقم سطور کو مولانا کے صرف دس شاگردوں کے نام ملے ہیں، جو یہ ہیں۔

(۱) مولانا مملوک العلی نانوتوی (۱)

(۲) مولانا حیدر علی فیض آبادی (۲)

(۳) مولانا قاری عبد الرحمان پانی پتی (۳)

(۴) مولانا محمد مظہر نانوتوی (۴)

(۵) مولانا احمد سعید بن ابو سعید دہلوی (۵)

گذشتہ صفحہ کا بقیہ...... یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ راقم نے مولانا کی دو بیاضوں سے استفادہ کیا ہے جن میں سے ایک معروف بیاض تو وہ ہے جو حکیم نصیر الدین صاحب (نصرتی دواخانہ کراچی) کے ذخیرہ میں ہے، اس نسخہ کا مکمل فوٹو اسٹیٹ (جو اصل سے لیا گیا ہے) راقم سطور کے ذخیرہ میں ہے، اس کا ایک اور عکس جو چھوٹا کر کے لیا گیا ہے اور صاف بھی نہیں ہے کئی جگہوں سے پڑھا نہیں جاتا ڈاکٹر مہر النساء کی کتاب العلامہ فضل حق خیر آبادی حیاتہ و مآثرہ مع تحقیق کتاب الثورۃ الھندیۃ (لاہور: ۱۴۰۶ھ) میں شامل ہے۔

دوسری ایک بیاض اور ہے جو راقم سطور کی نظر سے گزری ہے اس کا بھی عمدہ فوٹو اسٹیٹ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

(۱) نزھۃ الخواطر ص ۵۰۱-۵۰۲ ج ۷۔ (۲) نزھۃ الخواطر ص ۱۵۶-۱۵۷ ج ۷۔

(۳) نزھۃ الخواطر ص ۲۴۵-۲۴۶ ج ۸۔ (۴) نزھہ ص ۴۵۵ ج ۸

(۵) نزھہ ص ۴۱ ج ۷

(۶) مولانا کریم اللہ دہلوی (۶)

(۷) مولانا محمد شکور مچھلی شہری (۷)

(۸) سید محمد حکیم دہلوی (۸)

(۹) قاری یوسف بن مظہر علی دہلوی (۹)

(۱۰) مولانا کرامت علی موسوی دہلوی (۱۰)

مولانا کے صاحبزادگان

مولانا کی اولاد کی تفصیل مجھے نہیں ملی، تاہم چار بیٹوں کے نام ملتے ہیں، مگران کے بھی مفصل احوال بلکہ سنین وفات بھی دستیاب نہیں۔

مولانا سدید الدین خاں، مولانا مؤید الدین خاں، مولانا امین الدین خاں اور مولانا سلیم الدین خاں۔

مولانا سدید الدین خاں نے چند کتابیں اپنے والد ماجد سے اور اکثر درسیات مولانا مملوک العلی سے پڑھیں، جید عالم، نامور فاضل اور مشہور مدرس تھے، دہلی کالج میں مدرس تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مدرسہ عالیہ رامپور میں استاد مقرر ہو گئے تھے، مختصر تالیفات علمی یادگار ہیں، حضرت شاہ عبدالعزیز کی صحبتوں سے مستفید تھے اگرچہ مولانا کے شاہ صاحب سے تلمذ کی صراحت نہیں ملی لیکن عبدالرحیم ضیاء حیدرآبادی نے مولانا مؤید الدین کے حوالہ سے حضرت شاہ صاحب کے متعدد واقعات نقل کئے ہیں۔ مولانا حیدرآباد دکن میں جوڈیشیل (JUDICIAL) سکریٹری تھے۔ تشخیص القال کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی مولانا مؤید الدین کے بیٹے مولانا محی الدین بھی جید عالم تھے، جو حیدرآباد ہائی

---

(۶) نزھہ ص ۴۰۷-۴۰۸ ج ۷

(۷) نزھہ ص ۴۵۵ ج ۷

(۸) نزھہ ص ۴۲۰ ج ۷

(۹) وصال الجمیل شاہ امان الرحمان دہلوی ص ۷ (دہلی ۱۳۴۳ھ)

(۱۰) مقالاتِ طریقت عبدالرحیم ضیاء حیدرآبادی ص: ۵۴۰ (حیدرآباد دکن ۱۲۹۲ھ)

کورٹ میں جج کے عہدہ پر فائز رہے۔ مولانا محی الدین کی ایک بڑی دینی علمی خدمت ''تیسیر الوصول الی جامع الوصول'' (۱) کا اردو ترجمہ ہے، جو تلخیص الصحاح کے نام سے چھ جلدوں میں چھپا ہے، اور بھی تالیفات یادگار ہیں۔

مولانا مؤید الدین کا مولانا عبدالحیٔ حسنی نے مولانا محی الدین کے مختصر تعارف میں ضمناً ذکر کیا ہے۔ (۲)

مولانا سلیم الدین خاں کی آخری عمر دہلی میں گزری اور جب مولانا عبدالحیٔ حسنی رجب ۱۳۱۲ھ (جنوری ۱۸۹۵ء) میں دہلی پہنچے تو مولانا سلیم الدین کی وفات کو دو مہینے ہو چکے تھے۔ (۳) مولانا سلیم الدین کے ایک بیٹے مولوی رضی الدین خاں خطاطی کے بلند پایہ استاذ تھے، مولوی رضی الدین خاں کی غالباً رمضان المبارک ۱۳۰۷ھ (مئی ۱۸۹۰ء میں وفات ہوئی، مولوی رضی الدین کی وفات پر سرسید احمد نے لکھا تھا کہ ان کی وفات سے دہلی ایک بے مثل صاحب کمال سے خالی ہوگئی۔ (۴)

مولانا رشید الدین کا صحیح سنہ وفات

مولانا تعلیمی تدریسی خدمات میں منہمک تھے کہ ۱۲۴۲ھ (جون ۱۸۲۷ء) میں حج کا شوق غالب ہوا، کالج سے رخصت بھی مل گئی تھی، سفر کی تیاری مکمل تھی کہ اچانک بیمار ہوگئے، علالت کا سلسلہ دراز ہوا، بیماری نے نازک صورت اختیار کر لی اور یہی مرضِ موت بن گیا، علاج کیلئے ہر ممکن تدبیر کی گئی، مگر وقت آچکا تھا اجل کے مصمم فیصلہ کے سامنے کسی کی کچھ نہ چلی اور مولانا اسی بیماری میں محرم الحرام ۱۲۴۳ھ (جولائی ۱۸۲۷ء) کو انتقال فرما گئے رحمۃ اللہ علیہ۔

(۱) یہ ترجمہ پہلی مرتبہ مطبع صدیقی لاہور سے ۱۳۱۹ھ سے ۱۳۲۲ھ تک شائع ہوا تھا۔ اس طباعت کا ایک نسخہ ہمارے ذخیرے میں موجود ہے۔

(۲) نزھۃ الخواطر ص ۴۷۰ ج ۸ (حیدرآباد دکن، ۱۴۰۲ھ)

(۳) دلی اور اس کے اطراف، ص ۵۶ (دلی، ۱۹۵۸ء)

(۴) سرسید کی تعزیتی تحریریں، مرتبہ اصغر عباس ص ۹۱ (علی گڑھ، ۱۹۸۹ء)

اس تاریخ وفات کی ایک معاصر، معتبر اور قریب ترین ذریعہ سے تصدیق و تحقیق ہو رہی ہے، مولانا فضل حق خیر آبادی جو مولانا رشید الدین خاں سے روابط (بلکہ عقیدت و نیاز مندی) کا تعلق رکھتے تھے، اس وقت دہلی میں تھے، اس وقت مولانا خیر آبادی نے شیخ احمد بن محمد یمنی کو جو خطوط لکھے ان میں مولانا رشید الدین خاں صاحب کی علالت، مرض کی شدت اور وفات کا ذکر ہے۔

پہلا خط جس میں مولانا کی سخت بیماری کا ذکر آیا ہے ۷/ذی الحجہ ۱۲۴۲ھ کا لکھا ہوا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا رشید الدین نہایت کرب و بے چینی اور شدید مرض میں مبتلا ہیں، مرض کی صحیح تشخیص نہیں ہو سکی، اطباء اور معالجین کی الگ الگ رائے ہے اور دونوں علاج سے عاجز ہیں لکھا ہے کہ:

"ومما اقلق الادواء ابتلا مولانا المطاع، المولوی رشید الدین خاں بمعضل الداء فی مداویه فقد عجز الاطباء واضطرب بسوء حالاته الاحیاء، وتحیّر فی تشخیص مرضه حذاق الاساة فمنهم من یقول ام العلة ما تولد فی الکلیة من الحصاة، ومنهم من یقول انها عسر البول لاجل الرماح البواسیرة، وذٰلک رائی اکثر اهل الحصاة و لکن علاج الفریقین لا یشفی من العاهة" (۱)

ترجمہ: مولانا رشید الدین خاں بیماری میں مبتلا ہیں اور اسکے علاج کی تدبیر میں ناکام ہیں، انکے علاج سے اطباء عاجز ہو گئے ہیں۔ مولانا کی نازک کیفیت کی وجہ سے اکثر احباب اور اعزاء بھی پریشانی میں مبتلا ہیں، انکے مرض کی تشخیص میں حاذق طبیب بھی حیران ہیں، اطباء میں سے کچھ کہتے ہیں کہ بنیادی مرض گردوں میں پتھری کا پیدا ہو جانا ہے، کچھ یہ کہتے ہیں کہ یہ عسرِ بول کی شکایت ہے جو ریاحی بواسیر کی وجہ سے ہے اور یہی اکثر متعلقین کی رائے ہے، لیکن دونوں طبیبوں میں سے کسی کے علاج سے مرض کو شفا نہیں ہوئی۔

دوسرے خط میں مولانا کی وفات کی اطلاع اور مولانا خیر آبادی کے رنج و الم کا ذکر ہے، اس خط سے تأثر ملتا ہے کہ حادثہ بالکل تازہ ہے، غالباً یہ خط مولانا رشید الدین کی وفات

(۱) مکتوب مولانا خیر آبادی ۷/ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ (۷/جون ۱۸۲۷ء) بیاض خیر آبادی، ورق ۱۱-الف

کے دن یا اسکے ایک دو دن کے بعد لکھا گیا ہے۔اس سے مولانا کی مولانا رشید الدین خاں کی وفات پرغم کی شدید کیفیت (اور مولانا خیرآبادی کے مولانا رشید الدین سے نہایت گہرے بلکہ ارادت مندانہ تعلقات) کا اظہار ہوتا ہے،مولانا خیرآبادی نے لکھا ہے:

"وقدصرع الاسماع حال التحرير خبر وفاة الرشيدالنحرير فاجرت عيون الاعيان عيون العبرات حزناواوجب اهل السنة لمصاب ذٰلک الامام ما...... الشيعة فی هٰذه الايام،من وفور الآ لام بذكرهم الاما مين حسنا حسينا،وكاد فوادی الكليم ان ينفطربهذالبلاء العظيم والخطب الجسيم،كان والله مرشداً رشيداً و رء وفا بالطالبين رحيماً، تغمدة الله بر حمة رضوانه واسكنه بكرمه فسيح جنانه "(۱)

یہ خط ۱۴/محرم الحرام ۱۲۴۳ھ (۸/اگست ۱۸۲۷ء) کا لکھا ہوا ہے اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ مولانا رشید الدین کی شاید اسی دن یا اس سے ایک دو دن پہلے وفات ہوئی ہوگی،تیسرا خط جو احمد بن محمد یمنی کے خط کے جواب میں ہے،اس میں مولانا خیرآبادی نے مولانا رشید الدین کی وفات کی خبر پر یمانی کی تعزیت کا یوں ذکر فرمایا ہے:

مکتوبہ ۱۴/جمعہ محرم الحرام ۱۲۴۳ھ (۸/اگست ۱۸۲۷ء)

"فاماماشارمولانااليه من التحسرلوفات مولاناالمو لوی رشيد الدين خاں والتأسف عليه،فانه من ادهی الارذاء والخطوت،واشجی الدوا هی والكروب لايدع ان يلطم له الخدود وتشق له الخيوب،بل ان ينفطو له الاكباء و يتصدع له القلوب،فالنوح ان كان مفروض على مثل ذاک السندب المندوب ، فبا لله ای حنو ذئب وفات وای خير ذهب له الوفات "

(۱) بیاض مولانا خیرآبادی ورق ۱۲-الف

باب (۵)

دہلی کالج کا پس منظر اور قیام

مدرسہ غازی الدین حیدر سے دہلی کالج تک

پہلا نام مدرسہ دہلی، ابتدائی مدرسین، نظام تعلیم اس کے طریقۂ تعلیم

پر مشرقی مدارس کا اثر، مغربی اثرات سے بڑی حد تک حفاظت

مشرقی شعبہ کا مغربی شعبہ سے امتیاز اور متعلقات

مولانا مملوک العلی دہلی کالج میں

تذکرہ آچکا ہے کہ مولانا مملوک العلی ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۵ء) سے پہلے تعلیم حاصل کرنے کیلئے دہلی آئے تھے، دہلی میں تعلیم حاصل کی مگر تعلیم سے کب فارغ ہوئے اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد کیا مشغلہ رہا، یہ اوقات دہلی میں گذرے تھے یا وطن میں، کچھ معلوم نہیں، تعلیم کے زمانہ میں دہلی میں قیام کے بعد مولانا مملوک العلی کی دہلی مٰیں موجودگی کی پہلی معتبر اطلاع دہلی کالج میں نائب مدرس اول کے عہدہ پر مولانا کے تقرر اور مولانا کے اس خدمت کو منظور کرنے سے ملتی ہے۔ دہلی کالج کی ملازمت کی منظوری سے معلوم ہو رہا ہے کہ مولانا مملوک العلی دہلی کالج کے افتتاح سے کچھ دن پہلے سے دہلی میں موجود ہونگے اور شروع شوال ۱۲۴۰ھ (مئی ۱۸۲۵ء) میں یقیناً دہلی آگئے ہوں گے۔

دہلی کالج کا پس منظر اور تحریک

مگر خود دہلی کالج کیا تھا اس کے قیام کے محرکات، اس کی تاریخ اور اس کا علمی تعلیمی پس

منظر کیا ہے، اس کے نصاب تعلیم میں علوم شریعت (حدیث فقہ وغیرہ) کی تعلیم کا کس قدر حصہ تھا اور یہ کالج (شمالی ہندوستان میں انگریزوں کے نظام تعلیم کا سنگ میل اور بنیادی پتھر ہونے کے باوجود) مغربی تعلیم کے دیگر اداروں اور کالجوں سے کس حد تک مختلف تھا، مولانا مملوک العلی کے مدرسہ دہلی یا دہلی کالج کے دورِ ملازمت کا ذکر کرنے سے پہلے ان عنوانات ومحرکات کا کچھ تذکرہ ضروری ہے۔

لارڈ منٹو، وائسرائے ہند نے ۱۸۱۱ء ۱۲۲۶ھ میں ایک طویل یادداشت لکھ کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے مالکان کو بھیجی تھی جس میں یہ لکھا گیا تھا کہ علم کا روز بروز زوال ہو رہا ہے، ہندو مسلمانوں میں تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے جھوٹی گواہی دھوکہ بازی (اور جعل سازی) کے جرائم بڑھ رہے ہیں اس لئے سفارش کی گئی تھی کہ ہندوستان میں تعلیم پر زیادہ رقم خرچ کی جائے اور کئی کالج قائم کئے جائیں۔ لارڈ منٹو کی اس یادداشت کے بعد کمپنی نے ۱۸۱۳ء میں ایک کمیٹی بنائی اس کمیٹی کے سامنے بڑے بڑے انگریزوں کی شہادتیں ہوئیں اور کمیٹی کی سفارش پر پارلیمنٹ میں ایک قانون پیش کیا گیا جس میں کمپنی کے دورِ حکومت میں پہلی مرتبہ ہندوستانیوں کو تعلیم دینے کی تجویز تھی، یہ قانون منظور ہوا اور اس کی روشنی میں ہندوستانیوں کی تعلیم کیلئے ایک لاکھ روپے کی رقم مختص کی گئی، اور طے کیا گیا کہ محروسہ ہند میں تعلیم کی ترقی، ادب کے احیاء وترقی اور سائنسی تعلیم عام کرنے کیلئے کم سے کم ایک لاکھ روپے خرچ کئے جائیں (۱) مگر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کے الفاظ میں:

''یہ سالانہ رقم منظور تو ہوگئی لیکن دس برس تک ایک پیسہ بھی اس مد پر خرچ نہیں ہوا''۔ (۲)

---

(۱) تفصیلات کیلئے ملاحظہ ہو: الف: تاریخ التعلیم میجر باسو (Major B. D. BASU) اردو ترجمہ: وارث سرہندی ص: ۳۲ تا ۳۹ (کراچی: ۱۹۷۶ء)

ب: مسلمانوں کا روشن مستقبل، مولوی طفیل احمد منگلوری ص ۱۳۲ - ۱۳۳ (طبع اول بدایوں ۱۹۳۸ء) نیز ص ۱۴۱ - ۱۴۰ (طبع دوم، بدایوں ۱۹۳۹ء)

ج: مرحوم دہلی کالج، مولوی عبدالحق ص ۴ - ۶ (طبع دوم، دہلی: ۱۹۴۵ء)

(۲) ماسٹر رام چندر تالیف: ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی مقدمہ از خواجہ احمد فاروقی ص ۱۱ (دہلی: ۱۹۶۱ء)

دہلی کا تعلیمی جائزہ اور دہلی میں ایک کالج قائم کرنے کا فیصلہ

بالآخر انگریز حکمرانوں کو اس اہم ضرورت کا خیال آیا اور ۱۷؍جولائی ۱۸۲۳ء کو مجلس تعلیم عامہ (Genral Committee of Public instruction) کی تشکیل کی گئی، اور یہ ایک لاکھ کی رقم اسکے تصرف میں دیدی گئی، اس کمیٹی کا سکریڑی ولسن (Dr.Horace. Hyman Wilson) کو مقرر کیا گیا، جو مشرقی علوم کا حامی تھا۔ اس کمیٹی نے برطانوی علاقوں کا تعلیمی جائزہ لینے کیلئے ایک گشتی مراسلہ دہلی آگرہ اور دوسرے مقامات کی مقامی مجلسوں کے نام جاری کیا، جس میں ان اضلاع کے تعلیمی حالات دریافت کئے گئے تھے اور یہ بھی معلوم کیا گیا تھا کہ ان اضلاع میں تعلیم کی ترقی اور توسیع کیلئے کیا کیا وسائل وذرائع اختیار کئے جاتے ہیں، ان اضلاع کے قصبات و دیہات میں کون کون سے مکتب یا تعلیم گاہیں ہیں، ان میں کس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے اورکون کون سی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور ان میں سے کون کون سے مدارس سرکاری امداد کے مستحق معلوم ہوتے ہیں اور اس امداد کی کونسی صورت زیادہ مناسب اور بہتر ہوگی۔

ان سب امور کے بیان کرنیکے بعد یہ اطلاع بھی دی گئی تھی کہ گورنمنٹ کا منشاء دہلی میں ایک کالج قائم کرنیکا ہے، نیز کمپنی نے یہ خواہش بھی ظاہر کی تھی کہ اگر ان مقامات میں ایسے اوقاف موجود ہوں جو تعلیمی اغراض کیلئے کام آسکیں تو ان سے بھی مطلع کیا جائے۔

دہلی کی تعلیمی کمیٹی کے سیکریٹری جوزف ہنری ٹیلر (۱)(J. H. Taylor) نے اپنا مفصل جواب جنوری ۱۸۲۴ء (جمادی الاول ۱۲۳۹ھ) میں کمیٹی کو بھیجا، جس میں اس نے دہلی کے حوالہ سے تعلیم کے مختلف امور پر بحث کی، مولوی عبدالحق نے اس کا خلاصہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

اس میں اس کا ذکر تھا کہ کچھ دنوں پہلے متعدد درسگاہیں حکومت وقت کی طرف سے قائم تھیں لیکن اب وہ نہایت خراب وخستہ حالت میں ہیں۔ انکے مصارف کیلئے جو انتظام تھا وہ سیاسی

(۱) سکریٹری کا نام اکرام چغتائی صاحب نے فریڈرک ٹیلر لکھا ہے ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۲۰۲ جو صحیح معلوم نہیں ہوتا۔

انقلاب کی وجہ سے درہم برہم ہوگیا اور اب ان رقوم کا پھر سے حاصل کرنا امکان سے باہر ہے، دہلی میں سرکاری درسگاہ کے قیام کے متعلق مقامی مجلس نے لکھا ہے کہ اس امداد کیلئے ساڑھے تین ہزار روپے سالانہ کی گنجائش نکل سکتی ہے اور کچھ دنوں بعد اس میں اضافہ بھی ممکن ہے۔ اس مجلس نے یہ بھی لکھا کہ دہلی جیسے آباد شہر میں ایسے اشخاص کی خاصی بڑی تعداد موجود ہے جو کسی زمانے میں بہت مرفہ حال تھے لیکن سیاسی تغیرات کی وجہ سے اب نانِ شبینہ کے محتاج ہیں، مگر اس پر بھی وہ کسی ادنیٰ پیشے کو اختیار کرنا باعث ننگ و عار سمجھتے ہیں، اسلئے اگر مجوزہ کالج قائم ہوگیا تو اس قبیل کے بعض لوگ اسکی طرف مائل ہونگے، تا کہ تعلیم پاکر عزت سے بسر کرسکیں (۱)

مسٹر ٹیلر نے اپنی رپورٹ میں مدرسہ غازی الدین خاں کا خاص طور سے ذکر کیا اور لکھا کہ اس کی عمارت بوسیدہ ہے اور تعلیم کا حال بھی اچھا نہیں ہے۔ (۲)

کمپنی کے حکام نے یہ رپورٹ اپنی سفارش کے ساتھ کمپنی کے مالکان کو بھیجی وہاں سے غازی الدین خاں کے مدرسہ کی مرمت کیلئے سات ہزار ایک سو پندرہ روپے کی منظوری اور یہ ہدایت آئی کہ اس عمارت میں ایک کالج کھولا جائے جہاں شرفاء کی اولاد کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا جائے، اس حکم کی تعمیل میں ایک کالج کا افتتاح ہوا، جس کا نام مدرسہ دہلی یا دہلی کالج رکھا گیا۔

---

(۱) مرحوم دہلی کالج ص ۴-۵

(۲) اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے مالک رام صاحب نے لکھا ہے:

''کمیٹی نے غازی الدین خاں کے مدرسہ کا خاص طور پر ذکر کیا اور لکھا کہ اس مدرسہ کی حالت بہت خراب ہے، اس کی عمارت بوسیدہ اور مرمت طلب ہے اور تعلیم کا حال اس سے بھی بُرا، اس وقت اس میں صرف نو طالب علم ہیں جن کی تعلیم کے لئے ایک مدرس مقرر ہے''

اور اس عبارت کے لئے مرحوم دہلی کالج کا حوالہ دیا ہے۔ قدیم دہلی کالج ص ۲۴ (دہلی: ۱۹۷۶ء) مگر یہ الفاظ مرحوم دہلی کالج میں موجود نہیں ہیں۔ مولوی عبدالحق نے صرف یہ لکھا ہے کہ:

''البتہ مسٹر ایچ ٹیلر کی رپورٹ سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۲۴ء میں مدرسہ غازی الدین میں صرف نو طالب علم تھے اور مولوی عبداللہ ان کو تعلیم دیتے تھے۔''

عبدالحق کے الفاظ سے محسوس ہوتا ہے کہ اصل رپورٹ انکے سامنے ہے۔ اسلئے عبدالحق کی اطلاع پر اعتماد کیا جانا چاہئے۔ (مرحوم دہلی کالج ص ۳ دہلی: ۱۹۴۵ء)

مدرسہ غازی الدین خاں کی تاریخ تعمیر اور اس کا جائے وقوع

مدرسہ غازی الدین خاں اس زمانہ میں ایک اہم اور مشہور تعلیمی مرکز تھا، یہ مدرسہ ۱۷۹۲ء (۷-۱۲۰۶ھ) میں اجمیری دروازے کے باہر، عالم گیر ثانی کے وزیر غازی الدین خاں نے قائم کیا تھا (۱) جو ایک عرصہ تک اپنے بانی کے نام سے موسوم رہا۔ ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی نے مدرسہ غازی الدین خاں میں زیر تعلیم موضوعات، مدرسہ کی شہرت واہمیت اور اس کے خاص محل وقوع کا مفصل ذکر کیا ہے، تحریر ہے:

یہاں عربی وفارسی، قرآن وتفسیر، حدیث وفقہ، ہیئت ونجوم اور دیگر رسمی علوم کا درس دیا جاتا تھا۔ دہلی کی علمی زندگی میں مدرسہ خاص اہمیت رکھتا تھا، تھوڑے ہی عرصہ میں اس نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں شہرت حاصل کرلی تھی اور دور دور سے لوگ یہاں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آیا کرتے تھے۔ اسے شہر کی ہنگامہ خیز فضا سے ہٹا کر شہر پناہ کے باہر اس خیال سے قائم کیا گیا تھا کہ عام زندگی کا شور وشغب تحصیل علم میں حارج نہ ہو اور دراصل اپنے علمی ماحول کی بنا پر ہی اس مدرسہ کو خاص قدر ومنزلت حاصل ہوئی، آج بھی علمی اداروں کیلئے اس قسم کا ماحول سازگار سمجھا جاتا ہے، دہلی میں شاید پہلا ادارہ تھا جو اس خیال کے پیش نظر قائم کیا گیا تھا۔ (۲)

دہلی کالج کے افتتاح سے ایک سال پہلے تک مدرسہ غازی الدین حیدر میں تعلیم جاری تھی مگر اس تعلیم اور طلبہ کی تعداد کو اسکی پرانی عظمت وشان سے کچھ مناسبت نہیں تھی، جی ایچ ٹیلر کی اطلاع کے مطابق ۱۸۲۴ء (۱۲۳۹ھ) میں اس مدرسہ میں صرف نو طالب علم تھے جو ایک گمنام عالم مولوی عبداللہ سے پڑھتے تھے۔ (۳)

سرسید احمد خاں نے آثار الصنادید میں مدرسہ غازی الدین خاں کا تفصیلی تعارف کرایا ہے اور اس کی کشادگی، حسن وزیبائش اور پختگی کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ

---

(۱) سیر المنازل مرزا سنگین بیگ، تحقیق وترجمہ، ڈاکٹر شریف احمد قاسمی ص ۱۱۹ (دہلی: ۱۹۸۲ء)

(۲) رام چندر ص ۱۶ (دہلی: ۱۹۶۱ء) نیز ملاحظہ ہو: آثار الصنادید، سرسید احمد خاں باب سوم ص ۷۰ (مطبع سید الاخبار دہلی: ۱۸۴۷ء)

(۳) مرحوم دہلی کالج ص ۳

انگریزوں نے اسکو منہدم کرانے کا فیصلہ کیا تھا اور اس فیصلے پر عمل بھی شروع ہوگیا تھا، مگر اس کی عمارت ایسی مضبوط نکلی کہ جب تک گز بھر دیوار ٹوٹی، کئی کدالیں ٹوٹ گئیں اور مزید خرچ علیحدہ ہوا، اسلئے اسکے تڑوانے کا خیال بدل گیا اور بعد میں اس میں دہلی کالج قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ سرسید احمد کے الفاظ میں:

''اس کا انہدام موقوف کر کے ایک خندق اس کے گرد کھود کر اس کو شہر میں لے لیا اور سرکار انگریزی نے اسکو طالب علموں کی تعلیم کے واسطے پسند کیا، چند مدرس عربی اور فارسی اور شاستری کے اس میں مقرر کردیئے''(۱)

جب کالج کے مغربی اور مشرقی شعبے ایک جگہ ہوگئے تو شاید مدرسہ غازی الدین خاں کی عمارت ناکافی ہوگئی تھی یا کسی اور وجہ سے اس کام کیلئے ناموزوں خیال کی گئی، اس لئے مدرسہ دہلی (دہلی کالج) اجمیری دروازے سے کشمیری دروازے پر کتب خانہ دارالشکوہ میں منتقل کردیا گیا جو ۱۸۵۷ء تک وہیں رہا۔(۲)

مدرسہ دہلی (دہلی کالج) کا افتتاح اور مولانا مملوک العلی کا نائب مدرس اعلیٰ کیلئے انتخاب

ٹیلر کی دہلی میں ایک کالج قائم کرنے کی سفارش منظور کرلی گئی اور اس رپورٹ کے مطابق دہلی میں ایک کالج قائم کرنے کا فیصلہ ہوا اور یہی مسٹر ٹیلر جنھوں نے رپورٹ پیش کی تھی، اس کالج کے عارضی پرنسپل اور سپرنٹنڈنٹ نامزد کئے گئے، مدرس اعلیٰ اور نائب مدرس کا بھی تقرر ہوا۔ مدرس اعلیٰ کے عہدہ پر (حضرت شاہ عبدالعزیز کے خاص شاگرد، ہندوستان کے نامور عالم اور مدرس) مولانا رشید الدین خاں مقرر کئے گئے، مولانا کی تجویز اور مشورہ کے مطابق نائب مدرس اول کیلئے مولانا مملوک العلی کا نام منظور ہوا، تین مدرس اور رکھے گئے۔

(۱) آثار الصنادید سرسید احمد باب سوم ص ۷۰-۷۱ طبع اول: (مطبع سیرت الاخبار دہلی: ۱۲۶۳ھ-۱۸۴۷ء) نیز باب سوم ص ۳۱ (مطبع نول کشور لکھنؤ: ۱۳۱۸ھ-۱۹۰۰ء) یہ دونوں اشاعتیں کم یاب بلکہ نادر ہیں۔

(۲) یہ عمارت کشمیری گیٹ کے بڑے ڈاکخانہ سے متصل گرو گوبند سنگھ اندر پرستھ یونیورسٹی کے احاطہ میں گیٹ کے بالکل سامنے واقع ہے۔ اصلاً یہ دارا شکوہ کی لائبریری کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں اب محکمۂ آثار قدیمہ کا میوزیم ہے۔

پرنسپل کی ابتدائی تنخواہ ایک سو پچھتر روپے، مدرس اعلیٰ کی سو روپے، دو بڑے مدرسین کی تنخواہ پچاس پچاس روپے اور عام مدرس کی تنخواہ پچیس روپے تھی۔

اس ادارہ کا پہلا نام

اگرچہ سرکاری رپورٹوں اور کاغذات میں اس ادارہ کو دہلی کالج کے نام سے موسوم کیا گیا تھا، مگر دہلی کے عوام وخواص اور علمی حلقوں میں اس کی شہرت مدرسہ دہلی کے نام سے تھی۔ مرزا سنگین بیگ، سر سید احمد، نیز مولوی کریم الدین پانی پتی نے جو دہلی میں مقیم تھے اور اس مدرسہ کے پس منظر سے ذاتی طور سے واقف اور اس کے آغاز کے وقت سے اس کے تقریباً تمام واقعات وحالات کے دیکھنے والے معتبر راوی ہیں۔ اس کا نام مدرسہ دہلی لکھا ہے، نیز انگریز افسران نے اس ادارہ کیلئے نواب اعتماد الدولہ (ضیاء الملک فضل علی خاں بہادر سہراب جنگ) کا ایک لاکھ ستر ہزار روپے کا فیاضانہ اور گراں قدر عطیہ ملنے پر جو کتبہ مدرسہ غازی الدین میں ۱۸۲۹ء میں نصب کرایا تھا، اس میں بھی اس کا مدرسہ ہی نام لکھا ہے، نئے کالج کا آغاز بھی ایک بڑے دینی اسلامی مدرسہ کی طرح ہوا تھا، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے بھی اس نقطۂ نظر سے اتفاق کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

"صاف ظاہر ہے کہ ابتداء میں دہلی کالج کا مقصد بھی اور مدارس کی طرح خصوصیت سے عربی زبان اور قانون سکھانا تھا۔ (۱)

اس کی تاریخ افتتاح بھی یہی بتا رہی ہے کہ شروع شروع میں اس کا تصور صرف ایک مدرسہ کا تھا جس نے بعد میں توسیعی صورت اور کالج کا روپ اختیار کیا۔ رمضان المبارک کے بعد شوال کے دوسرے ہفتہ میں مدارسِ اسلامیہ کی ترتیب پر اس کا افتتاح کرنے سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت یہ خاص دینی، مذہبی مدرسہ تھا، اگرچہ اس کے نگرانِ اعلیٰ انگریز تھے اور تنخواہ وغیرہ کا انتظام بھی انہی کے ہاتھوں میں رہا۔

نیز متعدد شواہد اس کی تائید کر رہے ہیں کہ ابتداء میں اس پر دینی اثرات خاصے گہرے تھے، مثلاً دلی کالج کے شروع ہونے کے تین سال بعد جب پہلی مرتبہ انگریزی کی

(۱) مقدمہ (تالیف ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی) از ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ص ۱۳

کلاسیں شروع کی گئیں تو ان کا آغاز بھی مدرسوں کے معمول کی طرح شوال ۱۲۴۳ھ (اپریل ۱۸۲۸ء) (۱) میں ہوا تھا اور مولانا رشید الدین خاں کے انتقال کے کئی سال بعد مولانا مملوک العلی کے صدر مدرس کے عہدہ پر ترقی کا بھی رمضان ہی میں فیصلہ ہوا تھا۔ غالبًا یہ سب اسی خیال سے ہوتا تھا کہ نئے تعلیمی سال میں (جو اسلامی مدارس میں رمضان المبارک کے فوراً بعد شوال سے شروع ہوتا ہے) کلاسوں کا نظام درست ہو جائے اور تعلیمی وانتظامی سلسلہ بھی صحیح رہے۔

مدرسہ کے نظام اور طریقۂ تعلیم میں تبدیلی اور مغربی شعبہ کی ابتداء

مدرسہ دہلی (دہلی کالج) کے افتتاح کے وقت ہی اس میں زبان، سائنس اور ضروری علوم وفنون کی تعلیم وترقی کا بڑا منصوبہ شامل تھا مگر اس وقت تک کوئی واضح طریقۂ عمل سامنے نہیں تھا۔ کالج کی ابتداء ایک مدرسہ کی طرح ہوئی تھی اور تین سال تک اس کی یہی ترتیب رہی، مدرسین کی تعداد میں اضافہ ہوا، نہ نصاب تعلیم پر نظر ثانی کی گئی، مذہبی تفریق بھی نہیں تھی، شیعہ، سنی، مسلم، غیر مسلم ایک جماعت میں ایک استاد سے پڑھتے تھے۔ تین سال کے بعد اپریل ۱۸۲۸ء (شوال ۱۲۴۳ھ) میں پہلی مرتبہ انگریزی جماعت کا اضافہ ہوا، اور ایک اور قابل ذکر تبدیلی یہ ہوئی کہ ہیئت اور ریاضی کی مغربی اصولوں کے مطابق تعلیم دی جانے لگی (۲) مگر انگریزی کی تعلیم کا معیار معمولی تھا اور پہلے سال میں انگریزی جماعت کے امتحان کے نتیجے بھی اچھے نہیں تھے۔ خواجہ احمد فاروقی نے لکھا ہے کہ:

''اس سال کے امتحانات کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کالج میں انگریزی کی تعلیم ثانوی حیثیت سے ہوتی تھی، جس کا معیار بہت معمولی تھا''۔ (۳)

انگریزی تعلیم کی اس کیفیت کو دیکھ کر تعلیم عامہ کی جنرل کمیٹی نے سفارش کی کہ انگریزی کی جماعتیں (مدرسہ دہلی سے) علیحدہ قائم کی جائیں اور انگریزی زبان سائنس اور ادب کی تعلیم کے لئے آٹھ سو (۸۰۰) روپے ماہوار منظور کئے جائیں۔ حکومت نے بھی

(۱) رام چندر: تالیف صدیق الرحمن قدوائی، ص ۱۷ (دہلی: ۱۹۶۱ء)
(۲) مرحوم دہلی کالج ص ۱۱۸ (دہلی: ۱۹۴۵ء) (۳) مقدمہ خواجہ احمد فاروقی۔ ص ۱۴۔

اس خیال کی تائید کی اور دہلی کالج کا انگریزی شعبہ وجود میں آ گیا۔اور مشرقی ومغربی دونوں حصے علیحدہ علیحدہ کام کرتے رہے، مگر کچھ دنوں کے بعد دونوں شعبے پھر ایک جگہ کر دیئے گئے تھے جو آخر تک اسی طرح رہے۔

کالج کی ایک بڑی خصوصیت

درجوں میں نصابِ تعلیم اور نظام کی تھوڑی بہت تبدیلیوں کے علاوہ جو ہر ایک تعلیمی ادارہ اور انتظام میں ضروری ہوتی ہیں، دہلی کالج اور تغیرات سے بہت کم متاثر ہوا۔دہلی کالج کے بعد جو سرکاری تعلیمی ادارے شروع ہوئے ان میں موجود کوئی امدادی ادارہ، مدرسہ، کالج ایسا نہیں ہے جو اس دور کے نئے نئے قوانین اور احکامات وقواعد سے متاثر نہ ہوا ہو، بیشتر مدرسوں کالجوں میں بڑے بڑے انقلاب آئے، ذریعۂ تعلیم تبدیل ہوا، نصاب میں تبدیلی کی گئی، نئے نئے نصابِ تعلیم نافذ کئے گئے، اردو فارسی کی جگہ انگریزی نے لے لی۔دینی، شرعی علوم اور مشرقی طریقۂ تعلیم وتربیت کو نکال دیا گیا اور بھی طرح طرح کی پابندیاں عائد کی گئیں، مگر دلی کالج کچھ ایسا سخت جان تھا یا اس کے ذمہ دار اور سربراہ اور اس میں تعلیم دینے والے اپنے مقصد کیلئے ایسے مخلص تھے کہ اس میں چوتھائی صدی (یا مولانا مملوک العلی کی وفات ۱۲۶۷ھ ۱۸۵۱ء) تک کوئی غیر معمولی تبدیلی عمل میں نہیں آئی تھی، یہاں تک کہ لارڈ میکالے (BABINGTON, LORD,THOMAS, MACAULAY) کی ہندوستان اور ہندوستانیوں کی تعلیم پر وہ بدنامِ زمانہ یادداشت بھی، جو ڈاکٹر سید عابد حسین کے بلیغ الفاظ میں:

"جہالت، تنگ نظری وخطابت ووکالت کا بے مثال نمونہ ہے"(۱)

اور جس نے ملک کے پورے تعلیمی نظام اور تہذیبی عمل کو تہ وبالا کر دیا تھا، اس کالج

(۱) قومی تہذیب کا مسئلہ، ڈاکٹر سید عابد حسین ص ۱۰۷ (دہلی: ۱۹۸۰ء) اس رپورٹ پر کمپنی کے ایک اور افسر ولسن (Dr.HORACE WILSONHAY MAN) نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

"مجھے اس کے مطالعہ کا موقع ملا ہے، یہ اس کی تمام تحریروں کی طرح بہت پُرکارانہ وصناعانہ یادداشت ہے۔مگر اس ملک سے متعلق علم اور تجربہ کی کمی اس میں صاف جھلکتی ہے۔"

ترجمہ تاریخ التعلیم باسو۔ترجمہ وارث سرہندی ص ۱۴۲ (کراچی)

کے نظام اور طریقۂ کار پر اثر انداز نہیں ہو سکی۔

دہلی کالج اس لحاظ سے اس وقت (۱۸۵۷ء سے پہلے) کے ہندوستان کا ایک غیر معمولی اور منفرد ادارہ تھا، جو اس طوفان بلا خیز اور تیز آندھیوں میں بھی ایک شان سے کھڑا اور اپنے راستہ پر چٹان کی طرح جما رہا، خواجہ احمد فاروقی کے الفاظ میں:

''اکثر ایسا ہوتا ہے کہ زلزلہ آتا ہے اور مکان و مکین سب دب جاتے ہیں، لیکن ایک بچہ حسن اتفاق سے بچ جاتا ہے، کچھ ایسا ہی دلی کالج کے ساتھ ہوا، میکالے کی تعلیمی پالیسی نے پورے ہندوستان کو متاثر کیا، مشرقی علوم (سرکاری) سرپرستی اور امداد سے محروم کر دیئے گئے، لیکن کالج کو باقی رہنے دیا گیا، وایں آفت ازینا گذشت'' (۱)

مولوی عبدالحق نے بھی دہلی کالج کے اس امتیاز اور اس کے اس دور کے تغیرات سے متاثر نہ ہونے کا خاص طور سے ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ستم ظریفی یہ ہوئی کہ سنسکرت، عربی، فارسی کی تعلیم بھی انگریزی کے ذریعے ہونے لگی، دیسی زبانوں کی بدقسمتی کا کچھ ٹھکانا ہے۔ ۱۸۳۵ء سے قبل تقریباً تمام مدارس میں عربی، فارسی، سنسکرت کی تعلیم ہوتی تھی اور گورنمنٹ بھی اس کی پوری تائید پر تھی اور ساری توجہ اور محنت اس پر صرف کی جاتی تھی اور بدیسی زبانوں کو کوئی پوچھتا بھی نہ تھا۔ جب لارڈ بنٹنگ کا ریزیولیشن عمل میں آیا تو انگریزی نے وہ زور پکڑا کہ اس نے عربی سنسکرت ہی کو نہیں بٹھا دیا بلکہ دیسی زبانیں بھی کس مپرسی کی حالت میں آ گئیں۔ ایک دہلی کالج ایسا تھا جہاں مغربی علوم یعنی ہیئت، ریاضت، فلسفہ وغیرہ کی تعلیم بھی اردو کے ذریعہ سے دی جاتی تھی اور باوجود ان تمام موانعات کے جو معترضین ذریعہ تعلیم کی بحث میں ہر موقع پر پیش کرتے تھے، وہ نہایت کامیاب رہا'' (۲)

دہلی کالج کے مشرقی شعبہ کی مغربی شعبہ سے بہتر کارکردگی

دہلی کالج میں عربی، فارسی، علوم اسلامیہ، فقہ، دینیات، حدیث اور عربی اس اہتمام

(۱) مقدمہ خواجہ احمد فاروقی ص ۲۳-۲۴ (رام چندر، از صدیق الرحمان قدوائی)

(۲) مرحوم دہلی کالج ص ۳، ۴، ۲۵

اورتوجہ سے پڑھائے جاتے رہے جس طرح کالج کے ابتدائی دنوں میں پڑھائے جاتے تھے۔کالج کی تعلیمی زبان اردو رہی، جس میں اسلامی، ادبی، مشرقی اور سائنسی علوم مناسب موضوعات کی تمام کتابیں اردو میں پڑھائی جاتی تھیں جس کا بہت اعلیٰ معیار تھا، اور مشرقی شعبہ مغربی شعبہ سے بہت ممتاز تھا، دہلی کالج کے نگراں اور ممتحن مانتے تھے کہ:

''مشرقی شعبے کا طالب علم اپنے مغربی شعبے والے حریف سے بڑھا ہوا ہے''(۱)

یہ تبصرہ دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر کارگل (Jhon, Kargill) کا ہے۔ کارگل صاحب کا تجزیہ یہ تھا کہ نصاب کی مناسب کتابیں نہیں ہیں ورنہ مشرقی حصہ کے طالب علموں کا علم اس سے بھی اچھا ہو جاتا، کارگل کے تبصرہ کے کچھ اور الفاظ بھی مولوی عبدالحق نے نقل کئے ہیں، وہ لکھتا ہے:

''حال ہی میں کالج کا معائینہ بعض نہایت قابل فوجی افسروں اور مشنریوں نے کیا جو معاملاتِ تعلیم سے بخوبی واقف تھے، انہوں نے مشرقی شعبے کے طلبہ کا امتحان لیا اور ان سے علم ہیئت، جنرل سائنس، اخلاقی اور مذہبی مسائل میں گفتگو کی، ان سب کا یہ بیان ہے کہ اس شعبے میں قطعی طور پر بڑی ترقی پائی جاتی ہے اور مختصر یہ کہ تمام ہندوستان میں کسی جگہ ترقی کے لئے ایسے آثار نظر نہیں آتے''۔(۲)

ان اطلاعات اور تبصروں سے واضح ہے کہ دہلی کالج اور مدرسہ دہلی کے طلبہ کی مولانا مملوک العلی اور ان کے رفقاء نے اس طرح تربیت کی تھی اور ان کو علم کے جوہر سے اس قدر مالا مال کر دیا تھا کہ وہ اپنے ہم مرتبہ طلبہ سے ہمیشہ ممتاز رہے۔ مولانا کے طلباء کی لیاقت کا کچھ اور تذکرہ مولانا کے شاگردوں کے ذکر میں آئے گا۔

---

(۱) مرحوم دہلی کالج ص ۲۵

(۲) مرحوم دہلی کالج ص ۲۵

باب (۶)

مولانا مملوک العلی کا دہلی کالج میں تقرر

منصب، ترقی، کالج کے ذمہ داروں اور پرنسپل صاحبان سے روابط اور اختلاف، کالج سے ایک سال کی رخصت، مدرسہ عالیہ کلکتہ کے مدرسِ اول اور امین مدرسہ کے عہدہ کیلئے انتخاب، کلکتہ کے سفر کا ارادہ، مولانا کے دوستوں کا کلکتہ نہ جانے کا مشورہ، دہلی کالج سے ملازمتِ کلکتہ کیلئے رخصت لینے کی کوشش اور اس میں ناکامی، کلکتہ کے سفر کے منصوبہ کا اختتام اور مدرسہ دارالبقاء میں ملازمت کی روایت پر ایک نظر

منصب اور ترقی

دہلی کالج کے ابتدائی منصوبہ اور سب سے پہلے ملازمین اور مدرسین کے تقرر کے وقت جو اصحاب مدرسہ دہلی (دہلی کالج) میں تعلیم و تدریس کی خدمت کیلئے منتخب کئے گئے تھے ان میں مدرس اول (مولانا رشید الدین) کے بعد دوسرا نام مولانا مملوک العلی کا تھا۔ مولانا رشید الدین خاں دہلی کالج کے قیام کے وقت (۱۰ رشوال ۱۲۴۰ھ جون ۱۸۲۵ء) سے تین سال تک دہلی کالج کے مدرس اول رہے، مولانا رشید الدین کی وفات (۱) کی وجہ سے مدرس اول کا عہدہ خالی ہو گیا تھا، مولانا مملوک العلی مدرس اول کے نائب، کالج کے تمام استادوں میں سب سے پرانے اور علمی حیثیت اور تعلیمی و درسی خدمات میں سب سے فائق تھے، اس لئے مدرس اول کے عہدہ پر مولانا کا پورا حق تھا، اسلئے مولانا رشید الدین کی وفات کے بعد مولانا مملوک العلی کو مدرس اول کے عہدہ پر نامزد کیا جانا چاہئے تھا لیکن بوجوہ اس میں بہت دیر ہوئی، اگر چہ مولانا

---

(۱) مولانا رشید الدین خاں کی وسط ماہ محرم الحرام ۱۲۴۳ھ میں دہلی میں وفات ہوئی تھی، صحیح تاریخ کی تحقیق گزر چکی ہے۔

مملوک العلیؒ اس عہدہ پر عملاً فائز تھے اور اس کے متعلق تمام خدمات مولانا مملوک العلی انجام دے رہے تھے مگر مولانا کو عہدہ تفویض نہیں کیا گیا تھا، اس میں اور مشکلات کے علاوہ ایک رکاوٹ یہ آ گئی تھی کہ نواب حامد علی خاں نے (جو دہلی کالج کے لئے وقف اعتماد الدولہ لکھنؤ کے متولی تھے) مولوی جعفر علی خاں چارجوی کو مدرس رکھ لیا تھا اور نواب صاحب چاہتے تھے کہ مولوی جعفر علی خاں کو صدر مدرس نامزد کر دیا جائے، مگر نواب صاحب کی اس ہدایت پر عمل کرنے سے ڈاکٹر ایوب قادری کے الفاظ میں:

''مولانا مملوک العلی (جو) پندرہ سولہ سال سے کالج میں ملازم تھے ان کی حق تلفی ہوتی تھی''(۱)

اسلئے کالج کے ارباب انتظام نے یہ معاملہ مولانا مفتی صدرالدین آزردہ کے پاس مشورہ کیلئے بھیجا، مفتی صاحب نے مولانا مملوک العلی کے فضل و کمال کی تعریف کی اور مولانا کے حق میں رائے دی، مگر مشکل یہ تھی کہ کالج کی انتظامیہ، متولی، وقف کے رکھے ہوئے ملازم کو الگ بھی نہیں کرنا چاہتی تھی اور کمیٹی کیلئے مولانا مملوک العلی کی کالج سے پرانی وابستگی کو نظرانداز کرنا بھی مشکل تھا، دہلی کالج کیلئے مولانا کی خدمات نیز دہلی کے علمی حلقوں میں مولانا کی عظمت و وقعت اور پذیرائی کے کسی پہلو کو بھی نظرانداز کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس لئے اس معاملہ کو غالباً جوں کا توں رکھنے کا فیصلہ ہوا اور یہ فیصلہ برسوں تک ٹلتا رہا، کئی سال کے بعد مولانا مملوک العلی کے حق میں اس عہدہ کا فیصلہ ہوا، اور ایوب قادری صاحب کی اطلاع کے مطابق، مولانا کو ۸/نومبر ۱۸۴۱ء (۲۳/رمضان ۱۲۵۷ھ) کو باضابطہ صدر مدرس مقرر کر دیا گیا (شاید اسی موقع پر) کالج کے وزیر مسٹر ٹامسن (THOMASON) نے مولانا مملوک العلی کے تعارف میں لکھا تھا:

''وہ عربی کے بہت بڑے فاضل ہیں اور شہر دہلی میں ان کا بہت احترام ہے''(۲)

اگرچہ ایوب قادری صاحب نے مولانا مملوک العلیؒ کے صدر مدرس کے عہدہ پر مقرر

---

(۱) تذکرہ مولانا محمد احسن نانوتوی، مرتبہ محمد ایوب قادری ص ۱۷۴ (کراچی)

(۲) تذکرہ مولانا محمد احسن نانوتوی، مرتبہ محمد ایوب قادری ص ۱۷۴ (کراچی)

ہونے کی تاریخ کی صراحت کی ہے مگر مجھے یہ اطلاع مشتبہ معلوم ہوتی ہے، یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ دہلی کالج جیسے مقتدر علمی مرکز اور ادارہ میں دس سال مدرس اعلیٰ کا عہدہ پُر نہ کیا جائے، سال دو سال کی تاخیر تو ممکن تھی مگر دس سال کی اطلاع محل نظر ہے۔

مولانا مملوک العلی صدر مدرس ہو گئے اور کالج کے مشرقی شعبہ کے نگراں بھی رہے اگر چہ (وقف اعتماد الدولہ لکھنوی کی وجہ سے) کالج میں سنی اور شیعہ دینیات کیلئے الگ الگ استاد تھے، مولوی جعفر علی شیعہ دینیات پڑھاتے تھے مگر کالج کے علمی سربراہ مولانا ہی تھے جو اپنی زندگی کے آخر دنوں تک عزت وحرمت اور وضعداری کے ساتھ اس عہدہ پر فائز رہے اور یقیناً بناء مدرسہ ان کی ذات سے مستحکم رہی۔(۱)

مولانا مملوک العلی اپنے علم وفضل، اعلیٰ منصب، بے نہایت فیض، نامور شاگردوں تاریخی ناقابل فراموش خدمات کے علاوہ دہلی کالج کی تاریخ میں اس وجہ سے بھی ممتاز ہیں کہ دہلی کالج کے سب عہدہ داروں اور مدرسین میں مولانا کا دورِ ملازمت سب سے زیادہ وسیع ہے، مولانا کالج کے افتتاح کے وقت ۱۸۲۵ء (۱۲۴۰ھ) کالج میں مدرس ہوئے اور اپنی وفات کے دن ۱۱رذی الحجہ ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۱ء) تک تقریباً چھبیس سال دہلی کالج کی ملازمت میں گزارے، خود مولانا نے اسپرنگر کے نام اپنے ایک خط میں اپنی اس خدمت کا یوں ذکر کیا ہے:

''احقر نے چھبیس برس مدرسہ دہلی میں طلبہ کی خدمت کی ہے''(۲)

تنخواہ

مدرسہ دہلی (یا دہلی کالج) میں ابتدائی تقرر کے وقت مولانا مملوک العلی کی تنخواہ پچاس روپے ماہوار مقرر ہوئی تھی، جو اس زمانہ میں تعلیمی شعبوں میں ہندوستان کی تنخواہ کے اوسط کے لحاظ سے بہت مناسب تنخواہ تھی، مولانا کے ساتھ ایک اور مدرس (مولانا سید محمد صاحب) تھے، ان کی تنخواہ بھی پچاس روپے ماہانہ تھی۔ مدرس اول کی وفات کے بعد مولانا مملوک العلی اگر چہ مدرس اول کے قائم مقام تھے اور مولانا رشید

---

(۱) یہ الفاظ مولوی کریم الدین پانی پتی کے ہیں۔ طبقات شعرائے ہند ص ۴۶۳ (لکھنؤ ۱۹۸۱ء)

(۲) مکتوب مورخہ ۲۲ر جولائی ۱۸۵۰ء (۱۲ر رمضان ۱۲۶۶ء) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۷۰

الدین کی تنخواہ ایک سو (۱۰۰) روپے تھی لیکن مولانا مملوک العلی کی تنخواہ میں اضافہ نہیں ہوا، منصب میں ترقی کے باوجود وہی پرانی تنخواہ ملتی رہی۔

جنرل پبلک انسٹرکشن کمیٹی نے ۳۰ راکتوبر ۱۸۴۰ء (۴ ررمضان ۱۲۵۶ھ) کو گورنر جنرل کو ایک مراسلہ بھیجا تھا جس میں دہلی کالج کے استادوں کی تنخواہ کا ذکر کیا تھا اور اس تنخواہ میں اضافہ کی سفارش کی گئی تھی اور مولانا مملوک العلی کی تنخواہ میں اضافہ کا (خاص طور سے) ذکر تھا، خواہش کی گئی تھی کہ مولانا کی تنخواہ بڑھا کر اسی (۸۰) روپے ماہوار کر دی جائے، مگر کمیٹی کی یہ تجاویز منظور نہیں ہوئیں۔ اس تجویز کے ایک سال بعد نومبر ۱۸۴۱ء (رمضان ۱۲۵۷ھ) جب مسٹر ٹامسن (THOMASON) وزیٹر دہلی کی ہدایت پر مولانا مملوک العلی کو دہلی کالج کے مدرس اول کا عہدہ سپرد کیا گیا، اس وقت ٹامسن نے بھی مولانا کی تنخواہ میں اضافہ کی سفارش کی، اس سفارش پر مولانا کی تنخواہ میں دس روپئے کا معمولی اضافہ کیا گیا (۱) مگر یہ اضافہ اور تنخواہ مرحوم مدرس اول، مولانا رشید الدین خاں کی تنخواہ سے بہت کم تھا، اس امتیاز کو دہلی کالج کے ذمہ داروں نے غالباً محسوس کیا ہوگا، اس لئے مولانا کی تنخواہ میں اضافہ کی دوبارہ تحریک ہوئی ہوگی جس کی تفصیل راقم سطور کو نہیں ملی، لیکن اس کوشش کے نتیجہ میں مولانا کی تنخواہ بڑھ کر سو روپئے ماہوار ہوگئی تھی، اس اضافہ کی تاریخ معلوم نہیں، مگر ۱۸۴۷ء میں مولانا کی تنخواہ ایک سو روپے ماہوار تھی، کریم الدین پانی پتی کی اطلاع ہے:

> ''مدرس اول مدرسہ دہلی جناب مولوی مملوک العلی مدظلہٗ عالم بے بدل، متقی بے مثال اور فاضل کامل ہیں، عہدہ میر مولوی بہ مشاہرہ سو روپے ماہوار مدرسہ میں مقرر ہیں'' (۲)

یہ مولانا کی تنخواہ کا غالباً آخری اضافہ تھا، اسی ملازمت و تنخواہ پر چند سال بعد مولانا رحلت فرما گئے۔ سدا نام رہے اللہ کا!

---

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۳۱

(۲) طبقات شعرائے ہند ص ۳۶۳ (لکھنؤ ۱۹۸۱ء)

دہلی کالج سے طویل رخصت

مولانا مملوک العلی نے ملازمت کے زمانہ میں (کم سے کم) ایک مرتبہ کالج سے ایک سال کی طویل رخصت بھی لی تھی، یہ چھٹی سفر حج کیلئے لی گئی تھی، جس کی ابتداء ۲۶؍رجب ۱۲۵۸ھ (۲۳؍اگست ۱۸۴۳ء) کو ہوئی اور اختتام ایک سال بعد رجب ۱۲۶۰ھ (جولائی، اگست ۱۸۴۴ء) میں ہوا تھا۔ اس سفر کا مورخین، تذکرہ نگاروں اور علماء نے عموماً جو سنہ لکھا ہے وہ صحیح نہیں، کہا جاتا ہے کہ یہ سفر رجب ۱۲۵۸ھ میں ہوا تھا، مگر شہرت عام اور کثرت نقل کے باوجود ۱۲۵۸ھ میں سفر حج کی روایت واطلاع صحیح نہیں (تفصیلات سفر حج کے ذکر میں آئیں گی)۔ بہر حال اس زمانہ میں شمالی ہند کے سرکاری اسکولوں (اور دہلی کالج میں بھی) چھٹی کا ضابطہ یہ تھا کہ چھ مہینہ تک کی چھٹی تنخواہ کے ساتھ دی جاتی تھی، اگر چھ مہینہ سے زیادہ کی رخصت کی ضرورت ہو تو اس کی تنخواہ نہیں ملتی تھی، اس عہدہ پر عارضی طور سے دوسرے شخص کو رکھ لیا جاتا تھا مگر رخصت لینے والے کی ملازمت اور عہدہ محفوظ رہتا تھا، جب وہ رخصت سے واپس آتا تھا پرانی تنخواہ پر اپنے عہدہ پر بحال کر دیا جاتا (۱) مولانا مملوک العلی صاحب کو کالج کی انتظامیہ نے از راہِ قدر دانی وعزت افزائی پورے سال کی رخصت دی اور مولانا کیلئے تنخواہ کے ضابطہ میں بھی ترمیم کی گئی، تنخواہ بھی پورے سال کی عطا ہوئی۔

دہلی کالج کے انگریز ذمہ داروں سے روابط اور اختلافات

مولانا مملوک العلی کے چھبیس سالہ دورِ ملازمت میں دہلی کالج میں چار پرنسپل مقرر ہوئے، ٹیلر جو دہلی کالج قائم کرنے کا پہلا محرک تھا اسی کو کالج کا پہلا پرنسپل بھی مقرر کیا گیا تھا، اسکے بعد مولانا مملوک العلی کے عہد میں تین پرنسپل اور آئے، بتروس (۲) (FELIX. BOUTROS) اسپرنگر (SPRENGER) اور جے کارگل (JHON,KARGILL) دہلی کالج کے قدیم دور کی معلومات دستیاب نہیں، اسلئے ان

---

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب۔ مرتبہ محمد اکرام چغتائی ص ۳۳۰

(۲) بتروس پرنسپل دہلی کالج کی فرمائش پر مولانا شیخ امام بخش صہبائی نے ......

باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر......

صاحبان کے ساتھ مولانا کے روابط کی تفصیل بھی نہیں ملتی مگر اسپرنگر صاحب علم اور کتب ونوادر کا نہایت شوقین تھا مولانا کے اس سے خاص مراسم تھے، خط وکتابت رہتی تھی، یہ خط و کتابت اور تعلقات ٹیلر کو ناپسند تھے، اس لئے ٹیلر مولانا سے ناراض رہتا تھا، ڈاکٹر محمد اکرام چغتائی نے لکھا ہے:

''ٹیلر اسپرنگر کے قریبی احباب کو پسند نہیں کرتا تھا اور انہیں کسی نہ کسی طرح نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا رہتا تھا''(۱)

ٹیلر اور مولانا مملوک العلی کے اختلاف اور مولانا سے ٹیلر کی ناراضگی کا اس وقت سب کو پتہ چل گیا جب علی اکبر سونی پتی (جو دہلی کالج میں فارسی کا استاد اور مولانا مملوک العلی کا شاگرد تھا) کے کلکتہ جانے اور مدرسہ عالیہ کلکتہ کے عہدہ امینی کیلئے ملازم رکھے جانے کی خبر مشہور ہوئی اور دہلی کالج میں علی اکبر کے ماتحت استادوں کو یہ خیال ہوا کہ علی اکبر کے کلکتہ جانے کے بعد اس کی جگہ خالی ہوکر انہیں مل جائے گی، ادھر مولانا مملوک العلی نے یہ کوشش کی کہ علی اکبر کی جگہ پر مولانا مظہر نانوتوی (جو مولانا مملوک العلی کے بھتیجے اور شاگرد تھے) کا تقرر ہو جائے۔ قائم مقام پرنسپل ٹیلر تھا، وہ مولانا مملوک العلی کے اسپرنگر سے قریبی تعلقات کی وجہ سے مولانا محمد مظہر کو یہ ملازمت دینے پر تیار نہیں ہوا، اسلئے یہ جگہ مولوی احمد علی دہلوی کو مل گئی تھی، کچھ دنوں کے بعد جب علی اکبر کو کلکتہ کی ملازمت کی امید نہیں رہی اور احمد علی جو اس کی جگہ مقرر کئے گئے تھے چھٹی پر چلے گئے تو اس عہدہ پر دوبارہ علی اکبر کو رکھ لیا گیا، چغتائی صاحب نے اس واقعہ کا وضاحت سے اس طرح ذکر کیا ہے:

''اسپرنگر کو جب دہلی کالج کی پرنسپل سے ہٹا کر شاہانِ اودھ کے کتاب خانوں کی فہرست سازی کیلئے لکھنؤ بھیجا گیا (۶ر دسمبر ۱۸۴۷ء کو) تو اس کی جگہ ٹیلر کو قائم مقام پرنسپل مقرر کر دیا۔ ٹیلر سے مولانا کی بنتی نہیں تھی اور وہ چاہتے تھے کہ مدرسہ کی

گذشتہ صفحہ کا بقیہ... شمس الدین فقیر کی کتاب حدائق البلاغہ کا اردو ترجمہ کیا تھا اور اس کے مباحث اور مثالوں کو اردو کا مزاج بخشا تھا، یہ کتاب پہلی مرتبہ سرسید احمد خاں کے بھائی سید محمد خاں کے لیتھوگرافک پریس میں ۱۲۵۹ھ (اپریل ۱۸۴۲ء) میں مصنف کی تصحیح سے چھپی تھی، اس طباعت کا ایک نہایت عمدہ نسخہ ہمارے ذخیرہ میں ہے۔

(۱) ایک نادر مجموعۂ مکاتیب ص ۴۴

ملازمت ترک کر دی جائے اور اپنی جگہ اپنے بیٹے یعقوب یا قریبی عزیز محمد مظہر (محمد احسن نانوتوی کے حقیقی بڑے بھائی) کا تقرر ہو جائے، لیکن پرنسپل ٹیلر کی مخالفت کی وجہ سے مولانا اپنی خواہش پوری نہ کر سکے۔

مولانا اور ٹیلر کے مابین یہ اختلاف اس قدر بڑھ گیا تھا کہ دونوں میں قطع تعلق تک کی نوبت جا پہنچی۔ ٹیلر کی مخالفت کی شاید بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اسپرنگر کے قریبی احباب کو پسند نہیں کرتا تھا اور ہر وقت انہیں کسی نہ کسی طرح نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا رہتا تھا، اسی جھگڑے کے دوران میں مولانا کا انتقال ہو گیا اور ٹیلر نے فی الفور اُن کی جگہ سنّی طلبہ کے استاد مولوی سید محمد کو مقرر کر دیا'' (۱)

علی اکبر نے (جو ان واقعات کے تمام پہلوؤں سے واقف، بلکہ خود بھی اس کا ایک حصہ ہے) اسپرنگر کے نام ایک خط میں یہ تمام روداد یوں بیان کی ہے:

''عرضی مولوی محمد مظہر کی ملفوف ہے، باعث ان کی عرضی لکھنے کا یہ ہے کہ علی اکبر چونکہ کلکتہ ضرور جائے گا، علاقہ مولوی احمد علی کا بعد اس کے ہم کو ملے گا، لیکن اب صورت اس کی دگرگوں ہو گئی، یعنی سرکار میں استحقاق روشن علی کا ثابت ہو گیا، میرے بعد وہ علاقہ اسی کو ملے گا، مجھ کو بھی وہ علاقہ ملنا مشکل تھا مگر صرف حضور کے اقبال سے حاصل ہوا، ورنہ مجھ کو کون پوچھتا۔ چنانچہ ٹیلر صاحب مجھ سے فرماتے تھے کہ تو ہی تھا جو یہ علاقہ تجھ کو مل گیا اور کسی کو ہرگز نہ ملتا، اسی سبب سے انہوں نے مضطر ہو کر حضور کو لکھا اور سوا ارتکابِ سفر کے اور کچھ نہیں بن پڑتا۔

اگر مولوی مملوک العلی اور ٹیلر صاحب میں اتفاق ہوتا تو شاید علاقہ مذکور محمد مظہر کو مل جاتا، کیونکہ اختیار اور رائے بالکل ان دنوں میں ٹیلر صاحب کو حاصل ہے لیکن مولوی صاحب ایسے عقلمند ہیں کہ ٹیلر صاحب سے ناحق بگاڑ اور خلاف کر رکھا ہے، تمام مدرسہ کے باب میں جو مشورہ وغیرہ منظور ہوتا ہے ٹیلر صاحب مولوی سید محمد صاحب کو بلاتے ہیں، آمد و رفت مولوی مملوک العلی کی ان کے پاس ترک ہو گئی ہے۔ اور فی الواقع مولوی مملوک العلی ان کا ہر بات میں خلاف کرتے ہیں'' (۲)

---

(۱) ایک نادر مجموعۂ مکاتیب ص ۴۴ (۲) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۲۹۸

مولانا مملوک العلی اور ٹیلر کے اختلافات کا اس وقت بھی صاف اظہار ہوا جب مولانا نے اسپرنگر کے اصرار پر مدرسہ عالیہ کلکتہ جانے کا ارداہ کیا، مولانا چاہتے تھے کہ میں کلکتہ کی ملازمت کیلئے ایک سال کی رخصت حاصل کرلوں، دلی کالج کی ملازمت سے سبکدوش نہ ہوں، مگر مولانا اور ٹیلر کے اختلافات تھے، ٹیلر مولانا کے اسپرنگر سے تعلقات کی وجہ سے ناخوش تھا، اس نے مولانا کی رخصت منظور نہ ہونے دی (۱) چوں کہ اس وقت ٹیلر قائم مقام پرنسپل تھا مولانا کی دہلی کالج سے لمبی رخصت کی منظوری اس کی سفارش اور رائے کے بغیر متوقع نہیں تھی اور اسکو اسپرنگر کے پاس مولانا کا قیام کرنا پسند نہیں تھا، اس لئے نہ اس نے اجازت دی نہ مولانا کو رخصت ملی۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ کے مدرسِ اول یا امین کے منصب کیلئے مولانا مملوک العلی کا انتخاب

اسپرنگر جو دہلی کالج کا پرنسپل رہ چکا تھا، مولانا مملوک العلیؒ کو اچھی طرح جانتا تھا، دونوں میں قریب کے روابط تھے، علمی معلومات، کتابوں اور اطلاعات کا تذکرہ و تبادلہ ہوتا رہتا تھا، دہلی کالج سے اسپرنگر کو نوابانِ اودھ کے کتب خانہ کی فہرست بنانے کیلئے لکھنؤ بھیج دیا گیا تھا، اسپرنگر اودھ لائبریری کی فہرست بنا کر فارغ ہوا تو اس کا مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل کے عہدہ پر کلکتہ تقرر کر دیا گیا، اسپرنگر (غالباً) جون ۱۸۵۰ء میں لکھنؤ سے کلکتہ پہنچا اور نئی ذمہ داری کو سنبھال لیا۔ اس نے کلکتہ پہنچنے سے غالباً پہلے ہی مدرسہ کے انتظام اور نصابِ تعلیم میں چند بنیادی تبدیلیوں کا منصوبہ بنالیا تھا اور جو اہم عہدے خالی تھے ان کے لئے مناسب افراد کا تقرر بھی اسکے منصوبہ کا اہم حصہ تھا، اسپرنگر کے آنے سے پہلے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے امین، مولوی احمد کبیر کا انتقال ہو چکا تھا اور عہدہ امینی کا خالی تھا، اسپرنگر چاہتا تھا کہ اس منصب پر کسی عالم فاضل شخص کو لایا جائے، اسپرنگر دہلی کالج میں قیام کے وقت مولانا کے کمالات و خصوصیات اور مولانا کے اعلیٰ علمی مراتب سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا لہٰذا اس عہدہ

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۳۳۰

کیلئے اس کی نگاہِ انتخاب مولانا مملوک العلی پر گئی، اسپرنگر نے مولانا سے گزارش کی کہ وہ اس منصب کو قبول فرمالیں، محمد اکرام صاحب چغتائی لکھتے ہیں کہ:

''اسپرنگر نے مولانا کو کلکتہ بلانے کا مصمم ارادہ کرلیا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مولانا کے عالمانہ مرتبے اور مدرسانہ صلاحیتوں کا کس قدر معترف تھا، وہ کلکتہ پہنچتے ہی مدرسے کے نصاب وغیرہ میں بعض بنیادی تبدیلیاں کرنا چاہتا تھا، اوراس کیلئے اسے مولانا کے تعاون کی ضرورت تھی، چنانچہ اس نے مولانا سے پوچھے بغیر اربابِ اختیار کو یہ درخواست بھیج دی کہ مولانا کو دہلی کالج سے مدرسہ عالیہ بھیج دیا جائے''(۱)

مولانا مملوک العلی کے خطوط سے جھلکتا ہے کہ وہ ملازمتِ کلکتہ کی اس پیش کش کو قبول کرنا نہیں چاہتے تھے (۲) مگر اسپرنگر نے مولانا کو اس کی اطلاع دینے سے پہلے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے امین کے عہدہ کے لئے ایک درخواست اپنی سفارش کیلئے تعلیمی کونسل (EDUCATIONAL CONCIL) کے سکریٹری کو بھیج دی تھی، سکریٹری کیلئے اسپرنگر کی تجویز سے اختلاف کی کوئی وجہ نہیں تھی، لہٰذا اس نے اپنا تائیدی نوٹ لگا کر اسپرنگر کی یہ درخواست دہلی کالج کے پرنسپل کو بھیج دی اور جب یہ سب کاروائی مکمل ہوگئی اس وقت مولانا مملوک العلی کو اس کی خبر ملی، مگر تعجب ہے کہ اکرام چغتائی صاحب نے جو خود مذکورہ بالا وضاحت کر چکے تھے (اسی کتاب میں) چند صفحات کے بعد یہ بھی لکھ دیا کہ:

''مولانا مدرسہ عالیہ کے جس عہدہ کے خواہش مند تھے وہ امین کا عہدہ تھا''

چغتائی صاحب نے اپنے الفاظ کی اس طرح وضاحت کی ہے:

''مطلب یہ ہوا کہ مولانا اس ادارے کے جس عہدہ کے متمنی تھے وہ تدریسی نہیں بلکہ انتظامی نوعیت کا تھا، علاوہ ازیں اسپرنگر نے انہیں اس عہدہ کی پیش کش نہیں کی تھی بلکہ انہوں (مولانا) نے خود اس عہدہ کا انتخاب کیا تھا، ان دنوں کسی امین کے انتقال یا سبکدوشی کی وجہ سے یہ عہدہ خالی ہوا تھا، مولانا کی دہلی میں اسپرنگر سے

---

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۶۸

(۲) اکرام چغتائی صاحب نے لکھا ہے: وہ دہلی کالج کی ملازمت ترک کرنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ انہوں نے اپنی عمر کا اہم ترین حصہ یہیں بسر کیا تھا۔ ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۷۱

ملاقات ہوئی تو انہوں نے اس خالی جگہ کے لئے اپنا نام پیش کر دیا، اسپرنگر نے موات کو مولانا کے تقرر کی سفارش کر دی اور ساتھ ہی مولانا کو لکھا کہ جلد وہ اپنی درخواست بھیج دیں۔ مولانا چاہتے تھے کہ وہ مستقل طور پہ دہلی کالج کو نہ چھوڑیں، بلکہ انہیں ایک سال کی رخصت مل جائے اور اس عرصہ میں اگر وہ کلکتہ سے واپس دہلی آنا چاہیں تو ان پر کوئی پابندی نہ ہو، ایک سال کی رخصت کی یہ درخواست دہلی کالج کی کمیٹی نے نامنظور کر دی۔ اس نامنظوری کے بعد مولانا نے بعض ملنے بااختیار افراد سے رجوع کیا تا کہ کمیٹی کے اراکین اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لیں، لیکن غالباً وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے''(۱)

مگر چغتائی صاحب کی یہ قیاس آرائی صحیح نہیں، اس خیال واطلاع کی ان ہی کے اور مندرجات سے صاف تردید ہو رہی ہے، نیز خود مولانا مملوک العلی اور ان کے ایک شاگرد اور اسپرنگر کے علمی رفیق علی اکبر سونی پتی کے خطوط سے بھی واضح ہے کہ مولانا مملوک العلی اس عہدہ کے خواستگار نہیں تھے اور ابتدائی طور پر انہوں نے اس کیلئے کوئی درخواست یا کاوش نہیں کی تھی، مگر جب اسپرنگر نے مولانا کی طرف سے خود ہی درخواست بھیج دی اور اوپر سے اس کی منظوری ہو کر کاغذات دہلی کالج کے پرنسپل ٹیلر کے پاس پہنچ گئے اور اسپرنگر کا خط علی اکبر کے ذریعہ سے مولانا کو ملا، اس وقت مولانا کو اس قصہ اور ملازمت کلکتہ کی خبر ملی۔ لہٰذا مولانا نے دہلی کالج میں چھٹی کیلئے کاروائی شروع کی اور تھارن ٹن (THRIENTON) کے یہاں مدرسہ عالیہ کی اس ملازمت کیلئے درخواست بھیج دی۔

ترتیبِ واقعات، مولانا کی رخصت کی درخواست اور کالج سے اس کی نامنظوری

مولانا مملوک العلی کو اس سلسلہ میں اسپرنگر کا پہلا خط اکبر علی سونی پتی کے ذریعہ سے ۱۶/ جولائی ۱۸۵۰ء (۶/رمضان المبارک ۱۲۶۶ھ) سے شاید ایک دو دن پہلے ملا ہوگا، اگر اسپرنگر مولانا کیلئے کلکتہ کی

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۷۸

ملازمت کی درخواست کا مولانا سے ابتدائی مشورہ کرنے کے بعد ارادہ کرتا اور پہلے سے مولانا سے اجازت لی جاتی تو ممکن تھا کہ مولانا اس پیش کش کو منظور نہ کرتے، لیکن اس صورت میں جب مولانا کو اطلاع دینے سے پہلے بڑے افسران سے اسپرنگر اس کی منظوری لے چکا تھا، اس پیش کش سے انکار کرنے کا موقع نہیں تھا، ادھر مولانا کو اسپرنگر سے اپنے مراسم کا بھی خیال ہوا ہوگا، ڈاکٹر اکرام چغتائی کے الفاظ میں مولانا مملوک العلی:

''اپنے دیرینہ تعلقات کی بناء پر اسپرنگر کی اس پیش کش کو نامنظور نہیں کر سکتے تھے''(۱)

اسپرنگر کو مولانا سے ملاقات کا تقاضہ اور مولانا کے کلکتہ پہنچنے کی جلدی تھی، اسپرنگر چاہتا تھا کہ جب وہ اپنا سفر پورا کر کے کلکتہ پہنچے تو مولانا مملوک العلی وہاں موجود ہوں، مگر مولانا مملوک العلی کی رائے یہ تھی کہ وہ اسپرنگر کے پہنچنے کے بعد کلکتہ آئیں، مولانا نے اسپرنگر کے نام اپنے ایک خط میں اس کا یوں ذکر کیا ہے:

''عنایت نامہ حضور کا دستخطی مع چھٹی اسمی مواٹ (MOWAT) صاحب بہادر سکریٹری کونسل مدارس کی معرفت ٹیلر صاحب بہادر کے، بیسویں جولائی کو احقر کے پاس پہنچا، معزز اور ممتاز کیا۔

حضور نے ارشاد فرمایا کہ اگر آپ کی رائے میری رائے کے موافق ہو تو اپنی درخواست مع میری چھٹی جلد نہ بھیجیں، سو یہ تاخیر احقر کے نزدیک بہت مناسب ہے۔ بعد حصول جواب اس عرضی کے عشرہ اخیر اگست تلک، اگر خدا نے چاہا درخواست اپنی مع حضور کی چھٹی کے بھیجوں گا۔

اور وہ جو بیچ باب پہنچنے احقر کے اواخر اکتوبر اور بھیجنا اپنا اوسط نومبر میں ارقام ہوا احقر کے عندیہ میں بھیجنا احقر کا کلکتہ میں بعد پہنچنے حضور کے مناسب تر ہے۔ آئندہ جو حکم ہوگا عمل میں آوے گا''(۲)

مگر دہلی کالج کے اعلیٰ حکام نے مولانا مملوک العلی کی چھٹی کی درخواست منظور نہیں کی، ایک سال کی رخصت کی درخواست بھی رد کر دی گئی، بلکہ علی اکبر سونی پتی کی اطلاع کے مطابق:

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۳۰۹ (۲) ایک نادر مجموعہ مکاتیب، مکتوب نمبر ۵ ص ۶۹

''مولوی مملوک العلی کی رخصت ایک مہینے کی بھی نہ ہوئی''(۱)

مولانا یہ بھی چاہتے تھے کہ دہلی کالج میں مولانا کی جگہ مولانا کے بھتیجے مولانا مظہر کو عارضی طور پر مدرس اول مقرر کرلیا جائے، مولانا کلکتہ کی ایک دو سال کی ملازمت کے بعد دہلی کالج میں اپنی ملازمت پر واپس آجائیں گے نیز (مولانا مملوک العلی کے صاحبزادہ) مولانا یعقوب کو مدرس سوم نامزد کردیا جائے، مگر یہ کوشش بھی کامیاب نہیں ہوئی اور چھٹی بھی نہیں ملی، لیکن یہ ناکامی صرف ٹیلر کی مخالفت کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ اس میں کچھ اور محرکات بھی کارفرما تھے۔

مولانا کو رخصت نہ دینے کی ایک اہم وجہ

کالج کے بڑے بڑے افسران بھی یہ بات جانتے اور سمجھتے تھے کہ مولانا مملوک العلی کی وجہ سے دہلی کے مسلمانوں، علماء اور بڑے طبقہ میں دلی کالج کا خاص وقار اور احترام ہے، اگر مولانا دلی کالج سے کلکتہ یا کہیں اور چلے گئے تو دہلی کالج کا وقار اور تعلیمی نظام متاثر ہوگا، لیکن ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے موقعوں پر اداروں کے ذمہ دار متعلقہ شخصیت سے صاف نہیں کہتے کہ آپ کا تعاون اور رفاقت ہمارے ادارہ کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور آپ کے جانے سے ہمارا پورا ادارہ اور اس کا نظام تعلیم متاثر ہوگا، بلکہ عام طور پر ایسی ہی تدبیریں کی جاتی ہیں کہ بات بھی بنی رہے اور شخصیت بھی نہ جانے پائے۔ مولانا مملوک العلی کے ساتھ بھی شاید ایسا ہی ہوا ہوگا، اسی لئے اسپرنگر کی سفارش اور پرنسپل دہلی کالج کی منظوری کے باوجود بھی کامل رخصت اور کلکتہ جانے کی اجازت نہیں ملی۔

کلکتہ نہ جایئے! علماء اور دوستوں کا اصرار

مولانا مملوک العلی کے کلکتہ نہ جانے کی ایک وجہ اور بھی تھی، مولانا کے دوست احباب بھی نہیں چاہتے تھے کہ مولانا دہلی سے کلکتہ چلے جائیں اور وہ مولانا کی صحبتوں سے محروم ہوجائیں، اس وقت دہلی کالج کے مدرس دوم مولانا سید محمد

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۳۳۶

دہلوی تھے جو دہلی کالج میں مولانا کے قائم مقام تھے، اگر چہ مولانا مملوک العلی کے جانے کے بعد ان کا مدرس اول ہو جانا یقینی تھا مگر وہ بھی مولانا کی کلکتہ کی ملازمت کے حق میں نہیں تھے، ایک اور بڑی شخصیت مولانا مفتی صدرالدین آزردہ کی تھی، آزردہ بھی کلکتہ جانے سے مانع ہوئے، مفتی صاحب نے مولانا کو اس ارادہ سے بارہا منع کیا (اور تفریحاً) یہ تک کہہ دیا کہ:

''تم کلکتہ گئے اور مرے، مرے اور جہنم میں گئے'' (۱)

اسلئے معاملہ جوں کا توں رہا، نہ مولانا کو رخصت واجازت ملی، نہ مولانا کلکتہ گئے۔ کلکتہ کی ملازمت وسفر کا منصوبہ ختم کرنے کی مولانا نے اسپرنگر کو ان الفاظ میں خبر دی تھی:

''لہٰذا سب اہل رائے اور جمیع دوستوں کی عقل میں اس صورت میں کہ رخصت ایک سال بھی نہ ہو، چھوڑنا روزگار مدرسہ دہلی کا واسطے عہدہ کلکتہ کے مناسب نہیں'' (۲)

مولانا نے کلکتہ کے سفر اور ملازمت کا خیال دل سے نکال دیا

دوستوں کی سخت مخالفت اور کالج کے افسران کے اس رویہ کی وجہ سے کلکتہ کی ملازمت قبول کرنے کا وہ خیال جو پہلے ہی کمزور تھا بالکل ختم ہو گیا۔ مولانا نے اسپرنگر کو معذرت کا خط لکھ دیا، اس خط کا ایک اقتباس اور پڑھ لیجئے:

''عرضی باب رخصت بے معرفت ٹیلر صاحب بہادر کے دی تھی اور صاحب بہادر نے بسبب عرض اور معروض احقر کے سفارش بھی کی اور کچھ دلیلیں بھی لکھیں، لیکن بہت افسوس ہے کہ وہ درخواست منظور نہ ہوئی، اور صاحب بہادر کو بھی اس امر کا افسوس ہوا۔ لہٰذا سب اہل رائے اور جمیع دوستوں کی عقل میں اس صورت میں کہ رخصت ایک سال کی بھی نہ ہو چھوڑنا روزگار مدرسہ دہلی کا واسطے درخواست عہدہ کلکتہ کے مناسب نہیں، اور اغلب ہے کہ آپکی رائے بھی ان سب کی رائے کے موافق ہو گی اور احقر کو بسبب نہ بھیجنے درخواست کے معاف اور معذور تصور فرمائیں گے'' (۳)

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۳۰۰ (۲) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۷۰ (۳) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۷۴

مولانا مملوک العلی کے مدرسہ دارالبقاء دہلی میں ملازمت کی روایت پر ایک نظر

۱۸۵۷ء سے پہلے دہلی کے علمی افق پر جو تعلیمی ادارے روشن تھے، ان میں سے ایک مدرسہ دارالبقاء بھی تھا، یہ مدرسہ بہت پرانا تھا اور شاہ جہاں کی یادگار تھا، شاہ جہاں نے جامع مسجد کی تعمیر کے بعد (۱) اس کے ساتھ دو عمارتیں اور بنوائی تھیں، شمالی مغربی کونہ پر دارالشفاء، جس میں بیماروں اور دواؤں کا انتظام کیا گیا تھا، جنوب مغربی کونہ پر دارالبقاء جس میں طلبہ کے قیام و تعلیم کا نظم تھا، یہ دونوں عمارتیں مغلوں کے آخری دور میں خستہ و خراب ہوگئی تھیں دارالشفاء تو تقریباً ختم ہوگیا تھا اس پر لوگوں نے قبضے کر کے گھر بنالئے تھے، سرسید احمد کا مشاہدہ ہے کہ:

''سابق حکیم بیٹھتے تھے اور دوائی خانہ رہتا تھا اب لوگ رہتے ہیں اور گھر بھی بن گئے ہیں'' (۲)

دارالبقاء کی عمارت بھی ٹوٹ پھوٹ گئی تھی اور بالکل ویران پڑی تھی، مولانا مفتی صدر الدین آزردہ نے اسکی مرمت اور تجدید کرائی، جو حجرے گر گئے تھے انکو دوبارہ بنوایا، تعلیم کیلئے علماء ملازم رکھے اور جو طالب علم یہاں پڑھتے تھے اور رہتے تھے انکے خرچہ کی بھی پوری ذمہ داری لی۔ (۳) مگر اس میں درس دینے والے علماء اور طلبہ کی تفصیلات موجود نہیں، تاہم سرسید احمد نے اس مدرسہ کے دو استادوں مولانا حاجی محمد جونپوری اور ملا سرفراز کا ذکر کیا ہے۔

مولانا محمد جونپوری نے شاہ محمد اسحاق سے حدیث پڑھی تھی، ملا سرفراز مفتی صدر الدین کے شاگرد تھے اور دونوں صاحبان مدرسہ دارالبقاء میں تعلیم دیتے تھے۔ (۴) ان کے علاوہ دارالبقاء کے کسی اور مدرس کا سرسید اور کریم الدین پانی پتی وغیرہ نے ذکر نہیں کیا مگر مولانا محمد یعقوب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بھی

---

(۱)۔ آثار الصنادید سرسید احمد (باب سوم ص ۴۷) مطبع سید الاخبار، دہلی: ۱۸۴۷ء

(۲) آثار الصنادید باب سوم ص ۲۳ (منشی نول کشور لکھنؤ ۱۳۱۸ھ، ۱۹۰۰ء)

(۳) آثار الصنادید باب سوم ص ۲۰-۲۱ (طبع اول ۱۸۴۷ء)

(۴) آثار الصنادید باب چہارم ص ۱۷۲-۱۷۳ (طبع اول ۱۸۴۷ء)

(مولانا مملوک العلی کی وفات کے ایک ڈیڑھ سال بعد) کچھ دنوں کیلئے مدرسہ دارالبقاء میں رہے تھے (۱) یہ قیام مفتی صدرالدین آزردہ کی ہدایت پر وہاں درس دینے کیلئے تھا یا کسی اور صورت سے تھا اس کی صراحت نہیں ملی، لیکن اس سلسلہ میں یہ اطلاع صحیح نہیں کہ مدرسہ دارالبقاء میں مولانا مملوک العلی بھی مدرس رہے تھے، مولانا کے مدرسہ دارالبقاء میں مدرس، ملازم یا مقیم رہنے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

بظاہر اس روایت کی اساس نزہۃ الخواطر کی ایک عبارت اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے ایک ملفوظ پر ہے۔ مولانا عبدالحیؒ حسنی نے مولانا مملوک العلی کے تعارف میں لکھا ہے کہ:

"وولی التدریس بمدرسة دار البقاء فدرس و افاد مدة عمره" (۲)

ترجمہ: ان کو مدرسہ دارالبقاء میں پڑھانے کی ذمہ داری دی گئی اور انہوں نے اپنی تمام عمر درس وافادہ میں گزاردی۔

اور حضرت تھانوی کے ایک ملفوظ میں ہے:

"مولانا مملوک العلی صاحب جو کہ مولانا محمد یعقوب صاحب کے والد اور حضرت مولانا رشید احمد و مولانا محمد قاسم صاحب کے استاذ ہیں، دہلی میں دارالبقاء سرکاری مدرسہ تھا اس میں ملازم تھے۔ (۳)

متأخر تمام مآخذ کی اطلاعات ان ہی دو روایتوں سے لی گئی ہیں، لیکن ان دونوں ہی روایتوں میں ایسے اشارات موجود ہیں جن سے معلوم ہو رہا ہے کہ ان میں مدرسہ دارالبقاء کا نام سہواً آ گیا ہے، دونوں کی اصل مراد دہلی کالج ہی تھا، وجوہات درج ذیل ہیں:

الف: مؤلف نزہۃ الخواطر نے اس اطلاع کیلئے حالات مولانا محمد قاسم مؤلفہ مولانا

---

(۱) حالات طیب یا تذکرہ مولانا محمد قاسم، مرتبہ مولانا محمد یعقوب نانوتوی مشمولہ قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی ص: ۱۸۷

(۲) نزہۃ الخواطر، مولانا عبدالحیؒ حسنی ص ۵۰۱ ج ۷ (حیدرآباد: ۱۳۹۹ھ)

(۳) ملفوظات حسن العزیز مرتبہ خواجہ عزیز الحسن مجذوب ص ۴۹۰ جلد اول۔ ملفوظ نمبر ۴۹۵ جلد اول (مکتبہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون: بلاسنہ) نیز قصص الاکابر ص ۳۲ طبع اول: ماہنامہ الہادی دہلی، شعبان ۱۳۵۱ھ

محمد یعقوب نانوتوی کا حوالہ دیا ہے، تحریر ہے:

''کما فی رسالة و لده یعقوب ، فی تر جمة الشیخ قاسم النانوتوی''

مگر اس حوالہ میں کچھ سہو ہوا۔ مولانا محمد یعقوب کی تالیف ''حالاتِ طیب مولانا محمد قاسم'' میں کہیں درج نہیں کہ مولانا مملوک العلی مدرسہ دارالبقاء میں استاذ یا ملازم تھے، اس لئے ''وولی التدریس بمد رسة دار ا لبقاء'' کی نسبت ، حالاتِ طیب مولانا محمد قاسم، کی جانب درست نہیں۔ حالات طیب مولانا محمد قاسم میں مدرسہ دارالبقاء کا صرف ایک جگہ ضمناً ذکر آیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

ایک برس دن کے قریب بعد انتقال والد مرحوم احقر دہلی رہا، پھر نوکری اجمیر کے سبب دہلی چھوٹی اور مولوی صاحب سے جدائی پیش آئی، مولوی صاحب چند روز اس مکان میں تنہا رہے پھر چھاپہ خانہ میں جا رہے، پھر دارالبقاء میں چند روز رہے''(۱)

مولانا محمد یعقوب کی مذکورہ تالیف میں اس اندارج کے علاوہ مدرسہ دارالبقاء کا کہیں حوالہ یا تذکرہ نہیں اور اس عبارت میں مولانا مملوک العلی کے مدرسہ دارالبقاء میں مقیم ہونے یا وہاں مدرس یا طالب علم ہونے کا کچھ ذکر و اشارہ تک نہیں، اسلئے نزھۃ الخواطر کی اس عبارت کے حوالہ سے مدرسہ دارالبقاء میں مولانا مملوک العلی کی ملازمت کا تذکرہ محل نظر ہے۔

ب: مولانا تھانوی کے ملفوظ میں مدرسہ دارالبقاء سرکاری مدرسہ تھا، کے الفاظ بتارہے ہیں کہ حضرت تھانوی کی مراد سرکاری مدرسہ ہے، جو دہلی کالج تھا۔ دارالبقاء سرکاری مدرسہ نہیں تھا، اس کی توسیع و تجدید کا تمام خرچہ مفتی صدرالدین آزردہ نے دیا تھا، وہی اس مدرسہ میں مقیم طلبہ اور ان کے مدرسین کے اخراجات اٹھاتے تھے، اور وہی اس کا انتظام رکھتے تھے اس لئے اس کو سرکاری مدرسہ کہنا درست نہ ہوگا، اس وقت دہلی میں سرکاری انتظام میں ایک ہی بڑا ادارہ تھا، جہاں علوم دینیہ فقہ و حدیث وغیرہ کی تعلیم ہوتی تھی اور وہ دہلی کالج تھا۔ اسلئے یہ اطلاع بھی صاف اور فیصلہ کن نہیں، تاہم ممکن ہے کہ مولانا مملوک العلی نے مدرسہ دہلی (دہلی کالج) میں ملازمت سے پہلے، کچھ وقت مفتی

(۱) تذکرہ مولانا محمد قاسم نانوتوی، مرتبہ مولانا محمد یعقوب نانوتوی ص ۹ (مطبع صادق الانوار بھاول پور ۱۲۹۷ھ)

صدرالدین آزردہ کے مدرسہ دار البقاء میں گزارا ہو، یا درس دیا ہو لیکن یہ زمانہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کیلئے دہلی آنے (۱۲۶۱ھ ۱۸۴۵ء سے بیس بائیس سال پہلے کا ہوگا) مگر اس کی بھی کوئی معتبر شہادت موجود نہیں۔

باب (۷)

مولانا مملوک العلی کے عہد میں دہلی کالج کا نصابِ تعلیم درجوں کی کیفیت، امتحانات کے بہترین نتائج مولانا کے شاگردوں کی اعلیٰ ترین استعداد اور مولانا کی تربیت کے اثرات

مدرسہ دہلی میں مولانا کے درجوں کا نصابِ تعلیم

شروع میں دہلی کالج ایک خالص مشرقی انداز کا مدرسہ تھا اسلئے خیال ہے کہ اس میں شروع شروع میں وہی کتابیں پڑھائی گئی ہوں گی جن کی تعلیم کا علمائے دہلی کے یہاں عام معمول تھا، حدیث تفسیر فقہ اور عربی ادب اسکے خاص مضامین ہوتے تھے، بعد میں تاریخ وغیرہ کچھ اور مضامین کا آہستہ آہستہ اضافہ ہوا۔ کالج کے نصابِ تعلیم کا مرحوم دہلی کالج میں کچھ ذکر آیا ہے، مگر اس میں عربی کے نصابِ تعلیم کی زیادہ تفصیل نہیں ۔ جو معلومات ہیں وہ بھی نا تمام ہیں، مثلاً مولوی عبدالحق نے نصابِ تعلیم میں حدیث شریف کی کتابوں اور اسباق کا قطعاً ذکر نہیں کیا، حالانکہ اس کا معتبر ثبوت ہے کہ اس وقت مدرسہ دہلی کے نصاب میں حدیث کے سبق بھی شامل تھے۔ کریم الدین پانی پتی نے (جو دہلی کالج کا مشہور طالب علم، مؤلف، مترجم، اور تذکرہ نگار ہے) اسپرنگر کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

"(علی اکبر) نے صرف ایک ہدایہ، حماسہ اور حدیث اس کالج میں پڑھی ہے"(۱)

(۱) مکتوب ۴؍جولائی ۱۸۵۲ء، ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۱۷۹۔

اس خط کے الفاظ ''حدیث پڑھی ہے'' سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی ایک نہیں بلکہ کئی کتابیں (فن حدیث) دہلی کالج کے نصابِ تعلیم میں داخل تھیں۔

کریم الدین کے اس قول کی دوسرے معتبر ذرائع بھی تصدیق کر رہے ہیں، خود مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ کالج کی لوکل کمیٹی نے (۱۸۴۷ء میں) کالج کے نصاب میں ترمیم کرتے ہوئے یہ تجویز منظور کی تھی کہ:

''عربی صرف ونحو منطق فقہ اور حدیث وغیرہ کی اعلیٰ کتابیں نصاب میں شامل نہ کی جائیں، بلکہ ان کی تعلیم عام لکچروں کے ذریعہ دی جائے''(۱)

مذکورہ اقتباسات سے یہ واضح ہو گیا کہ مدرسہ دہلی (دہلی کالج) کے نصاب میں حدیث کی تعلیم شامل تھی اور اسکے باقاعدہ سبق ہوتے تھے اور یہ بھی کہ خصوصاً عربی درجوں کے نصابِ تعلیم کے حوالہ سے مولوی عبدالحق کی اطلاعات مکمل نہیں ہیں۔

۱۸۴۳ء میں عربی جماعت کی کتابیں

مدرسہ دہلی ۱۸۲۵ء (۱۲۴۰ھ) میں قائم ہوا تھا اس وقت سے ۱۸۴۲ء (۱۲۵۶ھ) تک تقریباً پندرہ سال کے طویل عرصہ میں کالج کے نصابِ تعلیم میں کیا کیا ترقی اور ترمیمات ہوئیں، طلبہ کی کیا کیفیت تھی، مولانا رشید الدین خاں اور مولانا مملوک العلی کے حلقۂ درس میں کون کون اصحاب تعلیم واستفادہ کیلئے آئے اور دہلی کالج سے کس طرح فیض حاصل کیا، اسکا کچھ تذکرہ نہیں ملا۔ کالج کے عربی درجوں کے نصابِ تعلیم کی، مولوی عبدالحق کی پہلی اطلاع سنہ ۴۰-۱۸۳۹ء کی ہے، اس سال کی اعلیٰ جماعت کے طلبہ جو موالانا مملوک العلی کے شاگرد تھے شمس بازغہ ختم کر چکے تھے، میر زاہد مع حاشیہ عبدالعلی اور مقامات حریری پڑھ رہے تھے، انکی تعلیمی کیفیت پچھلے سالوں سے بہتر تھی، کتابیں بھی معمول (کے نصاب) سے زائد ہوگئی تھیں اور طلبہ کی علمی استعداد بھی تعریف کے لائق تھی۔(۲)

کئی برس تک یہ نصابِ تعلیم جاری رہا ۱۸۴۵ء (۱۲۶۱ھ) میں اسپرنگر دہلی کالج کا پرنسپل مقرر ہوکر آیا اور اس نے کالج کے نصاب میں ترمیم کا فیصلہ کیا، اسپرنگر کی تجویز اور

(۱) مرحوم دہلی کالج ص ۳۰، ۴۳، ۶۵ (دہلی ۱۹۴۵ء)　(۲) مرحوم دہلی کالج ص ۳۰، ۴۷

ہدایت کے مطابق نیا نصابِ تعلیم تجویز ہوا اور کالج میں نافذ کر دیا گیا۔ ترمیم کے بعد نصابِ تعلیم درج ذیل تھا۔

(۱) دیوان متنبّی بعض حصے، درمختار، بعض حصے، اصول حکمت

(۲) وضع قوانین۔

THE PRIN CIPLES .OF GPVENM ENT AND-GEGISLATIPN

(۳) رہنمائے ضابطہ دیوانی۔ مصنفہ مارش مین۔

(4) MARSHMAN.S.GUIDETO THE CIVIL REGULATIONS CHAPTERS

(۴) الجبرا۔ وعلم مثلث تحلیلی مستوی۔

ALGEBRA-ANALYTI-CALPLANE TRIGNOMETRY

(۵) ہرشل کی کتاب ہیئت (ایک حصہ)

HERSHOL.S. ASTRPNOMY)(A-PORTION

نصاب کی یہ کتابیں سنی اور شیعہ دونوں جماعتوں کیلئے تھیں، فقہ کا نصاب دونوں کیلئے علاحدہ تھا۔ سنی طلبہ درمختار، ہدایہ، شرح وقایہ وغیرہ پڑھتے تھے اور شیعہ طلبہ کیلئے انکے مسلک کے مطابق فقہ جعفریہ کی کتابیں شامل درس تھیں۔ تین سال کے بعد ۱۸۴۸ء (۱۲۶۴ھ) میں اس مذکورہ نصاب میں کچھ اور ترمیم کی گئی اب نصاب کی ترتیب اس طرح ہوگئی تھی:

"فقہ میں درمختار، ادب میں تاریخ یمینی (اگر مکمل چھپ جائے) حماسہ پہلا باب۔ جامع التواریخ، سائنس، علم مناظر فلپ۔ علم ہیئت مصنفہ ہرشل احصائے تفرقات"

رام چندر" (۱) DIFFERENTIAL-CALCULUS

ان کے علاوہ طلبہ نے سائنس کی وہ کتابیں پڑھیں جو اردو میں ترجمہ ہوگئی تھیں، جیسے انٹروڈکشن ٹوینول، فلاسفی طبیعیات مؤلفہ ارناٹ وغیرہ مارل سائنس پیلی (PALEY) کی کتاب جہاں تک چھپ گئی ہو، نقشے بنانا (DRAWING) اور پیائش

(۱) مرحوم دہلی کالج ص ۷۸

(SURVEYING) اختیاری مضامین میں شامل تھی (۱) اور ہفتہ میں دو مرتبہ مضمون نویسی کی مشق کرائی جاتی تھی۔(۲)

۱۸۴۹ء (۱۲۶۵ھ) میں اس نصاب میں پھر ترمیم ہوئی:

توضیح حرکیات (DYNAMIES)، علم ہندسہ تحلیلی (-ANALYRICAL GEOMETRY) نیز تاریخ انگلستان کا اضافہ ہوا، ہرشل کی کتاب ہیئت، علم المناظرہ اور جامع التواریخ نصاب سے خارج کر دی گئیں (۳) ۱۸۵۰ء (۱۲۶۶ھ) کے نصابِ تعلیم میں تاریخ ابوالفداء بھی شامل تھی، اگر چہ دہلی کالج کے نصاب میں اسکے بعد بھی کچھ ترمیم ہوئی مگر ۱۸۵۱ء (۱۲۶۷ھ) میں مولانا مملوک العلی کی وفات ہوگئی تھی، اسلئے یہ گفتگو ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

جماعتوں کی درجہ بندی اور ترتیب

مولانا کے درجوں میں جماعت کی ترتیب یہ تھی کہ ابتدائے سال میں بڑی جماعت ہوتی تھی، ان کی کتابیں بیک وقت شروع ہوتی تھیں، اسباق آگے بڑھتے رہتے اور طلبہ کی صلاحیتوں کا زیادہ سے زیادہ اندازہ ہوتا رہتا تھا اور دو تین مہینوں کے بعد اس جماعت کے دو یا تین حصے ہو جاتے تھے۔ جو طلبہ غیر معمولی ذہین اور محنتی ہوتے تھے وہ اور طلباء سے آگے نکل جاتے تھے، انکی جماعت الگ ہو جاتی، وہ تیزی سے آگے بڑھتے رہتے تھے، مدرسین بھی قدرتی طور پر ایسے ہی طلبہ کی طرف زیادہ توجہ کرتے تھے، متوسط طلبہ کی ایک اور جماعت بن جاتی اور معمولی لیاقت کے طلبہ کی اپنی روش اور کچھوا چال علیحدہ ہوتی تھی، جس کا نتیجہ اکثر یہ ہوتا تھا کہ ایک جماعت کا نصاب پورا ہو جاتا دوسرے طلباء کی کم ترقی ہوتی تھی۔ اکثر طالب علم ایسے ہی ہوتے تھے جو دوسری تیسری جماعت میں شریک رہتے تھے، اس سے کالج کی کارگزاری پر حرف آتا تھا اسلئے کالج کی کمیٹی نے اس طریقہ کو بدلنے کی کوشش کی اور یہ طے کر دیا کہ سال کے شروع میں پوری جماعت کا کام (نصاب اور تعلیم کی مقدار) متعین کر دی جائے اور اس کو بارہ مہینوں پر تقسیم کر کے

(۱) مرحوم دہلی کالج ص ۷۹ (۲) مرحوم دہلی کالج ص ۸۰ (۳) مرحوم دہلی کالج ص ۸۱

اسی تناسب سے نصابِ تعلیم بڑھایا جائے۔ اور ماہانہ امتحان میں دیکھ لیا جائے کہ طلبہ نے سبق اچھی طرح سمجھ لئے یا نہیں، جس استاد کے زیادہ سے زیادہ طلبہ کامیاب ہوتے، وہی کارگزار اور اچھا استاذ سمجھا جاتا تھا۔

طلبہ کی (عموماً) تعداد

مدرسہ دہلی یا دہلی کالج بلکہ پورے شمالی ہندوستان میں اپنے طرز کی پہلی درسگاہ تھی جس سے امیدیں اور اندیشے برابر کے تھے، چونکہ اس کی تاسیس اور پورا نظام انگریزوں کی ماتحتی میں تھا اس لئے اول اول اس سے وابستگی میں اکثر لوگوں کو تکلف اور اندیشہ رہتا تھا، مگر جب کچھ دنوں کے بعد اندازہ ہوگیا کہ اس سے تعلیمی ترقی کے علاوہ کوئی اور مقصد نہیں ہے اور اسکے نظام تعلیم کی اور استادوں کی عیسائیت کی تعلیم و تلقین سے مطلق وابستگی نہیں تو یہ بدگمانی دور ہونی شروع ہوئی اور آہستہ آہستہ طلباء کی تعداد بڑھتی گئی، نیچے کے درجوں کے بچوں کی تعداد بڑھی تو اسکا اثر اعلیٰ جماعتوں پر بھی ہوا، اس میں بھی ترقی کے آثار نظر آئے، مگر ترقی کے باوجود خاص طور سے اونچے درجوں میں طلباء کی تعداد بہت زیادہ نہیں تھی۔ ایک موقع پر عربی کی جماعت میں انیس طلباء تھے وہ سب مسلمان تھے، مگر طلباء کی بڑی جماعتیں اور یہ تناسب ہمیشہ نہیں رہا، مختلف دور آئے، طلباء کبھی کم ہوئے، کبھی بڑھ گئے۔ اسکے اسباب بھی مختلف اوقات میں مختلف رہے، ایک مرتبہ کالج میں طلبہ کیلئے وظیفے ختم کئے جانے پر طلبہ اچانک کم ہوگئے تھے ایک سال جب وظیفہ کی تعداد فی طالبعلم پچاس روپے ماہانہ جا پہنچی تھی، طلبہ خاصی تعداد میں ہوگئے تھے۔ غرض اسی طرح اتار چڑھاؤ آتے رہے مگر ۴۱-۱۸۴۰ء (۵۶-۱۲۵۵ھ) کے علاوہ مایوس کن تعداد کبھی نہیں ہوئی۔ مولانا مملوک العلی کے زمانہ ملازمت تک دہلی کالج میں عربی کے طلبہ کی کل تعداد نقشہ ذیل سے معلوم ہوگی۔

(نقشہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

نمبر شمار	سنہ	طلبائے فارسی	طلبائے عربی		نمبر شمار	سنہ	طلبائے فارسی	طلبائے عربی
۱	۱۸۳۵-۳۶ء	۸۱	۶۱		۹	۱۸۴۳-۴۴ء	۵۳	۵۸
۲	۱۸۳۶-۳۷ء	اعداد و شمار درج نہیں	اعداد و شمار درج نہیں		۱۰	۱۸۴۴-۴۵ء	۱۰۹	۷۵
۳	۱۸۳۷-۳۸ء	۵۶	۳۵		۱۱	۱۸۴۵-۴۶ء	۱۱۵	۶۶
۴	۱۸۳۸-۳۹ء	۳۹	۳۵		۱۲	۱۸۴۶-۴۷ء	۵۸	۶۵
۵	۱۸۳۹-۴۰ء	۳۹	۴۱		۱۳	۱۸۴۷-۴۸ء	۴۳	۷۲
۶	۱۸۴۰-۴۱ء	۳۴	۲۸		۱۴	۱۸۴۸-۴۹ء	۴۷	۵۶
۷	۱۸۴۱-۴۲ء	۱۴۶	۱۶		۱۵	۱۸۴۹-۵۰ء	۶۱	۴۳
۸	۱۸۴۲-۴۳ء	۷۵	۴۰		۱۶	۱۸۵۰-۵۱ء	۵۶	۳۹

ایک وقت میں جب کالج کے پرنسپل ٹیلر کی اطلاع (۱) کے مطابق:

''شہر میں متعدد فارسی اور عربی درسگاہیں کھل گئی تھیں اور عربی فارسی پڑھنے والے طلباء ان قومی درسگاہوں میں بٹ گئے تھے'' (۲)

طلبہ کی تعداد بہت کم ہوگئی تھی مگر یہ کیفیت اور تنزل بھی عارضی تھا، اس کے بعد ایک مرتبہ پھر ترقی کے آثار ظاہر ہوئے مولانا مملوک العلی کی جماعت میں ۱۸۴۳ء (۱۲۵۹ھ) میں گیارہ طلبہ ہوگئے تھے، اور بعد میں بھی کم زیادہ ہوتے رہے۔

۱۸۴۷ء (۱۲۶۳ھ) میں دہلی کالج کے طلبہ کے رجسٹر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال مولانا مملوک العلی کی جماعت میں تین طالب علم تھے، علی اکبر سونی پتی، عبدالرحمٰن اور شمس الدین دہلوی، مولانا نے ان کو درج ذیل کتابیں پڑھائیں تھیں:

درمختار، تاریخ یمینی، جامع التواریخ، دیوان حماسہ، جزئیات رسالہ ہیئت اور علم مثلث (۳)

(۱) مرحوم دہلی کالج ص ۱۰۹ (۲) مرحوم دہلی کالج ص ۵۴ (۳) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۲۵۵

مگر اس سے یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ اس سال میں مولانا نے صرف انہی تین طالب علموں کو پڑھایا، بلکہ ایک خاص جماعت میں صرف تین طلبہ تھے، مولانا مملوک العلی اور عربی کے دوسرے استادوں کے پاس ایک سے زیادہ جماعتوں کے سبق ہوتے تھے اور ہر ایک جماعت میں کم زیادہ طلبہ رہتے تھے۔

وظیفوں کا نظام

گزشتہ سطور میں اجمالاً ذکر آچکا ہے کہ دلّی کالج مین طلبہ کیلئے وظیفہ کا بھی انتظام تھا، ہمت افزائی کیلئے وظیفہ دیئے جاتے تھے اور معاش کے لحاظ سے کمزور طلبہ کی مدد کیلئے بھی وظیفے جاری ہوتے تھے۔ اس کا سلسلہ کالج کے تقریباً ابتدائی وقت سے شروع ہوگیا تھا، جو کمی یا اضافہ کے ساتھ برابر جاری رہا، درمیان میں جب ۱۸۳۵ء میں وظیفہ دیئے جانے کا معمول ختم کردیا گیا تو کالج کو اس کا نقصان اٹھانا پڑا۔ اس کی وجہ سے طلبہ کی ایک خاصی تعداد کالج سے علیحدہ ہوگئی تھی جس میں بعض بہت اچھے اور لائق طالب علم بھی تھے (۱) اسلئے ۱۸۴۱ء (۱۲۵۷ھ) میں دوبارہ وظیفہ رائج کیا گیا اس میں مختلف درجے اور مراتب تھے مگر فرقِ مراتب کے باوجود عربی کی اعلیٰ جماعتیں قسم اول کے وظیفے حاصل کرنے میں سرفہرست رہیں۔ کالج کے شروع کے چند سال تک وظیفہ کی تعداد تین روپے ماہانہ یا کم زیادہ ہوگئی تھی، اس وقت وظیفوں کا خاصا حصہ عربی جماعتوں کو ملتا تھا، یہی صورت وظیفوں میں اضافہ اور کالج کی ترقیات کے دور میں رہی۔

۱۸۴۳ء (۱۲۵۹ھ) میں دہلی کالج میں دوطرح کے وظیفے دیئے جاتے تھے، سینئر (اعلیٰ) جونیر (ادنیٰ)، اعلیٰ درجہ کا وظیفہ تیس یا چالیس روپئے ماہوار تھا اور ادنیٰ پچیس روپئے سے چار روپئے ماہانہ تک، ۱۸۴۵ء (۱۲۶۱ھ) میں عربی شعبہ کے جن طلبہ کو وظیفہ ملتا تھا ان میں دس کو اعلیٰ (سینئر) وظیفہ ملتا تھا اور چار کو ادنیٰ (جونیر (۲)

دوسال بعد سنہ ۴۸-۱۸۴۷ء (۶۳-۱۲۶۲ھ) میں عربی شعبہ کے نو طلبہ کو اعلیٰ اور ادنیٰ درجہ کے اٹھارہ طلباء کو وظیفہ ملتا تھا۔ ۱۸۴۹ء میں (پچھلے سال جن طلباء کا وظیفہ جاری

(۱) مرحوم دہلی کالج ص ۹۶ (۲) مرحوم دہلی کالج ص ۱۰۱

ہوا تھا، انکے علاوہ) مزید چار طلبہ کو اعلیٰ اور آٹھ کو ادنیٰ درجہ کا وظیفہ ملتا تھا، ۱۸۴۹ء (۱۲۶۵ھ) میں عربی کی جماعت کی مندرجہ ذیل کتابوں کیلئے اعلیٰ وظیفہ تجویز کیا گیا تھا۔

''مقامات حریری۔نصف اول،شرح وقایہ نصف ،نفحۃ الیمن ،ترجمہ اردو سے (عربی) اقلیدس چھ مقالے،الجبرا تا مساوات درجہ چہارم،جغرافیہ،تاریخ ہند'' (۱)

وظیفہ میں یہ اضافہ غالباً مولانا مملوک العلی کے زمانۂ ملازمت (بلکہ زندگی کے آخری سال ۱۸۵۱ء،۱۲۶۷ھ) کا آخری اضافہ ہوگا۔

سنہ ۱۸۳۰ء کا اہم ترین امتحان

مولانا مملوک العلی کے تقرر کے پانچ سال بعد ۱۸۳۰ء (۴۶-۱۲۴۵ھ) میں کالج کے طلبہ کا امتحان ہوا۔جس میں طلبہ کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی،طلبہ کی لیاقت اور سوالات کے جوابات توقع سے بہت عمدہ نکلے،کالج کی کمیٹی نے امتحان میں اول آنے والوں کیلئے جس قدر انعامات دینے کا ارادہ کیا تھا اس سے زیادہ انعام دیئے گئے،اس امتحان کے نتیجوں کی بہت شہرت ہوئی، کالج کے سکریٹری نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ:

''جس قدر انعام ہم نے رکھے تھے اس سے زیادہ دینے پڑے،اس لئے کہ طلبہ کی استعداد ایسی عمدہ اور ان کے جوابات ایسے کامل تھے کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینی مشکل تھی ۔ بہت سے دیسی شرفاء جو امتحان کے وقت موجود تھے اپنے شہر کے ہونہار بچوں کی لیاقت دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ ساتے تھے'' (۲)

سنہ ۳۸-۱۸۳۷ء (۵۳-۱۲۵۲ھ) کے امتحانات

کالج کا تعلیمی سلسلہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا، اگرچہ درمیان میں ایک دو سال عربی کی جماعت میں طلبہ بھی کم رہے تھے وہ امتحان میں اچھے نمبر نہیں لا سکے تھے، مگر یہ کیفیت جلد ہی ختم ہوگئی تھی، ۱۸۳۷ء (۵۳-۱۲۵۲ھ) کے امتحانات پھر اسی روایتی شان سے ہوئے، اکثر طلبہ امتحان میں کامیاب ہوئے، امتحان لینے والوں نے طلبہ کی صلاحیت کی تعریف کی۔ (۳)

(۱) مرحوم دہلی کالج ص ۱۰۳ (۲) مرحوم دہلی کالج ص ۱۱ (۲) مرحوم دہلی کالج ص ۲۹

۱۸۳۸ء کے آخر میں کالج کے سالانہ امتحانات منعقد ہوئے، امتحان کے وقت دہلی کے معزز ترین اصحاب اور اہل فضل و کمال امتحان گاہ میں موجود تھے، انہوں نے اپنی آنکھوں اور کانوں سے امتحان کا حال دیکھا سنا اور:

''وہ طلبہ کی لیاقت اور جوابات سے بہت خوش ہوئے۔(۱)

عربی جماعت کے عربی ترجمے اور فارسی انشاء پردازی کے نمونے گورنمنٹ کو بھیجے گئے، گورنمنٹ نے انہیں بہت پسند کیا۔

۴۰-۱۸۳۹ء کی تعلیمی کیفیت

سنہ ۴۰-۱۸۳۹ء میں اگر چہ نصابِ تعلیم گزشتہ سالوں سے زیادہ تھا مگر پھر بھی طلبہ کی علمی استعداد اچھی تھی، عربی کی اعلیٰ جماعت شمس بازغہ ختم کر چکی تھی، میر زاہد مع حاشیہ عبد العلی اور مقامات حریری پڑھ رہی تھی۔

سنہ ۱۸۴۸ء (۱۲۶۴ھ) کا سالانہ امتحان اور اس میں کامیابی

سالانہ امتحان عیسوی سنہ کے آخر میں ہوتا تھا، اور اس زمانہ میں بڑی سالانہ تعطیلات دسمبر کے آخر میں ہوا کرتی تھی، اسی معمول کے مطابق ۱۸۴۸ء کا امتحان ہوا، یہ امتحان ۲۴ نومبر سے ۲۱/دسمبر ۱۸۴۸ء (ذی الحجہ محرم ۶۵-۱۲۶۴ھ) تک جاری رہا۔ عربی کی متوسط اور اعلیٰ کتابوں، تاریخ مسعودی، تاریخ یمینی، قدوری، میر قطبی، حماسہ، متنبّی (۲) کا تحریری امتحان ہوتا تھا، سوالات کے پرچے گورنمنٹ نے بنا کر بھیجے، جوابات مولانا مفتی صدر الدین آزردہ نے ملاحظہ کئے، مفتی صاحب کی رائے میں ان جماعتوں کی قابلیت نہایت عمدہ تھی۔

سنہ ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۱ء تک

۱۸۴۸ء کا سالانہ امتحان مولانا مملوک العلی کے زمانۂ ملازمت و تعلیم کا آخری امتحان ہے جس کا

(۱) مرحوم دہلی کالج ص ۳۰

(۲) مرحوم دہلی کالج میں ''میاں حسینی'' چھپا ہوا ہے ص ۴۴ (دہلی ۱۹۴۵ء جو صحیح معلوم نہیں ہوتا غالباً ''متنبّی'' صحیح ہوگا۔

مولوی عبدالحق نے کسی قدر مفصل ذکر کیا ہے۔ اس سال کالج کے کئی فارغین مختلف مدرسوں میں مدرسی کیلئے نامزد کیے گئے اور انہوں نے اپنے اپنے علاقہ میں علمی ترقی کیلئے کام کیا، دہلی کالج کا اخبار قران السعدین بھی اس کا معترف تھا، قران السعدین نے ایک شمارہ میں لکھا ہے:

”سالہائے گزشتہ میں اکثر لوگ متعلق مدرسہ کے علاقہ ہائے مدرسی پر مدارس گردونواح کے مقرر ہوئے ہیں اور طالب علموں وغیرہ میں واسطے تربیت کرنے اپنے ہم وطنوں کے اتنا میل اور خواہش دلی ہے کہ انہوں نے اپنی جیب خاص سے روپیہ خرچ کر کے ایک مکتب واسطہ تعلیم بے کس یتیموں کے شہر دہلی میں مقرر کیا ہے، ان جمیع باتوں سے ظاہر ہے کہ مدرسہ دہلی راہ راست میں طے منازل کرتا جاتا ہے اور اس کے وسیلہ سے علم کو ترقی ہے“(۱)

اس کے بعد مولانا مملوک العلی نے دہلی کالج میں دو سال اور گزارے مگر ان کی تعلیمی کیفیت اور امتحان کا تذکرہ راقم سطور کو نہیں ملا، اور ۱۸۵۱ء میں مولانا رحلت فرما گئے تھے، اس لئے یہاں بعد کی رپورٹوں کے ذکر کی ضرورت نہیں۔

مولانا مملوک العلی کے شاگردوں کی اعلیٰ استعداد

مولانا مملوک العلی کی علمی صلاحیت کا تعارف کرانا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ جو طالب علم مولانا کی خدمت میں پہنچا جوہر آب دار بن کر چمکا، مولانا کی صلاحیت اس درجہ کی تھی اور درسیات کی نئی پرانی تمام کتابیں اس طرح مولانا کے حافظہ میں تھیں کہ خطا مشکل تھی، مولوی کریم الدین پانی پتی لکھتے ہیں:

”کیوں کہ وہ فاضل ایسا ہی ہے کوئی کتاب کسی فن کی مشکل اس کے پاس لیجاؤ حفظ پڑھا دیں گے، گویا اس کو حفظ کر رکھی ہے“(۲)

---

(۱) صوبہ شمالی ومغربی کے اخبارات، ومطبوعات، محمد عتیق صدیقی ص۲۷۲ (علی گڑھ۔۱۹۶۲)

(۲) طبقات شعرائے ہند ص ۴۶۲ عکس طبع اول مطبوعہ لکھنؤ: ۱۹۸۲ء

کریم الدین کی یہ اطلاع مبالغہ سے پاک ہے، اور ذرائع کے علاوہ سرسید احمد کے الفاظ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ سرسید احمد نے جو مولانا کے شاگرد تو نہیں مگر مولانا سے اچھی طرح واقف اور دہلی کے اونچے علمی حلقوں اور ممتاز علماء کی مجلسوں کے صحبت نشیں تھے، مولانا کی یادداشت اور قوتِ حافظہ کا یوں ذکر کیا ہے:

"علم معقول و منقول میں استعداد کامل اور کتب درسیہ کا ایسا استحضار ہے کہ اگر فرض کرو کہ ان کتابوں سے گنجینۂ عالم خالی ہو جاوے تو ان کی لوحِ حافظہ سے پھر نقل ان کی ممکن ہے"(۱)

جب مولانا مملوک العلی دہلی کالج کے مدرس مقرر ہوئے اس وقت دہلی علماء کی کثرت اور بے نظیر علمی حلقوں اور مجالس تعلیم و تربیت کی وجہ سے برصغیر میں ممتاز تھی، ہر طرف سے اعلیٰ سے اعلیٰ استعداد کے طلبہ اور فاضل اصحاب دہلی آتے تھے اور یہاں کے علماء کی مجلسوں میں نیازمندانہ حاضری اور ان سے تعلیمی استفادہ کو ایک نعمت، اعزاز اور بڑی دولت سمجھتے تھے۔ حضرت شاہ محمد اسحاق، شاہ محمد یعقوب، خاندان ولی اللّٰہی کے دوسرے علماء نیز مولانا مفتی صدرالدین آزردہ، مولانا فضل حق خیرآبادی، مولانا محمد حیات پنجابی دہلوی، حضرت مولانا شاہ غلام علی، شاہ احمد سعید مجددی، مولانا نوازش علی اور بہت سے فخر روزگار علماء دہلی میں جلوہ فرماتے اور علماء و طلباء کو فیضیاب کر رہے تھے۔ ایسے بھرپور علمی ماحول میں کسی نوآموز طالب علم کا مدرس مقرر ہونا اور اسکے حلقۂ درس کی طرف طلباء اور اہل ذوق کی توجہ اور اس سے استفادہ کا شوق ایک بڑی بلکہ بہت غیر معمولی بات تھی، مولانا مملوک العلی کی اعلیٰ صلاحیت کا کمال، درسی کتابوں پر عبور، فنی اصطلاحات و رموز سے گہری واقفیت اور ان کا بروقت گہرا ادراک، انکے سمجھانے اور ذہن پر نقش کرنے کی اعلیٰ صلاحیت، عمدہ قوتِ تفہیم، زیرِ تدریس کتابوں اور طلبہ پر مضبوط گرفت، طلبہ کی ذہنی تربیت و ترقی پر قابو یافتہ ہونے کی دلیل ہے، اگرچہ یہ تمام کمالات بیک وقت بہت کم علماء کے حصہ میں آئے ہیں، لیکن یقیناً مولانا مملوک العلی کو ان سب صلاحیتوں سے بھرپور حصہ

(۱) آثار الصنادید، باب چہارم ص ۷۰ (نول کشور لکھنؤ ۱۳۱۸ھ)

ملا تھا اور مولانا نے ان سے ہر طرح سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اس صلاحیت سے ایسے ایسے لعل و گہر تراشے جن کی تابانی نگاہوں کو خیرہ کرتی ہے۔ مولانا مملوک العلی کے اسی کمال کا ذکر کرتے ہوئے مولانا رشید احمد گنگوہی فرمایا کرتے تھے کہ:

''اس زمانہ میں اچھے اچھے استاد دہلی میں موجود تھے مگر ایسے استاد کہ مطلب پوری طرح ان کے قابو میں ہو اور انواعِ مختلفہ سے تقریر کر کے شاگرد کے ذہن نشین کر دیں ایک ہمارے استاد مولانا مملوک العلی صاحب اور دوسرے ہمارے استاد مفتی صدر الدین صاحب تھے رحمۃ اللہ علیہما''(۱)

مولانا اپنے ایک ایک شاگرد کی اس طرح نگرانی و تربیت فرماتے اور اس کی تعلیمی ترقی کا ایسا لحاظ رکھتے اور اس کو یوں قدم بہ قدم آگے بڑھاتے کہ اس کی فطری صلاحیتیں چمک جاتی تھیں اور وہ علمی استعداد میں اپنے ہم عمر طالب علموں اور دوسرے طلبہ سے بھی عموماً ممتاز رہتا تھا اور ان کا علمی جوہر ایسا صیقل ہو جاتا تھا اور ان کی علمی استعداد اس قدر نمایاں ہو جاتی تھی کہ طلبہ کے ممتحن (جن میں مغربی یورپین فاضل بھی ہوتے تھے اور مولانا مفتی صدر الدین آزردہ جیسے نادرِ روزگا علماء بھی) مولانا کے شاگردوں کی پختہ صلاحیت، ذکاوت، حاضر جوابی اور زیر تعلیم موضوعات پر فنی گرفت سے حیرت زدہ ہو کر رہ جاتے تھے اور یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے کہ مولانا:

یہ جماعت طالب علموں کی ہے یا فاضلوں کی؟''(۲)

اس زمانے میں (اور بعد میں بھی) اچھے اساتذہ ابتدائی کتابوں کی تعلیم کو اصل اور تعمیر کی بنیاد کا پتھر سمجھتے تھے اسلئے ابتدائی کتابوں پر طلبہ سے اس قدر محنت کراتے تھے اور ان کو اس طرح تیار کر دیتے تھے کہ طلباء کا آئندہ کا تعلیمی سفر بہت آسان ہو جاتا تھا اور اس کی وجہ سے اکثر طلباء متوسط اور اعلیٰ کتابیں خود ہی نکال لیتے تھے، طریقۂ تعلیم یہ تھا کہ

(۱) تذکرۃ الرشید ج ۱ ص ۳۰-۳۱ سہارنپور: ۱۹۷۷ء

(۲) تذکرہ رحمانیہ (سوانح قاری عبد الرحمان پانی پتی) تالیف مولانا عبد الحلیم انصاری ص ۴۸ عکس طبع اول ۱۳۵۷ھ (لاہور: ۱۴۰۰ھ)

طالب علم خود کتاب حل کرتا اور پوری تیاری کے بعد استاذ کے سامنے اپنا سبق پڑھتا تھا، استاذ صرف اس کی عبارت سنتا اور کتاب فہمی کی لیاقت پر نظر رکھتا تھا کہ یہ طالب علم کہاں کیا پڑھ رہا ہے کیوں پڑھ رہا ہے، وہ غلط ہے یا صحیح، اور کہیں کہیں استاذ شاگرد سے کچھ معلوم بھی کر لیتا تھا، طالب علم پڑھتا رہتا استاذ سنتا رہتا اور اسی پر سبق ختم ہو جاتا تھا۔ اس کا مطلب یہ سمجھا جاتا تھا کہ شاگرد میں اس کتاب کے سمجھنے کی ابتدائی صلاحیت پیدا ہوگئی، جب استاذ کو اس بات کا اطمینان ہو جاتا تو اس کتاب کا پورا کرنا ضروری نہیں تھا اس کو کسی باب یا فصل پر ختم کر کے اس کے بعد کی کتاب شروع کرا دی جاتی تھی۔

اس طریقۂ تعلیم کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ تھا کہ جب طالب علم درسیات مکمل کر کے نکلتا تھا بلکہ بعض صورتوں میں درسیات مکمل کرنے سے پہلے نئے طالب علم اس کے پاس استفادہ اور تعلیم کیلئے آنا شروع ہو جاتے تھے، اس سے بڑے طالب علموں کو دوہرا فائدہ ہوتا تھا جو کتابیں اب تک انہوں نے پڑھی تھیں وہ منجھ جاتی تھیں اور تعلیم کے ساتھ ہی پڑھانے کی بھی ایسی مشق ہو جاتی کہ جب وہ پڑھنے سے فارغ ہوتے تو اچھے مشاق مدرس ہوتے تھے اور بڑی سے بڑی جگہوں پر ذہین سے ذہین طالب علموں کو بلا تکلف پڑھا سکتے تھے۔ اس طرح تعلیمی تجربہ کی وہ کٹھن منزل جو آجکل برسوں کی تدریسی مشغولیات کے بعد بھی مشکل سے حاصل ہوتی ہے تعلیم سے فراغت پر طالب علم کا زادِ راہ ہوتی تھی اور وہ نوعمری سے اپنے لئے تدریس کے ضوابط اور راہِ عمل متعین کر لیتا تھا۔ اس کے مستقبل کا تعلیمی تدریسی سفر بہت خوش اسلوبی سے طے ہو جاتا تھا۔ مولانا مملوک العلی کا نظامِ تعلیم بھی اسی ترتیب پر مرتب تھا۔

اگرچہ مولانا کے دہلی کالج میں پڑھے ہوئے شاگرد بھی ایک سے بڑھ کر ایک اور لائق فائق تھے مگر جن طالب علموں نے مولانا کے کالج سے فارغ اوقات میں گھر پر پڑھا انکا رنگ ہی کچھ اور ہے، غالباً اسکی وجہ یہ ہے کہ مولانا کالج میں کالج کے نصابِ تعلیم کو مقررہ اوقات اور کالج کے ضابطوں کے مطابق پڑھاتے تھے مگر گھر پر تعلیم کا طریقہ مختلف تھا،

کتابیں بھی مختلف ہوتیں اور اکثر طالب علم بھی وہ ہوتے تھے جو کالج میں داخل نہیں تھے۔

مولانا نے اپنے بلکہ علماء کے قدیم طریقۂ تعلیم کا انہی طلبہ پر تجربہ کیا اور اس میں نہایت کامیاب رہے متوسطات کی کتابوں سے عموماً آخری کتابوں تک زیادہ زور اسی پر ہوتا تھا کہ طالب علم سبق خود حل کر کے لائے، اسکو کتاب کے صرفی نحوی مباحث اور کتاب کے موضوع ومندرجات پر فی الجملہ عبور حاصل ہو اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کے الفاظ میں:

> ''استاذ جو چاہے پوچھ لے اور شاگرد کچھ نہ پوچھے، وہ کتاب گویا پڑھ لی، اس کے بعد (کتاب) ختم کرنا ضروری نہ تھا، اگر شاگرد کا جی چاہتا تو دورہ (حدیث کی کتابوں) کی طرح سے فرفر سنا کے ختم کر دیتا''۔(۱)

مولانا مملوک العلی کے یہاں بھی یہی طرزِ تعلیم رائج تھا خصوصاً چند ذی شعور استعداد کے طلبہ کیلئے تو گویا اسی کا قانون تھا کہ وہ سبق کی عبارت پڑھتے رہیں، مولانا توجہ سے سنتے رہیں۔ بعض مرتبہ بڑی کتابوں کے تیز رفتار سے سبق پڑھنے والوں پر انکے بعض ساتھیوں کو بھی شبہ ہو جاتا کہ یہ بغیر سمجھے یوں ہی پڑھے جا رہے ہیں، ایک مرتبہ ایسا ہی اتفاق حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ساتھ ہوا تھا، مولانا محمد قاسم کسی اونچی دقیق کتاب کا سبق لے رہے تھے، کتاب کی عبارت اس طرح پڑھتے جا رہے تھے جس طرح حافظ منزل سناتا ہے، کہیں کہیں کوئی لفظ کہتے اور باقی عبارت کا ترجمہ تک نہ کرتے تھے، مولانا مملوک العلی کے اور شاگردوں کو خیال ہوا کہ یہ طالب علم ان کتابوں کو سمجھتے نہیں یوں ہی پڑھتے آگے بڑھے جا رہے ہیں اور نام کیلئے کتاب ختم کرنا چاہتے ہیں، شاگردوں میں سے کسی نے یہ بات مولانا مملوک العلی سے بھی کہہ دی: حضرت! یہ تو کچھ سمجھتے معلوم نہیں ہوتے، مولانا نے فرمایا:

> ''میاں! میرے سامنے طالب علم بے سمجھے نہیں چل سکتا''(۲)

مولانا مملوک العلی کے خلف الرشید مولانا محمد یعقوب فرماتے ہیں:

---

(۱) آپ بیتی شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا، ص: ۴۴ حصہ دوم طبع اول (سہارنپور بلاسنہ)

(۲) حالات طیب مولانا محمد قاسم نانوتوی مشمولہ قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، ص: ۱۸۰

"واقعی ان کے سامنے بے سمجھے چلنا مشکل تھا، وہ طرزِ عبارت سے سمجھ لیتے تھے کہ یہ مطلب سمجھا ہوا ہے یا نہیں" (۱)

مولانا مملوک العلی طالب علم کے پڑھنے کے انداز سے سمجھ لیتے تھے کہ یہ اس کتاب کی عبارت کو کس قدر سمجھ کر پڑھ رہا ہے اور اس کے ذہن میں اس کا مطلب کہاں تک حاضر ہے، جب استاذ ایسا فہیم اور صاحبِ نظر ہو تو ظاہر ہے اس تربیت گاہ سے نکلنے والے طلبہ بھی علم و صلاحیت میں ممتاز ہی ہوں گے۔

حضرت مولانا کے شاگردوں کا ایک اور غیر معمولی کمال جو کتابیں پڑھیں ہی نہیں ان کا امتحان اور اس میں اعلیٰ کامیابی

حضرت مولانا مملوک العلی کی تدریس و تربیت کا ایک غیر معمولی کمال یہ تھا کہ مولانا طلبہ کو اس طرح تیار اور کامل بنا دیتے تھے کہ ان کو بڑے سے بڑے امتحان میں بیٹھنے میں تکلف نہیں ہوتا تھا، یہی نہیں کہ وہ حضرت مولانا سے پڑھی ہوئی کتابوں میں طاق ہوتے تھے، ان کو فرفر پڑھتے چلے جاتے تھے اور کڑے سے کڑے امتحان میں کامیاب رہتے تھے، بلکہ حضرت مولانا مملوک العلی کے خاص شاگردوں نے جن کتابوں کو حضرت مولانا یا کسی اور استاذ سے پڑھا بھی نہیں تھا حضرت مولانا ان کا امتحان دلواتے اور مولانا کے فیضان علمی کا اثر کہئے یا کرامت کہ وہ طلبہ اپنے ایسے امتحانات میں بھی اعلیٰ درجہ سے کامیاب رہتے تھے۔ غالباً اس وقت دہلی کالج کے نظام میں اس کی گنجائش تھی کہ جو طلبہ کالج کے استادوں سے پڑھتے تھے وہ کالج میں داخلہ کے بغیر بھی کالج کے امتحانات میں شرکت کر سکتے تھے، مولانا مملوک العلی نے ایسے کئی موقعوں پر اپنے شاگردوں کو امتحانات میں بٹھایا اور ممتحن نے مولانا کی محنت اور شاگردوں کی لیاقت کا اعتراف کیا، اس قسم کے دو واقعات قابل ذکر بلکہ ناقابل فراموش ہیں، دونوں نقل کئے جاتے ہیں۔

(۱) حالات طیب مولانا محمد قاسم نانوتوی مشمولہ قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، ص: ۱۸۰

مولانا قاری عبدالرحمٰن پانی پتی کا معقولات کی کتابوں کا پڑھے بغیر امتحان دینا

مولانا مفتی صدرالدین آزردہ کی مولانا سے دوستانہ چشمک اور چھیڑ چھاڑ چلتی رہتی تھی، ایک مرتبہ افسر اعلیٰ نے مولانا مملوک العلی کو لکھا کہ مدرسہ کا امتحان مفتی صدرالدین آزردہ میرے سامنے لیں گے، مولانا سمجھ گئے کہ اس میں مفتی صاحب کا دخل ہے، وہ میرے طلبہ کو نیچا دکھانا چاہتے ہیں، اسوقت منجملہ اور طلبہ کے مولانا قاری عبدالرحمٰن پانی پتی مولانا محمد مظہر نانوتوی وغیرہ مدرسہ کے علاوہ اوقات میں مولانا سے مختصر المعانی وغیرہ پڑھتے تھے، مولانا مملوک العلی نے ان کو طلب کیا اور مولانا قاری عبدالرحمٰن سے فرمایا کہ:

''حافظ جیو امتحان دینا پڑے گا''

مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب نے معذرت کی اور عرض کیا کہ میری تعلیم خارج از مدرسہ ہوئی ہے۔ مولانا نے فرمایا ہم نے پڑھایا ہے تم اس پڑھائی میں امتحان دو۔

پھر عرض کیا: کون سی کتاب میں سے امتحان لیا جائے گا، ارشاد ہوا مجھے کیا پتہ کون سی کتاب ہوگی۔(۱)

بعد میں مولانا مظہر نانوتوی نے قاری عبدالرحمٰن سے کہا (جو غالباً قاری صاحب کے رفیق سبق تھے) کہ یہ تو مفتی صاحب مولانا سے چھیڑ کر رہے ہیں، امتحان ہونے دو، دیکھا جائے گا۔ ایک ساتھی اور تھے تینوں نے مشورہ کر کے ایک منصوبہ طے کرلیا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ امتحان کے مقررہ وقت پر مفتی صدرالدین آزردہ تشریف لائے اور معقول کی ایک کتاب میں سے ایک عبارت پڑھوائی، ان ساتھیوں میں سے ایک نے جان بوجھ کر وہ عبارت غلط پڑھی، دوسرے سے پڑھوائی اس نے بھی یہی کیا، تیسرے نے بھی اسی طرح غلط پڑھی، مفتی صاحب نے اس کا مطلب بتانے کیلئے کہا تو جس ترتیب سے عبارت پڑھی تھی اسی پس منظر میں مطلب بتادیا۔ مفتی صاحب نے پھر کہا کیا یہ مطلب صحیح

(۱) تذکرہ رحمانیہ (سوانح حضرت مولانا قاری عبدالرحمٰن پانی پتی) تالیف مولانا عبدالحلیم انصاری پانی پتی ص ۳۷-۳۹

ہے، تو تینوں بیک زبان بولے، اگر یہ مطلب غلط ہے تو آنجناب اس پر اعتراض کریں یا اس کی تردید فرمائیں، یعنی ہم اس کا جواب دیں گے اور اپنے اس مطلب اور عبارت کو صحیح ثابت کریں گے۔ ظاہر ہے کہ ایسی اونچی بات وہی فاضل کہہ سکتا ہے جس نے کتاب پر ہر پہلو سے غور فکر کیا ہو اور اس کو ہر طرح سے پڑھا اور سمجھا ہو، مفتی صدر الدین صاحب بھی جلیل القدر عالم تھے سمجھ گئے کہ یہ معمولی طالب علم نہیں بلکہ فن کے ماہر ہیں، اس لئے اسی پر امتحان ختم کر دیا اور مولانا مملوک العلی سے فرمایا:

"مولانا! یہ جماعت طالب علموں کی ہے یا فاضلوں کی" (۱)

قاری عبدالرحمٰن صاحب فرماتے تھے کہ اسوقت میں نے مولانا مملوک العلی کی طرف نظر اٹھائی تو وہ مسکرا رہے تھے، مولانا نے مفتی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا:

"مفتی صاحب! میرے طالب علم تو ایسے ہی ہوا کرتے ہیں، آپ اعتراض کریں یہ جواب دیں گے"

اسی سوال و جواب پر امتحان ختم ہو گیا اور مفتی صدر الدین آزردہ نے جو ممتحن تھے افسر اعلیٰ سے کہہ دیا کہ:

"جب ان طالب علموں کا یہ حال آپنے دیکھا تو اب مزید امتحان کی ضرورت نہیں رہی، نہایت عمدہ تعلیم ہے، یقین ہے کہ تمام طالب علم ایسے ہی نکلیں گے۔ (۲)

مولانا محمد قاسم نانوتوی کا بغیر پڑھے اقلیدس کا امتحان دینا

ایک اور خاص واقعہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ساتھ پیش آیا تھا، اگر چہ اس وقت حضرت مولانا محمد قاسم کالج کے سالانہ امتحان میں شریک نہیں ہوئے تھے مگر عملاً ایسا امتحان ہو گیا تھا کہ جس کی کالج کے اندر اور باہر خاص شہرت ہوئی تھی۔

مولانا، حضرت مولانا مملوک العلی سے پڑھتے تھے اور دہلی کالج میں بھی داخل تھے،

(۱) تذکرہ رحمانیہ (سوانح حضرت مولانا قاری عبدالرحمٰن پانی پتی) تالیف مولانا عبدالحلیم انصاری پانی پتی ص ۳۷-۳۹

(۲) تذکرہ رحمانیہ ص ۳۹

مولانا مملوک العلی نے ریاضی کے استاذ سے کہہ دیا تھا کہ (مولانا) محمد قاسم کو میں خود پڑھا لوں گا، تم ان کی فکر مت کرنا، اور مولانا محمد قاسم سے فرمایا کہ اقلیدس تم خود دیکھ لو اور قواعد حساب کی مشق کرلو۔

مولانا محمد قاسم نے چند دنوں میں اقلیدس کے مقالات دیکھ لئے اور حساب بھی پورا کرلیا، چونکہ بغیر استاذ سے پڑھے خود اقلیدس کو حل کر لینا اور حساب میں ماہر ہونا بہت ہی انوکھا اور نا قابل یقین واقعہ تھا، اسلئے اس کا بہت چرچا ہوا۔ دہلی کالج کے طالب علموں نے مولانا سے چھیڑ چھاڑ شروع کی اور کئی سوالات کئے، مولانا نے ان کو آسانی سے حل کر دیا تو اور چرچا ہوا، آخر میں منشی ذکاءاللہ چند نئے سوالات لے کر آئے جن میں سے دو سوال بہت مشکل تھے، مولانا نے ان کو بھی حل کر دیا تو اس کا غیر معمولی تذکرہ ہوا، مگر مولانا محمد قاسم غالباً مولانا مملوک العلی کی ہدایت پر امتحان میں شریک نہیں ہوئے تھے جس کا دہلی کالج کے ہیڈ ماسٹر اور پرنسپل ٹیلر (J.H.Tylor) صاحب کو بہت رنج ہوا، کیوں کہ اس قدر ذہین اور غیر معمولی صلاحیت کا طالب علم اگر کالج سے امتحان دیتا تو اس سے کالج کی شہرت اور ناموری میں کس قدر اضافہ ہوتا۔

مولانا کے شاگردوں کا دوسرے مدارس میں، اور بڑے عہدوں پر تقرر

مولانا کی شاگردوں پر محنت، توجہ اور شاگردوں کی اعلیٰ قابلیت کا اس سے بھی اچھی طرح علم ہو جاتا ہے کہ مولانا کے اکثر شاگرد، دہلی کالج سے فارغ ہوتے ہی سرکاری مدرسوں کے مدرس اعلیٰ یا دوسرے ممتاز سرکاری عہدوں کیلئے منتخب کر لئے جاتے تھے، جس میں چند تو ایسے تھے کہ ان کی تعلیم بھی پوری نہیں ہوئی تھی مگر جس قدر تعلیم اور لیاقت تھی اس میں وہ اپنے ہم عمروں اور ان کتابوں کے پڑھنے والوں سے فائق نظر آتے تھے، اس لئے کسی خاص کوشش کے بغیر ان کا سرکاری ملازمتوں یا دوسری اچھی جگہوں پر تقرر ہو جاتا تھا۔ مولانا کے فرزند مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا محمد احسن نانوتوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی کے علاوہ

مولانا مہتاب علی دیوبندی، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، مولوی سمیع اللہ دہلوی، مولوی ذکاء اللہ دہلوی، ڈپٹی نذیر احمد بجنوری دہلوی، کریم الدین پانی پتی کے علاوہ مولانا کے اور بھی کئی شاگردوں (بلکہ اکثر شاگردوں) کے نام لئے جاسکتے ہیں (ان چند مخلصین اور نمونہ سلف اصحاب کے علاوہ جو سرکاری ملازمتوں اور عہدوں سے ہمیشہ علیحدہ رہے اور بلا کسی معاوضہ اور اجرت کے دینی خدمات انجام دیتے رہے) جو دہلی کالج کی تعلیم اور مولانا کے حلقہ درس سے فارغ ہوتے ہی برسر روزگار ہو گئے اور اپنی اعلیٰ علمی صلاحیت کی وجہ سے بڑے بڑے کارنامے اور علمی، دینی، درسی، تحریری، تصنیفی خدمات انجام دیں، جس کی وجہ سے مدرسہ دہلی (دہلی کالج) کی نیک نامی میں بہت اضافہ ہوا اور کالج کے طالب علموں کی محنتوں سے علمی کارواں تیزی سے آگے بڑھا، جس کی دہلی کالج کے کارکنان کو بیحد خوشی تھی اور وہ بہت مسرت کے ساتھ اسکا ذکر کیا کرتے تھے۔

ان سب طلباء کی تربیت اور گوہر تراشی کا عمل حضرت مولانا مملوک العلی کے ہاتھوں سرانجام پایا تھا، اس لئے حضرت مولانا کے ان شاگردوں میں حضرت مولانا کے کمالات و علم کی کرنیں اثر انداز ہوگئی تھیں اور بلاشبہ یہ سعادت مند شاگرد اس سعادت و نعمت کے اظہار میں کہتے ہوں گے کہ:

جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

اور اس حقیقت کے سب ہی اہل علم و کمال صاف معترف ہیں کہ حضرت مولانا کے شاگردوں کی یہ جماعت برصغیر میں احیائے علم و دانش کی علم بردار، آئندہ نسلوں کی رہنما اور ہماری دینی علمی تاریخ کی ایک سنہری کڑی اور اہم عنوان ہے۔

باب (۸)

دہلی کالج کے مختلف علمی تعلیمی شعبوں کی نگرانی دہلی کالج سے چھپنے والے تمام کتابوں رسالوں اوراخبارات کی تصحیح، دہلی کالج کے مطبع کی سرپرستی اس میں حصہ داری اور دیگر علمی مصروفیات

دہلی کالج کی دوسری مصروفیات اورنگرانی

دہلی کالج میں مولانا کی مصروفیات ہمہ گیرتھیں، تمام اوقات تعلیم اور اسباق میں گزرتے تھے، لیکن مولانا کی کالج سے متعلق یہی ایک مصروفیت نہیں تھی بلکہ کالج کے اور بھی کئی کام مولانا کی ہدایت ومشورہ کے پابند تھے۔ کالج کے جملہ علمی تعلیمی امور کی نگرانی مولانا کے سپرد تھی، مشرقی شعبہ کا انتظام اور تعلیم مولانا ہی دیکھتے تھے، کالج کے مطبع سے جو کتابیں چھپتی تھیں اور جو علمی کام ہوتے تھے ان میں مولانا کا مشورہ شامل رہتا تھا۔

دہلی کالج کے علمی تعلیمی نوعیت کے کئی شعبے تھے، ادارۂ تصنیف وتالیف تھا یا دہلی سوسائٹی (Verancular Translation Society) تھی، مطبع تھا اور ہفت روزہ اخبار قران السعدین تھا، حضرت مولانا مملوک العلی ادارہ تصنیف وتالیف کے رکن تھے، دہلی سوسائٹی کی سرپرستی فرماتے تھے، مطبع کے حصہ دار تھے اور اخبار قران السعدین کے شریک مشورہ اورنگراں تھے، اگرچہ اس کی تفصیلات کم معلوم ہیں جو کچھ ملا وہ درجِ ذیل ہے۔

شعبۂ تصنیف

شعبۂ تصنیف وتالیف جس کو سنہ ۵۹-۱۲۵۸ھ میں دہلی سوسائٹی کے نام سے موسوم کیا گیا تھا، دہلی کالج کا ایک اہم شعبہ اور اس زمانہ کا

بڑا کارنامہ تھا۔ دہلی سوسائٹی نے مختلف علوم وفنون کی کتابوں کے اردو میں ترجمہ کرانے اور ان کو چھپوانے کا ایک بڑا منصوبہ بنایا تھا جس میں عربی، فارسی، ہندی، انگریزی کی اعلیٰ درجہ کی کتابیں شامل تھیں۔ یہ کتابیں کالج کی درسی ضروریات اور عوام کیلئے متوسط درجہ کے علمی مطالعہ کے خیال سے لکھوائی جاتی تھیں، رسالے بھی چھپتے تھے، ان دونوں کے بنیادی رکن اور اصل نگراں مولانا مملوک العلی نیز دہلی کالج کے ایک اور نامور مدرس اور عالم مولانا سبحان بخش شکارپوری معلوم ہوتے ہیں۔

دہلی سوسائٹی کے متعلق معلومات کم ملتی ہیں، اسی وجہ سے مولوی عبدالحق، مالک رام اور صدیق الرحمٰن قدوائی نے دہلی سوسائٹی کے قیام اور اس کے مقاصد کا تو خاصا مفصل ذکر کیا ہے مگر سوسائٹی کے بنیادی ارکان، ان کتابوں اور اصلاحی تحریری خدمات کا ایسا ذکر نہیں کیا جیسا کیا جانا چاہئے تھا۔ سوسائٹی کے جن اصحاب کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب انگریز تھے، منصوبہ یقیناً ان کے مشورہ سے بنایا گیا ہوگا، لیکن تصنیف واشاعت کا اکثر کام کالج کے ذمہ داروں نے انجام دیا، جس کی متعدد ذرائع سے مجمل تصدیق ہوتی ہے، اور یہ ہر پہلو سے قرین قیاس بھی ہے کیوں کہ یہ منصوبہ بنانے والوں میں سے دہلی کالج کے پرنسپل بتروس (F. BOUTROS) کے علاوہ کوئی اور ایسا نہیں تھا جو کالج کے علمی تحریری کام اور تصنیف وتالیف کے لئے اپنا وقت فارغ کرسکتا اور یہ لوگ انگریزی کے علاوہ اور مضامین وموضوعات پر ایسی دسترس بھی نہیں رکھتے تھے کہ ان کی مسلسل نگرانی اور اصلاح کرتے، اسلئے سوسائٹی کے کام کی منصوبہ بندی، نگرانی اور سوسائٹی کیلئے عربی فارسی کتابوں کے ترجموں نیز تینوں زبانوں کی تصانیف کا جائزہ لینے کا کام عملاً مولانا مملوک العلی کے سپرد تھا۔ بتروس نے (جو کالج کا پرنسپل تھا) سوسائٹی کی خدمات کے متعلق اپنی ۱۸۴۳ء کی رپورٹ میں لکھا ہے:

> "مدارس کی درسی کتابیں جو اَب تک دہلی کالج یا دوسری درسگاہوں کے استعمال کے لئے طبع ہوئی تھیں ان کے صرف ایک ایک سو نسخے طبع کئے گئے تھے، ان میں سے بہت سی کتابیں ختم ہوچکی ہیں اور بعض مدرسہ (یعنی دہلی کالج کے مشرقی شعبے) میں

جاری ہیں۔ان کتابوں کے متعلق یہ قرار دیا گیا تھا کہ مدرسین پڑھاتے وقت تمام غلطیوں اور مبہم جملوں وغیرہ پر، جو ان کی رائے میں قابل اصلاح ہیں، نظر رکھیں اور قلمبند کرلیں، بعد ازاں یہ مجوزہ اصلاحیں صدر مدرس یا پرنسپل کو دکھائیں اور ان کی پسندیدگی اور مشورے کے بعد دوسرے ایڈیشن میں درج کردی جائیں۔ چونکہ ہر بعد کے ایڈیشن میں یہی طریقہ عمل میں لایا جاتا ہے اس لئے توقع کی جاتی ہے کہ ترجمہ گو شروع میں کیسا ہی ناقص ہو، آخر میں تمام غلطیوں سے پاک صاف ہوجاتا ہے‘‘(۱)

اس رپورٹ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب مشرقی شعبہ کے استادوں کو(اور ایسے ذمہ دار استادوں کے سربراہ مولانا مملوک العلی تھے) ایسے نصاب تعلیم کی نگرانی کرنی پڑتی تھی جس میں ایسی کتابیں بھی شامل تھیں جو انگریزی کتابوں کا ترجمہ تھیں، یا وہ فن اور موضوع ایسا تھا جس سے مشرقی شعبہ کے استادوں (علماء) کو کم واقفیت ہوتی تھی، اس صورت میں یہ استاد، ان ترجموں کو زیادہ توجہ سے پڑھتے تھے اور اپنے شاگردوں کو اہتمام سے پڑھاتے تھے، اس کمال میں بھی مولانا مملوک العلی دوسرے استادوں سے فائق تھے۔ مغربی علوم وفنون کی جو کتاب بھی ترجمہ ہوکر آتی، مولانا اس کا مطالعہ فرماتے اور اس کے اصول کو اس طرح سمجھ لیتے تھے ، جیسا قدیم زمانہ اور طالب علمی سے اس فن کو جانتے ہوں، کریم الدین پانی پتی کا اپنا مشاہدہ ہے، وہ لکھتا ہے کہ:

’’فارسی اور اردو عربی تینوں زبانوں میں کمال رکھتے ہیں، ہر ایک علم وفن سے جو ان زبانوں میں مہارت تامہ ان کو حاصل ہے اور جس فن کی کتاب اردو زبان میں انگریزی سے ترجمہ ہوتی ہیں ان کو اصل اصول سے بہت جلد ان کا ذہن چسپاں ہو جاتا ہے، گویا اس فن کو اول ہی سے جانتے تھے‘‘(۲)

شعبۂ تصنیف کیلئے تحریری خدمات

کالج کے علمی شعبہ نے تصنیف اور ترجموں کا جو بڑا منصوبہ بنایا تھا اسکی ابتداء بھی مولانا مملوک العلی کے ذریعہ سے ہوئی تھی، سوسائٹی کے ترجموں اور تالیفات کی فہرست میں

(۱) مرحوم دہلی کالج ص ۱۳۴ (دلی: ۱۹۴۵ء)

(۲) طبقات شعرائے ہند ص ۴۶۳ (عکس طبع اول لکھنؤ)

سب سے پہلا نام تحریر اقلیدس کا ہے، جسکے چار مقالوں کا مولانا مملوک العلی نے ترجمہ کیا تھا (یہ ترجمہ اسی وقت چھپ گیا تھا) اسکے علاوہ سوسائٹی کیلئے حضرت مولانا نے سنن ترمذی کا اردو ترجمہ کیا تھا (جو چھپا نہیں) تاریخ یمینی مرتب کی اور مسعودی کا خلاصہ تیار کیا۔(۱)

بہر حال مذکورہ اشارات سے دہلی کالج کی علمی سوسائٹی میں مولانا مملوک العلی کی اہمیت اور خدمات کا کچھ اندازہ ہوتا ہے، تفصیلات اس لئے نہیں ملتیں کہ جن لوگوں نے دہلی کالج پر لکھا انہوں نے کالج سے وابستہ علماء خصوصاً مولانا مملوک العلی اور مولانا سبحان بخش کو عموماً نظر انداز کیا ہے اور جو کچھ بھی لکھا ہے وہ بھی ان کی حیثیت کو کم کرتے ہوئے سرسری طریقہ سے لکھا ہے، اس لئے مولانا مملوک العلی کی خدمات کی تفصیل سامنے نہیں آتی۔ مگر اس میں شک نہیں کہ جب بھی شمالی ہند کی تعلیمی ترقیوں اور اردو ادب کی ان ابتدائی کوششوں کا ذکر ہوگا جن کے ذریعہ سے ہمیں علم و دانش میں ترقی کی ایک بڑی راہ ملی تو مولانا مملوک العلی کی خدمات کا ذکر ضرور کیا جائے گا۔ چنانچہ مالک رام نے دہلی کالج اور مولانا مملوک العلی کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''دلی کالج نے نہ صرف اردو کی یہ امتیازی حیثیت ثابت کردی کہ یہ ہر طرح کے موضوع کے اظہار کا ذریعہ بننے کے قابل ہے بلکہ اس نے ایک اور پہلو سے بھی اردو علم و ادب کی لازوال خدمت کی۔ یہیں کے اساتذہ اور طلبہ میں سے وہ اصحاب نکلے جنکے نام آج اردو جاننے والے بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ اردو ادب کا کونسا طالب علم ہے جو امام بخش صہبائی، مولوی مملوک العلی نانوتوی، ماسٹر رام چندر، منشی حکیم چند، رائے بہادر ماسٹر پیارے لال، شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد، شمس العلماء منشی ذکاء اللہ، شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد، شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین، میر ناصر علی ایڈیٹر صلائے عام، مولوی کریم الدین سے واقف نہیں۔ یہ وہ بزرگ ہیں جنکی تحریریں ہماری زبان کا قابل فخر اور رہتی دنیا تک باقی رہنے والا سرمایہ ہیں اور جن کے احسانات سے اردو علم و ادب اور اسکے پڑھنے والے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے''(۲)

(۱) تفصیلات مولانا کی تصانیف کے باب میں آرہی ہیں۔ (۲) قدیم دہلی کالج ص:۶۳

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مالک رام صاحب نے اس اقتباس میں جن صاحبان کے نام ذکر کیے ہیں ان میں سے اکثر مولانا مملوک العلی کے شاگرد یا ان کے تربیت یافتہ ہیں۔

کالج کے اخبارات کی اصلاح ونگرانی

دہلی کالج (یا مدرسہ دہلی) صرف ایک مدرسہ، کالج یا تعلیمی ادارہ ہی نہیں تھا بلکہ متنوع پہلوؤں پر مشتمل بڑی علمی تحریک تھی، جس نے مشرقی علوم کو مغربی فنون کے معیار پر زندہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور اسکے کارکنوں میں ہر شعبہ اور ہر فن کے اعلیٰ درجہ کے ماہرین شامل تھے۔ کالج کا تعلیمی شعبہ شروع سے خوب سرگرم تھا اور علمی دنیا میں اس کی ترقیات کا چرچا عام تھا، دوسرے شعبہ بھی آہستہ آہستہ سرگرم ہو رہے تھے، خصوصاً ڈاکٹر اسپرنگر کے پرنسپل مقرر ہونے کے بعد اس میں بہت تیزی آئی، نئے نئے کام شروع ہوئے اور تیزی سے آگے بڑھے، ان شعبوں میں سے ایک اہم شعبہ صحافت کا تھا، دہلی کالج سے کئی اخبار نکلنے شروع ہوئے جن میں سب سے اہم اور مقبول ترین اخبار قران السعدین تھا، اس کے علاوہ مختلف تاریخوں میں فوائد الناظرین، محب ہند، تحفۃ الحدائق، مفید ہند جاری ہوئے، اگرچہ ان اخبارات کی اشاعت بہت زیادہ نہیں تھی مگر انکے سنجیدہ، علمی تاریخی فکر انگیز مضامین نے علمی طبقہ کو بہت متاثر کیا، بعد میں اور کئی اخبارات اسی انداز پر نکلے اور ان کی وجہ سے صحافت کے مزاج ومذاق میں واضح تبدیلی آئی۔

اگرچہ ان اخبارات کا تعارف اور ان کی اہمیت کا ذکر تاریخ صحافت کا اہم اور خاص موضوع ہے مگر اس تعارف میں بھی ان اخبارات کے مدیران، مضامین اور ان کی تاریخی، علمی افادیت واثرات کا ذکر تو کیا جاتا ہے لیکن اس کا تذکرہ نہیں آتا کہ ان اخبارات کی نوک پلک سنوارنے، ان کے مضامین کی تراش وخراش اور ان کو عام قارئین کے لئے پسندیدہ بنانے اور ان کی معنویت کو چار چاند لگانے میں دہلی کالج کے علماء کا کس قدر وقیع اور ناقابل فراموش حصہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر دہلی کالج کو حضرت مولانا مملوک العلی جیسا فخر روزگار عالم ومدرس نہ ملتا اور مولانا سبحان بخش شکارپوری اور مولانا سید محمد دہلوی جیسے جید علماء دہلی کالج اور ان

اخبارات کے مدیروں کا تعاون نہ فرماتے اور یہ علمائے کرام کالج کی علمی تصنیفی خدمات کی آبیاری کرنے والے نہ ہوتے تو اس کام کا آگے بڑھنا اور عام ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں اور اہل دہلی کا اس ادارہ اور اس کی خدمات کو تعاون اور اعتماد حاصل ہونا سخت مشکل تھا، مگر ان حضرات کی اس بڑی خدمت، کارنامہ اور قربانی کو تقریباً فراموش کر دیا گیا ہے، دہلی کالج کا جب ذکر ہوتا ہے تو ان حضرات کا تذکرہ ضمناً آتا ہے، حالاں کہ اس جسم کی روح یہی اصحاب تھے، اور ان علماء پر عوام کے اعتماد کی وجہ سے ہی مسلمان اپنے بچے کالج میں بھیجنے کیلئے تیار ہوئے تھے، اور کالج کے علمی تعلیمی شعبہ کے علاوہ کالج کے سلسلہ میں تصنیف و تالیف اور کالج سے شائع اخبارات کی مقبولیت و پذیرائی میں بھی مولانا مملوک العلی کی ذاتی وجاہت، علمی مقام اور اس اعتماد کا بڑا حصہ تھا جو مولانا کو عام مسلمانوں میں خصوصاً دہلی میں حاصل تھا، مگر یہاں بھی مولانا کا نام کہیں ضمناً آجائے تو آجائے، یہ کسی نے بھی نہیں لکھا کہ اس کام میں بھی مولانا کی بھرپور شرکت تھی اور یہ کہ حضرت مولانا کی علمی رہنمائی اور مدد دہلی کالج کے اخبارات و رسائل کے مدیروں کو ہمیشہ حاصل رہی۔

قران السعدین دہلی کالج کا ایک معیاری اور معتبر نمائندہ تھا جو اسپرنگر کی کوشش سے ۱۸۴۸ء (۱۲۶۴ھ) میں جاری ہوا تھا، اس کے بعد اور اخبارات نکلے۔ یہ سب دہلی کالج کے استادوں کی کوشش سے نکل رہے تھے، مگر ایک دو بڑے علماء اور ٹیلر و اسپرنگر جیسے اصحاب کے علاوہ کالج کے مدرسین کا تعارف کالج کی وجہ سے تھا اور اسی وجہ سے ان اخباروں کو کالج کا نمائندہ و ترجمان سمجھا جاتا تھا، اور گورنمنٹ کی ہدایت کی وجہ سے کالج کے انگریز ذمہ دار یہ چاہتے تھے کہ کالج کے حوالہ سے جو بھی کام ہو اس پر علماء کی گہری نظر رہے، تاکہ کالج کا نام بے محل استعمال نہ ہو اور کالج کے علمی مقام کو نقصان نہ پہنچے۔ چونکہ کالج کے مطبع سے چھپنے والی ایک ایک چیز کی نگرانی اور اس کی ذمہ داری لینی مشکل تھی، اس لئے کالج کی منتظمہ نے یہ طے کیا کہ پریس کو کالج سے منتقل کر دیا جائے، پریس کالج سے علیحدہ ہو کر آزادانہ کام کر سکتا ہے اور کالج کے اخبارات کی نگرانی آسان ہے، اسلئے چند اخبارات کی کالج سے وابستگی میں کوئی اعتراض نہیں تھا مگر کالج کی کمیٹی نے اسکے لئے

بھی کچھ شرطیں طے کی تھیں، جن کے ذریعہ اخبارات کی مکمل نگرانی کی جاسکتی تھی، اور اخبارات میں چھپنے والے ایک ایک مضمون اور تحریر کا جائزہ لے کر اس کی ذمہ داری لی جاسکتی تھی۔ تفصیلات کا ذکر کرتے ہوئے عتیق احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ:

''یہ تمام اخبار ورسائل مطبع العلوم میں چھپتے ہیں، یہ مطبع پہلے کالج ہی سے متعلق تھا مگر اب کالج سے اس کا واسطہ نہیں۔ وجہ یہ ہوئی کہ کالج کی کمیٹی اس نتیجہ پر پہونچی کہ مطبع چوں کہ کالج کی خالص ملک نہیں ہے اس لئے کمیٹی کو اس پر سولہ آنے اختیار نہیں ہوسکتا اور گورنمنٹ کی خواہش کے مطابق اس مطبع میں چھپنے والی کتابوں کی پوری نگرانی بھی کمیٹی نہیں کرسکتی، چنانچہ یہی مناسب سمجھا گیا کہ مطبع کو کالج کے حدود سے منتقل کئے جانے کے احکام جاری کئے جائیں، لیکن جہاں تک اخبارات کا تعلق ہے کمیٹی اس نتیجہ پر پہونچی کہ ان کی نگرانی کرنا ممکن ہے، اسی کے پیش نظر کمیٹی نے تین مہینوں کے لئے حسب ذیل شرائط پر ان کی نگرانی قبول کرلی''(۱)

عتیق احمد صاحب نے سرکاری رپورٹ کے حوالہ سے ان شرائط کا بھی ذکر کیا ہے جو اخبارات کے مالکان سے کالج کے ذمہ داروں نے طے کی تھیں، یہاں ان شرائط کا مطالعہ مفید ہوگا۔ شرطیں یہ تھیں:

''اشاعت سے پہلے تمام چھپنے والے مضامین کالج کے شعبہ عربی کے اول اور دویم مولویوں کو دکھلائے جائیں، ان مضامین کے جو حصے ان لوگوں کو قابل اعتراض معلوم ہوں، ان کو حذف کرنے کا ان کو اختیار ہوگا''(۲)

اخباروں کے مالکان اور مدیروں نے یہ شرطیں منظور کرلیں اور ان کے مطابق کام شروع ہوگیا۔ قران السعدین کے پہلے ایڈیٹر دھرم نرائن تھے، دھرم نرائن کا جب (اندور) تبادلہ ہوگیا تو موتی لال ایڈیٹر مقرر ہوئے، اس کے بعد سید اشرف علی، پھر اصغر علی اور کریم بخش ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ قران السعدین سنہ ۱۸۴۸ء میں جاری ہوا تھا اور ۱۸۵۲ء تک چھپتا رہا۔ قران السعدین کا اس دور کے اہم اور ممتاز ترین اخبارات میں شمار ہے، اخبارات و

(۱) صوبہ شمالی ومغربی کے اخبارات ومطبوعات ص ۱۰۸ (علی گڑھ: ۱۹۶۲ء)

(۲) صوبہ شمالی ومغربی کے اخبارات ومطبوعات ص ۱۰۹

مطبوعات کی سرکاری رپورٹ میں اس کے متعلق لکھا ہے کہ:

''دہلی کالج سے جو اخبارات شائع کئے جارہے ہیں ان میں قران السعدین بلند ترین معیار کا حامل ہے، اس صوبہ کا کوئی اخبار بھی اس سے زیادہ متنوع اور قابل قدر معلومات پیش نہیں کرسکتا۔ اگر چہ فوائد الناظرین کا پلہ اس میدان میں بہت بھاری ہے جس کا ایڈیٹر ایک ماہوار رسالہ (محب ہند) بھی نکالتا ہے اور ان دونوں کی وساطت سے دیسیوں میں تاریخ و ادب اور یورپ کے دیگر علوم کی بے حد اشاعت ہورہی ہے''(۱)

ان اخبارات کی ترتیب و مضامین پر حضرت مولانا کے مفصل اثرات کا اخبارات کے تفصیلی مطالعہ کے بعد جائزہ متوقع ہے، مگر افسوس ہے کہ ان میں سے ایک اخبار بھی راقم سطور کی دسترس میں نہیں ہے۔

سید اشرف علی کے پریس مطبع العلوم میں شرکت

مدرسہ دہلی (یا دہلی کالج) نے اپنے تعلیمی کام کی ابتداء کے وقت سے ہی طباعت و اشاعت کا کام بھی شروع کر دیا تھا، کالج کی انتظامیہ کا کالج کے علمی تصنیفی شعبہ کو بہت اونچائی تک لیجانے کا منصوبہ تھا، اسلئے جلد ہی کالج کیلئے ایک پریس کا انتظام کیا گیا، یہ مطبع کالج کے احاطہ میں تھا اور مطبع مدرسہ دہلی کے نام سے موسوم تھا۔ شروع شروع میں اس پریس سے صرف کالج کے مصنفین کی تالیفات، ترجمے اور کالج کے رجسٹر وغیرہ چھپتے تھے، باہر کا کوئی کام نہیں ہوتا تھا، مگر جب اسپرنگر پرنسپل مقرر ہو کر آئے انہوں نے کالج کے نصاب و نظام میں اور بہت سی تبدیلیوں کے علاوہ مطبع کے انتظام میں بھی ترمیم کی، اس کا نام بدل کر مطبع العلوم کر دیا اور کالج کے دفتر کے نگراں منشی سید اشرف علی کو پریس کا ناظم بنا دیا، پریس کے اشاعتی کام کو وسعت دینے کی کوشش کی اور چاہا کہ یہ مطبع ایک لمیٹڈ کمپنی کی حیثیت سے آگے بڑھے اور کالج کی مطبوعات کے علاوہ بھی اشاعت کا کام کرے، اس منصوبہ کے مطابق اسپرنگر کی کوشش سے کالج کے کئی مدرسین مطبع کے حصہ دار بن گئے تھے جن میں حضرت مولانا مملوک العلی بھی شامل تھے۔

(۱) صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات ص ۱۰۸

مطبع العلوم ایک بڑا اور قابل قدر اشاعتی ادارہ تھا جس نے سنہ ۱۸۴۹ء سے سنہ ۱۸۵۱ء (۶۷-۱۲۶۵ھ) تک صرف تین سال میں متعدد اہم اور ضخیم علمی کتابیں چھاپی تھیں، غالباً یہی اس مطبع کی ترقی کا سنہرا دور تھا۔ مطبع العلوم کی مطبوعات کی جو فہرست عتیق صدیقی صاحب نے درج کی ہے اس سے مطبع کی عمدہ کارکردگی اور اعلیٰ معیار کا اندازہ ہوتا ہے۔

مطبع العلوم کی چھپی ہوئی کتابوں میں شاندار، ضخیم اور علمی کتابوں کی خاصی تعداد ہے، حضرت مولانا مملوک العلی کی تصحیح سے حضرت مولانا احمد علی محدث نے ترمذی کا جو نسخہ شائع کرنا شروع کیا تھا اسکی طباعت بھی اس مطبع میں ہوئی تھی، شاہ عبدالعزیز کی تفسیر عزیزی اور ٹیک چند بہار کی مشہور تصنیف بہارِ عجم (جو دو بڑی جلدوں میں ہے) اور تالیفاتِ شریفی (۱) جیسی اہم علمی اور خاصی ضخیم کتابیں مطبع العلوم نے شائع کیں، اس کے علاوہ مطبع العلوم کی اکثر مطبوعات مفید اور سنجیدہ موضوعات پر مشتمل ہوتی تھیں، تین سال تک مطبع العلوم کی مطبوعات کی فروخت بہت زیادہ نہیں ہوئی، کچھ کتابیں تو ایسی تھیں جو قابل لحاظ تعداد میں فروخت ہوگئی تھیں، لیکن جو رپورٹ چھپی ہے اس کے مطابق اکثر مطبوعات کی نکاسی کم ہوئی مگر یہ مقدار بھی ایسی معمولی نہیں تھی کہ اس سے مطبع کی معاشی حالت خراب ہوگئی ہو، جب تک کتابیں چھپتی رہیں مطبع العلوم کی مشترکہ حیثیت باقی رہی، پریس ترقی کرتا رہا، مگر جب اسپرنگر کا دہلی سے لکھنؤ (پھر کلکتہ) تبادلہ ہوگیا تو مطبع کی کارکردگی یکلخت متاثر ہوئی، مطبع کے حصہ داروں نے اپنے حصے فروخت کردیئے، جس کی وجہ سے مطبع کی ساکھ پر برا اثر پڑا اور اس کا منافع خسارہ میں بدل گیا۔ مطبع کے مہتمم سید اشرف علی نے اس کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوئے، بالآخر مطبع بند ہوگیا۔ سید اشرف علی نے مطبع کے حصہ داروں کے مطبع سے علیحدہ ہونے اور اپنی مشکلات کا اسپرنگر کے نام ایک خط میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے، یہاں اس کا مطالعہ مفید ہوگا:

---

(۱) تالیفات شریفی یا علاج الامراض، شیخ احمد علی سوداگر کی فرمائش پر سید اشرف علی نے مطبع العلوم، دہلی سے سنہ ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء میں شائع کی تھی یہ کتاب چھوٹے سائز کے نوسو چونتیس (۹۳۴) صفحات پر مشتمل ہے اور اس کتاب کی اس طباعت کا ایک عمدہ نسخہ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

''جس روز سے حضور یہاں سے تشریف لے گئے تو شرکاء مطبع نے مثل مولوی مملوک العلی مرحوم اور مولوی سبحان بخش اور مولوی امام بخش اور میر سید محمد خوشنویس اور اکثر طلبہ وغیرہ نے قریب پچاس حصوں کے بعض نے پورے پر اور بعض نے کچھ کم پر بیچ دیئے، درصورت لاچاری واسطے جاری رکھنے چھاپہ خانہ کے اس نیاز مند نے قریب تیس حصوں کے اور قریب بیس حصوں کے لالہ رادھا کشن خزانچی نے خرید لئے ...... (کاغذ کا دایاں کونا الگ ہو کر گر گیا ہے)...... حصہ داروں کو ادا کر دیا، اب جناب عالی! اس شہر میں بیس چھاپہ خانہ...... (دایاں کونا موجود نہیں)...... اس چھاپہ خانہ اور پرانے چھاپہ خانوں کی رونق گھٹ گئی اور باہر کی چھپائی اور سوسائٹی کی چھپائی کہ جس کے سبب سے بڑی آبادی تھی وہ بسبب نہ تشریف رکھنے حضور کے مطلق نہیں ہوتی، ناچار قرض دام کر کے چھاپہ خانہ ہی کی کتابیں چھاپنی شروع کیں تو اب یہ چھاپہ خانہ دو ہزار روپے کا قرض دار ہو گیا ہے اور آئندہ کو امید نفع کی بسبب کثرت چھاپہ خانوں کے نہیں معلوم ہوتی'' (۱)

اشرف علی کے اس خط سے مولانا مملوک العلی کی اس پریس میں حصہ داری کا اور اس سے علیحدگی کا تو علم ہوتا ہے، مگر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ حضرت مولانا کی اس مطبع سے کس قدر آمدنی تھی اور مولانا پریس کی حصہ داری سے کب سبکدوش ہو گئے تھے۔

مولانا مملوک العلی کی دہلی کالج سے وابستگی کا ایک بڑا فائدہ

حضرت مولانا مملوک العلی دہلی کی کالج سے وابستگی اور اس کی علمی تعلیمی خدمت کی یہ مجمل روداد تھی جو یہاں درج ہوئی۔ مذکورہ تفصیلات سے یہ بھی صاف اور بے غبار ہو گیا کہ مدرسہ دہلی (یا دہلی کالج) کے پروان چڑھانے اور اس کی علمی تعلیمی، تصنیفی اور صحافتی خدمات اور بلند معیار تک پہنچانے اور ان کی ترقی میں مرکزی اور بنیادی شخصیت حضرت مولانا مملوک العلی کی تھی اور دہلی کالج کی شہرت ومقبولیت میں بھی حضرت مولانا کی ذاتی عظمت، بلند وبالا شخصیت اور وجاہت واحترام کا خاص حصہ تھا، مگر یہ بات بہت اہم اور

(۱) خط سید اشرف علی بنام اسپرنگر، ایک نادر مجموعہ مکاتیب، مرتبہ ڈاکٹر محمد اکرم چغتائی ص ۲۳۰

قابل توجہ ہے کہ حضرت مولانا نے دہلی کالج کے تعلیمی مقاصد کو پھیلانے میں تو پوری جدوجہد کی اور اپنی غیر معمولی صلاحیتوں اور محنت سے کالج کے علمی تعلیمی معیار کو اس بلندی تک پہنچا دیا تھا کہ شمالی ہندوستان میں انگریزوں کا کوئی اور ادارہ ایسا باوقعت اور محترم نہیں تھا، مگر حضرت مولانا کا اس ادارہ کے ساتھ یہ تعاون صرف علمی کارواں کے آگے بڑھانے کیلئے تھا اور حضرت مولانا کی دہلی کالج سے وابستگی کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ یہ ادارہ انگریزی معاشرت کی تربیت گاہ اور نصرانیت میں ڈھالنے کا مرکز نہیں بنا۔

یہ ادارہ صرف علمی تصنیفی تعلیم و تربیت کرتا تھا، اور بہ ظاہر یہ مولانا کی نگرانی فرمانے اور نگاہ رکھنے کا اثر تھا کہ حضرت مولانا کی زندگی تک کالج کے استادوں اور طلبہ میں سے (غالباً) کسی ایک شخص نے بھی اپنا مذہب ترک کر کے عیسائیت قبول نہیں کی، کالج کے عملہ میں ماسٹر رام چندر پہلا شخص تھا، جو ہندو سے عیسائی ہوا تھا مگر یہ واقعہ بھی مولانا کی وفات (۱۲۶۷ھ ۱۸۵۱ء) کے بعد کا ہے۔ جس سے یہ بھی تأثر ملتا ہے کہ حضرت مولانا کے رہتے ہوئے کالج پر عیسائی اثرات بہت کم تھے اور مولانا کی موجودگی میں دہلی میں سرگرم عیسائی مبلغین کو بھی اس کی جرأت کم ہوتی تھی کہ وہ دہلی کالج کے استادوں یا طالب علموں کو ورغلا کر عیسائیت میں داخل کر لیں، اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ اگر حضرت مولانا دہلی کالج میں اور کوئی خدمت انجام نہ دیتے تب بھی مولانا کو ہمیشہ اس وجہ سے یاد کیا جاتا کہ مولانا نے اس بڑے اور اہم تعلیمی ادارہ کو مشنری کا تختۂ مشق اور عیسائیت کی پناہ گاہ بننے سے محفوظ رکھا۔ اس بڑی خدمت کے علاوہ دہلی کے مسلمانوں اور علمی حلقہ میں دہلی کالج کی قدر و منزلت میں مولانا کے کالج سے تعلق کا بہت زیادہ حصہ تھا، جسکا سب ہی نے اعتراف کیا ہے، اسلئے اگر یہ کہا جائے کہ کالج کے پہلے پچیس سال کی ترقیات اور تعلیم و تربیت کی تاریخ دراصل مولانا مملوک العلی کے ذاتی فضل و کمال کی تاریخ ہے، تو یہ ایک بڑی حقیقت کا اعتراف اور انصاف و دیانت کے عین تقاضوں کے مطابق ہوگا، مگر خود دلی کالج پر بھی بہت زیادہ نہیں لکھا گیا اور جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں اگرچہ مولانا مملوک العلی کا پورا احترام جھلکتا ہے مگر کالج کی تعلیمی، تصنیفی، ترقی اور معیار وقار کی بلندی میں حضرت مولانا کا جو

بنیادی حصہ اور مقام ہے افسوس ہے کہ اس کا شایانِ شان تذکرہ نہیں ملتا۔

مدرسہ دہلی (یا دہلی کالج) کے علاوہ مولانا کی علمی مصروفیات

حضرت مولانا کی زندگی علم وعمل، تعلیم و تدریس اور تربیت طلباء سے عبارت تھی، مولانا کیلئے تعلیم کی مصروفیت دہلی کالج سے وابستگی کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ کالج سے رابطہ اس ذوق کی وجہ سے ہوا تھا، لیکن حضرت مولانا نے اس رابطہ کو ملازمت کے اصولوں سے آگے بڑھ کر خدمت دین وعلم کے خیال سے قبول فرمایا تھا اور اس میں ایسے انہماک سے لگے کہ کالج کے اوقات کا ایک ایک لمحہ کالج سے وابستہ علماء اور طلبہ کیلئے مفید اور قیمتی بن گیا کالج میں درس و تعلیم کے علاوہ بھی جو مصروفیات تھیں ان میں بھی بھر پور حصہ لیتے تھے بلکہ انکے عملاً ذمہ دار تھے جسکی تفصیلات واشارات گزر گئے ہیں، مگر کالج کی طویل اور تھکا دینے والی مصروفیت بھی مولانا کے بلند خیالات اور عالی حوصلہ کے مطابق نہیں تھی، مولانا چاہتے تھے کہ میرے پاس جو بھی لیاقت وصلاحیت، وقت، صحت اور علم ہے اسکو دین اور علم کی راہ میں لٹادوں، اسلئے حضرت مولانا نے مدرسہ سے فارغ اپنے تمام اوقات بھی درس وتعلیم کیلئے وقف کردیئے تھے۔

مولانا کا کوئی لمحہ بھی تدریس وتعلیم سے فارغ نہیں تھا، تہجد کے وقت سے مدرسہ جانے تک اور مدرسہ سے واپسی کے بعد رات دیر گئے تک، تعلیم واسباق جاری رہتے تھے، مولانا سے تعلیم حاصل کرنے والوں کا اس قدر ہجوم تھا اور مولانا کی تعلیم اور اسباق میں ایسی گہری دلچسپی تھی کہ وہ اوقات بھی جو درس وسبق کے نہیں ہوتے اسی میں مشغول گزرتے تھے، گھر سے مدرسہ (کالج) آنے اور واپسی میں جو وقت راستہ میں گزرتا تھا وہ بھی اسباق کی مصروفیت سے گھرا ہوا تھا، آتے جاتے دونوں وقت سبق ہوتا، طلبہ مولانا کی سواری کے ساتھ دوڑتے اور سبق ہوتا رہتا تھا، تفصیلات گزر چکی ہیں۔

باب (۹)

تحریک سید احمد شہیدؒ سے وابستگی اور حضرت سید احمد شہید کا مولانا مملوک العلی کے نام ایک اہم اور مفصل گرامی نامہ

مولانا مملوک العلی کی تحریک سید احمد شہیدؒ کی عملی تائید اور اس کا تحریری اصلاحی تعاون

حضرت مولانا مملوک العلی نے جس علاقہ اور ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں اور تعلیم و تربیت حاصل کی تھی وہ پرانے زمانے سے علمائے کرام اور مشائخ و مصلحین کا علاقہ تھا، جس کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب (جو اس علاقہ سے مادری تعلق رکھتے تھے اور اسی خطہ کی ایک بستی پھلت میں ان کی پیدائش ہوئی تھی) کی ذاتِ گرامی، خدمات اور تعلیمات سے اک نیا جذبہ، نیا ولولہ اور علمی ذوق حاصل ہوا تھا، مولانا مملوک العلی اپنے خاندان کے افراد اور استادوں کی زبان سے حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے صاحبزادگان عالی مرتبت کے مراتب و کمالات اور امت پر ان کے دینی علمی احسانات کا تذکرہ ہمیشہ سنتے رہتے ہوں گے، کیوں کہ مولانا مملوک العلی کو جو استاذ ملے تھے وہ سب بلا واسطہ یا بالواسطہ حضرت شاہ ولی اللہ کے فیض علم و کمال کے جرعہ نوش اور خاندان ولی اللّٰہی کے علماء کے فیض یافتہ اور خادم و ترجمان تھے، ان نسبتوں اور روابط کی وجہ سے مولانا مملوک العلی بھی نسبت ولی اللّٰہی کے حامل اور فکر ولی اللّٰہی کے نمائندہ و ترجمان بن گئے تھے، جب مولانا مملوک العلی تعلیم مکمل کرنے کیلئے دہلی آئے اس وقت ان علماء اور بزرگوں کو دیکھنے کا اور ان کے فیض

صحبت سے براہِ راست مستفید ہونے کا موقع ملا جو علم وعمل کے آفتاب، برصغیر کی دینی علمی زندگی کے روحِ رواں اور ملتِ اسلامیہ کے محسن و رہنما تھے۔ مولانا مملوک العلی نے شاہ عبدالقادر کو غالباً دیکھا بھی نہیں، لیکن مولانا کو حضرت شاہ رفیع الدین کی زیارت وصحبت نصیب ہوئی ہوگی اور حضرت شاہ عبدالعزیز سے ایک سبق پڑھنے کی سعادت میسر آئی، ان بزرگوں کی ایک ہی صحبت بلکہ ایک نگاہ مس خام کو کندن بنانے کے لئے کافی تھی، مولانا مملوک العلی کو حضرت شاہ عبدالعزیز کی صحبت اور مجلسوں میں حاضری کے اور حضرت شاہ صاحب سے استفادہ کے مواقع کثرت سے ملے ہوں گے اور یقیناً مولانا نے ان سراپا علم وافادہ صحبتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہوگا۔

تحریک سید احمد شہیدؒ کا آغاز اور حضرت مولانا پر اس کے اثرات

جس زمانہ (تقریباً ۱۲۳۰ھ) میں حضرت مولانا مملوک العلی دہلی میں تھے اور حضرت شاہ عبدالعزیز کی زیارت اور فیضانِ علمی سے دامنِ مراد پُر کر رہے تھے اس دور میں حضرت شاہ عبدالعزیز کی مجلسوں کے فیض یافتہ اصحاب ایک نئے انقلاب، نئی تحریک اور ایک نئی مگر بہت بڑی اور غیر معمولی شخصیت کے فیضان وکمالات کا مشاہدہ کر رہے تھے اور ایک نئی دعوت اور جد وجہد کی آمد آمد کا چرچا سن رہے تھے، اور خود کو اس کا ایک رکن، خادم اور سپاہی بنانے کیلئے بے تاب وبے چین تھے، یہ تحریک وہ تھی جس کا منبع حضرت سید احمد شہید کی غیر معمولی شخصیت اور سراپا اخلاص وعمل ذات تھی۔ تحریک سید احمد شہید کا مولانا مملوک العلی کے دہلی قیام کے زمانہ میں آغاز ہوا، یہ تحریک اور جد وجہد تیز رفتاری سے آگے بڑھی اور دیکھتے ہی دیکھتے مہینوں برسوں میں پورے ملک (جس کو آج برصغیر کہنا چاہئے) میں پھیل گئی اور اس کے اس قدر غیر متوقع اور حیرت ناک نتائج ظاہر ہوئے کہ آج تک مورخین اور اہل نظر حیران ہیں۔

حضرت سید صاحب کی ذاتِ بابرکت سے جو دینی انقلاب برپا ہو رہا تھا، شرک و بدعات کے اثرات جس تیزی سے ختم ہو رہے تھے اور اصلاح معاشرہ نیز صحیح اسلامی زندگی

کے احیاء اور سنت و شریعت پر حرف بہ حرف عمل کی خدمت جس برق رفتاری سے انجام پارہی تھی، اور پورے ملک پر اسکے جو گہرے اثرات نظر آرہے تھے اور جس طرح صبح و شام معاشرہ قرونِ اولیٰ کے دینی معاشرہ اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی زندگی کی طرف رجوع ہورہا تھا، وہ ایسی چیز نہیں تھی جس سے کوئی مسلمان اور صاحب نظر شخص (جس نے براہِ راست سیرتِ طیبہ اور احادیث شریفہ کا مطالعہ کیا ہو) غافل اور بے پرواہ رہ سکتا اور مولانا مملوک العلی تو خود حضرت شاہ عبدالعزیز کے گھرانے کے ایک ایک عالم سے ذاتی طور سے واقف تھے، مولانا نے بہت قریب رہ کر ان کے احوال و کمالات اور سراپا عمل زندگی کا مشاہدہ و تجربہ کیا تھا، اسلئے مولانا مملوک العلی کی حضرت سید احمد رائے بریلوی اور اس تحریک سے وابستگی قدرتی طبعی مطالبہ اور اپنی متاعِ گم شدہ کی بازیافت تھی۔

مولانا مملوک العلی کی حضرت شاہ صاحب کے خاندان بلکہ گھر کے افراد خصوصاً حضرت شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ مولانا عبدالحئی بڈھانوی وغیرہ اور حضرت شاہ عبدالعزیز کے ممتاز ترین شاگردوں نیز ملک کے نامور علماء کی حضرت سید احمد رائے بریلوی سے ارادت وعقیدت مندی اور حضرت سید صاحب کے دامن تربیت سے وابستگی کیلئے بہت تھی، لیکن یہی نہیں بلکہ خانوادۂ حضرت شاہ ولی اللہ کے اکابر علماء کے علاوہ جو اصحاب حضرت سید صاحب اور انکی تحریک اور فکر و عمل کے ترجمان اور دست و بازو بنے ہوئے تھے اور تحریک میں سید صاحب کے نائب و ترجمان سمجھے جاتے تھے، ان میں سے اکثر جو مولانا مملوک العلی کے وطن اور علاقہ کے رہنے والے تھے اور اپنے اپنے علاقہ میں شہرت و امتیاز کے علاوہ اخلاص و ایثار اور دیانت و عمل کا نمونہ اور مثال تھے، وہ حضرت سید صاحب کے کفش بردار اور خادم بن گئے تھے اور سید صاحب کی خدمت و ہم رکابی کی سعادت کو فخر اور سرمایۂ نجات سمجھتے تھے۔

مولانا، حضرت سید صاحب سے بیعت ہوئے یا نہیں اس کی صراحت نہیں ملی، مگر جب مولانا کے اکثر استاد، اہل خاندان اور علاقہ کے تقریباً تمام مشائخ اور علماء سید صاحب کے سلسلہ سے وابستہ ہو گئے تھے اور علاقہ و نواح کے عوام ہی نہیں بلکہ ملک بھر کے علماء اور مشائخ جوق در جوق حضرت سید صاحب کے حلقۂ بیعت میں داخل ہورہے تھے

اوراس کو بڑی دولت اور نعمت سمجھ رہے تھے، اس وقت مولانا مملوک العلی اس سے علیحدہ اور یکسو رہے ہوں، ناممکن اور تمام قرائن و اشارات کے خلاف ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ مولانا مملوک العلی حضرت سید صاحب کے دورۂ دوآبۂ گنگ و جمن (ضلع سہارنپور اور موجودہ مظفر نگر) خصوصاً نانوتہ وغیرہ کے سفر میں سید صاحب کے قافلہ کے ساتھ ہوں اور اسی وقت سید صاحب کے دامنِ اصلاح و تربیت سے وابستہ ہو گئے ہوں؟ غالباً یہی وجہ ہے کہ مولانا مملوک العلی کی کسی اور بزرگ سے بیعت وارادت اور وابستگی کا ذکر نہیں ملتا۔

مکتوب حضرت سید احمد شہیدؒ

اگر چہ حضرت سید صاحب سے بیعت وارادت کی کوئی تحریری شہادت راقم سطور کے علم میں نہیں ہے، مگر مولانا مملوک العلی کے نام حضرت سید صاحب کے ایک اہم گرامی نامہ اور تحریک سید احمد شہید کے اصول اور ترتیب کے مطابق مولانا مملوک العلی کی اصلاحی تربیتی خدمات خصوصاً نکاحِ بیوگان کی تجدید اور رسوم و بدعات کی تردید اور اکابر علمائے سلسلہ ولی اللٰہی کے اصلاحی فتاویٰ اور تحریرات کی توثیق، اسی سلسلہ کی کڑی اور اسی نسبت و تعلق کا ثمرہ ہے جو مولانا کو حضرت سید احمد شہید اور تحریک سید احمد شہید سے حاصل تھا۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کے جس خط کا ذکر ہوا ہے، یہ خط میرٹھ اور سہانپور و مظفر نگر کے نامور علماء، مشائخ اہل درس وافادہ اور مرجع عام شخصیات کے نام صادر ہوا تھا۔

یہ گرامی نامہ جس کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے حضرت سید صاحب کے لئے امیر المومنین کے خطاب و منصب کے اعلان کے بعد لکھے گئے سید صاحب کے ابتدائی اور اہم مکتوبات میں سے ہے۔ اگر چہ یہ گرامی نامہ اعلانِ عام کیلئے اور گشتی چٹھی (CIRCULAR) کی حیثیت سے لکھا گیا تھا مگر اس کے پہلے اور اہم ترین مخاطب دہلی اور ضلع سہارنپور و مظفر نگر اور ان کے قصبات کے ممتاز و منتخب علمائے کرام تھے۔ خصوصاً وہ حضرات جو علمی تربیتی سلسلہ سے خانوادۂ حضرت شاہ ولی اللہ سے وابستہ تھے اور تحریک حضرت سید احمد شہید کے مقاصد و نظریات اور اس کی دینی اصلاحی جدوجہد کے معاون و قدرداں تھے۔

حضرت سید صاحب کا یہ گرامی نامہ نسبتاً غیر متعارف اور کم یاب ہے، راقم سطور نے

اس کے تین نسخوں سے استفادہ کیا ہے، جن میں سے ایک مطبوعہ ہے دو قلمی ہیں (۱) مولانا شیخ محمد تھانوی (مولانا شیخ محمد کے والد حضرت سید صاحب کے معاون تھے، مولانا نے بھی سید صاحب کی زیارت کی ہے) کی تصریحات کے مطابق یہ گرامی نامہ حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید کا لکھا ہوا ہے، مولانا شیخ محمد نے لکھا ہے کہ:

''منشی آں اعلام نامۂ جلیل، مولانا شاہ محمد اسماعیل موصوف اند قدس اللہ اسرارھم۔ در سنہ یک ہزار و دو صد و چہل و دو ہجری مطابق ۱۸۲۵ء ہنگامہ عزیمت جہاد بر کفرہ فجرہ قوم سکھانِ لاہور صورت تحریر یافتِ'' (۲)

اگرچہ مولانا شیخ محمد صاحب نے تاریخ تحریر کی صراحت نہیں فرمائی مگر قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط ۱۲۴۲ھ کے آخری تین چار مہینوں (مارچ جون، ۱۸۲۷ء) میں لکھا گیا ہوگا (۳) قلمی نسخوں میں تاریخ تحریر ذکر نہیں مگر خط کے اصل بنیادی مضمون پر تینوں نسخے متفق ہیں، مگر تینوں میں کسی قدر اختلاف یا کمی زیادتی بھی ہے (جسکا آئندہ سطور میں ذکر آرہا ہے) تینوں ہی نسخوں میں اس گرامی نامہ کا آغاز ان کلمات سے ہوا ہے:

''از امیر المومنین سید احمد بر الواحِ خاطر شرفا و ساداتِ کرام و مشاہیر علمائے عظام و جماہیر مشائخ ذوالاحترام، و اراکین امراء عالی مقام، و کافہ مومنین مخلصین، و جماعۃ مسلمین راسخین و سائر خواص و عوام از اہل ایمان و اسلام خصوصاً'' (۴)

انوارِ محمدی اور نسخہ لاہور میں مکتوب کے آخری فقرہ و السلام علی من اتبع الھدیٰ

(۱) مطبوعہ مولانا شیخ محمد تھانوی کی تالیف انوار محمدی میں شامل ہے جو صرف ایک مرتبہ ۱۲۹۱ھ (۷۵-۱۸۷۴ء) میں مطبع مجتبائی میرٹھ سے چھپی تھی، قلمی تحریر حضرت سید صاحب کے مجموعہ مکتوبات میں شامل ہے۔

(۲) انوار محمدی ص:۳۶

(۳) چودھری غلام رسول مہر نے صراحت کی ہے کہ سید صاحب سے ۱۲ر جمادی الثانی ۱۲۴۲ھ (۱۱ر جنوری ۱۸۲۷ء) بحیثیت امیر المومنین پہلی بیعت کی گئی اور اس بیعت کے تیسرے دن بدھ سنگھ کے نام اپنے خط میں سید صاحب نے اپنے لئے امیر المومنین کا خطاب استعمال فرمایا۔ سید احمد شہیدؒ ص ۲۸۳ ج اول طبع اول لاہور: ۱۹۵۸ء

(۴) (الف) مجموعہ مکتوبات حضرت سید احمد شہید مکتوبہ بلا سنہ مخزونہ کتب خانہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

(ب) انوار محمدی ص ۴۰ (ج) مکاتیب سید احمد شہید خطی نسخہ کا عکسی ایڈیشن لاہور ص: ۳۵ ب، ۱۳۹۵ھ

تک مسلسل مضمون ہے، مگر نسخہ لاہور میں مذکورہ بالا ابتدائی عبارت کے بعد مکتوب الیھم کے نام ذکر کئے گئے ہیں، اگر چہ مولانا شیخ محمد صاحب نے اس موقع پر مکتوب الیھم کے نام تحریر نہیں فرمائے لیکن انوارِ محمدی میں والسلام علی من اتبع الھدیٰ کے بعد چند سطروں کا اضافہ ہے، جو یہ ہیں:

''ہر چند کہ ایں اعلام عام است بخدمت کافہ اہل اسلام اسامے چندیں از مومنین مخلصین دریں مقام نگارش می رود، تا دراشاعۃ آں تحریر و تقریر سعی بلیغ فرمایند''(۱)

ترجمہ: اگر چہ یہ تمام اہل اسلام کے نام اعلان عام ہے مگر یہاں مومنین مخلصین میں سے چند اصحاب کے نام درج کئے جاتے ہیں تا کہ یہ سب (اس خط کو) تقریر اور تحریر کے ذریعہ سے عام کرنے میں پوری پوری کوشش فرمائیں۔

مولانا شیخ محمد صاحب نے درجِ بالا اقتباس کے بعد حضرت سید صاحب کی چند سطریں اور نقل کی ہیں، جو یہ ہیں:

''مکرر آنکہ مولوی محمد یعقوب صاحب وعبداللہ خاں ومومن خاں وسید امان علی ومولوی عبدالخالق ومولوی مملوک علی صاحب، بقبول ایں دعوت نامہ طویلہ وصغیرہ را گرفتہ دراشاعۃ آں تحریر و تقریر سعی بلیغ فرمایند، وچند قطعات دیگر کہ ملفوف ایں اعلام میرسد، آنرا بمکتوب الیھم بر سبیل ڈاک بہ محافظۃ تمام ارسال نمایند''

دونوں خطوط کے سرنامہ اور خاص مکتوب الیھم میں مولانا مملوک العلی کے ذکر اور مؤخر الذکر خاص ہدایت میں بھی مولانا مملوک العلی کے نام کی شمولیت سے مولانا مملوک العلی کی حضرت سید صاحب سے خاص قربت، سید صاحب کے مولانا پر اعتماد اور مولانا کے توسط سے تحریک جہاد کے عام تعارف اور اشاعت کی توقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حضرت سید صاحب کے خاص اراکین میں سے تھے اور تحریک سید احمد شہید کے مقاصد کی تلقین واشاعت سے گہری وابستگی اور دلچسپی رکھتے تھے۔(۲)

---

(۱) انوار محمدی مولانا شیخ محمد تھانوی ص:۴۰ (مطبع ضیائی میرٹھ:۱۲۹۱ھ)

(۲) انوار محمدی ص ۴۰

دونوں خطوط کی منزل اور مکتوب الیہم صاحبان مختلف ہونے کے باوجود یہ بات بہت قابل توجہ اور اہم ہے کہ درجِ ذیل چار علمائے کرام کا حضرت سید صاحب کے گرامی نامہ کے دونوں نسخوں میں ذکر آیا ہے جن میں حضرت مولانا مملوک العلی بھی شامل ہیں، اور دونوں خطوں میں مولانا کا نام اہمیت سے درج ہے، ترتیب یہ ہے:

مولانا رشید الدین خاں (۱) مولانا مملوک العلی مولانا سید محبوب علی جعفری (۲) مولانا عبداللہ خاں صاحب (دہلوی) (۳)

مکتوب الیہم اصحاب کی وہ فہرست جو قلمی نسخہ میں درج ہے

(مولانا) حکیم محمد اشرف (کاندھلوی) (۴) حکیم قاضی محی الدین (کاندھلوی) (۵) (مولانا) حکیم رحیم اللہ (کاندھلوی) (۶) (مولانا) احمد اللہ (تھانوی) (۷) شیخ فضل علی

---

(۱) مولانا رشید الدین خاں دہلوی: (شاگرد حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ) وفات محرم ۱۲۴۳ھ (جولائی اگست ۱۸۲۷ء)۔

(۲) مولانا سید محبوب علی: بن مصاحب علی جعفری دہلوی۔ ولادت ۲۷رمحرم ۱۲۰۱ھ وفات ۱۰رذی الحجہ ۱۲۸۰ھ (۱۷رمئی ۱۸۶۴ء) نامور عالم، مصنف حضرت شاہ عبدالعزیز کے ممتاز شاگرد اور شاہ محمد اسماعیل کے ہم سبق تھے۔

(۳) مولانا عبداللہ: بن قاسم علی خاں افغانی، شمس آبادی، دہلوی۔ اپنے زمانے کے ممتاز علماء میں سے تھے، شاہ محمد اسماعیل سے تعلیم حاصل کی، سید احمد شہید سے بیعت ہوئے، ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء) میں وفات ہوئی۔ نزہۃ الخواطر ص ۳۰۶-۳۰۷ ج ۷۔

(۴) مولانا حکیم محمد اشرف: خلف مولانا امام الدین (برادرزادہ حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی) مؤلف تفسیر سورہ یوسف وغیرہ ۳ر ربیع الثانی ۱۲۴۷ھ کو (اکتوبر ۱۸۳۱ء) میں خان پور ضلع بلند شہر میں وفات ہوئی۔

(۵) حکیم قاضی محی الدین: خلف قاضی نجیب الدین کاندھلوی تقریباً ۱۸۴۰ء میں وفات ہوئی، حضرت سید احمد شہید کے متوسل تھے۔

(۶) حکیم رحیم اللہ: خلف عزیز اللہ کاندھلوی۔ حضرت مفتی الٰہی بخش سے تعلیم حاصل کی، حافظ محمد ضامن سے بھی استفادہ کیا عالم اور جید طبیب تھے۔ ۱۸۷۲ء (۸۹-۱۲۸۸ھ) میں وفات ہوئی۔

(۷) مولانا احمد اللہ: خلف محمد بخش فاروقی تھانوی۔ مولانا شیخ محمد تھانوی کے والد ماجد۔ تاریخ تھانہ بھون میں مولانا احمد اللہ کا سنہ وفات ۱۲۳۹ھ (۱۸۲۲ء) لکھا ہے ......باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر......

(تھانوی) (حکیم) غلام سبحانی (جھنجھانوی) (۱) (حضرت میانجیو) نور محمد (جھنجھانوی) (۲) پیرجی عظیم الدین (غالباً جھنجھانوی)؟ شیخ محمد احسن؟ خلیفہ رسول بخش؟ (مولانا) محمد قلندر (جلال آبادی) (۳) (مولانا) محمد حسن (رام پوری) (۴) (مولانا) حکیم مغیث الدین (سہارنپوری) (۵) (مولانا) عبداللہ (خان صاحب سہارنپوری) (۶) (مولانا) عبدالرحمٰن (غالباً سہارنپوری)؟

مکتوب الیہم اصحاب کی وہ فہرست جو مولانا شیخ محمد صاحب نے انوارِ محمدی میں نقل کی ہے

(مولانا شاہ) محمد یعقوب (دہلوی) (۷) (مولانا مفتی) صدر الدین آزردہ

گزشتہ صفحہ کا بقیہ............ (تاریخ تھانہ بھون مولانا شیخ محمد تھانوی بحواشی ثناء الحق صدیقی صاحب ماہنامہ البلاغ کراچی ص ۴۴ وغیرہ) مگر سید صاحب کے اس خط کی روشنی میں یہ سنہ وفات صحیح معلوم نہیں ہوتا۔

(۱) حکیم غلام سبحانی: خلف حکیم شمس الدین بن حکیم صدر الدین جھنجھانوی خلیفہ ورفیق جہاد سید احمد شہید، فاضل طبیب عالم اور مصنف تھے۔

(۲) حضرت میانجیو نور محمد جھنجھانوی: پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی، خلیفہ حضرت سید احمد شہید اور مرشد کامل۔ وفات ۱۲۵۹ھ (۴۴-۱۸۴۳ء)

(۳) مولانا سید محمد قلندر جلال آبادی: عالم محدث اور مدرس، تعارف گذر چکا ہے۔

(۴) مولانا محمد حسن: بن غلام علی مصطفیٰ رام پوری (شاگرد حضرت مفتی الٰہی بخش) جید عالم نامور مدرس، مصنف، سید صاحب کے خلیفہ معتمد علیہ اور قاضی لشکر تھے، ذی قعدہ ۱۲۴۵ھ (اپریل مئی ۱۸۳۰ء) میں پھولڑہ کی جنگ میں شہید ہوئے۔

(۵) مولانا حکیم مغیث الدین: خلف حکیم محمد بخش بن غلام شرف صدیقی سہارنپوری۔ نامور عالم، طبیب، مفتی الٰہی بخش کے شاگرد حضرت سید احمد شہید کے خلیفہ اور رفیق جہاد تھے۔ وفات ۱۲۶۵ھ (۱۸۴۹ء)

(۶) مولوی عبداللہ (خان سہارنپوری): مفتی الٰہی بخش کے شاگرد، بڑے عالم، مفتی، محقق، مناظر اور صحیح بخاری کی طباعت بمبئی ۱۲۸۴ھ کے مصحح تھے۔

(۷) مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب: خلف محمد افضل سونی پتی، حضرت شاہ عبدالعزیز کے نواسہ اور شیخ محمد افضل فاروقی کے فرزند تھے۔ عالم، عارف اور نامور شیخ طریقت ولادت ذی الحجہ ۱۲۰۰ھ وفات ۲۸؍ذی الحجہ ۱۲۸۲ھ در مکہ معظمہ، نزہۃ الخواطر میں تاریخ وفات ۲۷؍ذی قعدہ لکھی ہے۔ نزہۃ الخواطر ص ۵۵۰ ج ۷، جو صحیح نہیں۔

(دہلوی)(۱)(حکیم) سید امان علی (دہلوی)(۲) مؤمن خاں مؤمن (دہلوی)(۳) مولوی نور الحق صاحب؟ (مولانا سید) نصیر الدین (مجاہد منگلوری)(۴)(مولانا) عبد الخالق (دہلوی)(۵) قاسم علی خاں؟ محمد علی خاں؟ حافظ عبد الوہاب عرف میاں معبود؟ خلیفہ عبد الرحمان؟ افادت مآب شاہ اکبر؟ صاجزادہ صاحب؟ میاں محمد حسن پیر جی؟ میر یوسف؟ میاں شاہ علی؟ حکیم خواجہ حسن (دہلوی)(۶)(شہزادہ) مرزا غلام حیدر گورگان (دہلوی)(۷)

مکتوب الیہم اصحاب کی دو علیحدہ فہرستوں کی وجہ سے خیال ہے کہ قلمی نسخہ میں درج مکتوب اور انوارِ محمدی کا گرامی نامہ دونوں ایسے مکتوبات کی نقل ہیں جو علیحدہ علیحدہ مختلف

---

(۱) مولانا مفتی صدر الدین آزردہ: خلف لطف اللہ کشمیری دہلوی تیرھویں صدی ہجری کے برصغیر ہند و پاک کے مایۂ ناز اور نامور ترین علماء میں سے تھے، عالم متبحر، مفتی، مصنف، شاعر، اور ہر علم وفن میں فخر زماں تھے۔ ولادت ۱۲۰۴ھ (۹۰-۱۷۸۹ء) وفات ۱۲۵۸ھ نزہۃ الخواطر ص ۲۲۶ ج ۷۔

(۲) اپنے عہد کے مشہور علماء میں سے تھے، شاہ عبد القادر سے تعلیم حاصل کی پھر طب پڑھی، نہایت قانع اور باخدا شخص تھے۔ نزہۃ الخواطر ص ۸۰-۷۹ ج ۷۔

(۳) مومن خاں مومنؔ: اردو کے مایۂ ناز شاعر، شاہ عبد العزیز کے شاگرد اور تحریک سید احمد شہید کے پرجوش معاون، ولادت ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۸ء) وفات ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۲ء) مؤمن شخصیت اور فن ص ۱۵۸-۱۵۹، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی (دہلی: ۱۹۷۲ء)

(۴) مولانا نصیر الدین: بن نجم الدین چشتی سونی پتی دہلوی شاہ محمد اسحاق کے داماد اور شاگرد، ۱۲۵۰ھ میں دہلی سے مجاہدین کی ایک جماعت کے ساتھ ہجرت کی اور حضرت سید احمد شہید کے قائم مقام سمجھے جاتے تھے، تقریباً ۱۲۵۶ھ (۴۱-۱۸۴۰ء) میں وفات ہوئی۔ نزہۃ الخواطر ص ۵۱۷ ج ۷

(۵) مولانا عبد الخالق دہلوی: شاہ عبد القادر کے شاگرد تھے، شاہ محمد اسحاق سے بھی حدیث پڑھی۔ دہلی میں لمبے عرصہ تک حدیث شریف کا درس دیا، مولانا سید نذیر حسین محدث اور ڈپٹی نذیر احمد کے بھی استاد تھے۔ ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) میں وفات ہوئی۔ نزہۃ الخواطر ص ۲۵۷ ج ۷

(۶) حکیم خواجہ حسن: نامور فاضل اور بلند مرتبہ کے طبیب تھے آثار الصنادید کی تالیف (۱۸۴۷ء) سے تقریباً تیس سال پہلے وفات ہوگئی تھی۔ آثار الصنادید ص ۳۹ باب چہارم (لکھنؤ ۱۳۰۰ھ)

(۷) مرزا غلام حیدر: دہلی کے ممتاز افراد میں سے تھے اور اکبر شاہ ثانی کے مشیر تھے۔ علم وعمل (وقائع عبد القادر خاں) اردو ترجمہ ص ۲۹۰ ج ۱، ترجمہ معین الدین افضل گڑھی، محمد ایوب قادری (کراچی:) مرزا غلام حیدر سید صاحب اور شاہ محمد اسماعیل کے غالباً خاص معتمد اور مکتوب الیہ تھے۔ مرزا صاحب کے نام دونوں کے متعدد گرامی نامے ملتے ہیں۔

اصحاب کو روانہ کئے گئے، اسی وجہ سے دونوں میں مکتوب الیہم کی ترتیب و تفصیل اور ان کے اندراج کے مواقع میں اختلاف ہے۔

اور جیسا کہ ذکر ہوا، قلمی نسخہ میں درج مکتوب میں تمہیدی کلمات کے بعد مکتوب الیہم کے نام آ گئے ہیں، یہ انیس (۱۹) حضرات ہیں۔ مگر نسخہ مکتوبہ مولانا عبید اللہ غلام حسین میں مکتوب الیہم اصحاب کے نام شامل نہیں کئے گئے، یہ جگہ خالی ہے، کاتب نسخہ نے غالبًا اختصار کے خیال سے نام نہیں لکھے۔ (۱)

مولانا شیخ محمد صاحب نے مکتوب الیہم کی جو فہرست نقل فرمائی ہے وہ بھی انیس (۱۹) ناموں پر مشتمل ہے، دونوں فہرستوں کے جائزہ سے یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ جو گرامی نامہ مولانا شیخ محمد صاحب نے نقل کیا ہے وہ دہلی کے علماء اور خواص کے نام تحریر صادر ہوا تھا، اور جو خط مجموعہ مکتوبات میں نقل ہوا ہے اس کے اصل مخاطب اضلاع سہارنپور مظفر نگر کے (دوآبہ جمنا و گنگا) قصبات کے علماء اور تحریک سید احمد شہید کے خاص اراکین ہیں۔ دونوں نسخوں میں درج مکتوب الیہم اصحاب کی فہرست جو اوپر درج کی گئی ہے جس سے اس خط کے مکتوب الیہم متعدد گم نام علماء کے نام سامنے آئیں گے۔ اور یہ بھی معلوم ہوگا اس خط میں حضرت سید صاحب کے اثرات اور مکتوب الیہم اصحاب کا دائرہ کس قدر وسیع تھا۔ مذکورہ بالا تفصیلات اور مکتوب الیہم اصحاب کے کسی قدر تعارف کے بعد یہ گرامی نامہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

اعلام نامہ سید صاحب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم از فقیر سید احمد بر الواحِ خواطر شرفا و سادات کرام و مشاہیر علماء عظام و جماہیر مشائخ ذوی الاحترام و اراکین امراء عالی مقام، و کافہ مومنین مخلصین و جماعۃ مسلمین راسخین سائر خواص و عام از اہل ایمان و اسلام، منقش و مبرہن آنکہ اصل جمیع طاعات و اساس ہمہ عبادات و مدار سعادت جاودانی و سرمایہ راحت دوجہانی تکمیل علاقہ عبودیۃ و انقیاد و تحصیل مقام اطمینان و اعتماد و ترجیح جانب

(۱) مجموعہ مکاتیب سید احمد شہید (عکس نسخہ خطی ص ۳۵ ب (لاہور: ۱۳۹۵ھ)

حضرت حق بر جانب عباد است، واقوی علامات واعظم آثار آں ایثار محبت حضرت رب الارباب بر محبتہ سائر اخوان واحباب ہست چنانچہ نص وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔

وحدیث مَنْ كَانَ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَحَبُّ اِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا بدین دعوی فرمان منسجل وشاہد معدل است وہر چند ایں محبت مذکورہ سری است مخفی وامریست مبطن لیکن آثار وعلامات آں در ضمن افعال واعمال ظاہر وہویدا میگردد۔ واقوی مظنہ آثار ظہور ایں محبت وانقیاد معرکہ جہاد با اہل کفر وعناد است۔ چہ مقابلہ مشرکین واقامت ایں رکن رکین مستلزم صرف جان ومال وترک اہل وعیال ومہاجرت اخوان واوطان است، پس اقدام در اقامہ ایں ذروہ سنام اسلام اقوی علامات غلبہ محبتہ حضرت خالق است بر محبتہ جمیع مخلوقات ولہذا در آیت کریمہ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآءُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۔

جہاد را با محبت خدا ورسول در یک سلک منسلک گردانیدہ اند، ہر چند کہ قتال اہل کفر وطغیان در ہر زمان وہر مکان لازم است۔

اما دریں جزو زمان کہ شورش اہل کفر وطغیان از حد گزشتہ کہ فریاد وفغان مظلوماں از دست تظلم ایشاں سر بفلک کشیدہ وتخریب شعائر اسلام از دست تعدی ایشاں ہویدا گردیدہ۔ پس بریں تقدیر اقامۃ ایں رکن رکین یعنی مقابلہ مشرکین بر ذمہ جمہور مسلمین دریں ایام اوکد واوجب گردیدہ۔

بناءً علیہ فقیر از وطن مالوف خود در دیارِ ہندوستان وخراسان دور وسیر نمودہ، ومومنین آں اقطار ومسلمین آں دیار را بہ سوئے ادائی واین عبادت عظمی وادراک این سعادت علیا ترغیب کرد، الحمد للہ کہ اکثر مومنین مخلصین وصادقین راسخین این دعوت حق را قبول کردند، وبہ کمال وفور رغبت وغایۃ علو ہمۃ کمر عزیمۃ در ادراک این سعادت

چست بستند، کہ عند الطلب بقلب وقالب حاضر خواہند گردید ودر صرف جان و مال در رضا ایزد متعال دریغ نخواہند کرد۔

والحال ہم بر طبق منطق لازم الوثوق وَ قَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لاَ تُكَلَّفُ اِلاَّ نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَى الْقِتَالِ بخدمت کافہ اہل دین و جماعۃ ارباب صدق ویقین بطریق دعوت عام نگارش کردہ میشود کہ ای مومناں پاک، وای مسلماناں چست وچالاک، شکر منعم علی الاطلاق بجا آرید، وحقوق مالک بالاستحقاق یاد آرید، وبہ حمیۃ اسلامی کار فرمائید، وغیرت ایمانی بر روی کار آرید، واین جان ناتواں ونہاد ست بنیاد خداوند حقیقی وخداوند تحقیقی بہ سپارید، ومتاع زندگانی فانی بعوض راحت جاودانی بہ فروشید، ودر تحصیل رضا جوئی حضرت رب العزت بکمال علو ہمتی و تاکید عزیمۃ بکوشید، ولباس صبر وتقوی واستقامۃ درمیاں دین شجاعۃ وشہامۃ بہ پوشید، و آب شمشیر براں مثل آب زلال باراں بنوشید، بالجملہ محبۃ اہل وعیال وانسیت اخوان واوطان پس پشت انداختہ، وجان ومال در رضا جوئی ایزد متعال درباختہ، و اطاعۃ ذو الجلال قبلہ ہمت ساختہ، وعلم نصرت دین متین برافروختہ، وکوس تائید شرع متین نواختہ، مردانہ وار در معرکہ جہاد کفار نگونسار درائید، وگوئی سعادت جاودانی وراحت دو جہانی بہ قوت ایمان از میدان شجاعۃ وجلادۃ بربائید، ودر مصاف قتل وقتال و معرکہ جنگ وجدال مثل کوہ متین در مقابلہ اعداء دین ثابت القلب وراسخ القدم باشید، وشکستن رونق اہل کفر وعناد وبرباد دادن ارباب شرک وفساد وبمشابہ راندن مگس ناپاک یا برتافتن خس وخاشاک شمارید ونص قرآنی: اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ وَ یُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ دراول جلادۃ منزل ملاحظہ کنانید وآیہ فرقانی: وَكَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ، وَكَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِیْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِیْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ. بلسان صدق ترجمان بخوانید ومضمون: اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلاَ اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ وَلاَطَاقَةَ لَنَا بِجَالُوْتَ جُنُوْدِهٖ.

مثل قاعدین سابقین برزبان حرب نشان مرانید، وگلگونہ خون شہادت بر چہرہ عبودیۃ واطاعۃ مالیدہ سرخروئی دنیا وآخرت حاصل کنید، وانگشت وفاء وانقیاد خون

اہل کفر وفساد و مخضب کردہ عروس دار، در محضر حضرت داور دادار جلوہ گر شوند، بہمین سوفتار و گفتار و این نیست درست وعزیمۃ چست مثل شیر زغران و پیل مست دماں مقابلہ اہل شرک وطغیان خواہیند رسید، ضرور بضرور بر طبق منطوق لازم الوثوق: فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغَالِبُوْنَ مظفر و منصور خواہید شد، واز الواث آثام مطہر گردیدہ از عذاب الیم جحیم نجات یافتہ بمدارج عالیہ ومراتب شامخہ در ریاض جنان و روح و ریحان در جوار رحمۃ منان خواہید رسید، و در سلک عباد مقربین و جماعۃ سابقین از بندگان خاص ومقبولان ذوی الاختصاص منسلک خواہید گردید۔

وعلاوہ بریں آنکہ درمیان اخوان واقران بشجاعت وجلادۃ موصوف وغیرت معروف خواہید شد، انشاء اللہ تعالیٰ او بر بلاد کفار وخزاین بیشمار فایض خواہید گردید، و بہ تسلط وحکومۃ بر اہل غرور ونخوت فائز شدہ بمناصب ریاست سلطانی وخلافۃ رحمانی خواہید رسید، و این مواعید را مثل نمایش باغ سبز بنا بر تسلی اطفال تصور نفرمایند بلکہ مواعید مذکورہ مطابق منطوق کلام ربانی وموافق منصوص آیات قرآنی است، قال اللہ تبارک وتعالیٰ: يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ، تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ، وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ، وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ، بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ.

وعلاوہ براین آنکہ این فقیر ہم در منامات بے شمار و معاملات خارج از حدو حصار در باب سرانجام دادن این امر عظیم ومہم فخیم از پردہ غیب باشارت ربانی واز ممکن لاریب بشارات رحمانی مبشرہ، و چونکہ الہام غیبی بکلام لاریبی منضم گردد پس در نظر مومنین راسخ الاعتقاد ومخلصین کامل الانقیاد بمشابہ نور علی نور جلوہ گر شود، واگر تقاعد و تساہل دریں باب بعمل خواہید آورد۔ ویس چنانکہ در دار دنیا مخذول ومنکوب شدہ اند ہم چنیں در دار آخرۃ وعذاب الیم و دردرکات جحیم گرفتار خواہید گردید، و درعوض ایشاں دیگر سعادت منداں ازلی ومقبلان لم یزلی در سلک جنود ربانی منسلک خواہند گردید،

وقال الله تبارک تعالیٰ: ان لا تنفروا یعذبکم عذابا الیما ویستبدل قوما غیرکم و لا تضروہ شیئا والله علی کل شیٔ قدیر.

بالجملہ این زندگانی فانی رالا بدروزی گزشتنی وگزاشتنی است ودرمحکمہ حساب و کتاب وسوال وجواب درحضرت رب الارباب حاضرشدنی است، پس اہل تقاعد و تساہل درمعرکہ حساب وکتاب بکدام زبان جواب خواہند داد، ودرحضور ملک علی الاطلاق و مالک بالاستحقاق بکدام روحاضر خواہند شد واز گرفت گیراں رب قدیر بکدام حیلہ وتزویر خلاص خواہند یافت و ما علینا الا البلاغ المبین والسلام علی من اتبع الھدیٰ۔

تحریک سید احمد شہید کے اثرات

مولانا مملوک العلی کی سید صاحب سے وابستگی اور سید صاحب کی تحریک سے عملی دلچسپی کی اگر چہ کوئی شہادت نہیں ملی لیکن محولہ بالا خط اور مولانا نے حضرت سید صاحب کی اصلاح رسوم وبدعات کی تحریک کی حوصلہ افزائی فرمائی، اسکوآگے بڑھانے اور بذات خود اس سے دلچسپی رکھنے کی علامت ہے۔ اسلئے کہا جاسکتا ہے کہ مولانا مملوک العلی اگر چہ بہت کھل کر (غالباً دہلی کالج کی ملازمت کی وجہ سے) حضرت سید صاحب اوراس تحریک کے ہم قدم نہیں رہے لیکن مولانا کی دلی وابستگی اور تائید حضرت سید صاحب کی خدمات اور انکے کام کے ساتھ تھیں۔

تحریک سید احمد شہید اور شاہ محمد اسماعیل کی دعوتِ توحید وسنت کی ترویج

مولانا مملوک العلی کے جوخاص تربیت یافتہ شاگرد اور وہ علماء ہیں جو مولانا کے عزیز وقریب تھے اور بعد میں ہندوستان میں تعلیماتِ دین اور احیائے اسلام کے نقیب ثابت ہوئے۔ وہ سب فکرولی اللٰہی کے نمائندہ وترجمان، تحریک سید احمد شہید کے دامن گرفتہ اوراس کے داعی ومبلغ تھے۔ اوران اصحاب کے ذریعہ سے ملت کوعلم ودین کا جوبیش بہا سرمایہ حاصل ہوا اور جودینی تعلیمی ادارے (دارالعلوم

دیو بند، مظاہر علوم سہارنپور وغیرہ اور ان کے اثر سے قائم اور فیض سے آراستہ ہزاروں لاکھوں دینی ادارے) برصغیر اور عالم سلام میں قائم اور آباد ہوئے وہ سب تحریک سید احمد شہید کے نمائندہ وترجمان ہیں اور یہ سب ادارے اور علمائے کرام اسی آواز کو، ان ہی مقاصد کو، اسی پیام کو لے کر چل رہے ہیں، آگے بڑھ رہے ہیں جس کی علمائے خاندان ولی اللّٰہی حضرت سید احمد شہید اور حضرت شاہ محمد اسماعیل نے آواز لگائی تھی، اور اس میں کچھ شک نہیں کہ علمائے دیوبند وسہارنپور میں ان اثرات کا ایک حصہ حضرت مولانا مملوک العلی کی تربیت وصحبت سے بھی آیا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ:

بہار رنگ وبو میں خون دیوانوں کا شامل ہے

نکاحِ بیوگان کی جدوجہد

حضرت سید صاحب نے جن برائیوں کے دور کرنے اور انکی اصلاح کی پرزور وپرجوش کوشش فرمائی تھی ان میں یہ ایک بڑا کام بیواؤں کے نکاح کرانے کی جدوجہد بھی تھی جس کی برکت سے ہزاروں بیواؤں کے نکاح ہوئے اور ہندوؤں کے اثر کی وجہ سے بیواؤں کے دوسرے نکاح کو سخت عیب سمجھنے کا جو رواج سو سال بلکہ اس سے زائد عرصہ سے مسلمانوں میں عام ہو گیا تھا، اس میں بہت کمی آئی۔

حضرت سید احمد صاحب نے اس مبارک کام کا اپنے خاندان بلکہ گھرانہ کی بیواؤں کے نکاح کرا کر آغاز کیا، خاندان حضرت شاہ ولی اللہ کے علماء نے اسکی تقلید کی اور پھر علاقہ کے اکابر علماء کی بھی ادھر خاص توجہ ہوئی، مختلف علاقوں کے ممتاز علماء نے دعوت وپیام کو آگے بڑھایا اور اس کا رواج عام کرنے کی کوشش فرماتے رہے، مولانا کی توجہ کی وجہ سے اور بھی کئی بڑے علماء نے اس میں خاص دلچسپی لی جس میں ایک بہت ممتاز اور نمایاں نام مولانا مملوک العلی کا ہے۔

مولانا مملوک العلی نے اس ہندوانہ رسم کو ختم کرنے اور مسلم معاشرہ کو اس سے پاک کرنے اور نکاحِ بیوگان کا رواج ڈالنے کے لئے قلمی اور عملی دونوں طرح موثر جدوجہد کی، نکاحِ بیوگان کیلئے جو فتوے لکھے گئے مولانا نے انکی تائید وتصدیق کی، ان پر دستخط کئے اور

نکاحِ بیوگان کی نانوتہ اور اسکے آس پاس کوشش فرمائی۔مولانا محمد یعقوب نے لکھا ہے:

''بیواؤں کے نکاح کی بنا ان اطراف میں اول ان (مولانا مظفر حسین کاندھلوی) سے ہوئی اور والد مرحوم نے اسکو نہایت خوبصورتی سے اجراء فرمایا اور ان دونوں بزرگواروں کے قدم بہ قدم حضرت مولانا (محمد قاسم) نے اسکو پورا شائع کیا''(۱)

بیواؤں کے نکاح کے ثواب اور اس مردہ طریقہ کو زندہ کرنے کیلئے ایک مفصل فتویٰ حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری نے لکھا تھا، حضرت شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کے اسی موضوع پر دو فتوؤں کے ساتھ (مطبع مطیع الرحمٰن دہلی سے ۱۲۶۸ھ مطابق ۵۲-۱۸۵۱ء میں) پہلی مرتبہ چھپا تھا (۲) اس پر مولانا مملوک العلی کے تائید اور مہر درج ہے۔

شفاعت کی تحقیق میں شاہ محمد اسماعیلؒ کی تائید.

حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید کے سفر ہجرت بلکہ شہادت کے بعد بعض علماء نے شاہ صاحب کی معرکۃ الآ را تصنیف تقویۃ الایمان کے خلاف شورش برپا کی اور اس پر طرح طرح کے اعتراضات کئے، جن میں ایک بڑا اعتراض شفاعت کے متعلق شاہ شہید کے بعض کلمات پر تھا۔ جو علماء علوم قرآن وسنت میں گہری نظر رکھتے تھے اور خاندان حضرت شاہ ولی اللہ سے تلمذ و تربیت کی نسبت رکھتے تھے ان میں سے اکثر نے اس اعتراض کے مختلف حیثیتوں سے جواب دیئے، کئی رسالے اور فتوے مرتب کئے گئے جن میں واضح دلائل سے حضرت شاہ محمد اسماعیلؒ کے الفاظ کے صحیح معنی اور شفاعت کی بحث میں علمائے سلف کا مسلک واضح کیا گیا تھا، اس سلسلہ کی تالیفات و تحریرات کا سلسلہ دیر تک جاری رہا، بعد کے دور میں اس موضوع پر جو تالیفات مرتب ہوئیں ان میں سے ایک مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی کا ایک مفصل فتویٰ بھی تھا۔ مولانا محمد حسین فقیر دہلوی نے اس فتوے پر ایک تمہید کا اضافہ کر کے اس کو "البضاعة في حقيقة الشفاعة" کے نام سے شائع کیا تھا، یہ فتوی ۱۲۶۶ھ میں مرتب ہوا تھا۔

(۱) حالات مولانا محمد قاسم، تالیف مولانا محمد یعقوب ص ۱۲ (بہاول پور ۱۲۹۷ھ)

(۲) اس اشاعت کا ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں ہے۔ اس فتویٰ کا اردو ترجمہ مولانا نواب قطب الدین دہلوی کی کتاب عروس المومنین (طبع اول، مطبع دارالسلام دہلی: ۱۲۶۴ھ) میں درج ہے۔

اس بحث کے متعلق ایک مشہور غلطی کی تصحیح اس میں مولانا نذیر حسین نے شاہ محمد اسماعیل پر کیئے گئے اعتراضات کا مفصل علمی جواب لکھا تھا، اس فتویٰ پر مولانا مملوک العلی کے تائیدی دستخط ہیں، جس سے اس بحث میں مولانا مملوک العلی کے نظریہ کا علم ہو جاتا ہے۔

نظریۂ شفاعت کی وجہ سے شاہ شہید پر اعتراضات، کچھ پس منظر اور حقائق

سب سے پہلے مولانا فضل حق خیرآبادی نے اعتراض کیا تھا مگر اس اعتراض اور اس کے بعد کے مباحث اور واقعات کے حوالہ سے سخت مغالطہ پایا جاتا ہے، اسلئے یہاں اس بڑی اور بہت مشہور تاریخی غلطی بلکہ غلط بیانی کی کچھ تحقیق وتصحیح ضروری معلوم ہوتی ہے۔

مشہور ہے کہ حضرت شاہ محمد اسماعیل کے سب سے بڑے مخالف مولانا فضل حق خیرآبادی تھے۔ مولانا خیرآبادی نے شاہ شہید کی برملا مخالفت کی، خیرآبادی کے شاہ شہید سے مناظرے یا مناظرہ بھی ہوا اور دونوں میں ہمیشہ ردوکد رہی، مگر یہ بات فرط شہرت (اور تقریباً پچاس کتابوں میں نقل ہونے) کے باوجود قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے۔

ایک اہم تاریخی حقیقت کا تذکرہ

حضرت شاہ محمد اسماعیل (ولادت ۱۲؍ربیع الثانی ۱۱۹۳ھ) نے اپنی معرکہ آراء تالیف ردالاشراک سنہ ۱۲۱۳ھ میں تالیف کی اور تقویۃ الایمان رمضان المبارک ۱۲۳۳ھ (جولائی ۱۸۱۸ء) میں لکھی گئی، اس کے بعد تحریک سید احمد شہید کا آغاز ہوا، اسی کے حوالہ سے تقویۃ الایمان کا پیام اور دعوت عام ہوئی اور پورے ملک میں پھیل گئی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز کی وفات تک حضرت شاہ شہید اور ان کے نظریات کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھی تھی، شاہ عبد العزیز کی وفات (۷؍شوال ۱۲۳۹ھ ۶؍جون ۱۸۲۴ء) کے سات مہینے کے بعد ۲۹؍ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ کو پہلی مرتبہ جامع مسجد دہلی میں دہلی کے چند علماء نے ایک اجتماع کیا تھا، جس میں شاہ محمد اسماعیل کے بعض نظریات پر بحث وگفتگو ہوئی تھی، اس موقع پر شاہ محمد اسماعیل اور مولانا فضل حق بھی موجود تھے، شاہ محمد اسماعیل نے اسی جلسہ میں اعلان کر دیا تھا کہ جس

کو بھی تقویۃ الایمان پر کوئی اعتراض یا شبہ ہو وہ یہاں میرے سامنے لائے اور پیش ہوتا کہ اس کا جواب دیا جا سکے، مگر مولانا خیرآبادی بالکل خاموش رہے، مولانا خیرآبادی نے نہ اس اختلاف کی تائید کی، نہ تقویۃ الایمان پر کوئی شبہ یا اعتراض کیا۔

مباحثہ جامع مسجد دہلی کے چھ مہینے کے بعد (آخر شوال ۱۲۴۰ھ جون ۱۸۲۵ء میں) شاہ محمد اسماعیل دہلی سے سفر جہاد کیلئے روانہ ہو گئے، جو دہلی بلکہ ہندوستان سے شاہ شہید کا آخری سفر تھا، اس سفر سے واپسی نہیں ہوئی، مگر اس وقت تک شاہ شہید یا تقویۃ الایمان کی تردید یا اعتراض میں کوئی تحریر مرتب نہیں ہوئی تھی، شاہ محمد اسماعیل کی دہلی سے آخری رخصت کے تقریباً آٹھ مہینے کے بعد جمادی الاخری ۱۲۴۱ھ (جنوری فروری ۱۸۲۶ء) میں مولانا فضل حق نے تقویۃ الایمان پر اعتراض کرتے ہوئے اپنی پہلی تحریر یا مختصر رسالہ ''تقریر اعتراض بر تقویۃ الایمان'' لکھا، جس میں تقویۃ الایمان کی ایک سیدھی سی عبارت پر اعتراض کرتے ہوئے شفاعت اور امکان و امتناع نظیر پر دقیق علمی اور فلسفیانہ بحث کی ابتدا کی۔

شاہ محمد اسماعیل قافلہ مجاہدین کی رفاقت میں شروع ذی الحجہ ۱۲۴۱ھ (جولائی ۱۸۲۶ء) سے سندھ میں قیام پذیر تھے کہ دس ذی الحجہ کو شاہ شہید کو مولانا خیرآبادی کا یہ رسالہ ملا، شاہ اسماعیل نے اسی وقت اسی مجلس میں اس کا قلم برداشتہ جواب لکھدیا تھا۔ اسی لئے شاہ محمد اسماعیل کی تالیف اور جواب کو ''رسالہ یک روزی'' کہا جاتا ہے۔

ادھر مولانا شہید کے رد میں مولانا خیرآبادی کے رسالہ کا چرچا ہوا، اِدھر رسالہ یک روزی کی نقلیں عام ہو گئیں۔

نیز تحریک سید احمد شہید کے ذریعہ سے بدعات و رسوم کے خلاف جس طویل جدوجہد اور مہم کا آغاز ہوا تھا اس کی تائید میں خانوادۂ ولی اللّٰہی کے علماء اور شاگردوں نے ایک مفصل فتویٰ یا رسالہ مرتب کر دیا، اس رسالہ یا فتوے کو بھی کثرت سے پڑھا گیا اور اس کی بہت شہرت ہوئی، مولانا خیرآبادی کو رسالہ یک روزی کے جواب کی تو جرأت نہ ہوئی مگر مولانا خیرآبادی نے اس فتوے کے جواب میں (بظاہر جمادی الثانی ۱۲۴۲ھ جنوری ۱۸۲۷ء میں) "ابطال الطغوی فی تحقیق الفتوی" لکھی تھی۔

حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ محمد اسماعیل ۲۴؍ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ (۸؍مئی ۱۸۳۱ء) کو بالاکوٹ میں شہید ہو گئے تھے مگر اس وقت تک مولانا خیرآبادی نے شاہ اسماعیل کے ردّ میں کوئی اور فتوی یا کسی قسم کی تحریر نہیں لکھی تھی۔ شاہ اسماعیل کی شہادت کے بعد بھی خاموش رہے، اس حادثہ کے چوبیس پچیس سال بعد ۷۳-۱۲۷۰ھ (۵۷-۱۸۵۵ء) میں مولانا فضل حق کے شاگرد مولانا ہدایت علی جونپوری نے مولانا حیدر علی ٹونکی کی ایک اور تالیف کے جواب میں " امتناع النظیر "مرتب کی تھی جس کو مولانا فضل حق سے منسوب کیا جاتا ہے، حالانکہ امتناع النظیر کا مولانا خیرآبادی سے انتساب درست نہیں، امتناع النظیر مولانا جونپوری کی تالیف ہے۔

اس فتنہ اور تفریق کا ذمہ دار کون تھا؟

واقعہ یہ ہے کہ شاہ محمد اسماعیل شہید اور تقویۃ الایمان کے خلاف برپا شورش میں بنیادی کردار مولوی رجب علی شیعہ کا ہے، رجب علی جگراؤں کا رہنے والا تھا۔ دہلی میں انگریزوں کے جاسوس اور ایجنٹ کی حیثیت سے متعین تھا اور یہ بات اب پوری طرح محقق اور ثابت ہو چکی ہے کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک میں دہلی کے مجاہدین اور تحریک جہاد کو سب سے زیادہ نقصان اسی شخص نے پہنچایا، یہ اس زمانے کا سب سے بڑا غدار اور دلی میں انگریزوں کا سب سے بڑا مخبر اور ایجنٹ تھا، اسی نے دلی کے اسلحہ خانہ کو اڑایا تھا اور اسی بدنصیب نے بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کیلئے جال بچھایا اور مرزا الٰہی بخش کو استعمال کیا تھا، اور حضرت شاہ محمد اسماعیل اور تقویۃ الایمان کے خلاف شورش بھڑکانے اور دہلی اور اطراف کے علماء سے مناظرے کرنیکا اور اس قضیہ کو آگے بڑھانے کا کام بھی اسی کا تھا۔ اگرچہ مولانا فضل حق خیرآبادی کو شاہ محمد اسماعیل شہید کے نظریات سے اختلاف تھا مگر وہ اس جھگڑے میں میدان میں کبھی نہیں آئے۔(۱)

(۱) درج بالا تمام واقعات کی تاریخی، تحقیق اور علمی دلائل کیلئے راقم سطور کی تالیف ''تقویۃ الایمان اور شاہ محمد اسماعیل کے خلاف برپا شورش تاریخ وحقیقت کے آئینہ میں'' کا انتظار فرمائیے جس کا نصف سے کچھ کم حصہ (پندرہ قسطیں) ماہنامہ الفرقان لکھنؤ میں چھپا ہے۔ (جولائی ۱۹۹۱ء سے اکتوبر دسمبر ۱۹۹۳ء تک) پوری کتاب انشاء اللہ جلد ہی سامنے آئے گی۔

باب (۱۰)

حضرت شاہ محمد اسحاقؒ کی ہندوستان سے ہجرت کے بعد شاہ محمد اسحاقؒ کی نمائندگی کے لئے علمائے ہند کے ایک مشاورتی بورڈ کی مشتبہ روایت

حضرت مولانا مملوک العلی جو خاندان ولی اللّٰہی کے اکابر کی صحبتوں کے پروردہ، ان کے علوم کے جامع وامین اوران کے فکر ومزاج اور تعلیمات واصول کے علم بردار تھے، انگریزوں کی ملازمت کے معاملہ میں بھی خانوادۂ ولی اللّٰہی کے علماء کے تابع فرمان تھے، حضرت شاہ عبدالعزیز اوراس خانوادہ کے علماء نے انگریزوں کی ملازمت جائز ہونے کا فتویٰ دیا تھا(۱) مگران کے طور وطریق سے مکمل احتیاط کی بھی تلقین (۲) فرمائی تھی، مولانا مملوک العلی نے زندگی بھراسی کواسوہ بنائے رکھا، مولانا مملوک العلی کی زندگی خصوصاً علمی تدریسی زندگی کا بڑا اور کامیاب حصہ انگریز کی ملازمت یعنی دہلی کالج کی مدرسی وسرپرستی میں گزرا مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت مولانا مملوک العلی جن کی ذہانت اور عالی دماغی کے اس وقت بھی غیر معمولی چرچے رہتے تھے، انگریزوں کی عیاری، سازشوں، اوران کی ہندوستانی نظام حکومت پر بڑھتی ہوئی گرفت اوراس کے متوقع اثرات سے بے خبر نہ ہوں گے، نیز حضرت مولانا جو مدرسہ دہلی (یا دہلی کالج) کے قائم ہونے کے پہلے دن سے اس ادارہ کے ذمہ دار رکن تھے، اس ادارہ کے مقاصد، کالج کے بانیوں کے نظریات وخیالات،

---

(۱) حضرت شاہ صاحب کا یہ فتویٰ ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم تاریخ ساز اور معرکہ آراء فتویٰ ہے، جسکے اثرات آج تک موضوع بحث بنے ہوئے ہیں۔ اصل فتویٰ کیلئے ملاحظہ ہو فتاویٰ عزیزی فارسی ص ۳۲ ص ۳۳ ج ۱ (مجتبائی دہلی ۱۳۲۲ھ)

(۲) فتاویٰ عزیزی ص ۱۱۸ ص ۱۲۰ ج دوم (مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۲۵ھ)

ان کے طریقۂ کار اور کالج کے دوررس اثرات، فائدوں اور نقصانات کو اس قدر ضرور جانتے تھے جس قدر کالج کے بانی جانتے ہوں گے۔

اس لئے حضرت مولانا نے کالج کے تعلیمی مقاصد سے اتفاق کرتے ہوئے کالج کے تعلیمی نظام کو ایسی ترتیب پر قائم رکھا جس سے یہ کالج سے زیادہ مدرسہ معلوم ہوتا تھا اور مولانا کی زندگی تک اس کالج سے صرف تعلیم وتربیت اور علمی نظریات کی ترجمانی و اشاعت کا کام ہوا۔ حضرت مولانا کا اس کالج کے ساتھ یہ تعاون ایک محدود دائرہ میں تعاون تھا اور حضرت مولانا نے اس کالج کو اپنی متعین کی ہوئی حدود سے کبھی تجاوز نہیں کرنے دیا۔ نیز حضرت مولانا نے نہ کبھی کالج کے کسی کام اور خدمت میں تساہل برتا، نہ کالج کے علاوہ انگریزوں کی کسی خدمت اور کام میں شریک ہوئے، حیرت ہوتی ہے کہ کالج کی ملازمت اور ہمہ وقت انگریز افسران سے روابط کے باوجود حضرت مولانا کا انگریز دشمنی کا طبعی فطری مزاج کس طرح قائم رہا اور مولانا نے کس طرح دہلی کالج کی سرپرستی و ملازمت اور انگریزوں کی ذاتی پذیرائی میں فاصلہ برقرار رکھا۔

حضرت مولانا کی انگریز دشمنی

حضرت مولانا انگریزوں سے کس قدر بےزار تھے اور اگر کبھی ان سے ملاقات ہوتی تو وہ کس کیفیت اور مجبوری میں ملاقات کرتے تھے، اس کا ایک واقعہ سے خوب اندازہ ہوجائیگا۔

ڈپٹی نذیر احمد کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ ہندوستان کا لیفٹننٹ گورنر دہلی دورہ پر آیا تھا(۱) اس کو دہلی کالج دیکھنے کی بھی دعوت دی گئی، گورنر نے مولانا کو دہلی کالج کا مدرس اعلیٰ (اور دہلی کا ممتاز عالم) سمجھ کر (مولانا کی عزت افزائی کیلئے) مولانا سے ہاتھ ملایا، مولانا نے ہاتھ تو ملالیا، مگر اسکے بعد کیا ہوا یہ پورا واقعہ ڈپٹی نذیر احمد کے الفاظ میں پڑھیے۔ لکھتے ہیں:

"ملکی لاٹ آئے اور تمام درس گاہوں کو دیکھتے بھالتے پھرے، قدردانی ہو تو ایسی ہو کہ جس جماعت میں جاتے مدرس سے ہاتھ ملاتے۔ بڑے مولوی صاحب

(۱) یہ لیفٹننٹ گورنر ولیم میور (SIR_WILLAM _MUIR) تھا، مولوی نذیر احمد نے لکھا ہے کہ جب حضور (ولیم میور) نے غدر سے پہلے کالج کا ملاحظہ فرمایا تھا میں عربی کی اول جماعت میں تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے لکچروں کا مجموعہ، لکچر نمبر ۲۰ ص ۴۳۰ ج ۲ (آگرہ: ۱۳۳۶ھ)

نے طوعاً و کرہاً بادلِ ناخواستہ آدھا مصافحہ کیا تو سہی، تو اس ہاتھ کو عضو نجس کی طرح الگ تھلگ لئے رہے، لاٹ صاحب کا منھ موڑنا تھا کہ بہت مبالغہ کے ساتھ انگریزی صابون نہیں بلکہ مٹی سے رگڑ رگڑ کر اس ہاتھ کو دھوڈالا'' (۱)

اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے مرزا فرحت اللہ بیگ نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''بچارے (مولانا مملوک العلی) پابندیٔ شرع اور تقویٰ کی وجہ سے چکر میں آگئے تھے، ہوا یہ کہ رزیڈنٹ بہادر مدرسہ کے معائنہ کو آئے، ان کے علم اور رتبے کے خیال سے ہاتھ ملایا، جب تک صاحب بہادر وہاں رہے انہوں نے ہاتھ کو جسم سے اس طرح الگ رکھا جیسے کوئی نجس چیز کو دور رکھتا ہے، جاتے ہی صاحب کے بہت احتیاط سے ہاتھ کئی بار دھویا'' (۲)

اسی ایک واقعہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت مولانا کی نظر میں اس ملک پر مسلط عیسائیوں اور انکے اربابِ اقتدار کی کیا حقیقت تھی اور وہ ان سے کس قدر دور رہنا چاہتے تھے۔ ان کی مجلسوں محفلوں میں جانا اور ان کا اعزاز و اکرام حضرت مولانا کو کس قدر ناگوار تھا، یہ ملاقات جو کسی اور ہندوستانی کے لئے ایک تاریخی لمحہ اور ایسی یادگار ملاقات ہوتی جس پر وہ اور شاید بہت زمانہ تک اس کی نسلیں بھی فخر کرتیں، اور اس کے حوالہ سے اپنے مفادات اور مقاصد پورے کرنیکی ہر ممکن کوشش کر سکتی تھیں، حضرت مولانا کی نگاہ میں ایسا بے وقعت اور غیر ضروری کام تھا کہ مولانا نے اس میں خفت محسوس کی اور اسکی تلافی کی کوشش فرمائی۔

عیسائیوں کے سلسلہ میں حضرت مولانا کا یہ رویہ اور مزاج خاندان حضرت شاہ ولی اللّٰہی سے وابستگی کا اثر اور اس زمانہ کے اکثر علماء اور غیرت مند ہندیوں کے خیالات کا عکس اور ترجمان تھا۔

لیکن اس وقت کے حالات ایسے نہیں تھے کہ انگریز اقتدار کے خلاف کوئی بڑی منصوبہ بندی کی جاسکتی، یا اس کو اقتدار سے باہر کرنے کی تدبیر پر عمل کیا جاتا، یہی وجہ ہے کہ اگرچہ حضرت شاہ ولی اللہ اور خاندانِ حضرت شاہ ولی اللہ کے علماء کی طرح حضرت شاہ

(۱) ابن الوقت، ڈپٹی نذیر احمد صفحہ اول ا (ناشر شیخ نذیر حسین دہلی۔ بلاسنہ)

(۲) دہلی کی آخری شمع، مرتبہ رشید حسن خاں ص ۵۵ (دلی: ۱۹۹۲ء)

محمد اسحاق اور شاہ محمد یعقوب (رحمہم اللہ) بھی انگریزوں کے تسلط اور غیر اسلامی نظامِ حکومت کی وجہ سے ہندوستان کو دارالحرب سمجھتے تھے مگر (تحریک سید احمد شہیدؒ کے بعد) حضرت شاہ محمد اسحاق یا اس خاندان کے کسی اور فرد نے انگریز کے خلاف مسلح جدو جہد کی کوشش نہیں کی، لیکن اگر کسی نے اس میدان میں قدم بڑھائے تو اس کو منع بھی نہیں کیا، یہی نظریہ مولانا مملوک العلی کا بھی معلوم ہوتا ہے۔ اگر چہ بہ ظاہر مولانا مملوک العلی بھی انگریزوں کے اقتدار اور ان کی بڑھتی سیاسی طاقت سے بے زار تھے، لیکن مولانا نے اس کے خلاف کسی عملی جدو جہد میں حصہ لیا ہو، اس کی منصوبہ بندی کی ہو، یا اس میں حضرت مولانا کا کچھ حصہ ہو اس کی کوئی شہادت اور اطلاع نہیں۔

برصغیر ہندو پاکستان کی گزشتہ دو سو سالہ سیاست اور انگریزوں کے خلاف اقدامات اور عملی جدو جہد میں حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت شاہ صاحب کے فکر و خیالات اور علوم و خدمات کے نام لیواؤں کے کام اور قربانیاں کسی تعارف کی محتاج نہیں، اور بلا تردد کہا جا سکتا ہے کہ پچھلی دو صدیوں میں انگریز کو برصغیر سے نکالنے کی کوئی جدو جہد ایسی نہیں تھی جس کا سرا خانوادہ ولی اللّٰہی کے علماء یا ان کے وابستگان سے نہ ملتا ہو۔ تحریک سید احمد شہید ہو، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے سورماؤں جیالوں کی روداد ہو، تحریک خلافت ہو، تحریک شیخ الہند مولانا محمود حسن ہو، یا تحریک خلافت کے بعد سے ۱۹۴۷ء تک کی دینی، اسلامی، سیاسی، ملی تحریکات، ہر اک میں اس جماعت کے نمائندے صف اول میں شامل اور ہر طرح کی قربانیاں دینے اور ہر پہلو سے جدو جہد کرنے میں دیگر جماعتوں سے نمایاں اور ہر محاذ پر اوروں سے آگے نظر آتے ہیں۔

مگر اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے زمانہ سے آج تک اس سلسلہ سے جس قدر بھی علماء، اہل کمال، مصنفین و مؤلفین، مدرسین اور داعیانِ اسلام وابستہ و منسلک رہے، سب ہی سیاسی تحریکی میدان کے رہ نورد اور عملی جدو جہد میں پیش پیش تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے عہد سے ہی سلسلہ ولی اللّٰہی کے علماء میں دونوں طبقہ و خیال کے نمائندے موجود تھے، جن میں سے کچھ سیاسی جدو جہد اور تحریک

کے علمبردار تھے کچھ جہاد اور اعلائے کلمۃ الحق کیلئے جانی و مالی قربانی دیکر: وقاتلوا فی سبیل الله الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان الله لایحب المعتدین پر بہر صورت عمل کرنا چاہتے تھے ،اور کچھ اس جد و جہد سے الگ اور سیاسی تحریکات کے خلاف تھے، کچھ اس کو دین ،ملت اور ملک کیلئے ضروری سمجھتے تھے اور نا مساعد حالات میں بھی اعلائے کلمۃ الحق کو فرض منصبی سمجھتے تھے اور بعض اس کی ضرورت کے قائل و معترف تو تھے لیکن یہ سمجھتے اور کہتے تھے کہ حالات ایسے نہیں ہیں کہ ہم معرکہ آرا ہو کر کوئی نتیجہ حاصل کر سکیں ، حالات ہمارے حق میں نہیں ، مسلح جد و جہد سے مسلمانوں کو سخت نقصان ہو گا ، اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔

یہ دوسری جماعت بھی پہلی جماعت کے علماء کی طرح مخلصین علماء صلحاء و اتقیاء کا گروہ تھا، اس کے بھی ارادے نیک تھے ، اس کی نیتوں میں بھی کوئی خرابی اور مقاصد میں کوئی فریب یا دنیاوی منافع و مفادات کا خیال نہیں تھا، لیکن وہ مسلح جد و جہد کے خلاف تھے، اور اس کو مسلمانوں کیلئے مہلک سمجھتے تھے اور یہ ترتیب اور تقسیم ۱۹۴۷ء تک اسی طرح قائم رہی، اسلئے حضرت شاہ ولی اللہ کی تحریک یا انکے سلسلہ سے منسلک ہر اک عالم و صاحب کمال کیلئے سیاسی خدمات کو ضروری سمجھنا، یا ان کی سیاسی جد و جہد کا تذکرہ تلاش کرنا دانشمندی نہیں ہے۔ یہ جاننا اور ماننا چاہئے کہ جو اصحاب اس طرح کی تحریکات سے دور یا اس کے مخالف رہے یا اس میں حصہ نہیں لیا وہ بھی اپنی رائے میں مخلص تھے اور انکا بھی ایسا ہی احترام کیا جانا چاہئے جس قدر ان لوگوں کا احترام کیا جاتا ہے جو سیاسی تحریکات میں شامل تھے۔

اور اس بحث و گفتگو کے وقت یہ بھی صاف اعتراف کیا جانا چاہئے کہ علماء یا بڑی دینی ملی شخصیتوں کی سیاسی جد و جہد اور ان کی عالی قدر خدمات اور ان کی زندگی کا صرف ایک معمولی اور کئی پہلوؤں سے صرف جزوی اور چھوٹا سا حصہ تھا، صرف سیاسی جد و جہد یا ۱۸۵۷ء یا بعد کی سیاسی تحریکات میں شامل ہونے یا نہ ہونے کی وجہ سے انکے اور کمالات و خدمات ، اخلاص ، تقویٰ ، للّٰہیت وغیرہ محاسن پر پردہ ڈالنا غلط ہی نہیں بلکہ سخت ناانصافی اور بددیانتی ہے۔ اسی طرح ان علمائے کرام کو جنھوں نے سیاسی تحریکات سے علیحدہ ہو کر دینی

علمی خدمات کو اپنا مقصد حیات بنالیا تھا اور خاموشی سے افراد سازی اور ملت کے معمار تیار کرنے میں مشغول رہتے تھے، سیاسی جدوجہد کا قائد بنا کر دکھانا اور ناکردہ گناہ ان کے سر تھوپنا بڑی جسارت اور سخت غلطی ہے، حق یہ ہے کہ:

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

کچھ پھول چمن کے لئے ہوتے ہیں، کچھ عیش ونشاط کی محفلوں کیلئے اور کچھ صرف غم والم کی مجلسوں میں نثار کرنے کیلئے، ہر ایک سے ایک ہی خوشبو ایک ہی کیف کی امید رکھنا، یا ہر شخص سے ایک ہی بٹیا اور راستہ پر چلنے کی توقع کرنا درست نہیں۔ یہ نہ انصاف ہے اور نہ دین وشریعت کا مطالبہ۔

مولانا عبیداللہ سندھی کا ایک بے ثبوت نظریہ یا اطلاع

اس پس منظر میں یہ عرض کرنا مناسب ہے کہ متأخر دور کے چند تذکرہ نگاروں اور علماء نے مولانا مملوک العلی کو تحریک ۱۸۵۷ء کے مؤسسین میں شمار کیا ہے جو صحیح نہیں ہے، اور غالباً اس غلط فہمی کی اساس مولانا عبیداللہ سندھی کی اس اطلاع پر ہے کہ:

''مولانا محمد اسحاق مکہ معظمہ میں اپنے بھائی مولانا محمد یعقوب دہلوی کو اپنے ساتھ لے گئے اور دہلی میں مولانا مملوک العلی کی صدارت میں مولانا قطب الدین دہلوی اور مولانا مظفر حسین کاندھلوی اور مولانا عبدالغنی دہلوی کو ملا کر ایک بورڈ بنا دیا جو اس نئے پروگرام کی اشاعت کر کے نئے سرے سے جماعتی نظام پیدا کرے اور یہی جماعت ہے جو آگے چل کر دیوبندی نظام کو چلاتی ہے۔ (۱)

مولانا عبیداللہ سندھی نے اسی سلسلہ گفتگو میں چند صفحات کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ:

''چونکہ مولانا محمد اسحاق نے حزب ولی اللہ کے کام کو چلانے کیلئے دہلی میں جو انتظام کیا تھا اسے آپ کمپنی کے کارندوں سے مخفی رکھنا ضروری سمجھتے تھے اور اسی غرض کے پیش نظر انہوں نے اپنا مرکز مولانا مملوک العلی کے حوالہ کیا تھا، جو ایک سرکاری ملازم تھے اور آپ نے اپنے خاص اصحاب کی جماعت کو انکے تابع کر دیا تھا'' (۲)

(۱) شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۱۲۴ (لاہور: ۱۹۴۵ء) (۲) ایضاً ص ۱۳۰

مولانا سندھی کے حوالہ سے یہ بات بار بار دہرائی اور کہی گئی ہے، مولانا محمد میاں دیوبندی، رتن لال بنسل اور متعدد اہل قلم نے یہ رائے نقل کی ہے، اس کے علاوہ اس موضوع کا جس جگہ ذکر کیا گیا ہے وہ مولانا سندھی کی تحریروں کی بازگشت یا اس سے مستفاد ہے، جس کو بعض حضرات صحیح بھی سمجھتے ہیں مگر اس اطلاع کی صداقت مشتبہ ہے، راقم سطور کو ممکنہ تلاش وجستجو کے باوجود اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔

خاندان حضرت شاہ ولی اللہؒ اور سلسلۂ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ میں اس قسم کے کسی بورڈ یا مشاورتی کمیٹی کا کہیں کوئی وجود نہیں تھا، شاہ عبدالعزیزؒ نے کوئی بورڈ بنایا نہ شاہ محمد اسحاقؒ نے مشاورتی کمیٹی تشکیل دی، نہ ہی حضرت شاہ صاحب کے سفر ہجرت ۱۲۵۸ھ کے بعد کوئی مشاورتی نمائندہ کمیٹی موجود تھی، جسکے صدر مولانا مملوک العلی ہوں اور مولانا مظفر حسین وغیرہ علماء اسکے رکن مقرر کئے گئے ہوں، ان بزرگوں کے حالات وسوانح کے جو قدیم مستند مآخذ اور جو مکتوبات وتحریرات اب تک شائع ہوئے ہیں یا ہماری دسترس میں ہیں ان سے اسکا کچھ ثبوت بلکہ اشارہ تک نہیں ملتا۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا سندھی نے یہ خیال یا نظریہ امیر الروایات (مجموعہ مرویات قصص علماء سلسلہ ولی اللّٰہی وعلماء دیوبند بزبانِ امیر شاہ خان مینڈھو) کی ایک روایت سے اخذ کیا ہے (۱) اور اسی کو ایک تاریخ اور فلسفہ سمجھ لیا ہے حالانکہ اصل روایت سے ظاہر ہے کہ اسکا وہ مطلب نہیں ہے جو مولانا سندھی کی فکر کی بنیاد ہے۔

اگرچہ حضرت شاہ محمد اسحاق اپنے بزرگوں وحضرت شاہ عبدالعزیز وغیرہ کی طرح ہندوستان کو دارالحرب سمجھتے تھے اور اسی لئے ہندوستان سے ہجرت فرماگئے تھے اور حضرت شاہ محمد اسحاقؒ کے چند ممتاز شاگرد مثلاً حضرت شاہ عبدالغنی مجددی بھی اسی کے قائل تھے، قرین قیاس ہے کہ مولانا مظفر حسین بھی اس کے ہم نوا ہوں (مگر مجھے اس کی کوئی تحریری شہادت نہیں ملی) لیکن ان حضرات نے مسلح جدوجہد کیلئے ماحول سازگار نہیں سمجھا تھا اس لئے میدان میں نہیں آئے، تاہم وہ یہ بھی جانتے تھے کہ احیائے دین کا یہی ایک طریقہ

(۱) مولانا نورالحق نے شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک میں الصدر الحمید شاہ محمد اسحاق کے حاشیہ میں اس کی تصریح کی ہے کہ مولانا سندھی کے اس نظریہ کی بنیاد امیر الروایات ص ۸۸ طبع اول دہلی ۱۳۴۵ھ کی ایک روایت ہے۔

نہیں ہے، ہندوستان میں خدمت دین کے بہت مواقع اور بے شمار صورتیں ہیں، اس لئے ان حضرات میں سے جس نے جس کام کو اپنے لئے موزوں سمجھا ان میں پورے انہماک سے آخر وقت تک مصروف رہے، ان حضرات کی یہ خدمات ہندوستان میں دین کے قدم جمانے کے مترادف تھیں اور یقیناً ان سے بہت فائدہ ہوا، ایسا فائدہ کہ آج تک ہم سب ان کی برکات سے بہرہ ور ہیں۔

حضرت شاہ عبدالغنی حضرت شاہ محمد اسحاق کی ہجرت (۱۲۵۸ھ) کے پندرہ سال بعد تک ہندوستان میں رہے، شاہ عبدالغنی نے ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۷ء) میں ہجرت فرمائی۔ مولانا مظفر حسین ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے فوراً بعد مکہ معظمہ چلے گئے تھے، پھر واپس آ گئے تھے، اسکے بعد آتے جاتے رہے، آخر میں ہجرت کی نیت سے گئے اور مدینہ منورہ میں ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) میں وفات ہوئی، یعنی ۱۸۵۷ء کے بعد مولانا مظفر حسین نے بھی ہندوستان میں رہنا پسند نہیں کیا۔ نواب قطب الدین بھی ۱۸۵۷ء کے بعد تک دہلی میں مقیم تھے بعد میں سفر ہجرت کیا، یعنی یہ تینوں علماء (جن کو مولانا سندھی نے ایک مشاورتی بورڈ کا رکن بنایا ہے) ۱۸۵۷ء سے پہلے اور اسکے بعد بھی ہندوستان میں برسوں قیام فرما رہے (مگر اسوقت تک) ان بزرگوں کے جو حالات، مکتوبات، تصانیف اور متعلقہ تحریرات دریافت ہیں ان میں سے کسی ایک تحریر سے بھی یہ اشارہ نہیں ملتا کہ یہ حضرات کسی بورڈ یا مشاورتی کمیٹی کے رکن تھے اور خاص (خفیہ) منصوبہ بندی کے ساتھ کوئی کام کر رہے تھے۔

اگر چہ ان حضرات کے برصغیر کے مسلمانوں سے وسیع روابط تھے اور یہ سب ہی حضرات اپنی دینی خدمات میں تعلیم و تربیت، اصلاح و ارشاد، تصنیف و تالیف اور وعظ و تذکیر کے ذریعہ سے ہمیشہ سرگرم رہے، مگر یہ تمام مصروفیات سیاسی تذکروں سے پاک اور اعلائے کلمۃ الحق کے لئے تھیں اور ہر شخص جانتا ہے کہ ہمیشہ ہر موقع پر سیاسی جدو جہد کا تذکرہ یا جہاد بالسیف کی تیاری ضروری نہیں۔

یہی بات پوری قوت سے مولانا مملوک العلی کے لئے بھی کہی جا سکتی ہے کہ مولانا کی زندگی کا ایک ایک دن بلکہ ایک ایک لمحہ علم و فضل کے گلدستے تیار کرنے اور انسانیت کے

نمونے بنانے میں صرف ہورہا تھا، مولانا کی علمی مصروفیات جو دن رات کے انہماک میں تبدیل ہوگئی تھیں، ایسی تھیں کہ ان میں کسی اور کام کے لئے وقت فارغ کرلینا سخت مشکل بلکہ تقریباً ناممکن تھا، اور مولانا جس اہم منصب پر فائز تھے وہاں رہ کر جو بڑی دینی خدمت انجام دے رہے تھے اور مولانا کی بھاری بھرکم شخصیت نے جس طرح دہلی کالج کو انگریزیت کی آلودگی اور عیسائیت کے مذہبی اثرات سے اور اسکو تبلیغ عیسائیت کا بڑا اڈہ یا مرکز بننے سے محفوظ رکھا وہ معمولی بات نہیں تھی، یہ بھی ایک بڑی خدمت اور کارنامہ ہے۔

شاہ محمد اسحاق کے سفر ہجرت کے بعد ملک کی آزادی کے لئے جو جدو جہد ہوئی اس میں حضرت شاہ محمد اسحاق کے دامن تربیت سے وابستہ علماء اور مولانا مملوک العلی کے متعدد شاگرد بے شک شریک ہوئے، بلکہ وہ اس مسلح جدو جہد کے قائدین اور رہنماؤں کی صف اول میں شامل تھے، اور یہ بھی صحیح ہے کہ مولانا سندھی نے اس کمیٹی کے تحت جن علماء کے نام درج کئے ہیں ان میں سے کچھ ۱۸۵۷ء کی تحریک کے ہم نوا تھے، شاہ عبدالغنی نے جہاد کے فتویٰ پر دستخط بھی فرمائے تھے (۱) نیز ان علماء کے بہت سے وابستگان اس معرکہ میں شریک تھے، بعض شہید ہوئے، کسی نے سزا پائی، کوئی ہجرت کر گیا، مگر یہ ان حضرات کا ذاتی فعل تھا اور اگرچہ اس قسم کے اکثر اصحاب نے جذبۂ حریت کی یہ فراوانی، قربانی کا یہ جذبہ اور دین کیلئے مر مٹنے کی یہ کیفیت خاندانِ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے مختلف سرچشموں سے حاصل کی تھی مگر اس مقصد کے لئے تحریک حضرت سید احمد شہید کے بعد بھی کوئی منظم تحریک چلی ہو، یا خانوادۂ حضرت شاہ ولی اللہ کے علماء کی جانب سے اس قسم کی کوئی مجلس یا کمیٹی قائم کی گئی ہو اور اس نے اس مقصد کیلئے متواتر کام کیا ہو اور اس مجلس کی ذمہ داری اور سرپرستی کچھ اصحاب کے سپرد ہو اور ان سے یہ روایت اور خدمات بعد کے اراکین یا ممبران مجلس کو منتقل ہوئی ہوں، بالکل غلط اور ایک ایسا مفروضہ ہے جس کا ہمارے علمی تاریخی سرمایہ میں کچھ ثبوت بلکہ

(۱) انگریز کے خلاف جہاد کیلئے علمائے دہلی نے جو تاریخی فتویٰ مرتب فرمایا تھا، اس پر حضرت شاہ عبدالغنی کے دستخط ہیں،
العبد مولوی عبدالغنی
یہ فتویٰ اسی وقت اخبار الظفر میں چھپا تھا، اس کا عکس عبدالرزاق صاحب کی کتاب نوائے آزادی میں شامل ہے۔ ص ۹ (بمبئی: ۱۹۵۷ء) اور ملاحظہ ہو اٹھارہ سو ستاون (۱۸۵۷ء) اخبارات و دستاویزات محمد عتیق صدیقی)

اشارہ تک نہیں ملتا، لہٰذا یہ بات صحیح نہیں ہے، اس کی بلا تأمل تردید کی جاسکتی ہے۔

حضرت شاہ محمد اسحاق کے سفر ہجرت (۱۲۵۸ھ) کے بعد مولانا مملوک العلی نو سال حیات رہے اور مولانا کا اس عرصہ میں (وطن کے سفر کے علاوہ غالباً) کہیں آنا جانا نہیں ہوا، مولانا سندھی کا یہ نظریہ اگر درست ہے تو اس کا تقاضہ تھا کہ حضرت مولانا مملوک العلی انگریزوں کے خلاف تیاری کرتے، اس سلسلہ میں کچھ جدوجہد فرماتے اور اس کے کچھ نہ کچھ اشارات مولانا کے شاگردوں اور متعلقہ اصحاب کی تحریروں سے جھلکتے، مگر مولانا کے دور کے جو اخبارات وغیرہ اب تک دستیاب ہوئے اور ان کے مندرجات کا جو حصہ شائع ہو چکا ہے، اس میں مولانا مملوک العلی کی اس نمائندگی یا مزاج کا کوئی تأثر نظر نہیں آتا، یہی وجہ ہے کہ چند ممتاز مورخین نے بھی مولانا عبیداللہ سندھی کے اس نظریہ کی صاف تردید کی ہے، مثلاً ڈاکٹر محمد اکرام لکھتے ہیں:

> ''مولانا عبیداللہ سندھی کی بعض باتوں سے اختلاف کرنا دشوار نہیں، وہ صرف مذہبی معاملات ہی میں نہیں بلکہ سیاسی امور میں بھی ولی اللّٰہی طریقے کو اپنا اساس کار بتاتے ہیں اور مجاہدین بالاکوٹ کے اختلاف کو ٹراٹسکی اور سٹالین کے اختلاف کی روشنی میں دیکھتے ہیں (۱)، نتیجہ یہ ہے کہ ان کے خیالات وافکار میں بسا اوقات تکلف نظر آتا ہے اور ان کی تصانیف میں ایسی چیزیں بھی مل جاتی ہیں جنھیں آپ بوڑھوں کی بہکی بہکی باتیں کہہ سکتے ہیں۔ مولانا کے کئی نظریے محل نظر ہیں اور ان کے چند ایک بیانات کی صحت بھی شبہ سے بالا نہیں، اس کے علاوہ صادق پوری پارٹی کے متعلق انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان میں بھی وہ کسی حد تک جادۂ اعتدال سے منحرف ہو گئے'' (۲)

دوسرے لوگوں نے یہ بات اور وضاحت سے لکھی ہے اس لئے مولانا سندھی کی اس روایت پر اعتماد درست نہیں۔

---

(۱) مثلاً دیکھئے شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، مولانا سندھی ص ۱۰۷ (لاہور ۱۹۴۵ء)

(۲) موج کوثر، شیخ محمد اکرام ص ۳۴۹ (لاہور: ۱۹۷۵ء)

اس میں شک نہیں کہ مولانا عبید اللہ سندھی مدبر، مفکر، علوم ولی اللہی کے ماہر اور ملی سیاست کے رہنماؤں میں سے ایک ہیں، لیکن مولانا نے حضرت شاہ ولی اللہ سے تحریک شیخ الہند تک واقعات کی جو ترتیب بنائی ہے اور جس طرح خاندان حضرت شاہ ولی اللہ کے سیاسی نظام کا تسلسل ثابت کیا ہے اس کی صداقت مشتبہ ہے۔ مولانا سندھی نے جس نظام اور ترتیب کی نشاندہی فرمائی ہے مولانا سندھی کی تحریرات کے علاوہ اس کا کہیں نام ونشان نہیں ملتا، خانوادۂ علمائے ولی اللہی کی تحریرات وتصانیف، مکتوبات اور علمی آثار اور سوانحات کا جو وسیع ذخیرہ موجود ہے وہ اس ترتیب کی تائید سے قاصر ہے۔ ان بزرگوں نے جو دینی علمی یا ملی خدمات انجام دیں ہیں وہ سب اپنی اپنی جگہ یقیناً بے نظیر اور ملت کی تاریخ کا غازہ ہیں، لیکن علماء واکابر میں سے ہر ایک کو سیاسی تحریکات سے وابستہ دکھانا ضروری نہیں، میرا خیال ہے کہ ہم ان میں سے بعض حضرات کو خواہ مخواہ سیاسی تحریکات سے وابستہ کر کے ان بزرگوں کی رفعت وعظمت میں اضافہ نہیں کرتے، بلکہ ایک ایسی موہوم حقیقت کا دعویٰ کرتے ہیں جس کو ثابت نہیں کر سکتے۔

مولانا سندھی کی ذہانت نے اس قسم کے کئی پیکر تراشے ہیں اور ان کا خاص ترتیب اور وسیع پس منظر کے ساتھ ذکر کیا ہے، مگر تاریخی حقائق مولانا کی روایات کا ساتھ نہیں دیتے، ان اطلاعات کا جب واقعات کی روشنی میں تجزیہ کیا جاتا ہے تو مولانا کی روایات کی صداقت پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔

مولانا سندھی کے بعض دینی علمی نظریات وخیالات اور انکے ذریعہ خاندان حضرت شاہ ولی اللہ اور علمائے دیوبند کی ترجمانی مطابق واقعہ نہیں، اس کا اوروں کے علاوہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی نے بھی ذکر فرمایا ہے، مناسب ہوگا کہ یہاں حضرت مولانا مدنی کی ایک تحریر کا اقتباس بھی نقل کر دیا جائے۔ حضرت مولانا نے لکھا ہے:

> ''تمام اہل قلم اور ارباب قلم وعلم سے پرزور درخواست ہے کہ مولانا مرحوم کی کسی تحریر کو دیکھ کر اس وقت تک اس پر کوئی حتمی رائے قائم نہ فرمائیں جب تک کہ اس کو اصول اور مسلماتِ اسلامیہ اور ضروریاتِ دین واعمالِ اہل سنت والجماعت کے

زریں قواعد و تالیفات پر پرکھ نہ لیں۔ اور علیٰ ہذا القیاس مولانا کے کسی کلام کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اسلاف و اکابر دیوبند کا مسلک بھی نہ سمجھیں جب تک کہ اسی کسوٹی پر اس کو کس نہ لیں۔ یہ حضرات اکابر جملہ عقائد و اعمال میں خواہ وہ فروع سے تعلق رکھتے ہوں یا اصول سے سلف صالحین اور ان کے اصول و قوانین مسلمہ اہل سنت والجماعت ہی کے تابع ہیں اور اسکی تعلیم و تلقین کرتے رہے ہیں۔(۱)

جب مولانا کے مذہبی، دینی، فقہی خیالات میں اس قدر بے ترتیبی درآئی تھی تو تاریخی روایات و واقعات میں اس کا اثر آجانا غیر متوقع نہیں تھا، اور اسی کا ایک اثر وہ روایت بھی ہے جو مولانا شاہ محمد اسحاق کے مشاورتی بورڈ کے متعلق ہے۔

(۱) حضرت مولانا حسین احمد مدنی کا یہ مضمون اولاً ماہنامہ برہان دہلی (جلد ۱۴ کے شمارہ نمبر ۴) میں چھپا تھا اور ذاتی ڈائری مولانا عبید اللہ سندھی مع رسائل، مرتبہ مولانا محمد عبد القدوس قاسمی (مطبوعہ لاہور: ۱۹۴۶ء) میں بھی شامل ہے۔ ملاحظہ ہو، ص: ۴۹-۵۰

باب (۱۱)

اخلاق و مزاج کی ایک سرسری جھلک

حسن کردار، اپنے سے چھوٹے باخدا اصحاب سے محبت اور نیاز مندی و احترام کا معاملہ نیز سادگی، بے تکلفی، خوش طبعی اور دل جوئی کے چند واقعات.

حضرت مولانا مملوک العلی اگرچہ دہلی کے بڑے نامور عالم، مشہور مدرس اور دہلی کے ایک بڑے علمی تصنیفی مرکز، دہلی کالج کے مدرس اوّل اور عملاً سربراہ بھی تھے، مولانا کے تمام اوقات تعلیم اور پڑھانے میں صرف ہوتے تھے اور کیونکہ کالج سے معقول تنخواہ ملتی تھی اسلئے خرچ بھی اعلیٰ درجہ کا تھا، رئیسوں کی طرح رہتے تھے۔ اس کے علاوہ مولانا کے علم و فضیلت، دہلی کالج کی صدر مدرسی اور ذاتی کمالات کی وجہ سے دہلی کی دینی علمی مجلسوں اور اصحابِ دولت و اقتدار میں بھی مولانا کا نہایت احترام تھا، ہر ایک مجلس میں ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے اور اعزاز و مرتبہ سے نوازے جاتے تھے، مگر اس احترام اور دن رات کی بے پناہ غیر معمولی تعلیمی مصروفیت کے باوجود مولانا نہایت کشادہ پیشانی، شگفتہ مزاج اور سادہ طبیعت شخص تھے، طالب علموں کا بہت احترام کرتے تھے، ان پر شفقت و کرم کی نگاہ رکھتے کبھی کوئی طالب علم بیمار ہو جاتا تو اسکی قیام گاہ پر جا کر اسکی مزاج پرسی کرتے، کوئی ضرورت مند ہوتا اسکا تعاون فرماتے اور جو بھی علم کا شائق مولانا کے دروازے پر آ جاتا کوشش کرتے کہ اس کا ہر ممکن تعاون فرمائیں، وقت میں کسی طرح بھی گنجائش نکل سکتی تو اس کو مایوس نہ فرماتے اور جیسے بھی ممکن ہوتا زیادہ سے زیادہ طلباء کو زیادہ سے زیادہ کتابیں

پڑھاتے، طالب علموں کیلئے وقت کی پابندی تو تھی مگر اپنے لئے آرام اور فراغت کے لمحات کی پابندی نہیں تھی، طالب علم فجر کی اذان سے مولانا کے کالج جانے تک بلکہ کالج کے راستے میں اور واپسی کے وقت بھی اور پھر اس وقت سے رات دیر گئے تک مولانا سے پڑھتے رہتے تھے، مولانا ہمیشہ بہت محبت اور خوش طبعی کے ساتھ پڑھاتے اور چاہتے تھے کہ کوئی طالب علم آزردہ خاطر نہ ہو، کسی کو مجھ سے شکایت نہ ہو اور کسی کا علمی نقصان اور اسکے تعلیمی سفر میں خلل نہ ہو، اس کے لئے خود ہر طرح کی پریشانی اُٹھاتے مگر طالب علموں کا پریشان ہونا گوارہ نہیں تھا۔ کریم الدین پانی پتی جو مولانا کا شاگرد اور کالج سے گھر تک مولانا کی مصروفیات اور معمولات کا چشم دید گواہ ہے، لکھتا ہے:

''انکے حسن اخلاق سے یہ بعید ہے کہ کسی طالب علم کی خاطر رنجیدہ کریں''(۱)

ایک مرتبہ حضرت مولانا کے شاگرد مولانا رشید احمد گنگوہی خارش میں مبتلا ہوئے، مرض بڑھتا رہا مگر مولانا گنگوہی نے حضرت مولانا کے درس میں جانا نہیں چھوڑا، ایک روز مرض کی بہت شدت تھی مگر اس دن بھی سبق میں حاضر ہو گئے، حضرت مولانا نے فرمایا:

''میاں رشید احمد تمہارا تو وہ حال ہو گیا کہ بقول شخصے:

یک تن و خیل آرزو بہ چہ مدعا دہم
تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم''(۲)

طلباء کی تعلیم پر بھرپور توجہ اور ان کیلئے ہر وقت حاضر رہنے کے علاوہ حضرت مولانا کے کردار اور مزاج کا ایک اور پہلو بھی نہایت دلکش اور قابل عمل ہے۔

جو معلومات دستیاب ہیں ان سے تو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مولانا کے اپنے دور کے ممتاز مشائخ اور اصحابِ سلوک و طریقت سے کیا روابط تھے، کہاں حاضری کا معمول تھا، مولانا کس سلسلہ کے کون سے شیخ سے وابستہ تھے اور راہِ سلوک کا کس قدر سفر کس راستہ اور ترتیب سے طے فرمایا تھا، مگر قرین قیاس ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز یا حضرت سید احمد

(۱) تذکرہ فرائد الدہر ص ۴۰۳ (دہلی ۱۹۹۲ء)

(۲) تذکرۃ الرشید ص ۲۷۶ ج ۲

شہید کے گرفتہ دامن ہوں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ دہلی یا اپنے نواح کے علماء اور مشائخ میں سے کسی سے استفادہ کیا ہو، لیکن ان تفصیلات سے قطع نظر مولانا اپنے بعض خدادوست نیاز مندوں اور شاگردوں سے قدر و منزلت اور احترام پذیرائی کا جو معاملہ فرماتے تھے اس سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ مولانا کے دل میں اللہ والوں اور دین کے مخلص سچے خادموں کی بے پناہ وقعت تھی، اگرچہ ان میں سے بعض عمر میں، صلاحیت میں، علم و مرتبہ میں حضرت مولانا سے بہت چھوٹے اور چند ایک مولانا کے حلقۂ درس کے حاضر اور طالب علم تھے اس کے باوجود مولانا اُن کو کس نظر سے دیکھتے تھے اور ان کی بے نفسی پر کیسے فریفتہ تھے، ان چھوٹوں کی انہیں صفات اور کمالات کی وجہ سے ان سے وہ معاملہ کرتے تھے جو اپنے بڑوں اور بزرگوں سے کیا جاتا ہے، ان کو یوں نوازتے جیسے وہ مولانا کے بڑے اور مرشد و مخدوم ہوں۔ اس جلالت شان، عظمت و احترام خصوصاً علمی مرتبہ و وقار کے باوجود اپنے چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور اُن کو احترام سے نوازنا اپنے آپ میں خود ایک غیر معمولی بات، خود شکنی و بے نفسی کا اعلیٰ ترین نمونہ اور دل میں دین و شریعت کے بے پناہ احترام کا مظہر ہے۔

یہاں مولانا کے تین صاحبان سے روابط و معاملہ کا ذکر کیا جاتا ہے جو تینوں ہی علم و عمر اور مرتبۂ کمال میں مولانا سے بہت چھوٹے تھے لیکن مولانا ان سے غیر معمولی بلکہ ایسا رابطہ رکھتے تھے جیسا اپنے ہم عمروں بلکہ اپنے سے ممتاز اصحاب سے کیا جاتا ہے۔ اس مختصر فہرست میں حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی، حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی اور مولانا کے ایک شاگرد مولانا محمد حسن رامپوری سے روابط کی خاص شان تھی، ملاحظہ ہو۔

حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی طالب علم کی حیثیت سے دہلی گئے تھے، جب مولانا دہلی پہنچے ہونگے اس وقت حضرت مولانا مملوک العلی دہلی کے بڑے علماء اور اہل درس میں گنے جاتے ہونگے، یہی وہ دور ہے جس میں دہلی کالج قائم ہوا اور مولانا مملوک العلی اس کے مدرسِ دوم مقرر کیے گئے، مولانا مملوک العلی کے سامنے ہی مولانا مظفر حسین کی طالب علمی کا اختتام ہوا ہوگا اور چونکہ مولانا مملوک العلی حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی

کے شاگرد تھے اس لئے مولانا مظفر حسین کے والد ماجد اور دوسرے اعزاء نیز خانوادہ کے تمام ہی افراد سے قریبی مراسم رکھتے ہونگے اور مولانا مملوک العلی مولانا مظفر حسین سے بھی ان کی نوعمری سے واقف ہونگے، لیکن اس سب کے باوجود مولانا مملوک العلی، مولانا مظفر حسین کا اس طرح احترام کرتے تھے جیسے اپنے بزرگوں کا کیا جاتا ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب نے (حالات طیب مولانا محمد قاسم میں) مولانا مظفر حسین صاحب کا بلند الفاظ میں تذکرہ کیا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ مولانا محمد یعقوب کا یہ تأثر دراصل حضرت مولانا مملوک العلی کے خیالات کا پرتو ہے، مولانا مملوک العلی مولانا کاندھلوی کا اس قدر خیال فرماتے تھے کہ:

"مولانا مظفر حسین نے کہہ رکھا تھا کہ دہلی سے آتے اور جاتے ہوئے کاندھلہ میں مل کر جایا کرو" (۱)

مولانا مملوک العلی نے ہمیشہ اس کی پاسداری کی، جب کاندھلہ سے گذرتے یہاں ٹھہر کر ملاقات کر کے جاتے، واپسی کے لئے بھی یہی ضابطہ تھا۔

مولانا مظفر حسین صاحب نے اتباعِ سنت اور نکاحِ بیوگان وغیرہ کی جو تحریک شروع کی تھی حضرت مولانا مملوک العلی نے اس کی بھی تائید فرمائی اور مولانا مظفر حسین کے طریقہ پر کام کرتے رہے، مولانا محمد یعقوب صاحب نے لکھا ہے کہ:

"بیواؤں کے نکاح کی بناء ان اطراف میں اوّل ان (مولانا مظفر حسین) سے ہوئی اور والد مرحوم نے اس کو نہایت خوبصورتی سے اجراء فرمایا، ان دونوں بزرگواروں کے قدم بہ قدم حضرت مولانا (محمد قاسم) نے اس کو پورا شائع کیا" (۲)

حضرت حاجی صاحب حضرت مولانا مملوک العلی سے عمر میں بہت (تقریباً تیس سال) چھوٹے تھے مگر مولانا مملوک العلی کا ان سے بھی یہی رابطہ تھا، یہاں تک کہ جب حاجی صاحب (جو اس وقت نوعمر تھے) دہلی آجاتے تو مولانا مملوک العلی کی درسی

(۱) حسن العزیز ص: ۴۹۰ جلد اوّل (تھانہ بھون)

(۲) قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، احوال و آثار باقیات و متعلقات ص: ۱۹۱ (کاندھلہ ۱۴۲۱ھ)

مصروفیات بھی کم ہو جاتیں اور مولانا شاگردوں سے فرما دیتے کہ اب حاجی صاحب آ گئے، سبق پھر ہوگا اور وطن سے آتے جاتے وقت مولانا مظفر حسین صاحب سے ملاقات کا جو معمول تھا اس کا تھانہ بھون میں بھی اعادہ ہوتا تھا۔

تیسرے شخص جو مولانا کے شاگرد اور مولانا کے ہر طرح سے نیاز مند تھے، مولانا ان سے بھی بزرگوں جیسا معاملہ کرتے اور ان کا بے حد احترام فرماتے تھے، یہ مولانا محمد حسن انصاری رامپوری تھے۔ وطن میں ابتدائی تعلیم کے بعد دہلی گئے تھے، دہلی میں حضرت مولانا مملوک العلی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے، مولانا سے پڑھتے تھے کہ مولانا کو ان کے کمالات کا اندازہ ہو گیا اور مؤلف تذکرۃ العابدین کے الفاظ میں:

> ''مولانا مملوک العلی صاحب کمال معتقد مولوی محمد حسن کے ہو گئے اور بہت ادب کرنے لگے''(۱)

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب حضرت مولانا کا اپنے شاگردوں، نیاز مندوں کے ساتھ احترام اور پزیرائی کا یہ معاملہ تھا تو اپنے بڑوں اور بزرگوں پر کس قدر نثار ہوتے ہونگے اور ان کے انفاسِ عالیہ اور صحبت کو کس طرح کس درجہ عزیز رکھتے ہونگے اور ان کے لئے کس درجہ کے احترام کے جذبات مولانا کے دل میں موجزن رہتے ہونگے۔

مولانا کی مصروفیات اگرچہ بہت زیادہ تھیں مگر ان مصروفیات میں اور مشاغل کے لئے بھی وقت نکال لیا کرتے تھے، دوست احباب سے ملاقاتیں، دہلی کی دینی علمی ادبی محفلوں میں شرکت، عوام کی پزیرائی اور ان کے مزاج اور صلاحیت کے مطابق معاملہ بھی مولانا کے مصروف نظام کا ایک حصہ تھا۔

جو عام لوگ مولانا کے پاس آتے مولانا ان کی پزیرائی فرماتے، ان کیلئے کچھ وقت فارغ کرتے اور ان کی خوش دلی کے لئے ان کی فرمائش بھی قبول کرتے، ان کے ہدیہ کو قبول کرتے اور ان کے لائے ہوئے تحفہ کو وہ کیسا ہی کم قیمت اور سادہ کیوں نہ ہو بے تکلف استعمال کرتے تھے۔ حضرت مولانا تھانوی نے مولانا کا ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے

(۱) تذکرۃ العابدین، حاجی محمد نذیر احمد، ص:۵۴ (دہلی ۱۳۳۳ھ)

معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اگر چہ عمدہ لباس پہنتے تھے اور آسودہ حال میں رہتے تھے لیکن معمولی لباس اور کم قیمت کپڑا پہننے میں بھی کوئی تکلف اور عار نہیں تھا، نہ قیمتی لباس سے فخر اور اپنی بڑائی کا خیال ہوتا نہ معمولی لباس میں پریشانی محسوس کرتے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عام لوگوں اور غریب غرباء کی دل جوئی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اس خیال سے کہ اس غریب کی دل شکنی نہ ہو ان کے لائے ہوئے معمولی ہدیہ، کپڑا لباس وغیرہ کی بہت قدر کرتے اور اہتمام سے اس کو استعمال کرتے تھے، اور اس کو پہنے ہوئے بلا تأمل عوامی مجمعوں میں چلے جاتے، نہ کبھی اس کا خیال فرماتے کہ لباس عمدہ اور بیش قیمت نہیں اور نہ یہ سوچتے کہ دیکھنے والے کیا کہیں گے، یہ کیفیت ظاہر اور باطن کی یکسانیت، تام جھام اور ظاہری رکھ رکھاؤ سے بے تعلقی اور دل میں ان کی وقعت نہ ہونے کی بڑی دلیل ہے۔ حضرت مولانا کا ذکر کرتے ہوئے ایک مرتبہ مولانا تھانوی نے فرمایا:

> ''(مولانا مملوک العلی صاحب) خوش لباس تھے، انہیں حکام سے ملنا ہوتا تھا، ایک شخص نے ان کو دھوتر کا کرتہ دیا، اس کو آپ جمعہ کے دن پہن کر نماز پڑھیں، چنانچہ اُنہوں نے جمعہ کے دن اس کو پہنا، سارے کپڑے تو قیمتی تھے، پائجامہ سرکا، دوپٹہ تو بڑھیا اور کرتہ دھوتر کا، اسی طرح جامع مسجد تشریف لے جاکر نماز پڑھی، لوگوں نے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ وہ خوش ہوگا۔ ہمارے حضرت ہدیہ یہ سمجھ کر کھاتے تھے کہ اس کی دلجوئی ہوگی'' (۱)

اگر چہ مولانا کی عام زندگی اور اخلاق و معاملات کے تفصیلی اشارے مفقود ہیں مگر انہیں چند واقعات سے اس کا خاصا اندازہ ہو جاتا ہے کہ مولانا اخلاق و اخلاص کے کس درجہ پر فائز تھے۔

نیز مولانا ایک خشک مزاج مدرس نہیں تھے بلکہ شعر و ادب کے ذوق میں منفرد، شگفتہ بیان اور باذوق عالم تھے۔ اس ذوق کی وجہ سے کبھی کبھی منتخب ادبی نشستوں اور مشاعرہ کی محفلوں میں بھی شرکت کر لیا کرتے تھے، اگر چہ شعر نہیں کہتے تھے مگر فرحت اللہ بیگ کے

(۱) قصص الاکابر ماہنامہ الہادی، ص: ۳۲ (شعبان سنہ ۱۳۵۶ھ)

الفاظ میں:

''مگر سمجھتے ایسا تھے کہ ان کا کسی شعر کی تعریف کر دینا، گویا اس کو دوام کی سند دینا ہے۔''(۱)

اگر چہ مولانا نہایت باوقار، کم گو اور حلیم و بردبار شخص تھے لیکن ایسی محفلوں میں جہاں مجمع احباب اور خوش ذوق اصحاب کا جمگھٹا ہو کھل جاتے اور رعنائی محفل کے لئے چٹکلوں لطیفوں میں حصہ لیتے، بعض خاص شاعروں کے ساتھ فقرہ بازی کرتے اور دلچسپ سوالات و جوابات سے رنگ محفل کو نکھار دیتے تھے، فرحت اللہ بیگ نے دہلی کے ایک مشاعرہ کی مجلس سجائی ہے اس میں کئی جگہ مولانا مملوک العلی کا بھی ذکر آیا ہے۔

وہ مشاعرہ اس عہد کی ادبی زندگی کی ایک دلکش تصویر ہے، جس کے شرکاء میں ایک اہم شخصیت حضرت مولانا مملوک العلی کی بھی تھی، اس مشاعرہ میں مولانا مملوک العلی سے جو کلمات اور فقرے منسوب کئے گئے ہیں اگر چہ اُن کو عین حقیقت سمجھنا درست نہ ہوگا مگر اس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ مولانا کیسے خوش فکر، سادہ مزاج اور باذوق تھے، اپنے دوستوں اور ساتھیوں کی محفل میں کس طرح بے تکلف رہتے اور کیسے لطف اور خوش مزاجی کا معاملہ فرماتے تھے اور مولانا کے واقف اور اس دور کے اہل علم و باذوق اصحاب مولانا کے کیسے واقعات واحوال سنایا کرتے تھے۔

فرحت اللہ بیگ نے ایک موقع پر مولانا کی چھیڑ چھاڑ کا ایک دلچسپ قصہ نقل کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ دہلی کے ایک پرانے شاعر تھے جن کو میر صاحب کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، یہ میر صاحب دماغ کے ڈھیلے سے تھے شاید اسی وجہ سے دلی کی محفلوں کی رونق سمجھے جاتے تھے، دلی کا ہر ایک چھوٹا بڑا، عالم فاضل ہو یا عامی جاہل ان سے مذاق کرتا، یہ بھی ہر ایک کا بلا فرقِ مراتب تڑ سے جواب دیتے، یہ جوابات اگر چہ ہمیشہ بے تکے اور معقولیت سے خارج ہوتے مگر ان کے فقروں اور جوابات کی وجہ سے ہر ایک ان سے خواہ مخواہ الجھتا تھا، یہاں تک کہ بادشاہِ وقت بہادر شاہ ظفر اور مفتی صدر الدین آزردہ نیز مولانا مملوک العلی جیسے باوقار، شائستہ اور عالی مرتبت علماء بھی ان کو چھیڑتے اور انکے فقروں اور بے تکی حاضر

(۱) دہلی کی آخری شمع، مرتبہ رشید حسن خاں ص: ۵۵ (دہلی ۱۹۹۲ء)

جوابی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ فرحت اللہ بیگ نے لکھا ہے کہ:

''چھوٹا ہو یا بڑا کوئی ان سے بغیر مذاق کے بات نہیں کرتا تھا اور یہ بھی تڑ سے وہ جواب دیتے کہ منہ پھر جاتے، ان کو اس سے غرض نہیں تھی کہ جواب ہو بھی گیا یا نہیں! مشاعرہ میں میاں تمکین سے بادشاہ سلامت تک ان کو چھیڑتے، انہوں نے نہ ان کا برا مانا نہ ان کا، جواب دینے میں نہ ان سے رکے نہ ان سے'' (۱)

میر صاحب کا طریقہ یہ تھا کہ وہ غزل کے نام سے فی البدیہ نثر میں بولنا شروع کرتے تھے، بیچ بیچ میں دوسروں کے اعتراضات کا جواب بھی دیتے رہتے، جب کہتے کہتے تھک گئے تو ردیف کہہ کر قافیہ لا کر شعر کو ختم کر دیا، اس معمول کے مطابق میر صاحب نے مشاعرہ میں بھی شعر پڑھے۔ جیسے ہی انہوں نے پڑھنا شروع کیا چاروں طرف سے ان پر اعتراضات کی بوچھار ہوگئی، بھلا یہ کب دبنے والے تھے، چو مکھا لڑتے، جب زبان سے نہ دبا سکتے تو زور میں آکر کھڑے ہو جاتے، یہ کھڑے ہوئے اور کسی نے انکو بٹھا دیا، معترض کو ڈانٹا، ان کا دل بڑھایا، پھر وہی اعتراضوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ فرحت اللہ بیگ نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''اور تو اور مولانا مملوک العلی کو ان سے الجھنے میں مزا آتا تھا، یہ بھی مولوی صاحب کی وہ خبر لیتے کہ اگر ان کا کوئی شاگرد سن لیتا، تو مدرسہ سے مولوی صاحب کا سارا رعب داب رخصت ہو جاتا'' (۲)

خیر اس محفل میں میر صاحب نے اپنے معمول کے مطابق ایک 'غزل' شروع کی، مگر یہ کسی کو معلوم نہیں کہ انہوں نے کیا پڑھا، اس کا مضمون کیا تھا۔ انہوں نے ایک مصرع شروع کیا جو کسی طرح ختم ہونے میں نہ آرہا تھا تو مولانا مملوک العلی صاحب نے کہہ دیا:

''اجی میر صاحب:...... یہ مصرع بحر طویل میں جا پڑا''

اسکے بعد کیا ہوا بات کہاں پہنچی اور اہل محفل نے جن میں غالب اور مولانا امام بخش صہبائی جیسے اساطین علم وفن بھی تھے، اس سے کس طرح لطف لیا اور اس میں کس کس طرح

(۱) و (۲) دہلی کی آخری شمع، مرتبہ رشید حسن خاں ص:۸۵ (دہلی ۱۹۹۲ء)

شیرہ لگایا، اس کی تفصیل مرزا فرحت اللہ کے بہار آفریں کے قلم سے پڑھئے:

''اب میر صاحب نے غزل شروع کی، کیا پڑھا، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ بس اتنا تو معلوم ہوا کہ تیر، پیر، کھیر، قافیہ ہے اور ردیف ہے۔ اس کے علاوہ میں تو کیا خود میر صاحب بھی نہیں بتا سکتے کہ اُنہوں نے کیا پڑھا اور مضمون کیا تھا۔ جہاں قافیہ اور ردیف آئی لوگوں نے سمجھ لیا کہ شعر پورا ہو گیا اور تعریفیں شروع ہوئیں، کسی نے ایک آدھا اعتراض بھی جڑ دیا، اعتراض ہوا اور میر صاحب بگڑے، ان کے بگڑنے میں سب کو مزا آتا تھا، اعتراضوں اور میر صاحب کے جوابوں کا رنگ بھی دیکھ لیجئے۔

غزل میں میر صاحب نے جو ایک مصرعے کو کھینچنا شروع کیا تو اتنا کھینچا کہ شیطان کی آنت ہو گیا، مولوی مملوک العلی صاحب نے کہا:

''اجی میر صاحب یہ مصرع بحر طویل میں جا پڑا''

میر صاحب نے کہا: ''مولوی صاحب کبھی بحر طویل دیکھی بھی ہے یا یوں ہی سنی سنائی باتوں پر اعتراض ٹھوک دیا۔ پہلے مطوّل پڑھئے مطوّل، جب معلوم ہوگا کہ بحر طویل کس کو کہتے ہیں''۔

مولوی صاحب بڑے چکرائے اور کہنے لگے: ''میر صاحب! بھلا مطوّل کو بحر طویل سے کیا واسطہ؟ مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ! آپکا جو جی چاہتا ہے کہہ جاتے ہیں''۔

میر صاحب کو اب کسی حمایتی کی تلاش ہوئی، مولانا صہبائی کی طرف دیکھا، انہوں نے کہا کہ مولوی صاحب!

''مطوّل میں بحر طویل کی بحریں نہیں ہیں تو اور کیا ہے؟ آپ بھی ہمارے میر صاحب کو اپنی علمیت کے دباؤ سے خاموش کر دینا چاہتے ہیں''۔

''بس اتنی مدد ملنی تھی کہ میر صاحب شیر ہو گئے، کہنے لگے: جی ہاں مولوی صاحب! آپ سمجھتے ہونگے کہ آپکے سوا کسی نے مطوّل پڑھی ہی نہیں۔ اجی حضرت! میں تو روزانہ اس کے دو دور کرتا ہوں۔ کل ہی اس کی ایک بحر میں غزل لکھنے بیٹھا تھا، لکھتے لکھتے تھک گیا ایک مصرع کوئی پونے دو سو صفحہ میں لکھا، وہ تو کہو بیاض کے صفحے ہی ختم ہو گئے جو مصرع ختم ہوا، ورنہ خدا معلوم اور کہاں تک جاتا''۔

مرزا نوشہ نے کہا: میر صاحب آپ سچ فرماتے ہیں ہمارے مولوی صاحب نے بحر طویل کہاں دیکھی، مجھ سے پوچھو میرے بھتیجے خواجہ امان کو جانتے ہو؟ اس نے ایک کتاب بوستانِ خیال لکھی ہے، یہ بڑی اور یہ موٹی بارہ جلدیں ہیں، بحر طویل کے بس بارہ مصرعوں میں ساری جلدیں ختم ہوگئی ہیں۔ آپ کا مصرعہ بحر طویل میں نہیں رباعی کی بحر میں ہے۔ میر صاحب نے بڑے زور سے ''ہیں'' کی اور بگڑ کر کہا: واہ مرزا صاحب! سیدھے چلتے چلتے آپ بھی بھٹک گئے۔ رباعی کی بحریں آپ کو معلوم بھی ہیں؟ بھلا بتایئے تو سہی کون سی کتاب میں ہیں؟ یہ ذرا ٹیڑھا سوال تھا۔ مرزا غالب ذرا چپ ہوئے تو خود میر صاحب نے کہا میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ آپ نے زبردستی اعتراض کر دیا ہے۔ مرزا صاحب! اربعین پڑھئے جب معلوم ہوگا کہ رباعی کی بحریں کون کون سی ہیں۔

غرض اسی طرح کی خوش مذاقی میں کوئی گھنٹہ بھر گذر گیا، ہنستے ہنستے جو آنسو نکلے، آنکھوں نے نیند کے خمار سے آنکھیں صاف کر دیں اور ایسا معلوم ہونے لگا گویا مشاعرے کا دوسرا دور شروع ہو رہا ہے اور سب لوگ تازہ دم ابھی آ کر بیٹھے ہیں''۔(۱)

اس روداد سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مولانا مملوک العلی اور ان کے عہد کے اکابر کے باہمی تعلقات کیسے شگفتہ تھے اور وہ آپس میں کس قدر بے تکلف گھلے ملے اور دوستوں کی طرح رہتے تھے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم اس ذوق، صفتِ انکسار اور محبت کی چاشنی سے محروم ہیں۔

(۱) دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ، مرتبہ رشید حسن خاں، ص:۸۶-۸۷ (دہلی ۱۹۹۲ء)

باب (۱۲)

سفر حج، اس کا صحیح سنہ اور ضمناً حضرت شاہ محمد اسحٰق کے سفر ہجرت کے سنہ کی تعیین

حضرت مولانا دہلی کالج کی ملازمت کے زمانہ میں شاہ محمد اسحاق کے سفر ہجرت کے بعد حج کے لئے حاضر ہوئے تھے، مولانا مملوک العلی کے اس سفر کی تفصیل دریافت نہیں، جو معلومات ملیں، وہ درج ذیل ہیں:

حضرت شاہ محمد اسحاق حضرت شاہ عبدالعزیز کے جانشین اور صدر بزم علماء تھے اور ایک خاص شانِ محبوبیت رکھتے تھے، حضرت شاہ عبدالعزیز سے نسبت اور اپنے علمی عملی کمالات اور بے نظیر اخلاق و معاملات کی وجہ سے پورے ہندوستان خصوصاً دہلی اور اطراف کے بڑے چھوٹے سب علماء کا مرجع اور ان کی تمناؤں کا مرکز تھے۔

حضرت شاہ محمد اسحاق، حضرت شاہ عبدالعزیز اور خانوادۂ ولی اللّٰہی کے اکثر علماء کے نقطۂ نظر کے مطابق ہندوستان کو انگریزوں اور مرہٹوں وغیرہ کے تسلط کی وجہ سے دارالحرب سمجھتے تھے، اسی وجہ سے شاہ محمد اسحاق اور انکے بھائی حضرت شاہ محمد یعقوب نے ہندوستان سے ہجرت کا ارادہ کرلیا، اور ذی قعدہ ۱۲۵۸ھ (دسمبر ۱۸۴۲ء) میں دہلی سے سفر ہجرت پر روانہ ہو گئے تھے۔ شاہ صاحب کے سفر کے بعد مولانا مملوک العلی نے بھی حج و زیارت کا ارادہ کیا اور اس سفر سے ایک سال کے بعد رجب میں واپس ہوئے۔ مولانا محمد یعقوب نے حالات مولانا محمد قاسم کے حاشیہ پر شاہ محمد اسحاق کے سفر ہجرت اور مولانا مملوک العلی کے سفر کا مختصر ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

’’۱۲۵۷ھ بارہ سو ستاون ہجری میں حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب اور جناب مولانا محمد یعقوب صاحب دہلوی دونوں نواسے اور جانشین مولانا شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے تھے اچانک ارادہ ہجرت کیا، ذی قعدہ میں شاید روانہ ہوگئے، دہلی میں اندھیرا ہوگیا‘‘(۱)

لیکن اس اطلاع کی اہمیت کے باوجود مذکورہ اقتباس میں مذکور سنین صحیح نہیں۔

شاہ محمد اسحاق کے سفر ہجرت کا صحیح سنہ

واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ محمد اسحاق کے سفر ہجرت کے سنہ کی تعیین میں مؤرخین اور تذکرہ نگاروں کو سخت مغالطہ ہوا ہے، جن میں مولانا محمد یعقوب نانوتوی بھی شامل ہیں، سر سید احمد کی تحریر سے شاہ محمد اسحاق کا سن ہجرت ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۹ء) معلوم ہوتا ہے (۲) اکثر مؤرخین اور تذکرہ نگاروں نے یہی نقل کر دیا ہے، حالاں کہ یہ بھی غلط ہے، اکثر علمائے دیوبند کے تذکروں میں مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی تحریر پر اعتماد کرتے ہوئے ۱۲۵۹ھ لکھا گیا (۳) مگر یہ بھی صحیح نہیں۔

درست یہ ہے کہ حضرت شاہ محمد اسحاق ذی قعدہ ۱۲۵۸ھ میں دہلی سے روانہ ہوئے تھے، مولانا نواب قطب الدین دہلوی نے جو (حضرت شاہ صاحب کے خاص شاگرد تھے اور دہلی میں ہر وقت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر رہتے تھے اور اس سفر کے وقت شاہ صاحب کو رخصت کرنے والوں میں شامل تھے) احکام العیدین کی تمہید میں شاہ صاحب کے سفر ہجرت کا ذکر کیا ہے اور اس موقعہ پر شعراء نے جو قطعاتِ تاریخ لکھے تھے ان میں سے دو قطعات بھی نقل کئے ہیں، جس سے شاہ محمد اسحاق کے سفر ہجرت کا صحیح سنہ صاف معلوم ہو رہا ہے۔

میر ظہور علی دہلوی نے (جو مولانا مفتی صدر الدین آزردہ کے شاگرد تھے) تاریخ کہی جس میں سنہ ہجرت صاف الفاظ میں نظم ہوا ہے اور شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ جو یہ ہے:

---

(۱) حالات طیب مولانا محمد قاسم ص:۶، ۷ (طبع اول بہاولپور: ۱۲۹۷ھ)

(۲) آثار الصنادید سر سید احمد باب چہارم ص:۵۹ (لکھنؤ: ۱۳۱۸)

(۳) مثلاً تذکرۃ الرشید ج:۱ ص:۲۷ و سوانح قاسمی ص:۲۱۲ ج:۱، وغیرہ

مولوی اسحاق صاحب باکمال ترک خانہ کردہ سوئے کعبہ رفت
سال تاریخش چنیں گفتہ ظہور یک ہزار ودوصد وپنجاہ وہشت (۱)

خواجہ احسن اللہ کا قطعہ تاریخ پانچ شعروں پر مشتمل ہے، جو اس طرح ہے:

مولوی اسحاق صاحب فخر دین تھا منور شہر جن کے نام سے
درس فرماتے ہفتے میں دوبار فہم سے، ادراک سے، الہام سے
عالم وجاہل سبھی چھوٹے بڑے بہرہ ور تھے ان کے فیض عام سے
کر گئے ہجرت مع اہل وعیال سوئے کعبہ شوق کے احرام سے
سچ تو یوں ہے جو کہ احسن نے کہا شہر خالی ہوگیا اسلام سے (۲)

تیسرا قطعہ فارسی میں ہے جو تاریخ مومن خاں مومن کا ہے، مومن اس خاندان کے دامن گرفتہ، شاہ عبدالعزیز اور شاہ محمد اسحاق کی خدمت کے حاضر باش تھے، مومن نے کہا ہے:

تاریخ مولوی اسحاق

آں مبنی دین و جان اسلام عرفان مصور و مجسم
از کشور ہند رخت بر بست بیزار از کافرانِ اظلم
اندیشۂ سال ہجرت او بر چرخ مہاجر و مکرم
ہم چشم مقربان حق بیں ہمراز فرشتگان محرم
فرمود وحید عصر اسحاق بر حکم شہنشہ دو عالم
بگزاشتہ دارِ حرب امسال جا کردہ بمکۂ معظم (۳)

لیکن اس فقرۂ تاریخ کے اعداد کی صحیح ترتیب معلوم نہ ہونیکی وجہ سے اسکے صحیح اعداد کی تعیین میں مغالطہ ہوا ہے، مولوی بشیر الدین احمد دہلوی نے جو اعداد شمار کرائے ہیں وہ صحیح

(۱) و (۲) احکام العیدین مولانا نواب قطب الدین دہلوی ص:۲ (مطبع نول کشور لکھنؤ: ۱۲۹۰ھ)
(۳) دیوان فارسی۔ مؤمن، ص: ۱۴۱ (طبع اوّل دہلی ۱۲۷۱ھ)

نہیں۔(۱) صحیح استخراج یہ ہے کہ وحید عصر اسحاق کے اعداد (۵۵۸) ہوتے ہیں اور مکہ معظمہ کے ۱۱۱۵، دونوں کا مجموعہ ۱۶۷۳ ہے، اس مجموعہ کے اعداد میں دارِ حرب کے ۴۱۵ عدد نکال دیں تو صرف بارہ سو اٹھاون ۱۲۵۸ عدد باقی رہتے ہیں (۲) یہی شاہ صاحب کا سنہ ہجرت ہے جیسا کہ میر ظہور علی اور خواجہ احسن اللہ کے قطعاتِ تاریخ سے بھی معلوم ہو رہا ہے۔

بہر حال حضرت شاہ محمد اسحاق ذی قعدہ ۱۲۵۸ھ (دسمبر ۱۸۴۲ء) میں دہلی سے رخصت ہوئے تھے اسی وقت سے مولانا مملوک العلی حجاز حاضری کی کوشش میں لگ گئے تھے۔ آہستہ آہستہ سامانِ سفر اور زادِ راہ کا انتظام کرتے رہے، جب اس طرف سے کچھ اطمینان ہو گیا تو کالج میں رخصت کی درخواست دی، رخصت منظور ہو گئی اور کالج کی انتظامیہ نے پورے سال کی تنخواہ دینے کا فیصلہ کیا جس میں چھ مہینہ کی تنخواہ کالج کے ضابطہ کے مطابق تھی، مزید چھ مہینے کی تنخواہ مولانا کی قدر دانی، خدمات کے اعتراف اور عزت افزائی کے طور پر پیش کی گئی تھی۔ حضرت مولانا سب کاموں سے فارغ ہو کر رجب ۱۲۵۹ھ میں دہلی سے چلے، حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری (جو حضرت شاہ محمد اسحاق کے خاص شاگرد تھے اور شاہ صاحب سے حدیث شریف کی تکمیل کیلئے شاہ صاحب کی خدمت میں مکہ معظمہ میں حاضر ہونا چاہتے تھے) اس سفر میں مولانا مملوک العلی کے ساتھ تھے۔ مولانا احمد علی نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے:

''یادداشت سفر حج واقعہ بتاریخ بست و ششم رجب ۱۲۵۹ھ از مقام دہلی'' (۳)

یعنی مولانا مملوک العلی اور مولانا احمد علی ۲۶؍ رجب ۱۲۵۹ھ (۲۲؍ دسمبر ۱۸۴۳ء) کو دہلی سے چلے تھے، مولانا مملوک العلی کی ایک سال کے بعد رجب ۱۲۶۰ھ (جولائی، اگست ۱۸۴۴ء) میں دہلی واپسی ہوئی، اس وقت کالج سے ایک سال کی رخصت کا وقت ختم ہو رہا تھا اسلئے مولانا دہلی آ کر کالج کی ملازمت پر حاضر ہو گئے تھے گھر نہیں گئے، جب کالج

(۱) ملاحظہ ہو واقعات دار الحکومت دہلی ص:۴۲۸ جلد دوم (آگرہ: ۱۳۳۷ھ ۱۹۱۹ء)

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے حیات شاہ محمد اسحاق حکیم محمود احمد برکاتی ص:۴۷ (دہلی: ۱۴۱۲ھ ۱۹۹۲ء)

(۳) یہ بیاض حضرت مولانا احمد علی کے سفر حج اور شاہ محمد اسحاق سے مکہ مکرمہ میں درس حدیث کے زمانے میں مولانا کے ساتھ تھی۔

کی سالانہ چھٹی ہوئی اس وقت گھر گئے، یہی مولانا محمد یعقوب نے بھی لکھا ہے، تحریر ہے:

''۱۲۵۷ھ بارہ سوستاون ہجری میں حضرت جناب مولانا محمد اسحاق صاحب اور جناب مولانا محمد یعقوب صاحب دہلوی دونوں نواسے اور جانشین مولانا شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے تھے، اچانک ارادہ ہجرت کا کیا، ذی قعدہ میں شاید روانہ ہوگئے، دہلی میں اندھیرا ہوگیا اور آپ صاحبوں کے ساتھ ایک بہت بڑا قافلہ عرب کو روانہ ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر حضرت والد مرحوم کو بھی دھیان حج ہوا، خفیہ تدبیر رخصت اور سامان سفر کی کرتے رہے، آخر جب رخصت ایک سال کی مل گئی اور سرکار نے براہِ قدر دانی آدھی تنخواہ بھی دی، رجب ۱۲۵۸ھ میں وطن سے روانہ ہوئے اور اول ذی الحجہ مکہ پہنچے، زیارت حرمین سے فارغ ہوکر برس دن میں پھر دہلی پہنچے۔ اس وقت یہ سفر جلد طے ہونے میں عجیب سمجھا، رخصت کے دن پورے ہو چکے تھے وطن نہ آسکے، ذی الحجہ میں جب چھٹی سالانہ ہوئی وطن تشریف لائے اور مولوی صاحب کو دہلی ساتھ لے گئے۔(۱)

حضرت مولانا کا یہی پہلا اور آخری سفر حج تھا اس کے علاوہ حضرت مولانا کے کسی اور سفر حج کا تذکرہ نہیں ملتا۔

(۱) حالات طیب مولانا محمد قاسم (نانوتوی) (طبع اول بھاولپور: ۱۲۹۷ھ) حاشیہ نمبر ۶ نیز مشمولہ قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی احوال و آثار باقیات و متعلقات ص: ۲۳۴-۲۳۵

باب (۱۳)

مولانا مملوک العلی کی تصانیف، مؤلفات حاشیے اور ترجمے

حضرت مولانا مملوک العلی کے علمی تحریری آثار خصوصاً تصانیف و مؤلفات بہت ہی کم ہیں، شب و روز کی درسی مصروفیات اور طلبہ سے ہر وقت گھرے رہنے کی وجہ سے حضرت مولانا کو اس کا وقت اور فرصت نہیں ملتی تھی کہ وہ تصنیف و تالیف پر توجہ فرمائیں۔ مولانا کی درسی مصروفیات کا کیا حال تھا اور ایک نئے سبق کیلئے بھی وقت نکال لینا کس قدر مشکل تھا اس کا حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی ایک روایت اور مولانا گنگوہی کے زمانۂ طالب علمی کے ایک واقعہ سے اندازہ ہو جاتا ہے۔ مولانا نے فرمایا:

> جب میں اور مولوی محمد قاسم صاحب دہلی میں استاد رحمہ اللہ سے پڑھتے تھے ہمارا ارادہ سلم شروع کرنے کا ہوا، لیکن مولانا کو فرصت نہ تھی اس لئے انکار فرماتے تھے، بالآخر میں نے عرض کیا کہ حضرت ہفتہ میں دو بار صرف پیر اور جمعرات (یا جمعہ) کو پڑھا دیا کیجئے، خیر یہ منظور ہو گیا اور ہفتہ میں دو سبق ہونے لگے، تو اس سبق کی ہمیں بڑی قدر تھی'' (۱)

تصنیف و تالیف پر توجہ نہ کرنے کی وجہ

ایسی بے پناہ مصروفیات میں جب ہفتہ میں صرف ایک سبق کیلئے بھی وقت نکالنا مشکل ہو، تصنیف و تالیف کیلئے گنجائش نکال لینا نہایت دشوار تھا اور یہ بھی معلوم ہے کہ مولانا مملوک العلی کی تدریسی مصروفیات کا زندگی کے آخری دنوں تک یہی حال رہا۔ دہلی کالج کے معمولات و مصروفیات اور گھر پر درس و تعلیم کے شبانہ روز حلقوں کی بھی ویسی ہی

(۱) تذکرۃ الرشید مولانا عاشق الٰہی میرٹھی ص:۱۴۱ ج:۱ (سہارنپور: ۱۹۷۷ء)

کیفیت رہی بلکہ وقت گذرنے کے ساتھ اس میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا رہا ہوگا، کیوں کہ مولانا کسی طالب علم کو مایوس کرنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ کریم الدین پانی پتی کا قول ہے:

''تمام عمر میں باوجود اس کثرت علم اور فضل کے وعظ عام نہیں کیا اور تصانیف کتب پر مائل نہیں ہوئے۔ باعث اس کا یہی ہے کہ چوں کہ ان کی خدمت میں صدہا طالب علم اطراف وجوانب سے واسطے تعلیم پانے علوم کی حاضر ہوتے ہیں اور ان کے حسن اخلاق سے یہ بعید ہے کہ کسی طالب علم کی خاطر رنجیدہ کریں، پھر اس صورت میں فرصت واسطے تصانیف کے ہونی معلوم۔ لہٰذا اپنا ہرج گوارا کیا، دل شکنی کسی کی منظور نہ کی، مگر ہاں ایک کتاب تحریر اقلیدس کا جو عربی زبان میں تھی بموجب حکم پرنسپل مدرسہ دہلی کے ۱۸۴۴ء میں ترجمہ اردو زبان میں کر کے پانی کر دیا اور بہت اچھی طرح سے ہر ایک شکل کو حل کیا ہے'' (۱)

حضرت مولانا کی تحریری تصنیفی خدمات، مؤلفات اور ترجمے

درج بالا اقتباسات سے واضح ہے کہ مولانا مملوک العلی کو تصنیف وتالیف پر توجہ کا بہت کم موقع ملا، مگر کریم الدین کی یہ اطلاع صحیح نہیں کہ مولانا نے صرف ایک کتاب ترجمہ تحریر اقلیدس لکھی تھی، بلکہ مولانا نے اس کے علاوہ بھی چند کتابوں کی تحقیق، تصحیح، ترجمہ یا تدوین وانتخاب کی خدمت انجام دی ہے، اس وقت تک مولانا کی چھ تالیفات وتراجم کا علم ہوا ہے، جو تین موضوعات پر مشتمل ہیں:

(۱) تصحیح سنن ترمذی (۲) اردو ترجمہ سنن ترمذی
(۳) تصحیح وحواشی تاریخ یمینی (۴) کتاب المختار فی الاخبار والآثار
(۵) ترجمہ اردو تحریر اقلیدس (۶) نتیجہ تحریر

اس میں پہلی دوسری کتاب خدمت حدیث شریف کی ہے، تیسری چوتھی ادب اور تاریخ کی، پانچویں چھٹی ریاضی کی، مذکورہ کتابوں کا آئندہ صفحات میں اسی ترتیب سے تعارف درج ہے، انکے علاوہ عربی اور اردو کے چند خطوط بھی معلوم ہیں، انکا ذکر علیحدہ کیا جائیگا۔

(۱) تذکرہ، فرائد الدھر ص: ۴۰۲، ۴۰۳ (مطبع العلوم دہلی: ۱۸۴۷ء)

سنن ترمذی کی تصحیح اور مقابلہ میں مولانا احمد علی کی رفاقت

ہندوستان میں حضرت شیخ عبدالحق محدث اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ تعالیٰ کی محنت، حسن توجہ اور برکت سے درس حدیث کا بفضلہٖ تعالیٰ بہت بلند پیمانہ پر احیاء ہوگیا تھا اور خدمت حدیث کی ہوائیں چل رہی تھیں، مگر وہ دور کتابوں کی طباعت واشاعت کا نہیں تھا، اس وقت کتابوں کی نقل کا رواج تھا طلبہ اور شاگردوں نے اساتذۂ کرام کی خدمت میں جو کتاب پڑھی اس کی پڑھنے کے ساتھ ساتھ تصحیح ہوگئی، اور دوسرے علمائے کرام کے افادات اور حاشیے اپنی کتاب پر یا علیحدہ نقل کئے جاتے تھے، وہ نقلیں عام کاتبوں اور کتابوں کی خرید وفروخت کا کام کرنے والوں کے پاس جاتی تھیں اور ان میں سے کچھ ہاتھوں ہاتھ پھیل جاتی تھیں اور بعض کی مانگ محدود ہوتی تھی، جس کی وجہ سے وہ افادات حواشی اور محنت عموماً کم یاب اور کبھی کبھی ضائع بھی ہوجاتی تھی۔ اسلئے دوبارہ پھر انہیں کتابوں پر اسی قدر محنت کی ضرورت ہوتی تھی اور یہ سلسلہ مدت سے جاری تھا۔

جب ہندوستان میں پریس آیا اور کتابوں کی طباعت کے کام کا آغاز ہوا اس وقت (راقم سطور کی معلومات میں) سب سے پہلے حضرت شاہ محمد اسحاقؒ نے حدیث کی کتابوں کی اشاعت کا اہتمام وانصرام فرمایا۔ سب سے پہلے جو کتاب حضرت شاہ صاحب کے افادات سے چھپی، وہ سنن نسائی تھی جو ۱۲۵۸ھ (۱۸۴۲ء) میں مطبع سلطانی قلعہ معلیٰ دہلی سے چھپ کر آئی تھی۔ (۱) اسی سال ۱۲۵۸ھ میں حضرت شاہ صاحب نے ہندوستان سے ہجرت فرمائی، حضرت شاہ صاحب کی ہجرت کے بعد شاہ صاحب کے ایک مستعد اور خاص شاگرد مولانا احمد علی سہارنپوری بھی شاہ صاحب کی خدمت میں مکہ معظمہ حاضر ہوگئے، مولانا نے تقریباً ڈیڑھ سال حضرت کی خدمت میں حاضر رہ کر حدیث شریف کی کتابیں پڑھیں اور وہاں سے خدمت حدیث کا وہی جذبہ لے کر ہندوستان واپس آئے جو خاندان حضرت

---

(۱) اس نادر ترین اشاعت کا ایک عمدہ نسخہ ہمارے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے، جس کی ایک خصوصیت اور امتیاز یہ ہے کہ یہ نسخہ حضرت شاہ محمد اسحاق اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے درس میں پڑھا گیا ہے اور اس پر دونوں حضرات کی چند تصحیحات اور افادات بھی درج ہیں۔ فللّٰہ الحمد۔

شاہ ولی اللہؒ کا طغرائے امتیاز تھا۔

مولانا احمد علی نے ہندوستان پہنچ کر سب سے پہلے حضرت شاہ محمد اسحاق کے شروع کئے ہوئے کام کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا اور حدیث پاک کی اہم ترین بنیادی کتابوں کو دقتِ نظر کے ساتھ صحیح و درست کر کے ان پر ضروری اور جامع حاشیہ لکھ کر، ان کی طباعت واشاعت کا سروسامان کیا۔

حضرت مولانا احمد علی نے سب سے پہلے جن کتابوں پر توجہ فرمائی وہ صحیح بخاری، صحیح مسلم اور سنن ترمذی تھیں، مولانا احمد علی نے ان کی تصحیح اور حاشیے لکھنے میں کئی کئی سال محنت کی اور بار بار مقابلہ اور نظر ثانی کے بعد ان کو اشاعت کیلئے تیار کیا، ان کتابوں میں سے سب سے پہلے سنن ترمذی شائع ہوئی۔ حدیث کی بنیادی کتابوں کی تصحیح وحواشی لکھنے کا کام نہایت نازک، بہت بڑا اور سخت محنت طلب تھا، جس کو مولانا احمد علی نے بدرجۂ کمال پورا کیا، اور حضرت مولانا نے ان کتابوں کے متون، حواشی کی تصحیح اور نظر ثانی کو مزید بہتر اور پوری طرح قابل اطمینان بنانے کیلئے چند ممتاز ترین علماء اور ایسے جید فاضلوں کا انتخاب کیا جن کی علمی نظر اور قابلیت سے مولانا پوری طرح مطمئن تھے، پھر ان میں سے علیحدہ علیحدہ اصحاب سے الگ الگ کتابوں کی تصحیح مکرر اور نظر ثانی کا کام لیا۔

مولانا احمد علی کا اعتراف

اس نظام اور ترتیب کے مطابق سنن ترمذی کے مقابلہ اور تصحیح میں مولانا مملوک العلی مولانا احمد علی کے معاون اور رفیق رہے، مولانا مملوک العلی کے تعاون کا مولانا احمد علی نے اپنی شائع کی ہوئی سنن ترمذی کی سب سے پہلی اشاعت میں صاف اعتراف کیا، اور مولانا مملوک العلی کا اونچے الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

" وانی مع قلة الدراية والبضاعة قد اجتهدت فی تصحیحه وحل مطالبه بحسب الوسع والطا قه،ثم لاحظ ثانیاً بالملاحظة التامة والمراجعة العامة الفاضل الاجل والحبرالا بجل العالم بالخفی والجلی مولا نامحمد مملو ک العلی "

ترجمہ: اور میں نے اپنی کم فہمی اور معمولی لیاقت کے باوجود اس کتاب (سنن ترمذی) کے درست کرنے اور اس کے مفہوم کو حل کرنے کی صلاحیت وطاقت کے مطابق پوری کوشش کی، پھر دوبارہ اس کو گہری نظر سے دیکھا، جو اعلیٰ درجہ کی نظر ثانی تھی (جس میں) اسکے حاشیوں اور مراجع کا بھرپور مقابلہ کیا گیا تھا، یہ خدمت فاضل اجل بحر علوم، ظاہر اور خفی (مشہور اور غیر مشہور) علوم کے جاننے والے مولانا مملوک العلی نے انجام دی ہے۔"

اس نسخہ کی پہلی طباعت

مولانا احمد علی نے اس نسخہ کی طباعت کا اہتمام کیا، اسکی طباعت صفر ۱۲۶۵ھ (جنوری ۱۸۴۹ء) میں مطبع العلوم میں شروع ہوئی تھی، اس اشاعت کے صفحہ اول (ٹائٹل) پر طباعت شروع ہونے کی تاریخ درج ہے، لکھا ہے:

"الحمد لله الذی وفقنا بشروع طبع کتاب الترمذی، فی مطبع العلوم الدهلوی (کذا؟) فی شهر صفر ۱۲۶۵ھ من هجرة خیر البشر صلی الله علیه وسلم، باهتمام السید اشرف علی الواسطی"

مگر مطبع العلوم میں ترمذی کی طباعت کی رفتار بہت سست تھی، روزانہ صرف دو ورق چھپتے تھے، مولانا مملوک العلی نے اسپرنگر کے نام ایک خط میں اس رفتار کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"ترمذی انشاء اللہ تین مہینے یا کچھ زیادہ میں تمام ہوگی، دو، دو ورق روز چھپتے ہیں۔" (۱)

مگر شاید بعد میں طباعت کے کام کی رفتار اور سست ہوگئی ہوگی، جس کی وجہ سے کام پورا ہونے میں دیر لگی، فقط ایک سو چالیس صفحات اس مطبع میں چھپے تھے، اس سے بعد کے صفحات مطبع احمدی میں چھپنا شروع ہوئے، ابواب الحج کی ابتدا (ص:۱۴۱) سے آخر تک پوری کتاب اسی پریس میں چھپی، اس صفحہ پر یادداشت کے طور پر یہ سطور چھپی ہوئی ہیں:

"وقد شرع طبع هذا الکتاب الترمذی من هذا المقام فی مطبع الاحمدی الواقع فی الدهلی، باهتمام الشیخ ظفر علی فی شهر

(۱) مکتوب محررہ ۹/ اکتوبر ۱۸۴۸ء، (۱۲/ ذی الحجہ ۱۲۶۴ھ) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص:۵۹

جمادی الاول ۱۲۶۵ ھ والله الموفق والهادی"

ترجمہ: اس مقام سے اس کتاب ترمذی کی طباعت مطبع احمدی واقع دہلی میں شیخ ظفر علی کے اہتمام سے، جمادی الاولی ۱۲۶۵ھ میں شروع ہوئی۔

جلد اول ص: ۳۰۲ پر ختم ہو کر صفحہ: ۳۰۳ کے آغاز سے دوسری جلد شروع ہوگئی، جو صفحہ: ۶۵۴ پر مکمل ہوئی، آخری صفحہ پر خاتمۃ الطبع درج ہے جو مولانا احمد علی کا لکھا ہوا ہے، اس کی چند سطریں گذر گئیں ہیں، مکمل عبارت درج ذیل ہے:

یقو ل العبد الضعیف الراجی الی رحمة الولی احمد علی السهارنفور ی، قدوقع الفراغ من طبع هذا الكتاب الشريف فی المطبع (ای الواقع فی الد هلی) الاحمدی، ثانی عشر من الصفر، سنة ست وستين بعد الالف والمئتين من هجرة خيرالبشرعليه افضل الصلوات وازكی التحية. وانی مع قلة الدراية والبضاعة قد اجتهدت فی تصحيحه وحل مطالبه بحسب الوسع والطاقة ، ثم لاحظ ثانيًا بالملاحظة التامة والمراجعةالعامة الفاضلٰ الاجل والحبر الابجل،العالم بالخفی والجلی مولانا محمد مملوک العلی، فالماٗمول ممن ينظر فيه وينتفع به ان لا ينسانا من دعاء الخير .

ولواطلع علی شئی من الخطاء والزّلل فينبغی ان يصلحه ويسد الخلل ان تجد عيباً فسد الخلا، جل من لا عيب فيه وعلا. واللّٰه المستعان وعليه التكلان. وآخردعواناان الحمدلله رب العالمين والصلوة والسلام علی رسوله محمد وآله اصحابه اجمعين .

یہ سنن ترمذی کا وہی مشہور و مقبول حاشیہ ہے جو اُس وقت (۱۲۶۶ھ) سے آج تک مسلسل چھپ رہا ہے (۱) پچاسوں مرتبہ پہلے شائع ہوا اور اب بھی ہندو پاکستان میں دسیوں ناشرین کی مطبوعات میں شامل ہے۔

(۱) مولانا احمد علی کے حاشیہ والا یہ نسخہ بہت مقبول ہوا۔ اسکی غیر معمولی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس کا دوسرا ایڈیشن صرف چار سال بعد ۱۲۷۰ھ (ستمبر ۱۸۵۴ء) میں مطبع فخر المطابع (قلعۂ دہلی) دہلی سے نیاز احمد کیرانوی کے اہتمام سے چھپا۔ اس نسخہ کی اصلاح کی خدمت حضرت شاہ محمد اسحاق کے ... باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر....

یہاں یہ عرض کردینا بے محل نہ ہوگا کہ حضرت مولانا کی اس بڑی اور اہم ترین اور علمی یادگار کا اس وقت تک کسی تذکرہ نگار نے بھی ذکر نہیں کیا، محمد اکرام صاحب چغتائی کو بھی غالباً اس کا سراغ نہیں ملا۔

ترجمہ اردو سنن ترمذی

مولانا مملوک العلی نے سنن ترمذی کی دوسری خدمت ترمذی شریف کے اردو ترجمہ کی صورت میں انجام دی، یہ ترجمہ کب ہوا، پورا ہوگیا تھا یا نامکمل تھا، تفصیلات راقم سطور کو نہیں ملیں، قیاس کیا جا سکتا ہے کہ تصحیح ترمذی شریف کے بعد یا شاید اسی زمانہ (تقریباً ۶۶-۱۲۶۵ھ) میں یہ خدمت انجام پائی ہوگی، اس ترجمہ کا سب سے پہلے مولوی عبدالحق نے ذکر کیا ہے، مولوی عبدالحق کی اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کالج کے ماتحت ادارہ ورنا کلر سوسائٹی (Vernacular Translation Society)(۱) نے مختلف علوم وفنون کی کتابوں کے اردو ترجموں کا ایک بڑا منصوبہ بنایا تھا، اس کے تحت جن کتابوں کا ترجمہ ہوا ان کی فہرست مرحوم دہلی کالج میں دی ہے، اس فہرست میں ایک سو اٹھائیس (۱۲۸) کتابوں کے نام ہیں، جن میں ایک سو چودہ (۱۱۴) نمبر پر ''سنن ترمذی اردو ترجمہ'' کا نام آیا ہے (۲) غالباً یہ ترجمہ چھپا نہیں، اور نہایت افسوس ہے کہ اسکے کسی نسخہ کا حال سراغ نہیں ملا، بہر صورت یہ ترجمہ برصغیر میں حدیث کی بنیادی کتابوں کے ابتدائی ترجموں میں ایک اہم اور یادگار ترجمہ ہوگا۔

گذشتہ صفحہ کا بقیہ......... ایک اور ممتاز شاگرد مولانا سبحان بخش شکارپوری نے انجام دی تھی، اس نسخہ کا حاشیہ اور تمام ترتیب وہی ہے صرف جزوی تصحیح کی گئی ہے۔ یہ دونوں نادر اشاعتیں کتب خانہ مظاہر علوم (قدیم) میں محفوظ ہیں۔ اس طباعت کے چند سال کے بعد سنن ترمذی کے اسی نسخہ کا ایک ایڈیشن غالباً اور چھپا تھا، تیسری یا چوتھی اشاعت مولانا احمد علی کے دوسرے مطبع احمدی کی تھی جو ۱۸۵۷ء کے بعد میرٹھ میں قائم کیا گیا تھا۔ (دہلی کا مطبع احمدی ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ختم ہوگیا تھا) اس نسخہ کی طباعت رمضان ۱۲۸۲ھ (جنوری فروری ۱۸۶۶ء) اسی مطبع (احمدی، میرٹھ) سے ہوئی تھی، اس چوتھی اشاعت کا ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ کتب میں ہے۔

(۱) اس کو دلی ورنا کیولر سوسائٹی بھی کہتے ہیں۔ قدیم دہلی کالج، مالک رام ص: ۴۳

(۲) مرحوم دہلی کالج ص: ۱۴۵ دہلی (۱۹۴۵ء) مالک رام صاحب مولوی عبدالحق کی اس کی فہرست میں درج اکثر کتابوں کے مترجمین، سنہ ترجمہ یا طباعت اور مطبع کی معلومات کا اپنی تالیف ......باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر......

تصحیح وحواشی تاریخ یمینی

سلطان محمود غزنوی (۴۲۱ھ) کے حالات پر تاریخ یمینی ایک معاصر ماخذ اور معروف مستند کتاب ہے، جو ابو نصر محمد بن عبدالجبار العتیبی (وفات سنہ ۴۲۷ھ ۱۰۳۶ء) (۱) کی تالیف ہے، یہ کتاب دہلی کے دینی علمی حلقوں میں اپنی زبان کی وجہ سے مقبول تھی، خاندان حضرت شاہ ولی اللہ کے یہاں بھی اس کے درس کی اطلاعات ملتی ہیں، مولانا رشید الدین خاں بھی اس کو بے حد پسند کرتے تھے اور اس کے نہایت مداح تھے، ان کے کتب خانہ میں اس کا ایک عمدہ اور صحیح نسخہ تھا، مولانا رشید الدین سے اس نسخہ کی ایک نقل مؤلف نفحۃ الیمن احمد بن محمد یمانی نے بھی منگوائی تھی (۲) بعد میں جب دہلی کالج کا نصاب طے ہوا تو اس میں بھی یہ کتاب شامل درس کی گئی (۳) اسکی نصاب میں شمولیت میں غالباً مولانا رشید الدین خاں کا مشورہ شامل رہا ہوگا اور مولانا کی وجہ سے مولانا مملوک العلی کا اس سے دلچسپی رکھنا اور اس کی تصحیح اور حواشی لکھنے پر توجہ فرمانا فطری بات ہے۔

مولانا نے اس کتاب کی تصحیح میں بہت محنت فرمائی ہے، عربی متن کے ساتھ سطور کے درمیان میں اور حاشیے پر وضاحتی عبارتیں لکھی ہیں، مشکل الفاظ کے معانی فارسی میں درج

گذشتہ صفحہ کا بقیہ...... ''قدیم دلی کالج'' میں مختصر ذکر کیا ہے اور عبدالحق کی فہرست کو فنون کی ترتیب پر مرتب کردیا ہے۔ اس فہرست میں بھی مذہبیات کے تحت مولانا مملوک العلی کے ترجمہ سنن ترمذی کا ذکر ہے، لیکن اس کی کوئی وضاحت صفحات، سنہ، ترجمہ یا مطبع وغیرہ کا ذکر نہیں۔ (ص:۱۸۷ اندراج ۱۲۴) بظاہر یہ ترجمہ چھپا نہیں۔

محمد ایوب قادری صاحب نے تذکرہ مولانا محمد احسن نانوتوی میں مولانا مملوک العلی کے ترجمہ سنن ترمذی کیلئے حالات مولانا قاسم تالیف مولانا محمد یعقوب کا حوالہ دیا ہے ص:۱۸۸ (کراچی: ۱۹۶۶ء) مگر یہ غالباً سہو کتابت ہے، تذکرہ مولانا محمد قاسم میں اس ترجمہ کا بالکل ذکر نہیں ہے۔

(۱) الاعلام، زرکلی ص:۱۸۵ ج:۶ (بیروت ۱۹۷۹ء)

(۲) المکاتیب (مراسلت مولانا رشید الدین خاں وشیخ احمد بن محمد یمانی شروانی) مکتوب مولانا رشید الدین خاں محررہ ۱۲۳۱ھ (۱۸۱۶ء) ص:۱۳-۱۴ (مجتبائی دہلی: ۱۳۱۱ھ)

(۳) یہاں یہ اطلاع مفید ہوگی کہ جب ۱۲۸۳ھ میں مدرسہ دیوبند (دارالعلوم) کا افتتاح ہوا تو مدرسہ کے عربی دینیات کے متوسط اعلیٰ نصاب میں سنن ترمذی مشکوۃ اور تفسیر جلالین کے ساتھ تاریخ یمینی بھی شامل درس تھی اور اس کا درس ہوتا تھا۔ ملاحظہ ہو، روداد سال اول مدرسہ (دارالعلوم) دیوبند۔

کئے ہیں، نیز اس میں مذکورہ شخصیتوں، مقامات اور تاریخی واقعات کی وضاحت کی گئی ہے۔ یہ وضاحت حاشیہ میں عربی میں ہے، آخر میں چھ صفحات کی مفصل فہرست مضامین ''فهرس مطالب التاريخ اليميني'' شامل ہے۔

کتاب پر دیباچہ یا اس کی وجہ اشاعت وغیرہ موجود نہیں، تاہم آخر میں تاریخ تکمیل ان الفاظ میں درج ہے:

" فرغت من تحرير هذا الكتاب يوم السبت فی ۲۲ شهر رمضان ۱۲۶۳ ھ" (جمعہ ۳/ ستمبر ۱۸۴۷ء)

اس نسخہ کے حواشی کی کتابت کے متعلق جناب محمد اکرام صاحب چغتائی کا خیال ہے (موصوف نے اس کتاب کا نسخہ جرمنی میں اسپرنگر کے ذاتی ذخیرہ میں دیکھا ہے) کہ یہ:

''تمام حواشی اور عبارت مولانا کے ہاتھ کی تحریر کردہ معلوم ہوتی ہیں'' (۱)

اس طباعت کے دیکھنے سے یہ خیال تو ضرور ہوتا ہے کہ اس نسخہ کے حواشی کی کتابت خوش نویس یا کاتب کے قلم سے نہیں ہے مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ حواشی مولانا مملوک العلی کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس طباعت کا ایک بہت عمدہ اور صاف نسخہ راقم سطور کے سامنے ہے۔

یہ کتاب سید اشرف علی کے پریس میں چھپی تھی، ٹائٹل پر یہ عبارت درج ہے:

''باہتمام سید اشرف علی، در مطبع العلوم، مدرسہ دہلی طبع شد''

طباعت کے فوراً بعد اس کتاب کے پچیس نسخے اسپرنگر کی ہدایت پر یورپ بھیجے گئے تھے (۲) اور ۱۸۴۸ء میں یہ کتاب دہلی کالج کی اعلیٰ عربی جماعت کے نصاب میں داخل ہوگئی تھی (۳) اس طباعت کا بروکلمان (Carl Brockelman) نے بھی ذکر کیا ہے (۴)

ایوب قادری صاحب نے لکھا ہے کہ مولانا مملوک العلی نے تاریخ یمینی کا اردو ترجمہ

---

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص: ۳۹ (سہ ماہی اردو، کراچی: اکتوبر دسمبر ۱۹۸۵ء)

(۲) مکتوب سید اشرف علی بنام اسپرنگر، ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص: ۲۱۱

(۳) مرحوم دہلی کالج ص: ۹۷ (دہلی: ۱۹۴۵ء)

(۴) تاریخ الادب العربی، کارل بروکلمان، عربی۔ ترجمہ سید یعقوب بکر۔ ص: ۲ ج: ۶ (قاہرہ: ۱۹۷۷ء)

بھی کیا تھا (۱) مگر اس اطلاع کی کسی اور ذریعہ سے تصدیق نہیں ہوئی اور اس ترجمہ کے مطبوعہ یا قلمی نسخہ کا بھی سراغ نہیں ملا اس لئے یہ اطلاع مشتبہ ہے، لہٰذا راقم سطور نے اس ترجمہ کا مولانا کے علمی باقیات میں ذکر نہیں کیا۔

کتاب المختار فی الاخبار والآثار

مولانا کی مؤلفات میں اس کتاب کا اضافہ جناب اکرام چغتائی صاحب کی دریافت ہے اس کا کوئی نسخہ راقم سطور کی نظر سے نہیں گذرا، اس کا تعارف چغتائی صاحب کے شکریہ کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے۔

مروج الذہب ومعادن الجوہر ابوالحسن (علی بن الحسین) مسعودی کی مشہور مایۂ ناز تالیف ہے (۲) دہلی کالج کے فاضل پرنسپل، اسپرنگر کو اس سے شروع سے دلچسپی تھی اور وہ ہندوستان آنے سے پہلے جرمنی قیام کے زمانہ میں اس کا انگریزی میں ترجمہ شروع کر چکا تھا، اس ترجمہ کی پہلی جلد ۱۸۴۰ء میں لندن سے شائع ہوئی تھی۔ جب اسپرنگر دہلی کالج کا پرنسپل مقرر ہو کر دہلی آیا تو اس کو اپنی محبوب کتاب دوبارہ یاد آئی، اس وقت اس نے مولانا مملوک العلی کو اس کی تلخیص پر توجہ دلائی، مولانا نے اسپرنگر کے تعاون سے اسکا انتخاب تیار کیا، جو ''المختار فی الاخبار والآثار'' کے نام سے چھپا۔

المختار فی الاخبار والآثار چھوٹے سائز کے پونے تین سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے، اس کی طباعت ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء) میں عمل میں آئی تھی، سرورق پر مطبع یا ناشر کا نام موجود نہیں، صرف ''طبع فی المدرسة الدهلوية'' لکھا ہوا ہے۔ محمد اکرام چغتائی صاحب کا قول ہے کہ یہ وہی مطبع ہے جو بعد میں مطبع العلوم کے نام سے موسوم ومشہور ہوا، اس کتاب کے سرورق پر یہ الفاظ درج ہیں:

کتاب المختار فی الاخبار والآثار

---

(۱) تذکرہ مولانا محمد احسن نانوتوی ص: ۱۸۸ (کراچی: ۱۹۶۶ء)

(۲) مروج الذہب کئی مرتبہ چھپی ہے۔ ایک عمدہ طباعت دار الهجرة، قم، ایران کی ہے، جو چار جلدوں میں ۱۴۰۴ھ ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی، یہ دار المعارف مصر کی ۱۹۷۷ء کی طباعت کا عکس ہے۔

الجلد الاول

وفیه تاریخ الدولة الامویة من مروج الذهب

للابی الحسن علی المسعودی المتوفی ۳۴۶ھ

خلصه وصححه مولوی مملوک العلی النانوتوی

والوائس اسپرینگر التیرولی

المختار فی الاخبار والآثار کی یہ اشاعت تین حصوں پر منقسم ہے، جو ایک جگہ مجلد ومرتب ہیں، ہر حصے کے صفحات کا شمار علیحدہ ہے:

حصہ اول : ذکر خلافت علی بن ابی طالب (ص: ۱-۶۹)

حصہ دوم : ذکر ایام معاویة بن ابی سفیان (ص: ۱-۵۰)

حصہ سوم: ذکر یزید بن معاویة بن ابی سفیان (ص: ۱-۱۶۰) (۱)

بروکلمان نے مولانا مملوک العلی اور اسپرنگر کی اس مشترک کاوش کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

History of the Mmayyades from Masudy's Golden Meadows by a. Sprenger and Mauloee Mamluk Aly in Hist. Select from arabic authorst, 1846 (۲)

مگر تعجب ہے کہ کریم الدین پانی پتی نے (جو مولانا کا شاگرد ہے اس کتاب سے واقف ہے بلکہ اس سے استفادہ بھی کرتا ہے) مولانا مملوک العلی کے حالات میں اس کا بالکل ذکر نہیں کیا، بلکہ وہ اس کو اسپرنگر کی تالیف کہتا ہے، کریم الدین نے لکھا ہے کہ:

''پوشیدہ نہ رہے کہ کتاب المختار فی الاخبار والآثار میں جو کہ ڈاکٹر اسپرنگر صاحب بہادر، پرنسپل مدرسہ دہلی نے کتاب سعودی اور آغانی سے منتخب کر کے عربی زبان میں چھپوائی ہے'' (۳)

مگر مذکورہ اطلاعات کی روشنی میں کریم الدین کا یہ قول صحیح نہیں۔

---

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص: ۴۱ اسی اطلاع پر چغتائی صاحب کا تعارف ختم ہوا۔ بعد کی سطور راقم سطور کا اضافہ ہیں۔

(۲) تاریخ الادب العربی، عربی ترجمہ دکتور عبدالحلیم النجار ص: ۵۹ ج: ۳ (دار المعارف قاہرہ: ۱۹۷۷ء)

(۳) کریم الدین نے شعرائے عرب کے تذکرہ فرائد الدہر میں ایک موقع پر ضمناً لکھا ہے: فرائد الدہر ص: ۷۵ (دہلی: ۱۸۴۷ء)

اردو ترجمہ تحریر اقلیدس (اور اس کی پہلی طباعت)

مولانا مملوک العلی کی تحریری باقیات میں سے جس کتاب کی سب سے زیادہ شہرت ہے وہ ترجمہ تحریر اقلیدس ہے، اقلیدس کی کتابِ اصول، دہلی کالج کے نصاب تعلیم میں داخل تھی، جب دلی کالج کے پرنسپل فیلکس بوترو کے زیر انتظام مجلس ترجمۂ کتب قائم ہوئی تو اقلیدس کے ترجمہ کا بھی فیصلہ ہوا اور یہ کام مولانا مملوک العلی کے سپرد کیا گیا، مولانا نے اس کے چار مقالوں کا اردو ترجمہ کیا۔

حیرت ہے کہ کریم الدین پانی پتی نے لکھا ہے کہ مولانا نے چھ مقالوں کا اردو ترجمہ کیا، اور چغتائی صاحب نے آٹھ مقالوں کے ترجمہ کا ذکر کیا ہے، حالانکہ یہ دونوں ہی اطلاعیں غلط ہیں، مولانا نے اس کتاب میں تحریر اقلیدس کے صرف چار مقالوں کا ترجمہ کیا ہے، جیسا کہ اس کتاب کی پہلی طباعت کے سرورق پر لکھا ہوا ہے، نیز اس کتاب کی اور طباعتوں میں بھی اسی قدر مضمون ہے۔

ترجمہ تحریر اقلیدس کی سادگی اور جامعیت کی کریم الدین نے اپنی دونوں کتابوں میں تعریف کی ہے، طبقات شعرائے ہند میں لکھا ہے:

''حق یہ ہے کہ علم ہندسہ کو پانی کی طرح بہا دیا ہے''(۱)

اور تذکرہ فرائد الدہر میں رقم طراز ہے:

''ترجمہ اردو زبان میں کر کے پانی کر دیا اور بہت اچھی طرح سے اس کی مشکلات کو حل کیا ہے''(۲)

تحریر اقلیدس مختصر سی کتاب ہے، جس کی ابتداء اس طرح ہوتی ہے:

" الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على خير خلقه محمد و آله واصحابه اجمعين .

(۱) طبقات شعرائے ہند ص:۳۶۴ (لکھنؤ:۱۹۸۷ء)

(۲) فرائد الدہر ص:۳۰۳۔

حدود بیان ہے ان لفظوں کے معنی کا جو اس علم میں مستعمل ہیں۔
نقطہ اسے کہتے ہیں جسکے جز نہ ہوئے اور اس کی طرف انگلی سے اشارہ ہو سکے۔
خط ایک طول ہے بدون عرض کے، یعنی لمبا ہے چوڑا نہیں اور تمام ہوتا ہے نقطہ پر۔
خط مستقیم یعنی خط سیدھا وہ چھوٹا ہے سب خطوں میں جو ملیں درمیانی دو نقطوں کے۔
سطح اور بسیط وہ ہے جسکو فقط طول عرض یعنی لمبائی چوڑائی ہو اور تمام ہوتی ہے خط پر۔
سطح مستوی اس سطح کو کہتے ہیں کہ جتنی خط مستقیم اس پر کسی جہت میں نکالیں اسے چھوئے اور لگتے گذاریں"

اور اس کے سرورق پر یہ الفاظ چھپے ہوئے ہیں:

"تحریر اقلیدس کے چار مقالہ اول کا ترجمہ مولوی مملوک العلی مدرس اول، مدرسہ عربی نے زبان اردو میں ۱۸۴۳ء میں کیا"

اس کے بعد انگریزی میں تحریر ہے:

met
of
Geometry
Books l, ll,lll and lv
by
Mowlvee Mamlook Ally
of the Delhi College
1844

آخر میں دو سطریں ان الفاظ پر مشتمل ہیں:

"مطبع رفاہِ عام کے لیتھو گرافک پریس، واقعہ خاص دارالخلافہ شاہ جہاں آباد، گذر ترکمان دروازہ کے میں اہتمام مولوی کریم الدین سے چھاپا ہوا۔ فقط" (۱)

ترجمہ اقلیدس کی اسی سال دوبارہ اشاعت ہوئی، کریم الدین پانی پتی نے جو اس رسالہ کا ناشر بھی تھا، لکھا ہے:

(۱) یہ اشاعت نہایت کم یاب بلکہ مفقود ہے، اس کا ایک نسخہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے کتب خانہ کی بچی کھچی کتابوں میں راقم سطور کی نظر سے گذرا ہے۔ اس نسخہ کے شروع آخر کے صفحات کا فوٹو اسٹیٹ ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے، اس اشاعت اور نسخہ کے متعلق اکرام چغتائی صاحب کی اطلاع میں کئی فروگذاشتیں ہیں۔

''ایک کتاب تحریر اقلیدس کا جو عربی زبان تھی بموجب حکم پرنسپل مدرسہ دہلی کے ۱۸۴۴ء میں ترجمہ اردو زبان میں کر کے پانی کر دیا اور بہت اچھی طرح سے ہر ایک شکل کو حل کیا ہے یہ ترجمہ ۱۸۴۴ء میں دو دفعہ چھپ چکا ہے''(۱)

گارسین دتاسی کا قول ہے کہ یہ ترجمہ فارسی سے ہوا تھا مگر راقم کا خیال ہے کہ مولانا مملوک العلی نے انگریزی نسخہ سے بھی فائدہ اُٹھایا ہوگا، مولانا کی ذاتی کتابوں میں اسکا انگریزی نسخہ موجود تھا۔

چند طباعتیں اور

۱۸۴۹ء اور ۱۸۵۰ء میں سید اشرف علی کے پریس مطبع العلوم سے یہ کتاب دو مرتبہ چھپی، ۱۸۴۹ء میں ڈیڑھ سو نسخے اور ۱۸۵۰ء میں تین سو نسخے (۲) جو اس زمانہ کے لحاظ سے خاصی تعداد اور مقبولیت کی بڑی علامت ہے، مگر یہ اس کتاب کی آخری طباعت نہیں تھی، وقفہ وقفہ سے اور طباعتیں بھی سامنے آئیں، ایک اور طباعت جو راقم سطور کی نظر سے گذری ہے، مطبع احمدی شاہ پیر دروازہ میرٹھ کی ہے جو محرم الحرام ۱۲۷۷ھ (جنوری ۱۸۶۰ء) میں شائع ہوئی تھی، اسکا خاتمۃ الطبع درج ذیل ہے:

''بعد حمد وسپاس خالق بے چوں ودادرِ بے چگوں اور صلوۃ بے قیاس اوپر خاتم رسل، برگزیدہ قادر بے نموں کے۔

ظاہر ہووے کہ چار مقالہ نسخہ جیدہ ترجمہ تحریر اقلیدس مؤلفہ مولوی مملوک العلی صاحب مرحوم کی ہے، بباعث کثرت خواہش طالبین کے بکوشش تمام وسعی وافر، بیچ مطبع احمدی حافظ غلام احمد صاحب کے واقع میرٹھ متصل شاہ پیر دروازہ، اہتمام سے مرزا اموں جاں کے، بتاریخ دوم شہر محرم الحرام ۱۲۷۷ھ میں مطبوع ہوئی''

یہ نسخہ چھوٹے سائز کے ایک سو اٹھائیس صفحات پر مشتمل ہے۔

---

(۱) تذکرہ فرائد الدہر ۳۰۳ (مطبع العلوم مدرسہ دہلی: ۱۸۴۷ء)

(۲) صوبہ شمالی ومغربی کے اخبارات ومطبوعات۔ محمد عتیق صدیقی ص: ۱۸۸، ۱۹۰ (علیگڑھ)

ترجمہ تحریر اقلیدس پر مولانا عبدالحق خیر آبادی کے اعتراضات اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے جوابات

مولانا مملوک العلی کے ترجمہ تحریر اقلیدس کی بعض تعبیرات اور ترجمہ کی صحت پر مولانا عبدالحق خیر آبادی نے شبہ کیا تھا اور مولانا حبیب الرحمان (مہتمم دارالعلوم دیو بند) کے الفاظ میں ''رکیک الفاظ میں اعتراضات کئے تھے'' (۱) جب حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رام پور گئے اس زمانہ میں جب مولانا عبدالحق خیر آبادی بھی رام پور میں ملازم تھے، اس سفر کے موقع پر حضرت مولانا نانوتوی نے اہل شہر کی درخواست پر وعظ کہا، یہ وعظ اذا وقعت الواقعة لیس لوقعتها کاذبة پر کہا گیا تھا اور اس کے تحت فلسفہ کے ان تمام مسائل کا جن پر معقولین کو ناز تھا ردّ فرمایا اور مولانا خیر آبادی نے مولانا مملوک العلی کے ترجمہ تحریر اقلیدس پر جو اعتراضات کئے تھے ان سب کے جوابات دیئے اور نہایت جوش میں فرمایا:

> ''کہ یہ کیا بات ہے کہ لوگ گھر میں بیٹھ کر اعتراض کرتے ہیں، اگر کچھ حوصلہ ہے تو میدان میں آجائیں مگر ہرگز یہ توقع لیکر نہ آئیں کہ وہ قاسم سے عہدہ برآ ہوسکیں گے۔ پھر فرمایا کہ میں کچھ نہیں ہوں مگر میں نے جن کی جوتیاں سیدھی کی ہیں وہ سب کچھ تھے، غرض کہ مسائل مناطقہ وفلاسفہ کا نہایت زبردست ردّ اس وعظ میں فرمایا۔ شہر کے تمام مشاہیر علماء سوائے مولوی عبدالحق صاحب خیر آبادی کے اس وعظ میں موجود تھے، مگر بولنے کی جرأت کسی کو نہ ہوئی'' (۲)

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ تحریر اقلیدس کے نام سے عربی اور اردو میں اور بھی متعدد تالیفات ہیں مگر ان کا مولانا مملوک العلی سے کچھ تعلق نہیں۔

---

(۱) ارواحِ ثلاثہ: ص: ۲۶۲

(۲) ارواحِ ثلاثہ ص: ۲۶۳ مکتبہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون

نتیجۂ فکر مولانا کی اس تالیف کا جناب اکرام چغتائی صاحب نے ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''گارسین دتاسی نے اپنی ''تاریخ'' میں اس کتاب کا حوالہ دیا ہے (۲،۲،۲۷۲) اور یہ لکھا ہے کہ یہ کتاب مختلف اجزاء میں طبع کی گئی ہے، یہ علم ہندسہ سے متعلق ہے اور شمالی مشرقی صوبوں کے مدارس میں اسے پڑھایا جاتا ہے۔ ''آگرہ گورنمنٹ گزٹ'' (بابت یکم جون ۱۸۵۵ء) میں بھی اس کا حوالہ دیا گیا ہے، ممکن ہے یہ مولانا کی تحریر اقلیدس'' ہی کا کوئی حصہ ہو'' (۱)

گارسین (Garcin De Tassy) کی تاریخ ادب اردو کا ترجمہ راقم سطور کو نہیں ملا، اس لئے گارسین کی اس اطلاع پر کچھ کہنا صحیح نہیں۔

مگر اس کو ''ترجمہ تحریر اقلیدس کا کوئی حصہ'' قرار دینا صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے نام سے یہ ضرور معلوم ہو رہا ہے کہ یہ کتاب ریاضی کی ہے اور یہ بھی تحریر اقلیدس کی طرح اس نام کی واحد تالیف نہیں ہے، بلکہ مولانا مملوک العلی کے قریب العہد اصحاب اور مولانا کے بعض شاگردوں نے بھی اس نام سے کتابیں لکھی ہیں (۲) راقم سطور کو چغتائی صاحب کی مذکورہ اطلاع کے علاوہ اس کتاب کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہے۔

مولانا کا ایک ناتمام کام، حاشیہ حماسہ حماسہ دہلی کالج اور ہندوستان کے اکثر دینی علمی حلقوں کے نصابِ تعلیم میں شامل تھا، مولانا مملوک العلی نے حماسہ کے انتخاب کا اور اس کی شرح لکھنے کا ارادہ کیا تھا، اور غالباً یہ کام شروع بھی کر دیا تھا اور اس میں تعاون کیلئے اپنے شاگرد، علی اکبر سونی پتی سے رابطہ کیا تھا، مگر وہ مولانا کے اس منصوبہ سے متفق نہیں تھا بلکہ چاہتا تھا کہ مولانا یہ کام نہ کریں۔ علی اکبر اسپرنگر کے نام ایک خط میں لکھتا ہے:

---

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص: ۴۱

(۲) منشی ذکاء اللہ نے اقلیدس کے پہلے دوسرے مقالہ کا اردو ترجمہ کیا ہے اس کا نام بھی نتائج ہے (مطبوعہ مطبع مرتضوی دہلی: ۱۸۷۳ء) منشی ذکاء اللہ کی اس موضوع پر اس نام کی ایک تالیف اور بھی ہے اور عربی میں بھی ریاضی پر نتائج تحریر نام کی کئی کتابیں ہیں۔

''مولوی صاحب کا ارادہ ہے کہ ''باب الحماسہ'' چھپوادیں، اس طرح کہ ضروریات شرح حاشیہ پر ہو اور مجھے اس کے انتخاب کو کہتے ہیں، لیکن میرے نزدیک اس کا چھاپنا اس طرح بُرا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ شرح اشعار و جز شعر و قصہ و صحر و شاعر مختصراً کتاب کے اندر ہو اور بعضے شعر و شاعر کا حال حماسہ میں کچھ نہیں اور اغانی میں اس کا حال موجود ہے۔ یہ بھی بہتر ہے کہ ''اغانی'' میں سے کچھ کچھ حال لکھوں، سو یہ بدون حاضر ہونے دہلی کے غیر ممکن ہے''(۱)

علی اکبر سونی پتی کی اس علمی خدمت کی مخالفت کی وجہ بہ ظاہر یہ تھی (جس کا مولانا کو علم نہ ہوگا) کہ وہ خود حماسہ کی شرح لکھنا چاہتا تھا اور صاف بات یہ تھی کہ مولانا کی شرح کی موجودگی میں اس کے کام کی کچھ وقعت نہ ہوتی، اس لئے اس نے مولانا کے حماسہ پر کام کرنے کی برملا مخالفت کی مگر وہ خود بھی حماسہ پر کچھ کام نہ کرسکا، تاہم اسکے چھوٹے بھائی علی اصغر نے حماسہ کی ایک شرح لکھی تھی، جس کا اس کی ایک تحریر میں ذکر ہے۔

یہ حضرت مولانا مملوک العلی کی اس وقت تک معلوم تصانیف، تراجم اور علمی تحریری خدمات کا تعارف ہے، مذکورہ تحریری آثار کے علاوہ مولانا مملوک العلی کی کسی اور تصنیف، تالیف، ترجمہ یا تصحیح کی ہوئی کتاب کا راقم سطور کو علم نہیں ہے۔

---

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص:۲۹۹

باب (۱۴)

حضرت مولانا کا عربی کا ایک خط بھی دستیاب ہے یہ خط جو صنعت مہملہ (بے نقط الفاظ) میں ہے، مولانا کے شاگرد کریم الدین پانی پتی نے اپنی تالیف تذکرہ فرائد الدھر (تاریخ شعرائے عرب) میں نقل کیا ہے اور یہ اس وقت تک معلوم مولانا کا واحد عربی مکتوب ہے۔

کریم الدین کی تحریر کے مطابق حضرت مولانا نے یہ خط شہزادہ فیروز کو لکھا تھا، کریم الدین کہتا ہے کہ:

"ایک مسودہ عربی خط کا جو مسمی فیروز بادشاہ زادے کو انہوں نے ایام طالب علمی میں بے نقط لکھا تھا ڈھونڈ لایا ہوں، تیمناً و تبرکاً اپنی کتاب میں لکھتا ہوں" (۱)

مگر کریم الدین کی یہ اطلاع صحیح نہیں کہ یہ خط حضرت مولانا کے زمانۂ طالب علمی کا لکھا ہوا ہے، کیونکہ اس خط کی آخری سطور سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ یہ خط حضرت مولانا رشید الدین خاں کے مرض وفات میں لکھا گیا ہے، مولانا نے تحریر فرمایا ہے:

والمدرس الاول ماحله مسّه کسر مؤلم، ودهمه همّ مدلهم رحم لسوء حاله الاسود والاحمر، واكده الدهر كداً وهوادهى وامر والحال مسدد واودده ومعدهمه وكمده واطرد امره وحلا مره وسوده۔ (۲)

مولانا رشید الدین خاں ۱۲۴۲ھ (جون، جولائی ۱۸۲۷ء) کے آخری مہینوں میں بیمار ہوئے تھے اور محرم ۱۲۴۳ھ (اگست ۱۸۲۷ء) میں مولانا کی وفات ہوگئی تھی۔ مولانا رشید الدین خان کے سنہ وفات کے بارے میں بعض تذکرہ نگاروں نے ایک روایت اور بھی نقل

(۱) فرائد الدہر (تذکرہ شعرائے عرب) (دہلی: ۱۸۴۷ء) ص: ۴۰۴

(۲) فرائد الدھر، ص: ۴۰۶

کی ہے مگر مولانا فضل حق خیر آبادی کے ایک خط میں (جو اس وقت دہلی میں موجود تھے) مولانا رشید الدین کی شدید بیماری اور وفات کا ذکر ہے۔ مولانا خیر آبادی کے اس خط پر تاریخ تحریر درج ہے، جس سے یہ بات محقق ہو جاتی ہے کہ مولانا رشید الدین کی وفات محرم ۱۲۴۳ھ میں ہوئی تھی، تاریخ وفات کی اور اطلاعات صحیح نہیں (۱) اسی صراحت سے ضمناً یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ مولانا مملوک العلی کا یہ خط اواخر ۱۲۴۲ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اسلئے کریم الدین کی یہ اطلاع صحیح نہیں کہ مولانا کا یہ خط انکے زمانہ طالب علمی کا لکھا ہوا ہے۔

اس خط کے متعلق کریم الدین کی یہ اطلاع بھی صحیح معلوم نہیں ہوتی کہ یہ خط شہزادہ فیروز کے نام ہے، خط کے مضمون سے یہ جھلکتا ہے کہ یہ خط قلعہ معلّٰی کے اورنگ نشیں، اکبر شاہ ثانی (ابن شاہ عالم ثانی دور حکومت سنہ ۱۲۲۱ھ ۱۸۰۶ء تا سنہ ۱۲۵۳ھ، ۱۸۳۷ء) کے نام لکھا گیا ہے، ممکن ہے کسی مصلحت یا آدابِ شاہی کے خلاف ہونے کی وجہ سے شہزادہ کو بھیجا گیا ہو، مضمون تمام تر بادشاہِ وقت کے نام ہے۔

اس خط میں مولانا رشید الدین خاں کی وفات کے بعد کالج کے مدرس اوّل کے لئے مولانا سید محمد دہلوی کے نام کی سفارش کی گئی ہے کہ وہ اس کیلئے بہتر اور موزوں ہیں مگر سوال یہ ہے کہ مدرسہ دہلی (دہلی کالج) کے مدرس اوّل و دوم کی تقرری کا قلعہ معلّٰی سے کیا تعلق تھا، کیا انگریز حکام اس کیلئے بادشاہِ وقت سے اجازت لیتے تھے، اگر یہ خیال صحیح ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ مدرسہ دہلی کی ابتدا اور اس کیلئے مدرس اول و دوم کے لئے تقرر کی بھی بادشاہ سے اجازت لی گئی ہوگی، یوں مدرسہ دہلی اور دہلی کالج اکبر شاہ ثانی کی دانش مندی اور دور بینی کا ایک ثبوت بھی ہو سکتا ہے۔ اس پس منظر اور تفصیل کے بعد خط ملاحظہ ہو، مولانا نے لکھا ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ المحمود، المالک الودود، الواحد السرمد، الملک الصمد. سمک صرح السماء ولا دعام، وکل ماسواہ ھالک ولہ الدوام ادراکہ

(۱) تفصیلات مولانا رشید الدین کے تعارف میں گذر گئی ہیں۔

کما هو محال ، ماادرکه اهل الحال،ولا علمه اهل الکمال.مسلکه سهل لکل سالک ، عدله مهلک لکل هالک.

امره امر وحکمه حکمٌ وحلا له حلال ومحرمه محرم .مطروده مردود ومودوده مسعود.همه اعد همّاً وسرورا،وحکمه حصل حزّاً وحروراً .لا امد لدوامه ولاراد لاحکامه.ماسعد الا مسعوده وما رد الا مردودهٗ.اکرم السعداء، وعلم العلماء. مراده معمول ومعموله حاصل.لاحد لدامّا ء حکمه ولا ساحل .عالم الاسرار، مالک الاحرار.مسعر الاسعار،محصل الاوطار، مملک الامصار، مکررالاصال والاسحار. ماامّله مؤمّلٌ اٰلاووصل مأموله، وما سأله سائل الا وما آخرم مسؤوله.

اللّٰهم! اکرم محل محمد المودود، اسمه احمد ومسماه محمود. مادحه ممدوح لکل واحد، ومحموده محمودٌ لکل حامد. علوه سماک وسموُّه لو لا ک. طُوره سماء، وطَوره عطاء . حامل لواء الحمد، ومالک ممالک الاکرام، سالک مسالک العدل، وممهد مهاد الاسلام. وارحم اله الکرماء رهطه الکملاء واودّاء ہ السعداء .

اسلموا لله واطاعوا رسوله الودود، وسددوا الاسلام ودمّروا اهل الصدود. هواهم دواءٌ لکل داء، وودُهم محصلٌ لکل مرادٍ واهواء. رحمهم الله وروّح ارواحهم، واکرمهم واعلا اسماء هم .

وصل طرس مسطور، ام دوح ممطور سواده علا المسک العطر، وسطوره عطل سمط اللؤلؤوسلک الدرر.مطلعه مروح الارواح، مرآه کاسرا لهمم کراح رحراح . ملحه مصلح الکلام کالملح للطعام . الملکُ الکا مل الحلا حل،العالم العامل. سماء العلم والعمل، المعلم للمعلم الاول.کرم لا عد لاٰ لاٰ ئه ، سمح لا حد لعطا ئه . کلامه وکلامه الصحاصح الاعلام کالهطل والرهام او المدره والعوام . لم لا؟ وکلام الملوک ملوک الکلام .

ملک عطاؤہ مطر هامر، وسماحه سمر سائر. کلامه حلو وسلامه سلو. لله درک ! ما أحلا کلامک ورعاک الله ما اعلی اعلامک .صدر امرک المحکم لا سطر الطرس عاطلاً کمر سومک الاکرم .وهاا ملک العصر! امله کماهو الامر، واحرر لک الحال کما هو امرک . أ اما م اهل الکمال !

حال مملو ککک حال مسرور،لا أود لسداد ه والحمد لمالک الامور. وصالح حال اهله وأولاده، ورهطه وسواده. أمله حاصل وسروره کامل. حساده حصدوا، وأعداؤه کمدوا. الا هوحر ولولا ئک مملو ک ، ودرهمه لوسم ودک مسکوک . الا وا ساه لعدم وصالک السار، وأساء ه مرآک المروح للروح والکاسر للهموم الامرار. ادعولک اسحاراًو آصالا. وأسأل لک علوّاً وکما لا. أطاح الله حسادک ، وسد د عمادک . ومد عمرک وطوله، وأعطی مرادک وحصله،مادام رعد وسماء، ومطروماء، ومارڈ وکلاء، وورد وسلاء.

والمدرس الاول حلّه ماحلّ مسّه کسر مؤلم ، ودهمه هم مدلهم. رحم لسوء حاله الاسود والاحمر، وأکد ہ الدهر کداً وهو ادهی وأمر. و الحال سدد أوده ، ومعد همه وکمده . واطرد امره وحلا مره.

والسؤدد محمد المکرم الاسعد، عادل الا حوال ، سالم الا وصال. واعِ لا سرار کلامک ، وطالع لمطالع مرامک.

وللمملو ک أوصل له سلام الملک الهمام، وهو أعاد السلام مع الاکرام. ودعا لعلو کلمک ولسمو اعلام حکمک. سلمک الله وأو صلک مدی الکمال واعلاه . والسلام مع الاکرام. (۱)

(ترجمہ از مولانا عبدالرشید صاحب بستوی وابوالحسن ارشد کاندھلوی سلمہ)

ترجمہ: تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جو لائق حمد، تمام چیزوں کا مالک، اپنے

(۱) فرائد الدهر مولوی کریم الدین پانی پتی ص: ۴۰۵ (مطبع العلوم دہلی: ۱۸۴۷ء)

بندوں سے محبت کرنے والا، ذات وصفات میں یکتا، ہمیشہ رہنے والا بے نیاز بادشاہ ہے، جس نے بغیر ستون کے آسمان کی چھت بلند کی، جس کے سوا ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے، باقی رہنے والی ذات صرف اسی کی ہے، اس کی تمام کیفیات کے ساتھ اس کا ادراک محال ہے، نہ اصحاب حال اس کا ادراک کر سکے اور نہ اہل کمال کو اس کا سراغ لگا، اس کا راستہ ہر شخص کے لئے آسان ہے، اس کا انصاف ہر اس شخص کے لئے ہلاکت کا سامان ہے جس کے لئے ہلاکت مقدر ہے۔

اس کا حکم مستحکم ہے، اس کا حلال کردہ حلال اور حرام کردہ حرام ہے، جس کو اس نے اپنے دربار سے دھتکار دیا وہ مردود ہے اور جو اس کے نزدیک سعادت مند ہے وہ اسے محبوب اور ہر دل عزیز ہے، اس کا قصد وارادہ موجب غم بھی ہے اور باعث مسرت بھی، اس کے فیصلہ کو کوئی ٹال نہیں سکتا، خوش بختوں کو اس نے عزت دی اور علماء کو علم سے نوازا، اس کی ہر منشا پوری ہوتی ہے، اس کی حکمتوں کے سمندر کا کوئی ساحل اور کنارہ نہیں، وہ رازہائے سربستہ سے واقف، بندوں کی ضروریات پوری کرنے والا، اشیاء کی قیمت مقرر کرنے والا، شہروں اور ملکوں کا مالک بنانے والا، صبح اور شام کو اس کے وقت پر برابر لانے والا ہے، اس کے یہاں ہر امیدوار مراد کو پہنچتا ہے، کوئی سائل محروم نہیں ہوتا۔

اے اللہ اپنے محبوب بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ٹھکانہ بہتر بنا جن کا نام نامی اسم گرامی احمد اسم بامسمی یعنی قابل تعریف ہے، جن کی تعریف کرنے والا ہر شخص کی نظر میں قابل تعریف ہے، جس کی وہ تعریف کردیں وہ ہر مداح کے نزدیک قابل ستایش ہے، جن کی رفعت اور بلندی سماک (ایک ستارہ کا نام) اور لولاک ہے، جن کا طور آسمان بالا ہے، جو حمد کے علم بردار، عزت کی جگہوں کے مالک، انصاف کے راستے پر چلنے والے، اسلام کا راستہ ہموار کرنے والے اور اللہ کے ان معزز محبوب اور سعادت مند کامل بندوں میں سب سے زیادہ اس کے نزدیک موردِ الطاف وعنایات ہیں۔

جنھوں نے ایک اللہ کے سامنے جبین نیاز خم کردی، اس کے محبوب پیغمبر کی فرماں برداری کی، اسلام کو استحکام بخشا، اصحابِ زیغ وضلال کو ہلاک وبرباد کیا۔ جن کی محبت ہر

بیماری کی دوا اور ہر خواہش و مراد کے حصول کی ضامن ہے۔ اللہ رب العزت اپنے ان محبوب بندوں پر رحم فرمائے، ان کی روحوں کو پاکیزہ بنائے اور انہیں ہر طرح کی عزت اور بلندی سے ہمکنار فرمائے۔

مکتوب صحیفہ موصول ہوا جس کی روشنائی مشک و عنبر پر فائق ہے، جس کی سطروں کے سامنے موتیوں کی لڑیاں گرد ہیں، اس کی آمد روح افزاء اور دیدار غم غلط کرنے کا سامان ہے، اس کے لطیفے کلام کی اصلاح کا ذریعہ ہیں جیسے نمک کھانے کے لئے، یہ صحیفہ اس عالم باعمل شہنشاہِ معظم کا ہے جس نے علم و عمل کو رفعت دی جو معلم اول کا معلم ہے، جس کی بے پایاں نعمتوں اور بخششوں کو شمار میں نہیں لایا جاسکتا، جس کا کلام مسلسل برسنے والی بارش کے مانند کثیر النفع ہے، اس میں حلاوت اور شیرینی ہے، اور ایسا تو ہونا ہی چاہئے کیوں کہ بادشاہوں کا کلام، کلاموں کا بادشاہ ہوا کرتا ہے۔

اللہ آپ کی حفاظت فرمائے، آپ کا حکم صادر ہوا کہ آپ کے معزز مکتوب کی طرح اپنی صورت حال آپ کے سامنے رکھدی تو اے شہنشاہِ زمانہ! آپ کے حکم کے مطابق اس کا املاء کروگا اور بہ تعمیل حکم صورت حال تحریر کروں گا:

آپ کے اس غلام (یا مملوک العلی) کا حال بہتر ہے الحمد للہ! کسی طرح کی کوئی دقت اور پریشانی نہیں ہے، گھر والے، بال بچے، خاندان کے لوگ بخیریت ہیں امیدیں برآئی ہیں، رنج و غم نام کی کوئی چیز نہیں ہے، حاسد موت کے گھاٹ پہنچ چکے ہیں، دشمن غمزدہ ہیں۔ میں آزاد ہوں مگر تیری گرم گستریوں کا غلام ہوں، پیسوں پر تیری محبت کا نقش قائم ہے، تیری خوش کن ملاقات، اور رحمت پروردگار ہے جو ازالۂ غم کا سامان ہے۔ محرومی کے باعث مغموم ہوں، صبح و شام تیرے لئے دعا گو ہوں، تیری بلندی اور کمال کا خواہاں ہوں، اللہ تیرے حاسدوں کو ہلاک کرے، تجھے رفعت عطا کرے، عمر دراز کرے اور جبتک دنیا قائم رہے اور کائنات کی نیرنگیاں اور رعنائیاں برقرار رہیں تیری ہر مراد پوری ہوتی رہے۔

مدرس اول کو تو پیش آنا تھا، آچکا، تکلیف دہ مصیبت کی اچانک آمد نے تاریک کردیا، ان کے حال پر سرخ و سیاہ سب ہی کو ترس آیا۔ زمانے نے ان کو پریشان کردیا،

زمانہ تو شاطر اور تلخ ہوتا ہی ہے۔ ایام موجودہ نے ان کی کجی ٹھیک کردی، ان کا رنج والم کافور ہوگیا۔ ان کا معاملہ اب ٹھیک ٹھاک ہوگیا، ان کی تلخی بھی اب شیریں ہوچکی ہے۔

سربراہی (مولانا) محمد (دہلوی) کیلئے زیبا ہے، جو سب سے زیادہ خوش بخت، جن کے حالات سب سے زیادہ درست، جسمانی اعضاء ہر بیماری سے محفوظ ہیں۔ جو آپ کے کلام کے اسرار ورموز سے واقف ہے، آپ کے طلوع گاہِ سلطنت کا نیر تاباں ہے۔

مملوک العلی کو شاہِ معظم کا سلام پہنچا، اس نے بھی نہایت عزت واحترام سے جواب دیا، آپ کی شہرت، اقتدار اور حکومت کی بلندی کی دعاء کی۔ خدا آپ کو محفوظ رکھے اور آپ کو کمال کی بلندیوں تک لے جائے۔ والسلام مع الاکرام۔

مشکل الفاظ کے معنی

سمک البناء: بلند کرنا، اونچی بنانا۔ دعام جمع دعم: ستون کھمبا حرور دھوپ، آگ۔ امد جمع آماد: انتہا۔ داماء: جنگلی چوہے کا بل اور وہ مٹی جسے چوہا اپنے بل سے نکالتا ہے، جمع دوامٌ. مسعر: سعر النار: آگ تیز کرنا، شعلہ زن کرنا۔ اسعار: واحد سعر: بھاؤ، ریٹ۔ أوطار مفرد وطر: حاجت وضرورت۔ أصال واحد أصيل: شام، شام کا وقت۔ امّل احدا: امید باندھنا، توقع رکھنا۔ حرم حرم رجلا شيئاً: محروم کردینا۔ سماک: ایک روشن ستارے کا نام ہے۔ طوّر جمع اطوار: حال۔ أوداء واحد وديد: دوست عاشق۔ سددوا: سدد الأود: کجی درست کرنا، ہموار کرنا۔ روّح: خوشبو لگانا، خوشبودار بنانا۔ طرسٌ: جمع طروسٌ واطراسٌ: تحریر، خط روح مفرد روحة: تناور اور لمبا چوڑا درخت۔ سمط: جمع سموطٌ: لڑی جس میں موتی پر ویا جائے۔ راح: تیز وتند ہوا۔ رحراح: وسیع وعریض. مُلح مفرد ملحة: لطیفہ، دل چسپ بات۔ حلاحل: بہادر، بے باک۔ صحاصح: واحد صحصاح وصحصوحٌ: محقق، ہر بات کی کھوج کرید کرنے والا۔ هطل: هطل المطر: ہلکی ہلکی بارش ہونا۔ رهام: مفرد رهمةٌ: ترشح جو مسلسل پڑے۔ مدره:

سربرآوردہ شخص ۔ هامر: همر الماء : پانی گرنا۔ سلو: سامان تسلی ۔ أمّله : أملا شيئاً: لکھنا، نوٹ کرنا۔ أود: کجی ٹیڑھاپن. حصد الروح : جان لینا، قتل کرنا۔ کمدوا: کمد الرجل: شدید رنج میں مبتلا ہونا . دسم: چربی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ لفظ ''وسم'' واو سے ہو۔ تو اس کا معنی نشان اور داغ ہے۔ دونوں یہاں درست ہو سکتے ہیں. مسکوک: سکہ ڈھالنا. امرار: مفرد مرٌّ: تلخ، کڑوا۔ ماردٌ: بلند چیز (پہاڑ) أسلاء: گھٹیا اور گندی چیز (گندگی) مدلهمٌّ: گھنا، پھیلا ہوا، بہت زیادہ۔ أكدَّ: فلاناً: دھتکارنا، راندۂ درگاہ کرنا. أمر: تلخ ترین۔ معد الحزن : غم دور ہونا. أوصال: مفرد وصلٌ : جوڑ، بند۔ مدی: انتہا، چوٹی۔

باب (۱۵)

مولانا مملوک العلی کے اردو کے چند اہم خطوط

چند وضاحتیں مولانا مملوک العلی کی تصانیف اور مؤلفات کی طرح مولانا کے اور تحریری آثار بھی بہت کم معلوم ہیں۔ مؤلفات وتراجم کے علاوہ مولانا کے کل دس گرامی نامے اس وقت تک دریافت ہوئے ہیں، جن میں سے ایک خط عربی میں ہے جو اوپر نقل ہوا اور نو خطوط اردو میں ہیں۔ اردو کے یہ تمام خطوط مولانا نے دہلی کالج کے پرنسپل، اپنے افسر اعلیٰ، ایک علم دوست شخصیت اور معروف جرمن مستشرق، اسپرنگر (ALOYS,SPREN GER) کو لکھے تھے۔ یہ خطوط کئی پہلوؤں سے اہم اور لائق مطالعہ ہیں اور مولانا کی اردو کی بے تکلف ذاتی تحریر کا پہلا دستیاب نمونہ ہیں، انہی خطوط کے ذریعہ سے مولانا کو کلکتہ میں ملازمت کی پیش کش اور اس کے متعلقات روشنی میں آتے ہیں اور ان سے اس دور کی بعض نادر معلومات اور علمی سرگرمیوں کا بھی علم ہوتا ہے۔

ان خطوط سے جو ایک اور بڑی بات معلوم ہوتی ہے اور خاص رہنمائی ملتی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے اکابر اور بڑے علماء علمی بلکہ دینی معلومات میں بھی ذہنی تحفظات اور تعصب سے بہت دور تھے، وہ علمی کاموں میں ہر ایک کی بلا تامل مدد اور رہنمائی فرماتے تھے اور جن کتابوں کے متعلق اندازہ ہوتا کہ ان کی اشاعت مفید اور ضروری ہے ان کیلئے ایسے غیر مسلم اور عیسائی اہل علم اصحاب کو بھی توجہ دلاتے رہتے تھے جو علمی دنیا میں سرگرم تھے اور ملک کے اعلیٰ طباعتی ادارے ان کی دسترس میں تھے، اور یہ عالی مرتبت حضرات اپنے چھوٹوں کی ہر طرح سے مدد ہمت افزائی اور تعاون کرتے رہتے تھے۔

ایک بات اور قابل توجہ ہے کہ اگرچہ اسپرنگر کے نام خطوط میں مولانا نے اسپرنگر کے

علمی مقام اور منصب کی رعایت کرتے ہوئے مناسب کلمات استعمال کئے ہیں، مگر اس میں ایک حرف بھی ایسا نہیں ہے جس سے اسپرنگر کے غیر ضروری احترام، خوشامد، اسپرنگر کی برتری کا، اپنی کم مائیگی کا یا اس طرح کا کوئی اور احساس جھلکتا ہو۔

یہ تمام خطوط اسپرنگر کے ذاتی کاغذات میں جرمنی کی شہرۂ آفاق لائبریری (Deutshe Staatbibliothek) میں چھپے ہوئے پڑے تھے، پاکستان کے نامور محقق جناب محمد اکرام صاحب چغتائی نے اس اہم لائبریری میں خاصا وقت گذارا، اسپرنگر کے سب کاغذات تفصیل سے دیکھے اور اس ذخیرہ میں حضرت مولانا مملوک العلی اور اس عہد کے ممتاز علماء اور مشاہیر کے جو خطوط موجود تھے ان کی نقول حاصل کیں، اور پھر ان پر بہت محنت سے مفصل حاشیے لکھے۔ جس میں مکتوب نگاروں کے احوال، خطوط کے مندرجات کی تحقیق و تفصیل اور کثیر حوالے درج ہیں۔ یہ تمام خطوط چغتائی صاحب کے شکریہ کے ساتھ یہاں پیش کئے جارہے ہیں، حواشی راقم سطور نے لکھے ہیں، جن میں چغتائی صاحب کی معلومات سے استفادہ کیا گیا ہے، چند اضافے یا تصحیح و ترمیم راقم سطور نے بھی کی ہے۔

مکتوب کی ترتیب چغتائی صاحب کی ترتیب سے کسی قدر مختلف ہے

آخر میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ زیر نظر مکتوبات کی ترتیب جناب محمد اکرام چغتائی صاحب کی ترتیب سے کسی قدر مختلف ہے۔ یہ کل نو خط ہیں، جن میں پہلے پانچ خطوط کی ترتیب، تاریخ تحریر اور مضمون کے لحاظ سے درست ہے، مگر اسکے بعد کی ترتیب صحیح نہیں، مولانا مملوک العلی کے پیش نظر مکتوبات میں سے مکتوب نمبر ۴ مکتوبہ ۱۶ رجولائی ۱۸۵۰ء (۶ ررمضان ۱۲۶۶ھ) سے مکتوب نمبر ۸ تک جس کو چغتائی صاحب نے مکتوب نمبر ۵ رتمبر ۱۸۵۰ھ (شوال ۱۲۶۶ھ) قرار دیا ہے، کل چار خط ایسے ہیں جن میں کلکتہ کی ملازمت اور اس کے متعلقات کا ذکر ہے، مگر غالباً ان خطوط میں سے ایک دو خطوں کی تاریخ تحریر میں کچھ غلطی ہوگئی ہے۔ وہ خط جس کو چغتائی صاحب نے مکتوب نمبر ۶ قرار دیا

ہے (مکتوبہ ۱۹؍اگست ۱۸۵۰ھ) ۱۰؍شوال ۱۲۶۶ھ وہ دراصل آٹھویں خط کی جگہ آنا چاہئے، کیوں کہ جو خط چغتائی صاحب نے آٹھ نمبر پر درج کیا ہے وہ ۵؍ستمبر ۱۸۵۰ھ (۲۷؍شوال ۱۲۶۶ھ) کا لکھا ہوا ہے اور چغتائی صاحب کی ہی تحقیق کے مطابق وہ تھارن ٹن (Thorienton) کے نام درخواست ملازمت ہے۔ اور چغتائی صاحب نے جو خط نمبر ۶ پر درج کیا ہے اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ دہلی کالج کی انتظامیہ نے مولانا کی ایک سال کی درخواست رخصت بھی منظور نہیں کی، اسلئے مولانا نے کلکتہ جانے اور مدرسہ عالیہ کی ملازمت کا خیال دل سے نکال دیا ہے، اسپرنگر کے نام مولانا نے ایک خط میں لکھا ہے:

> ''لیکن بہت افسوس ہے کہ وہ درخواست منظور نہ ہوئی اور صاحب بہادر کو بھی اس امر کا افسوس ہوا، لہٰذا سب اہل رائے اور جمیع دوستوں کی عقل میں اس صورت میں کہ رخصت ایک سال کی بھی نہ ہو، چھوڑنا روزگار مدرسہ دہلی کا واسطے درخواست عہدہ کلکتہ کے مناسب نہیں، اور اغلب ہے کہ آپ کی رائے بھی ان سب کی رائے کے موافق ہوگی اور احقر کو بیچ نہ بھیجنے کی درخواست کے معاف اور معذور تصور فرماویں گے، اور آپ نے اپنے عنایت نامہ میں ارقام فرمایا کہ مجھے اس امر میں سفارش کرنے کا اختیار نہیں، ورنہ پھر احقر مکلّف اس امر کا ہوتا کہ واسطے ایک ہی برس کے حضور سفارش فرماویں تاکہ کسی طرح احقر ہمراہی حضور سے محروم نہ رہے، لیکن اب حسرت اور افسوس سے کیا عرض کرے۔ واجب تھا عرض کیا۔''(۱)

اس خط کی تاریخ تحریر چغتائی صاحب نے ۱۹؍اگست ۱۸۵۰ء (۱۰؍شوال ۱۲۶۶ھ) نقل کی ہے، اس خط سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ مولانا کو اسپرنگر سے توقع تھی کہ وہ مولانا کے لئے کالج کی انتظامیہ اور بڑے افسران سے سفارش کریں گے مگر اسپرنگر نے لکھدیا:

> ''مجھے اس باب میں سفارش کا اختیار نہیں''

اس لئے مولانا نے کلکتہ کی ملازمت کا خیال دل سے نکال دیا اور اس قصہ سے یکسو ہو گئے۔ اس واقعہ کا اس خط میں ذکر ہے۔ چغتائی صاحب نے اس کے بعد جو خط درج کیا ہے نمبر ۷ پر، اس کی تاریخ کتابت ۵؍ستمبر ۱۸۵۰ء (۲۷؍شوال ۱۲۶۶ھ) لکھی ہے،

(۱) ایک نادر مجموعۂ مکاتیب ص: ۷۴

اس خط کا ضمیمہ مکتوب نمبر ۸ ہے جو تھارن ٹن کے نام رخصت کی درخواست ہے، جس کے ساتھ اسپرنگر کی سفارش کی مولانا کو توقع تھی، لہٰذا یہ بات بالکل صاف ہے کہ مکتوب نمبر ۶ کی تاریخ تحریر ۱۹؍اگست ۱۸۵۰ء (۱۰؍شوال ۱۲۶۶ھ) میں کچھ غلطی ہے، کتابت کی غلطی ہو اور یہ بھی غیر متوقع نہیں کہ خود مولانا مملوک العلی سے تاریخ غلط لکھی گئی ہو، بہر حال میرا خیال ہے کہ اس خط کی صحیح تاریخ تحریر غالباً ۱۹؍ستمبر یا ۱۹؍اکتوبر ہوگی، بظاہر ۱۹؍ستمبر (۱۲ ذی قعدہ ۱۲۶۶ھ) ہے کیوں کہ اس خط کے بعد تھارن ٹن کو درخواست بھیجنے اور اسپرنگر سے سفارش کی مکرر درخواست قطعاً نا مناسب تھی، لہٰذا خطوط کی چغتائی صاحب کی پیش کی ہوئی ترتیب میں کسی قدر ترمیم ضروری معلوم ہوتی ہے، راقم سطور نے چغتائی صاحب کی ترتیب میں درج چھٹے خط کو بالکل آخر میں ذکر کیا ہے، آٹھواں خط ساتویں کا گویا ضمیمہ ہے اور جو خط آخر میں تھا وہ چھٹے خط کی جگہ پیش ہے۔ امید ہے کہ مضامین کے مندرجات کی روشنی میں یہی ترتیب صحیح ہوگی۔

ب: چغتائی صاحب نے خطوط کی نقل میں کئی موقعوں پر مولانا مملوک العلی کے طرز تحریر کی پابندی کی ہے، مگر چونکہ یہ املاء اور طریقۂ تحریر اب بالکل اجنبی اور متروک ہے اس لئے راقم نے پرانے املاء کو ترک کر دیا ہے، مضمون جوں کا توں ہے۔

مکتوب اول

غریب پرور، سلامت!

کتاب ''اصطلاحات'' مصنف کے ہاتھ کی، جس کا ذکر میں نے حضور سے کیا تھا، نام اس کا ''کشاف اصطلاحات الفنون'' ہے (۱) احقر کے گمان میں مقدار اس کی قاموس سے کم نہیں اور وہ کتاب وطن (۱) میں بعض دوستوں (۲) کے پاس ہے۔ اگر خدا چاہے اب کی بار امتحان کے بعد جو وطن کو جاؤں گا، اس کتاب کو مالک سے مستعار لے کر اپنے

(۱) کشاف اصطلاحات الفنون، اصطلاحات علوم وفنون پر قاضی محمد اعلیٰ تھانوی (وفات ۱۱۹۱ھ، ۱۷۷۷ء) کی شہرۂ آفاق کتاب ہے۔ مولانا مملوک العلی نے اس کا نسخہ مصنف، مولانا ابوالحسن ...... باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر......

ہمراہ لاؤں گا، بعد ملاحظہ کے صاحب کو نقل اس کی لکھوانے کا اختیار (۳) ہے، واجب تھا عرض کیا۔فقط

مملوک العلی

مدرس اول مدرسہ دہلی

۱۲؍نومبر ۱۸۴۶ء (۲۴؍ذی قعدہ ۱۲۶۲ھ)

گذشتہ صفحہ کا بقیہ.......... (خلف حضرت مفتی الٰہی بخش) کاندھلوی کے پاس دیکھا تھا، اس کا اسپرنگر سے ذکر کیا، اسپرنگر کو اس کے مطالعہ کا اشتیاق ہوا، مولانا مملوک العلی نے یہ نسخہ کاندھلہ سے منگا کر اسپرنگر کو دکھایا، اسپرنگر نے اس کی نقل کرائی اور کچھ تصحیح و اضافہ کے بعد کلکتہ سے شائع کرانے کا اہتمام کیا۔

ان مکتوبات کے حواشی میں کشاف اصطلاحات الفنون کے حوالہ سے محمد اکرام چغتائی صاحب کی بعض اطلاعات درست نہیں، مفصل معلومات اور قاضی محمد اعلیٰ کے متعلق فروگذاشتوں کی وضاحت کیلئے ملاحظہ ہو راقم سطور کا مضمون قاضی محمد اعلیٰ تھانوی۔مؤلف ''کشاف اصطلاحات الفنون احوال وآثار'' جو سب سے پہلے سہ ماہی فکر ونظر اسلام آباد پاکستان (محرم، ربیع الاول ۱۴۱۰ھ اکتوبر دسمبر ۱۹۸۹ء) میں چھپا تھا، بعد میں جزوی ترمیمات یا اضافوں کے ساتھ اور رسائل میں بھی شائع ہوا۔اس مضمون کا خلاصہ کشاف اصطلاحات الفنون کی پاکستانی اشاعت (سہیل اکیڈمی، لاہور: ۱۴۱۳ھ) میں بھی شامل ہے۔

(۱) وطن سے وطن کا نواح مراد ہے، مولانا کا وطن نانوتہ تھا اور یہ کتاب نانوتہ کے قریب کاندھلہ میں تھی، جیسا کہ ذکر ہوا۔

(۲) دوستوں سے مولانا ابوالحسن کاندھلوی کی طرف اشارہ ہے، مولانا کے مختصر احوال وتعارف کے لئے ملاحظہ ہو:

۱۔ نزهة الخواطر (بالاعلام بما في الهند من الاعلام) مولانا عبدالحئ حسنی (حیدر آباد: رائے بریلی) جلد ۸ ۲۔ حالات مشائخ کاندھلہ۔مولانا احتشام الحسن کاندھلوی ۳۔ مضمون راقم سطور مشمولہ ضمیمہ امداد المشتاق مولانا تھانوی (دہلی: ۱۹۸۱ء)

(۳) اسپرنگر نے مولانا کے مشورہ کے مطابق کشاف اصطلاحات الفنون کے نسخہ مصنف کی نقل کرائی تھی جو مطبوعہ نسخہ کی اساس ہے۔یہ نقل مولوی کریم الدین پانی پتی نے کی تھی۔

مکتوب دوم

غریب پرور سلامت!

پروانہ حضور کا پہنچا سر بلند کیا۔ مضمون اس کا مولوی محمد مظہر (۱) کو لکھ بھیجوں گا، خط مولوی صاحب موصوف کا لکھا ہوا، ۲۶ رشوال کا آیا تھا، لکھا تھا کہ بہ سبب کثرت بارش کے چلنا قافلہ کا نہیں ہوسکتا، شاید ۱۵ ر ذی قعدہ تک چلنا ہو، اغلب ہے کہ اب وہ قافلہ (۲) چل لیا ہوگا، لیکن اور خط نہیں آیا۔ لکھا تھا کہ بسبب گراں فروشی اور بے پروائی تاجر کے اور نیز بسبب دور ہونے مکان کے میں خریدنے میں کتب کے انتظار جواب کا نہ کرسکا اور میں اول دہلی میں اور بعد ازاں وطن میں اور بعد اس کے بنارس (۳) میں پہنچوں گا۔ خلاصہ مضمون خط کا یہ تھا، لیکن وہ خط ان کے والد (۴) کے پاس بھیج دیا، اس سبب بعینہٖ نقل اس کی نہیں لکھی۔ (۵)

---

(۱) مولانا محمد مظہر: خلف لطف علی بن محمد حسن نانوتوی۔ مولانا مملوک العلی کے چچازاد بھائی کے بیٹے تھے، ۱۲۳۷ھ (۲۲-۱۸۲۱ء) میں ولادت ہوئی، محمد مظہر تاریخی نام ہے۔ مولانا مملوک العلی اور حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری سے تعلیم حاصل کی، چند کتابوں میں مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ہم سبق رہے، مولانا عبدالغنی مجددی سے حدیث پڑھی۔ تعلیم کے بعد بنارس کے سرکاری اسکول میں مدرس ہوئے، متعدد علمی کام اور مدرسہ مظاہر علوم دینی یادگار ہے۔ ۲۴ ر ذی الحجہ ۱۳۰۲ھ اکتوبر ۱۸۸۵ء میں وفات ہوئی۔

(۲) قافلہ سے مراد حاجیوں کا قافلہ ہے۔ مولانا محمد مظہر ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۷ء کے اواخر میں رخصت لیکر حج کیلئے گئے تھے، یہ مولانا کا پہلا سفر حج تھا جس کا مولانا پر لکھی گئی تحریروں اور مضامین میں ذکر نہیں ملتا۔

(۳) مولانا بنارس کالج میں مدرس تھے رخصت لیکر حج کے لئے گئے تھے، رخصت ختم ہونے کا وقت آرہا تھا اس لئے مولانا سفر حج سے واپسی پر پہلے بنارس جانا چاہتے تھے تاکہ ملازمت پر اپنی حاضری درج کرادیں۔

(۴) شیخ لطف علی بن محمد حسن صدیقی نانوتوی، نانوتہ کے تین برگزیدہ علماء (مولانا محمد مظہر، مولانا محمد احسن اور مولانا محمد منیر) کے والد ماجد تھے، افسوس ان کے حالات معلوم نہیں۔ ۱۲۷۹ھ میں نانوتہ کے ایک بڑے قافلہ کے ہمراہ حج کے لئے گئے، ۱۶ ر ربیع الاول ۱۲۸۰ھ (یکم ستمبر ۱۸۶۳ء) کو سفر حج سے واپس آتے ہوئے وفات ہوئی۔ مکتوب حضرت مولانا گنگوہی بنام حافظ اللہ دیا کاندھلوی۔ شمولہ تبرکات، مرتبہ نورالحسن راشد کاندھلوی ص:۲۹ (کاندھلہ: ۱۳۹۵ھ)

(۵) پیش نظر ماخذ، ایک نادر مجموعہ مکاتیب (ص:۵۸) میں یہ لفظ اسی طرح لکھا ہوا ہے، بہ ظاہر یہ ''اس سے'' ہوگا، یعنی اس سے پہلے جو...... اور ممکن ہے کہ اسے ہی ہو، اسے یعنی مولانا محمد مظہر کو۔؟

پہلے اسے جو حضور نے واسطے طلب ''بخاری شریف'' اور ''جامع ترمذی'' کے حکم بھیجا تھا، احقر نے ''جامع ترمذی'' ٹیلر صاحب (۱) کی خدمت میں بھیجی تھی اور واسطے نہ دینے ''بخاری شریف'' کے یہ عذر کیا تھا کہ اگر کوئی لکھنؤ میں اسکی نقل چھاپے تو ہمارا نقصان متصور ہے، جب صاحب بہادر نے فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب بہادر اقرار کرتے ہیں کہ ہم وہ کتاب کسی کو نہ دیں گے تو پانچ سپارے ''بخاری شریف'' کے جس قدر چھپے تھے، (۲) صاحب بہادر کی خدمت میں آپ پہنچائے تھے اور اپنا عذر بھی عرض کیا تھا، سوانھوں نے آپکو لکھا ہوگا۔

ترمذی انشاءاللہ تین مہینے میں یا کچھ زیادہ میں تمام ہوگی، دو ورق روز چھپتے ہیں (۳) اور چھپنا بخاری شریف کا ابھی ملتوی ہے، بعد تمامی اس کتاب کے شروع ہوگا، جب حضور تشریف لاویں گے، ملاحظہ سے گزرے گا۔

احقر کو ہر وقت خیال عنایت اور اخلاقِ حضور کا رہتا ہے اور زبان پر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جلد تر ملاقات نصیب فرماوے، واجب تھا عرض کیا۔ فقط

مملوک العلی

مدرس اول ۱۹ر اکتوبر ۱۸۴۸ء (۱۳رذی الحجہ ۱۲۶۴ھ)

---

(۱) ایچ۔ جے۔ ٹیلر (H.J.Taylor) دہلی تعلیمی کمیٹی کے سکریٹری تھے۔ ٹیلر کی رپورٹ اور فرمائش پر دہلی کالج کا قیام عمل میں آیا تھا، ٹیلر دہلی کالج کے پہلے عارضی پرنسپل مقرر کئے گئے بعد میں بھی پرنسپل رہے اور انگریزی شعبہ کے صدر آخری دن تک تھے۔ ۱۸۵۷ء میں آزادی کی تحریک کے دوران دیہاتیوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ مرحوم دہلی کالج ص: ۱۴۶-۱۴۹۔

(۲) بخاری شریف، حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری نے صحیح بخاری شریف پر جو گراں بہا حاشیہ لکھا تھا اس کا اور اس کی طباعت کا ذکر ہے۔ اس نسخہ کی سرسید احمد کے بھائی سید محمد کے مطبع سید الاخبار دہلی میں، جمادی الاول ۱۲۶۴ھ (مئی ۱۸۴۸ء) میں طباعت شروع ہوئی جو بعد میں مولانا احمد علی کے مطبع احمدی میں منتقل ہوگئی تھی، دونوں جلدیں اسی پریس سے چھپیں۔ ۱۲۷۰ھ، ۱۸۵۴ء میں جلد ثانی کی طباعت مکمل ہوئی۔ ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے۔

(۳) ترمذی کی اس طباعت کا ذکر ہے، جو مولانا احمد علی کی تصحیح وحواشی اور مولانا مملوک العلی کی تصحیح ونظر ثانی کے بعد ۱۲۶۶ھ (۱۸۵۰ء) میں مطبع العلوم دہلی کالج اور مطبع احمدی دہلی سے شائع ہوئی تھی اور جو مولانا مملوک العلی کے علمی باقیات میں ممتاز ترین یادگار ہے، تعارف مولانا کی تصنیفات میں گذر گیا۔

مکتوب سوم

غریب پرور

پروانہ حضور کا پہنچا معزز اور سر بلند کیا۔ مکان مولد شریف (۱) کا جو احقر نے بچشم خود دیکھا ہے۔ بموجب اپنی یاد کے حقیقت اس کی عرض کرتا ہوں، کہ وہ مکان جانب شرقی میں بلدہ طیبہ مکہ کے واقع ہے۔ بالفعل وہاں کچھ آثار پہاڑ کے نہیں، ایک کوچہ میں داہنی طرف دروازہ مکان کا ہے، زمین کوچہ کی بلند ہے اور مکان نشیب میں ہے، کئی سیڑھی اتر کر مکان میں داخل ہوتے ہیں، اس میں ایک حجرہ ہے، اس کا دروازہ بہت بڑا ہے، اس کے اندر بوریوں اور غالیچوں کا فرش ہے، اس کی زیارت کرتے ہیں اور وہاں نماز پڑھتے ہیں اور دعاء مانگتے ہیں، اور ایسا ہی مولوی احمد علی صاحب (۲) کو یاد ہے۔

---

(۱) مولد النبی صلی اللہ علیہ وسلم: یہ رشکِ کائنات مبارک واقدس مکان سوق اللیل میں واقع ہے، جو شعب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا ایک حصہ ہے، اسی محلہ میں بنو ہاشم رہتے تھے۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مکان عقیل ابن ابی طالب کو ہبہ کر دیا تھا۔ مولانا مملوک العلی ۱۲۵۹ھ (۴۴-۱۸۴۳ء) میں ایام حج کے قریب مکہ مکرمہ پہنچے تھے اور رجب ۱۲۶۰ھ (اگست ۱۸۴۴ء) میں دہلی واپس آ گئے تھے، اس لئے قرین قیاس ہے کہ مولانا کے یہ مشاہدات ۱۲۶۰ھ کے ابتدائی مہینوں (جنوری مارچ ۱۸۴۴ء) کے ہوں گے، اس وقت سے تقریباً ۱۳۵۰ھ (۱۹۳۰ء) تک یہ مبارک وبابرکت گھر اسی طرح تھا، جس کی مولانا مملوک العلی نے ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۴ء) میں زیارت کی تھی۔ محمد لبیب البتنونی نے اس مکان کا جو آنکھوں دیکھا تعارف لکھا ہے وہ مولانا مملوک العلی کی اطلاع کے قریب قریب ہے۔ جب اس کی مولانا مملوک العلی اور مؤلف الرحلۃ الحجازیہ نے زیارت کی اس وقت یہ مکان سڑک سے تقریباً ڈیڑھ میٹر نیچا تھا، سیڑھیوں سے اتر کر اندر حاضری ہوتی تھی۔ ملاحظہ ہو: الرحلۃ الحجازیہ ص:۵۲ (مصر:۱۳۲۹ھ) مولد مقدس، یہی ہیئت اور کیفیت ابراہیم رفعت پاشا نے (مراۃ الحرمین: ج۱ص:۱۸۶) میں لکھی ہے۔ مگر اب نہ وہ قدیم عمارت موجود ہے نہ اس کے آثار ونشانات محفوظ، آج کل یہاں مکتبہ مکہ مکرمہ اور وزارت الحج والاوقاف کی عمارات ہیں۔

(۲) حضرت مولانا احمد علی: خلف شیخ لطف اللہ انصاری، سہارنپوری۔ تقریباً ۱۲۲۵ھ، ۱۸۱۰ء میں ولادت ہوئی، متعدد علماء سے تعلیم حاصل کی۔ شاہ محمد اسحاق اور مولانا وجیہ الدین سہارنپوری سے اجازت حدیث حاصل کی۔ تمام عمر خدمت درس حدیث کی مشغولی میں بسر فرمائی۔ ۶ر جمادی الاول ۱۲۹۷ھ ۱۷ر اپریل ۱۸۸۰ء شنبہ میں سہارنپور میں وفات پائی۔ مولانا احمد علی کا برصغیر کے ممتاز ترین خادمانِ حدیث وسنت میں بہت اونچا مقام ہے، مولانا نہ صرف برصغیر بلکہ عالم اسلام کے وہ سب سے پہلے عالم ہیں ......باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر......

لیکن شعب ابو طالب کا احقر کو حال معلوم نہیں اور نہ کوئی جا وہاں بالفعل اس نام سے مشہور ہے، اور جو تاریخ کی کتابوں میں ہے، آپ کو خوب معلوم ہے (۱)۔

احقر خدا تعالیٰ کی جانب سے صحیح و سالم و تندرست ہے۔ اکثر اوقات تذکار عنایتوں حضور کا بزبان رہتا ہے۔ واجب تھا عرض کیا۔ فقط

عرضی ۲۶/ (مہینہ درج نہیں) ۱۸۴۹ء (۶۶-۱۲۶۵ھ)

مملوک العلی مدرس اول

اس صفحہ کے اوپر مولانا مملوک العلی نے اپنے ہاتھ سے مندرجہ ذیل نقشہ بنایا ہے اور اس میں جو عبارتیں ہیں وہ بھی مولانا مملوک العلی کے قلم کی لکھی ہوئی ہیں۔
(سمتوں کی وضاحت نور الحسن راشد نے کی ہے۔)

نقشہ مبارکہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے

گذشتہ صفحہ کا بقیہ........... جنھوں نے حدیث کی کتابوں کی سخت محنت، دقت نظر اور محققانہ ژرف نگاہی سے تصحیح کر کے ان کے چھپوانے پر توجہ فرمائی، مولانا کی خدمات ایک بڑی کتاب کا موضوع ہیں۔ مختصر تعارف کیلئے ملاحظہ ہو: ۱۔ تذکرہ مولانا احمد علی محدث سہارنپوری مرتبہ جناب سید محبوب رضوی صاحب دیوبند ۲۔ مضمون راقم سطور نور الحسن راشد شامل ضمیمہ امداد المشتاق ۳۵۲-۳۶۵۔ دہلی ۱۹۸۱ء

(۱) اسپرنگر اس وقت سیرت پر ایک کتاب لکھ رہا تھا جو ۱۸۵۱ء میں الہ آباد سے شائع ہوئی اور متنازعہ ثابت ہوئی، اسپرنگر کو اس کتاب کیلئے ان معلومات کی ضرورت تھی۔

			مغرب		
	حجرہ اندرونی	حجرہ بیرونی	دروازہ مکان	کوچہ	
شمال	حجرہ اندرونی جس میں آکر لوگ نماز پڑھا کرتے ہیں		یہاں دیوار میں ایک جالی لگی ہے، باہر سے اندر مکان کے نظر جاسکتی ہے	اس طرف اہل کوچہ کے مکان ہیں	جنوب
			مشرق		

اس کاغذ کی دوسری جانب یہ عبارت ہے۔

''عرضی مملوک العلی مدرس اول ، یہ عرضی بہ خدمت صاحب بہادر والا مناقب ڈاکٹر الوس اسپرنگر صاحب بہادر اقبالہ گزارنیں''

مکتوب چہارم

غریب پرور!

عنایت نامہ حضور کا بیچ خط مولوی علی اکبر کے پہنچا، باعث سرفرازی اور سربلندی کا ہوا۔ نواب بڑھے صاحب سے بیچ مقدمہ خرید کتب معرفت احمد علی کتاب فروش کے میں نے کہلا بھیجا ہے اور فہرست کتابوں کی طلب کی ہے، جب فہرست آوے گی اور قیمتیں معین ہوں گی، ان کے حال سے حضور کو مطلع کروں گا۔

ان دنوں دہلی میں گرمی بشدت ہے اور مہینہ رمضان کا شروع ہوا ہے، روزہ داروں کو چلنا پھرنا اور بات چیت کرنا دشوار ہے، اس جہت سے جواب اب تلک حاصل نہیں ہوا، اور

تاریخ حلبی (۱) بموجب ارشاد کے ہمراہ احقر کے ہوگی۔

وہ جو بیچ خط مولوی اکبر احقر کے حق میں ارشاد ہے کہ ہم کو اختیار تھا کہ تم کو جلد تر کلکتہ کو روانہ کریں، ہماری رائے میں دیر مناسب ہے۔ سو رائے احقر کی حضور کے مطابق ہے، اگر چلنا احقر کا بمعیت حضور کے ہو یا بعد تشریف فرمائی حضور کی روانگی احقر کی صورت پکڑے تو مناسب تر ہے، بالجملہ پہنچنا احقر کا وقت تشریف رکھنے حضور کے کلکتہ میں احقر کی دانست میں بہت اچھا ہے۔ (۲)

پہلے حضور نے ٹیلر صاحب بہادر کی چٹھی میں لکھا تھا کہ ہم نے تیری طرف سے درخواست لکھ بھیجی ہے، اب مشہور ہے کہ وہ درخواست منظور ہوئی اور قرائن کلام حضور کے بھی اس مطلب پر دال ہیں، لیکن اگر حضور صاف صاف حال منظوری یا عدم منظوری احقر کا لکھ بھیجیں، تا بموجب اسکے فکر سفر کا یا حضر کا کروں، یا جو کچھ اس باب میں حکم ہوا ہو اس سے مجھے اطلاع ہو تا کہ اگر چہ عرض معروض مناسب ہو تو عمل میں آوے، غرض اس عرض سے یہ ہے کہ اس عرضی کے جواب حالی میں مفصل تحریر فرماویں۔

اور جب حضور دہلی تشریف لاویں گے سب حال اپنا عرض کروں گا، اور حسب ارشاد حضور کے چلنے کی صورت بندھے گی۔ زیادہ بجز اشتیاق ملاقات کے کیا عرض کرے۔ فقط!

مکرر عرض یہ ہے کہ مولوی محمد مظہر (۳) بامید پرورش حضور کی دہلی میں موجود ہیں، اگر حضور کو ان کا خیال رہے گا تو بندہ نوازی اور پرورده داری سے بعید نہ ہوگا۔ زیادہ لکھنے کی حاجت نہیں کہ: ''خواجہ خود روش بندہ پروری دارد'' فقط

مملوک العلی مدرس اول، ۱۶ر جولائی ۱۸۵۰ء (۶ر رمضان ۱۲۶۶ھ)

---

(۱) تاریخ حلبی، صحیح سیرت حلبی۔ انسان العیون فی سیرۃ النبی الامین المامون تالیف شیخ نورالدین علی بن ابراہیم بن احمد حلبی (ولادت ۹۷۵ھ، ۱۵۶۷ء، وفات ۱۰۴۴ھ ۱۶۳۵ء) جو حلبیہ کے نام سے مشہور ہے اور سیرت کی اہم کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ الاعلام زرکلی ص: ۲۵۱ ج: ۴ طبع رابع بیروت (۱۹۷۹ء) سیرت حلبیہ کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

(۲) کلکتہ میں مولانا مملوک العلی کی ملازمت کی بات چلی تھی، اسپرنگر چاہتے تھے کہ مولانا جلد سے جلد کلکتہ پہنچیں، مگر یہ منصوبہ پورا نہیں ہو سکا تھا، اس لئے مولانا کلکتہ نہیں گئے۔

(۳) مولانا محمد مظہر (نانوتوی) کا تعارف گذر گیا ہے۔

مکتوب پنجم

غریب پرور!

عنایت نامہ حضور کا دستخطی معہ چٹھی اسمی مواٹ صاحب (۱) بہادر سکریٹری کونسل مدارس کی معرفت ٹیلر صاحب بہادر کے بیسویں جولائی کو احقر کے پاس پہنچا، معزز اور ممتاز کیا۔ حضور نے ارشاد فرمایا کہ اگر آپکی رائے میری رائے کے موافق ہو تو اپنی درخواست معہ میری چٹھی جلد نہ بھیجیں، سو یہ تاخیر احقر کے نزدیک بہت مناسب ہے، بعد حصول جواب اس عرضی کے عشرہ اخیر اگست تلک اگر خدا نے چاہا درخواست اپنی معہ حضور کی چٹھی کے بھیجوں گا۔

اور وہ بیچ باب پہنچے احقر کے اواخر اکتوبر کے اور بھیجنا اپنا اوسط نومبر میں ارقام ہوا ہے، احقر کے عندیہ میں بھیجنا احقر کا کلکتہ میں پہنچ لئے حضور کے مناسب تر ہے، آئندہ جو حکم ہوگا عمل میں آوے گا۔

احقر سب طرف سے بخیال معیت حضور کی خوش وخرم ہے، لیکن ایک امر موجب خلجان طبعیت کا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی کو اپنے مزاج کا حال بیچ زبان آئندہ کے معلوم نہیں ہوتا، تو خوف اس امر کا ہے کہ مبادا بعد بھیجنے کلکتہ کے بسبب عدم موافقت آب وہوا کے یا کسی اور امر کے احقر کو وہاں کا روزگار چھوڑنا پڑے اور اس صورت میں روزگار مدرسہ دہلی کا کہ احقر کے واسطے بمنزلہ وطن ہو رہا ہے مفت ہاتھ سے جاتا رہے، تو واسطے رفع اس خوب کے اور حصول اپنے اطمینان حضور کی عنایت اور مہربانی سے امید رکھتا ہوں کہ حضور سعی اور کوشش فرماویں کہ گورنمنٹ سے احقر کے لئے حکم ہو جائے کہ مجھے اختیار رہے، دو برس تک اگر چاہوں تو پھر اپنے عہدہ پر دہلی کے مدرسہ میں آجاؤں۔

اور چونکہ احقر نے چھبیس برس (۲) مدرسہ دہلی میں طلبا کی خدمت کی ہے اور اگر

---

(۱) مواٹ صاحب، فریڈرک جان مواٹ (John Mouat) ۱۸۱۶ء میں پیدا ہوا، ہندوستان کے مختلف طبی اور فوجی عہدوں پر کام کرتا رہا، بنگال کی کونسل برائے تعلیم کا ممبر تھا۔ اس نے ہندوستان کی جدید تعلیم گاہوں کی ابتداء اور ترقی پر ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص:۷۲

(۲) دہلی کالج کی ابتداء جون ۱۸۲۵ء (شوال ۱۲۴۰ھ) میں ہوئی، ......باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر......

مدرسوں میں پنشن کا دستور ہوتا تو استحقاق پنشن کا حاصل کیا ہے تو احقر کے حق میں بجائے پنشن کے ہونا اس حکم کا اس مدت میں جب چاہوں اپنے عہدہ پر آ جاؤں، بعید دور شناسی سے نہیں، اور بدون مدت دو برس کے حال موافقت آب و ہوا کا معلوم ہونا دشوار ہے۔ اس لئے کہ بدون رہنے ایک برس کے جو چار موسموں پر مشتمل ہے اور ہر موسم کی ہوا کا مزاج جدا ہے، موافقت آب و ہوا کی مزاج سے معلوم نہیں ہوسکتی اور پانچ چھ مہینے آنے جانے میں اور ایک دو مہینہ سامان سفر وغیرہ میں صرف ہوتا ہے تو اس لئے بدون اجازت مدت دو برس اطمینان طبع حاصل اور بدون سعی اور سفارش حضور کی، اس مدت کی اجازت احقر کو میسر نہیں ہوسکتی، احقر امیدوار جواب اس عرضی کا ہے۔

منشی اشرف علی صاحب (۱) سے حال نقل کروانے کتاب الاغانی (۲) کا پوچھا گیا انھوں نے کہا تھوڑی سی باقی رہ گئی ہے چند روز میں تمام ہو جائے گی، اور الفاظ الادویہ (۳) کے مقدمہ میں یہ معلوم ہوا کہ سید محمود صاحب (۴) نے بشرکت کسی اور صاحب کے

گذشتہ صفحہ کا بقیہ...... اس وقت مولانا مملوک العلی یہاں مدرس دوم مقرر کئے گئے تھے، بعد میں مدرس اول ہو گئے اور عملاً سربراہ بھی وہی تھے۔ وفات (۱۱رذی الحجہ ۱۲۶۷ھ اکتوبر ۱۸۵۱ء) تک اسی عہدہ پر کام کرتے رہے، مولانا کی کل مدت ملازمت چھبیس سال ہے۔

(۱) سید اشرف علی واسطی: غالباً ۱۷۹۰ء (۵-۱۲۰۴ھ) کے قریب پیدا ہوئے، تعلیمی حالات اور ذاتی کوائف دستیاب نہیں۔ اشرف علی کا دہلی میں پریس تھا بعد میں یہ مطبع دہلی کالج میں منتقل ہو گیا تھا اور اسکا نام مطبع العلوم ہو گیا تھا۔ اس پریس میں مولانا مملوک العلی اور مولانا سبحان بخش شکار پوری کا بھی حصہ اور شرکت تھی، اشرف علی کے مزید حالات نہیں ملتے۔ ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص:۱۸۳ تا ص:۱۹۸۔

(۲) اسپرنگر کو کتاب الآغانی (ابوالفرج اصبہانی) کا ایک نسخہ ملا تھا، وہ اس کی نقل کرانا چاہتا تھا، اس نے یہ کام اشرف علی کے سپرد کیا تھا، اشرف علی نے یہ نسخہ (خانوادہ شیخ عبدالحق کے آخری دور کے ایک عالم) مولانا سالم کے فرزند عبدالرزاق سے نقل کرایا، شوال ۱۲۶۶ھ (اگست، ستمبر ۱۸۵۰ء) میں یہ نقل مکمل ہو گئی تھی، اب یہ کتاب اسپرنگر کے ذخیرہ (برلن، جرمنی) میں محفوظ ہے۔ نادر مجموعہ مکاتیب ص:۷۲، ۷۳۔

(۳) الفاظ الادویہ، نورالدین محمد قرشی شیرازی کی معروف کتاب ہے۔ (مؤلفہ ۱۰۳۸ھ) یہ کتاب مطبع العلوم، دہلی سے ۱۲۶۵ھ (۱۸۴۹ء) میں چھپی تھی، اسپرنگر کو اسی نسخہ کی ضرورت تھی۔

(۴) مطبوعہ نسخہ میں اسی طرح لکھا ہوا ہے، ممکن ہے سید محمد صحیح ہو جو سر سید احمد کے چھوٹے بھائی تھے، انکی ذی الحجہ ۱۲۶۱ھ دسمبر ۱۸۴۵ء میں وفات ہوئی، تاریخ صحافت اردو، امداد صابری ص:۲۲۵ جلد اول (دہلی: ۱۹۶۷ء)

چھپوائی تھی اور سب کی سب حاجی رستم علی سوداگر کے ہاتھ بیچ دی تھی، لیکن بازار میں تلاش سے مل سکتی ہے، انشاء اللہ ایک نسخہ حضور کے واسطے خرید کر کے اور جلد بنوا کر ہمراہ رکھوں گا، اور ہمراہ لے جانا صندوق کتابوں کا الٰہ آباد تک جہاں تلک بنے گا، حسب الحکم عمل میں آوے گا، اطلاعاً عرض کیا۔ فقط

مملوک العلی مدرس اول

۲۲ر جولائی ۱۸۵۰ء (۱۲ر رمضان ۱۲۶۶ھ)

مکتوب ششم

غریب پرور سلامت!

ارشادات حضور کے زبانی ٹیلر صاحب بہادر کے احقر نے سنے، حسب موقع اور بجا ہیں حسب الارشاد عرضی درخواست رخصت کی بنام تھارن ٹن صاحب (۱) بہادر کے ملفوف ہے۔ اگر چہ کچھ عبارت کی کمی بیشی منظور ہو تو اصلاح فرما کے مولوی علی اکبر سے اور عرضی لکھوایئے۔

اور احقر نے بلحاظ اس امر کے کہ شاید بسبب طویل مدت کے رخصت منظور نہ ہو ایک ہی سال کی رخصتی کی درخواست لکھی ہے، لیکن بدون ایک سال کی رخصت حال آب وہوا کا معلوم نہیں ہو سکتا، امیدوار ہوں کہ جب حضور نے میری پرورش کے لئے اپنے اوپر بوجھ سفارش کا اٹھایا تو واسطے رخصت ایک سال کے سفارش کیجئے، یعنی میری درخواست اس عرضی کے بموجب منظور کروا دیجئے۔

شاید حضور کو گمان ہوا کہ احقر نے درخواست رخصت کی واسطے عذر کے کی ہے۔ اس میں، میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اگر احقر کو عذر منظور ہوتا تو عذر اور بہت تھے، اگر آپ

(۱) اس وقت تھارن ٹن نام کے کئی شخص تھے، اس لئے صحیح اندازہ نہیں کہ یہ کون سا تھارن ٹن ہے۔ غالباً یہ ایڈورڈ تھارن ٹن (Edward Thorienton) ہوگا جو ۱۷۹۹ء میں پیدا ہوا، ۱۸۷۵ء میں فوت ہو گیا، اس نے ہندوستان کی تاریخ لکھی اور کئی گزیٹر بھی مرتب کئے۔ ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص: ۷۶۔

انصاف سے نظر فرماویں گے تو احقر کو اس امر میں معذور جانیں گے، مجھ جیسے کو اگر روزگار مدرسہ چھوٹ جائے تو ویسا روزگار کہاں میسر ہوسکتا ہے۔ اس جہت سے یہی چاہتا ہوں کہ درصورت جانے کلکتہ کے اطمینان طبع حاصل رہے۔ واجب تھا عرض کیا۔ احقر کو آج ہی ارشاد حضور کا پہنچا، آج ہی عرضی لکھ کر واسطے جلدی کے معرفت ٹیلر صاحب بہادر کے روانہ کی ہے۔ واجب تھا عرض کیا۔ فقط

مملوک العلی

مدرس اول پنجم ستمبر ۱۸۵۰ء (۲۷ رشوال ۱۲۶۶ھ)

مکتوب ہفتم

غریب پرور سلامت!

بسبب خالی ہونے عہدہ امینی مدرسہ کلکتہ کے ڈاکٹر اسپرنگر صاحب بہادر سے احقر زبانی درخواست اس عہدہ کی کی تھی، اور مرکوز اس احقر کو یہ تھا کہ بروقت منظوری درخواست کی مدرسہ دہلی سے رخصت حاصل کر کے کلکتہ کو روانہ ہوں گا۔ اب جو صاحب بہادر نے بیچ مقدمہ تقرر احقر کے اس عہدہ پر ڈاکٹر مواٹ صاحب بہادر کی خدمت میں سفارش کی اور واسطے بھیجنے درخواست کے احقر کو لکھا تو احقر نے واسطے حصول رخصت کے معرفت ٹیلر صاحب بہادر قائم مقام پرنسپل مدرسہ دہلی میں گذارنی، صاحبان کمیٹی نے اس درخواست کو نامنظور کیا۔

اور احقر کو باعث حاصل کرنے رخصت کا مدرسہ دہلی سے یہ ہے کہ آدمی کو حال آئندہ کا معلوم نہیں، اگر بعد پہنچنے کلکتہ کے آب وہوا اس شہر کی میرے مزاج سے مخالف ہو اور کوئی سبب باعث پڑے کہ مجھے ترک روزگار کا منظور ہو، تو اس صورت میں میں بالکل روزگار سے محروم نہ ہو جاؤں، اس لئے آپ کی عنایت اور مہربانی سے کہ اوپر سب لکھنے پڑھنے والوں کے مبذول رہتی ہے، امیدوار ہوں کہ آپ میری سفارش کو گورنمنٹ سے کر کے اجازت اس امر کی حاصل کروادیں کہ مجھے بعد پہنچنے کلکتہ میں ایک برس تک اختیار

رہے، اگر کسی سبب سے چاہوں پھر اپنے عہدہ پر آؤں، واجب تھا عرض کیا۔ الٰہی گلشن اقبال کا سرسبز رہے۔

مملوک العلی

مدرس اول، پنجم تمبر ۱۸۵۰ء (۲۷رشوال ۱۲۶۶ھ)

مکتوب ہشتم

غریب پرور سلامت!

حسب ایماء حضور کے کہ جو مولوی علی اکبر کے خط سے معلوم ہوتی تھی عرضی بابت رخصت کے معرفت ٹیلر صاحب بہادر کے دی تھی اور صاحب بہادر نے بسبب عرض اور معروض احقر کے سفارش بھی کی اور کچھ دلیلیں بھی لکھیں، لیکن بہت افسوس ہے کہ وہ درخواست منظور نہ ہوئی اور صاحب بہادر کو بھی اس امر کا افسوس ہوا۔ لہٰذا اب اہل رائے اور جمیع دوستوں کی عقل میں اس صورت میں کہ رخصت ایک سال کی بھی نہ ہو چھوڑنا روزگار مدرسہ دہلی کا واسطے درخواست عہدہ کلکتہ کے مناسب نہیں، اور اغلب ہے کہ آپ کی رائے بھی ان سب کی رائے کے موافق ہوگی اور احقر کو بیچ نہ بھیجنے درخواست کے معاف اور معذور تصور فرماویں گے اور آپ نے اپنے عنایت نامہ میں ارقام فرمایا کہ مجھے اس امر میں سفارش کرنے کا اختیار نہیں ورنہ پھر احقر مکلف اس امر کا ہوتا کہ واسطے ایک ہی برس کے حضور سفارش فرمادیں، لیکن اب حسرت اور افسوس سے کیا عرض کرے، واجب تھا عرض کیا۔

مملوک العلی

مدرس اول ۱۹راگست ۱۸۵۰ء (۱۰رشوال ۱۲۶۶ھ)

ایک وضاحت اس خط کی تاریخ تحریر محمد اکرام چغتائی صاحب نے ۱۹راگست ۱۸۵۰ء (۱۰رشوال ۱۲۶۶ھ) لکھی ہے، اگر اصل تحریر میں بھی اسی

طرح ہے تو وہ حضرت مولانا کی سبقت قلم ہے، ممکن ہے نقل یا طباعت میں سہو ہوا ہو، بہر حال اس خط اور گذشتہ خطوط کے اندراجات کی روشنی میں یہ تاریخ تحریر صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ مولانا ۵؍ستمبر ۱۸۵۰ء کے خط میں اسپرنگر سے سفارش کیلئے کہہ رہے ہیں اور اسی تاریخ میں مواٹ کو ملازمت کیلئے خط لکھ رہے ہیں۔ اسلئے قیاس چاہتا ہے کہ یہ خط سلسلۂ ملازمت کا آخری خط ہے اور یہ خط غالباً ۱۹؍اکتوبر کا لکھا ہوا ہے، اگست غلطی سے لکھا گیا ہے۔

مکتوب نہم

غریب پرور سلامت!

الطاف نامہ حضور کا پہنچا، سربلند کیا بموجب حکم کے تین نسخہ مؤطا شریف کے بنام قائم مقام ڈاکٹر مواٹ صاحب کے بدستخط پرنسپل بہادر کے، جو بلحاظ تحریر حضور کے انہوں نے کر دیئے، کل کی تاریخ میں روانہ کئے۔ یہ عرضی اس نظر سے کہ حضور ان سے ارشاد کر کے دو نسخہ واسطے مدرسہ کے خرید کریں اور ایک نسخہ بطور ہدیہ کے اپنی خدمت میں رکھیں پہلے لکھ بھیجی۔

مولوی سدید الدین خاں قریب الہ آباد کے پہنچے، خط ان کا آیا تھا بسبب مخالفت ہوا کے بجرہ سواری (۱) کا کم کم چلتا ہے، احقر امیدوار ہے کہ گاہ بگاہ تلطف نامہ سے مع کاروبار لائق اپنے کے سربلند اور سرفراز ہوتا رہے۔ واجب تھا عرض کیا۔ فقط

مملوک العلی مدرس اول مدرسہ دہلی

اسپرنگر کے نام مولانا کے مذکورہ بالا خطوط کی اشاعت کے بعد مولانا کا اسپرنگر کے نام ایک خط اور ملا ہے، جس کی جناب محمد اکرام چغتائی صاحب نے راقم کو خط سے اطلاع دی ہے، مگر وہ خط ابھی تک شائع نہیں ہوا، اس لئے یہاں درج نہیں، امید ہے کہ دوسری طباعت میں شامل ہوگا۔

---

(۱) متوسط درجہ کی گول اور خوشنما کشتی جس میں امیر لوگ بیٹھ کر دریا کی سیر کرتے ہیں۔ فرہنگ آصفیہ۔ مولوی سید احمد دہلوی ص: ۳۶۸ (دہلی: ۱۹۷۴ء)

باب (۱۶)

مولانا مملوک العلی کی تصدیق سے مزین چند اہم فتاویٰ اور علمی سوالات کے جوابات

حضرت مولانا مملوک العلی کی یہی ایک حیثیت نہیں تھی کہ وہ مدرسہ دہلی (دہلی کالج) کے مدرس اور نگرانِ اعلیٰ تھے، بلکہ مولانا کا دہلی کے مقتدر علماء اور غالباً ممتاز اصحابِ فقہ وفتاویٰ میں بھی شمار تھا۔ اس لئے جب دہلی میں اہم دینی علمی تحریریں مرتب ہوئیں یا ایسے فتوے لکھے جاتے جن میں دہلی اور اطراف کے ممتاز علماء کی تصدیق ضروری یا مفید سمجھی جاتی تھی، جن کے علم وفضل، تقویٰ دیانت اور انصاف پسندی پر عوام وخواص کو اعتماد تھا، تو دہلی کے نامور علماء میں سے ایک بڑا اور معتمد نام مولانا مملوک العلی کا شامل ہوتا تھا۔

اس دور میں خصوصاً تحریک سید احمد شہید اور اس کے بعد کی اصلاحی تبلیغی جدوجہد، اس کے اثرات اور اس کے متعلق دینی مباحث پر دہلی کے بڑے علماء کے متعدد فتاویٰ نکلے جس پر خانوادۂ ولی اللّٰہی اور اس خط کے اکابر علماء کے علاوہ مولانا مملوک العلی کے بھی دستخط ثبت ہیں، جس سے حضرت مولانا کے بلند علمی مقام کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ حضرت پر دہلی کے عوام کو کس قدر اعتماد تھا، نیز ان فتاویٰ پر مولانا کی تصدیقات سے متعلقہ مسائل پر مولانا مملوک العلی کی رائے کی ایک جھلک بھی سامنے آجاتی ہے۔

یہ تحریریں اور فتوے مختلف موضوعات پر ہیں، جن میں سے کچھ معاشرتی مسائل پر ایک دو عقائد وعبادات پر ہیں، اور ایک دو میں علمی بحثیں بھی ہیں۔ اس قسم کے چند فتووں اور تصدیقات کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

پہلا فتویٰ مغلوں کے دورِ زوال میں جو چند برائیاں معاشرہ میں عام ہوگئی تھیں ان میں سے ایک بُردَہ فروشی بھی تھی، کچھ لوگ لڑکیوں، عورتوں کی خرید وفروخت کا کام کرتے تھے، ایسی عورتیں گھروں کی خدمت اور کام کے نام پر قیمت ادا کر کے خرید لی جاتی تھیں اور خریدنے والے انکو شرعی غلام اور کنیز سمجھ کر گھروں میں رکھ لیتے تھے، یہ عورتیں گھروں کے تمام کام اور خدمات انجام دیتی تھیں اور کچھ شخص ان سے جسمانی تعلق بھی کر لیتے تھے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ برائی بہت بڑھ گئی تھی، اسلئے خاندان حضرت شاہ ولی اللہ سے وابستہ علماء نے معاشرہ کی اور برائیوں کے ساتھ اسکے خلاف بھی آواز اٹھائی اور اس موضوع پر فتوے مرتب کئے۔

منجملہ ایسے فتوٰوں کے ایک مفصل اور اہم فتویٰ وہ ہے جو مولانا وجیہ الدین محدث سہارنپوریؒ نے مرتب فرمایا تھا، یہ فتویٰ جب حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق نے ملاحظہ کیا تو اس کی تحسین فرمائی اور کہا کہ ''یہ فتویٰ میری رائے کے مطابق ہے'' نواب قطب الدین نے مولانا وجیہ الدین کے اس فتوے کا (اپنے دوست) مولانا سید نذیر حسین محدث (میاں صاحب) سے ذکر کیا، مولانا نذیر حسین صاحب نے کہا کہ اس موضوع پر شاہ محمد اسحاق صاحب کا بھی ایک (مختصر) فتویٰ ہے جو میرے پاس موجود ہے۔ یہ دونوں فتوے فارسی میں تھے، نواب قطب الدین نے ان دونوں کا اردو ترجمہ کر کے ان کو ''مظہر الحق'' کے نام سے مرتب کر کے شائع کرادیا تھا۔

مظہر الحق چھوٹے سائز (۱۲-۱۹ سنٹی میٹر) کے چھبیس صفحہ کا رسالہ ہے جس میں پہلے دو صفحات کی تمہید ہے، ص ۱۵ سے ص ۱۷ تک تقریباً ڈھائی صفحہ کا شاہ محمد اسحاق کا وہ فتویٰ ہے جو مولانا نذیر حسین صاحب کے پاس محفوظ تھا۔ ص ۱۷ سے ص ۲۶ تک مولانا وجیہ الدین کا فتویٰ درج ہے، اسی فتوی کے اختتام پر ص ۲۶ پر نواب قطب الدین، مولانا سید نذیر حسین وغیرہ دس علماء کی تصدیق درج ہے، جن میں سب سے پہلے نام اور تصدیق مولانا مملوک العلی کی ہے، جس پر مولانا مملوک العلی کی مہر بھی ثبت ہے: محمد مملوک العلی (۱)

(۱) رسالہ مظہر الحق سب سے پہلے مولانا وجیہ الدین سہارنپوری کے مطبع احمدی دہلی سے ربیع الاول ۱۲۶۰ھ (اپریل ۱۸۴۴ھ) میں چھپا تھا، اس نادر اشاعت کا ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

(۲) فتویٰ نکاحِ بیوگان

اس زمانہ کی بری رسموں میں سے ایک بہت بری رسم یہ تھی کہ بیواؤں کا دوسرا نکاح نہ کرتے تھے اور ان کے دوسرے نکاح کو سخت عیب سمجھا جاتا تھا، بات یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ اگر کوئی بیوہ دوسرا نکاح کر لیتی تھی تو پورا خاندان اور علاقہ اسکا مقاطعہ (Boycott) کر دیتا تھا اور جو شخص کسی بیوہ سے نکاح کر لیتا تھا اس کو بھی ہر طرح سے پریشان کیا جاتا تھا بلکہ اس کے قتل کر دینے کو بھی بُرا نہیں سمجھتے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ اور انکے صاحبزادگانِ والا شان حضرت شاہ عبد العزیز اور شاہ رفیع الدین رحمہما اللہ تعالیٰ اس بری رسم کو ختم کرنے کیلئے کوشش فرماتے رہے۔ اس کیلئے کئی تحریرات مرتب کیں اور فتاویٰ جاری فرمائے۔

اسی کوشش کو حضرت سید احمد شہید اور شاہ محمد اسماعیل نے تحریک بنادیا تھا۔ سید صاحب نے اعلان اور قوت کے ساتھ اس بری رسم کو توڑا، اپنے خاندان میں بیواؤں کے نکاح شروع کرائے۔ سید صاحب کے فیض صحبت۔ سے اور علماء بھی ادھر متوجہ ہوئے۔ متعدد علماء نے اس موضوع پر تحریرات اور فتوے تحریر فرمائے، جن میں چند فتاویٰ مشہور ہوئے اور اس جدوجہد کی کامیابی میں ان فتوؤں کا بڑا حصہ ہے۔ ایسے فتوؤں میں سے ایک مفصل فتویٰ وہ ہے جو دہلی میں حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری نے مرتب کیا تھا، یہ فتویٰ فارسی میں ہے۔ اس پر دہلی اور اطراف کے اکثر نامور علماء کے دستخط ہیں۔ سب سے پہلے دستخط مولانا مفتی صدر الدین آزردہ کے، دوسرے مولانا مملوک العلی صاحب کے ہیں۔

مشاہیر علماء میں سے مولانا نذیر حسین میاں صاحب، مولانا نواب قطب الدین دہلوی، مولانا سید محبوب علی جعفری، مولانا شاہ احمد سعید احمدی مجددی، مولانا سبحان بخش شکارپوری، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا سید محمد دہلوی (مدرس دوم، دہلی کالج) مولانا محمد حیات دہلوی، مولانا رحمت اللہ خاں دہلوی، مولانا سعادت علی سہارنپوری (بانی مظاہر علوم سہارنپور) اور مولانا ابوالحسن کاندھلوی (مؤلف گلزار ابراہیم وغیرہ) کے دستخط ہیں۔ (۱)

---

(۱) یہ مجموعہ فتاویٰ رسالہ نکاح ثانی کے نام سے مطبع مطبع الرحمٰن: دہلی سے ۱۲۶۸ھ (مارچ ۱۸۵۲ء) میں چھپا تھا جو پیش نظر ہے۔ اس طباعت سے پہلے سولہ صفحات میں شاہ عبد العزیز کا فتویٰ ہے، آخری بارہ صفحات میں مولانا احمد علی کا فتویٰ اور اس کی تصدیقات درج ہیں۔

(۳) فتویٰ نکاحِ بیوگان کا اردو ترجمہ

اس فتویٰ کا اردو ترجمہ نواب قطب الدین دہلوی نے اپنی تالیف عروس المومنین میں درج کیا ہے، اس پر بھی یہ سب دستخط ترتیب میں معمولی تبدیلی کے ساتھ درج ہیں۔(۱)

(۴) غیر اللہ کی خوشنودی کیلئے جانور ذبح کرنا

اس دور میں ایک بری رسم یہ بھی تھی کہ غیر اللہ کی عظمت واحترام میں یا اسکی خوشنودی کیلئے جانور ذبح کیا کرتے تھے جو قطعاً حرام ہے۔ خانوادۂ ولی اللہی کے علماء نے اس برائی کو ختم کرنے کیلئے بھی کوشش فرمائی، اس موضوع پر بھی کئی فتوے اور تحریریں مرتب ہوئیں۔ منجملہ ان کے ایک فتویٰ مولانا سید نذیر حسین (میاں صاحب) کا بھی ہے، اس فتوے پر بھی مولانا مملوک العلی کے تائیدی دستخط ہیں، یعنی اس مسئلہ میں بھی مولانا مملوک العلی فکر ولی اللہی کے ترجمان تھے۔ یہ فتویٰ فتاوی نذیریہ میں شامل ہے۔(۲)

(۵) شفاعت کی تحقیق

حضرت شاہ محمد اسماعیل کی تقویۃ الایمان پر منجملہ اور اعتراضات کے ایک اعتراض شفاعت کے انکار کا بھی تھا، متعدد علماء نے اس اعتراض کے جواب لکھے جن میں ایک جواب مولانا سید نذیر حسین کا ہے جو مولانا نذیر حسین نے ۱۲۶۶ھ (۵۰-۱۸۴۹ء) میں تحریر فرمایا تھا۔ مولانا محمد حسین فقیر بنتی دہلوی نے مولانا نذیر حسین کے اس فتویٰ کو "افضل البضاعة فی حقیقة الشفاعة" کے نام سے شائع کر دیا تھا۔ اس تالیف پر اس وقت کے متعدد علماء کی تصدیقات، دستخط یا مہریں ثبت ہیں، جن میں ایک مہر "مملوک العلی" مدرس اول مدرسہ شاہ

(۱) عروس المومنین مطبع دار السلام دہلی سے ۱۲۶۴ھ میں چھپی تھی اس میں ص:۲۱ سے ص:۵۲ تک مولانا احمد علی کے لکھے ہوئے فتوے کا ترجمہ اور تصدیقات شامل ہیں۔

(۲) فتاوی نذیریہ (مرتبہ مولانا شمس الحق ڈیانوی و مولانا عبد الرحمان مبارکپوری) ص:۴۱۶ جلد اول (طبع اول، دہلی۔ بلا سنہ)

جہاں آباد کی بھی ہے۔(۱)

(۶) ایک علمی نحوی صرفی بحث کی تحقیق

دہلی ہندوستان کا اہم ترین علمی مرکز تھا، دینی فقہی سوالات کے علاوہ خالص فنی تحقیقی مسائل اور درسی علمی کتابوں کی مشکلات کیلئے بھی دہلی کے علماء سے رجوع کیا جاتا تھا۔ دہلی کے علماء میں مولانا مفتی صدر الدین کی غیر معمولی شخصیت جملہ مباحث وعلوم میں مرجع اور سند کی حیثیت رکھتی تھی، مفتی صاحب کی خدمت میں علمی سوالات کا ڈھیر لگا رہتا تھا، مفتی صاحب انکے جوابات لکھتے اور جو اہم جوابات ہوتے ان پر اپنے اہم دوستوں سے (جو نامور علماء تھے) تائید وتصویب کیلئے دستخط کرا دیا کرتے تھے۔ مفتی صاحب کی خدمت میں آئے ایسے دو سوالات کے جوابات پر مشتمل ایک تحریر ہے جس پر مولانا مملوک العلی کے بھی دستخط ہیں۔

اس تحریر میں دو مباحث زیر گفتگو آئے ہیں، پہلا یہ کہ غیر منصرف کو ضرورتِ شعری کی وجہ سے منصرف بنالینا صحیح ہے یا نہیں؟ ایک طبقہ اس کو درست مانتا تھا دوسرا غلط سمجھتا تھا۔

دوسری بحث، علامہ بہاری کے قول رؤسا کے اعراب کی تحقیق پر ہے، اس میں بھی علماء اور اہل نظر کے دو قول تھے، سائل نے اس میں بھی فریقین کے دلائل کا خلاصہ نقل کیا ہے اور مفتی صاحب کا فیصلہ طلب کیا ہے، مفتی صدر الدین آزردہ نے دونوں کے فیصلہ کن جوابات لکھے ہیں اور دونوں کے آخر میں مولانا مملوک العلی کے دستخط بھی ثبت ہیں۔(۲)

فتاویٰ میں اور علماء کے فتاوی اور تحریرات سے قطع نظر حضرت مولانا کی خالی رائے بھی معتبر سمجھی جاتی تھی اور مسائل ومعاملات میں مولانا کی ذاتی رائے پر فیصلہ ہو جاتا تھا اور حضرت مولانا کی رائے اور مشورہ اس قدر معقول ہوتا تھا کہ بلا تکلف سمجھ میں آ جاتا تھا اور اس پر فتویٰ دے دیا جاتا تھا۔ ایک واقعہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ حضرت مولانا رشید احمد

(۱) یہ اشاعت دو رسائل پر مشتمل ہے افضل البضاعة اور القول الفاضل بين الحق والباطل، مؤخر الذکر رسالہ مولانا محمد حسین فقیر بنی دہلوی کی تالیف ہے، یہ مجموعہ مطبع قادری دہلی سے ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۸ء) میں چھپا تھا۔

(۲) یہ تحریر پروفیسر مولوی محمد شفیع نے دریافت کی تھی جو اورینٹل کالج میگزین لاہور اگست ۱۹۶۲ء میں چھپی تھی اور جناب عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی کی تالیف مفتی صدر الدین آزردہ میں بھی شامل ہے۔ ص: ۱۷۶-۱۸۴ (دلی: ۱۹۷۷ء)

گنگوہی سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ:

''حضرت بندوق سے جو شکار کیا جائے اور وہ بلا ذبح کئے صرف گولی لگنے سے مرجائے اس کو اکثر مالکیہ آج کل حلال کہتے ہیں اور ابناءِ زمان علماء کو بھی اس میں تردد ہے، بظاہر تیر مارے ہوئے کے مثل معلوم ہوتا ہے۔

حضرت نے ارشاد فرمایا لوگوں کو اسکی حلت کا اس وجہ سے شبہ ہوا کہ فقہ میں احراق بالنار کو قاطع لکھا ہے اور اسی بنا پر بندوق کی گولی کو بھی محرق اور قاطع سمجھ کر بعض علماء نے حلت کا فتویٰ دیا ہے، حالانکہ یہ غلط ہے۔ مولانا مملوک العلی صاحب سے ہم نے اس کو دریافت کیا تھا فرمایا کہ روئی پر نشانہ لگاؤ معلوم ہو جائے گا۔ چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا، گولی پار ہوگئی اور روئی کچھ نہ جلی، سو گولی توڑنے والی ہے محرق نہیں ہے، جب تک ذبح نہ کیا جائے بندوق کا شکار حلال نہیں۔(۱)

---

(۱) تذکرۃ الرشید ص:۱۳۹ ج:اول (سہارنپور: ۱۹۷۷ء)

باب (۱۷)

چند اہم دینی علمی کتابوں کی تصنیف واشاعت میں حضرت مولانا مملوک العلی صاحب کا حصہ

حضرت مولانا دہلی کالج سے وابستگی اور اپنی بے پناہ تعلیمی تدریسی مشغولیتوں کے علاوہ اس وقت کی جملہ دینی علمی خدمات میں بھی خاصا حصہ رکھتے تھے۔ اہم علمی کتابوں کی تصنیف واشاعت کے لئے علماء اور اشاعتی اداروں سے برابر روابط رکھتے تھے اور مختلف اہم ترین یا کسی پہلو سے ضروری موضوعات پر تصنیف وتالیف کی ضرورت یا کتابوں کے شائع کرانے کے لئے توجہ دلاتے رہتے تھے۔ حضرت مولانا کی کوشش اور توجہ سے کئی اہم کتابیں لکھی گئیں یا شائع ہوئیں، یہ سب کتابیں برصغیر (ہندو پاکستان وغیرہ) کے دینی علمی ورثہ کا ایک اہم حصہ اور اس ذخیرے پر قابل قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں، ان کتب ومطبوعات کا ذکر کئے بغیر مولانا کی علمی تصنیفی خدمات کا تذکرہ نا تمام رہے گا، اسلئے یہاں ان کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔

مولانا مملوک العلی کے اصرار پر مولانا رشید الدین خاں کی بعض تصانیف کی تالیف

مولانا مملوک العلی کے زمانہ تعلیم میں شیعہ مجتہدین ومصنفین خوب سرگرم تھے، اہل سنت کے نظریات ومعتقدات کی تردید میں کثرت سے لکھ رہے تھے، ادھر سے مولانا رشید الدین خاں انکے جوابات تحریر فرماتے تھے اور چونکہ شیعوں کے اثرات اور یہ بحثیں لکھنؤ کے گلیاروں سے گزر

کر دہلی میں قلعہ معلی کے ایوان تک پہنچ گئی تھیں اور جگہ جگہ اسکے چرچے اور مناظرے ہو رہے تھے، بڑے بڑے خاندان شیعہ ہو رہے تھے اور اس بلا سے دہلی کے اطراف خصوصاً حضرت مولانا مملوک العلی کا وطن نانوتہ اور دیوبند وغیرہ بھی کسی قدر متأثر ہو گئے تھے اسلئے اس موضوع سے مولانا مملوک العلی کی دلچسپی قدرتی تھی۔ شیعیت کے اثرات ختم یا کم کرنے کیلئے دہلی اور نانوتہ میں مولانا کی خدمات کا تذکرہ مجھے نہیں ملا، لیکن دہلی اور نواح کے جو علماء اس موضوع پر درجہ استناد رکھتے تھے اور وقیع کتابیں لکھ رہے تھے، ان میں سے ایک بڑے عالم حضرت مولانا رشید الدین مولانا کے استاد تھے۔

مولانا رشید الدین نے شیعہ مجتہدین کے اعتراضات وتصانیف کے جوابات میں کئی کتابیں لکھیں، جن کے وزن اور دلائل کو محسوس کیا گیا اور آج تک اس کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ مولانا رشید الدین خاں کی ان تصانیف میں اور محرکات کے علاوہ مولانا مملوک العلی کی فرمائش اور خوشنودیٔ خاطر کا خیال بھی کارفرما رہتا تھا اور ممکن ہے کہ ان کتابوں کی تالیف وترتیب میں مولانا مملوک العلی کی خدمت اور تعاون بھی شامل رہتا ہو۔ مولانا رشید الدین خاں کی ایک اہم تصنیف ''صولت غضنفریہ'' کے متعلق صراحت ہے کہ مولانا رشید الدین نے یہ کتاب (اپنے شاگرد) مولانا مملوک العلی کی پاس خاطر سے تصنیف کی تھی کریم الدین پانی پتی نے (جو مولانا مملوک العلی کا شاگرد اور دہلی کالج کا مشہور طالب علم ہے) لکھا ہے:

> ''ایک ردّ متعہ میں کتاب لکھی ہے جس کا نام صولت غضنفریہ رکھا ہے، یہ کتاب مولوی مملوک العلی مدرس اول حالی مدرسہ دہلی کے پاس خاطر سے تصنیف کی تھی'' (۱)

مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی اہم تصنیف ازالۃ الاوہام کی طباعت کا اصرار اور کوشش

جب شیعیت کا فتنہ علمائے خاندان حضرت شاہ ولی اللہ اور تحریک حضرت سید احمد شہید کی بدولت فرو ہوا اور اس طرف سے کسی قدر اطمینان ہوا، تو ایک اور تحریک آندھی

(۱) تذکرہ فرائد الدہر ص ۴۰۱

طوفان کی رفتار سے بڑھنے لگی، یہ عیسائیت کی تبلیغ اور پادریوں کی طرف سے اسلام اور قرآن مجید پر اعتراضات، مناظروں اور گلی کوچوں میں عیسائیت کی منادی اور تشہیر کا سلسلہ تھا، علمائے اسلام نے اس نئی آفت کا بھی نہایت ہوشمندی اور علم واستدلال کے مؤثر ہتھیاروں سے مقابلہ کیا، عیسائیوں کے اعتراضات کے ہر پہلو سے الزامی تحقیقی جوابات لکھے، عیسائی مبلغوں پادریوں سے مناظرے کیلئے آگے آئے۔ عیسائیوں نے اسلام پر اعتراضات اور تصنیف ورسائل کا جو سلسلہ شروع کیا تھا ان میں سے پادریوں کی تین کتابوں میزان الحق پادری فنڈر (C.G.PFANDER) بروق لامعہ، تالیف پادری اور تغلیب المطاعن، کو بنیادی اہمیت حاصل تھی، کچھ عیسائیوں کو یہ غلط فہمی ہوگئی تھی کہ ان کتابوں کے مصنفین نے اسلام اور قرآن شریف وغیرہ پر جو اعتراضات کئے ہیں، علمائے اسلام کیلئے انکے جوابات دینے مشکل ہوں گے، مگر علمائے اسلام جو بفضلہٖ تعالیٰ علم وکمال سے مالا مال اور عیسائیوں کے تمام مذہبی سرمایہ اور تصانیف کے حافظ اور محقق تھے، انھوں نے ان کتابوں کے ایسے جوابات لکھے کہ عیسائیوں کو شرمندہ ہونے اور ان جوابات کی حقانیت کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہ ہوا۔

منجملہ اور علماء کے حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی نے بھی عیسائیت کے مطالعہ اور پادریوں کی تصانیف واعتراضات کے جوابات پر توجہ فرمائی، حضرت مولانا نے سب سے پہلے درج بالا تینوں کتابوں کے جوابات لکھے پھر پادریوں کے تمام اعتراضات دستیاب کئے اور ان کے جواب میں فارسی میں ایک بڑی اور مفصل کتاب ''ازالۃ الاوہام'' تصنیف فرمائی، ان کتابوں میں سے ہر ایک اپنے موضوع کی دستاویز اور عیسائیت پر ضرب کاری کی حیثیت رکھتی ہے۔

حضرت مولانا کی اول الذکر تینوں کتابیں اگر چہ شائع نہیں ہوئی تھیں مگر علمائے اسلام اور عیسائیوں میں ان کا خوب چرچا تھا، ان کی نقلیں عام ہوگئی تھیں اور پادریوں نے بھی ان کے دلائل کی اہمیت اور گہرائی کو تسلیم کیا تھا۔ اس لئے جب ردعیسائیت پر مولانا رحمت اللہ کی چوتھی اور بڑی کتاب ازالۃ الاوہام کی تصنیف کی خبر عام ہوئی تو اس کا

مسلمانوں میں استقبال ہوا اور عیسائی اس کے جواب کی فکر اور تیاری کرنے لگے۔

دہلی کے اکابر علماء کو اس کا تقاضہ ہوا کہ ازالۃ الاوہام جلد سے جلد چھپ جائے تا کہ عیسائیوں کو منھ کھولنے کی گنجائش نہ رہے۔ جو علماء ازالۃ الاوہام کی اشاعت کے لئے فکر مند اور سرگرم ہوئے ان میں حضرت مولانا مملوک العلی بہت نمایاں تھے۔ مولانا مملوک العلی مولانا رحمت اللہ کو بار بار خط لکھتے اور ازالۃ الاوہام کا مسودہ شائع کرنے کیلئے بھیج دینے کی فرمائش کرتے تھے، مولانا مملوک العلی کے اصرار پر مولانا رحمت اللہ صاحب نے ازالۃ الاوہام کو چھپوانے کا ارادہ کر لیا تھا، مگر چونکہ یہ معلوم تھا کہ ازالۃ الاوہام کے چھپتے ہی عیسائی فاضل اور پادری اس کے جوابات کی فکر کریں گے، اس لئے مولانا رحمت اللہ چاہتے تھے کہ کوئی ایسا بڑا عالم جو اور علوم میں تبحر کے علاوہ عیسائیت پر بھی گہری علمی نظر رکھتا ہو ازالۃ الاوہام کو تنقیدی اصلاحی نظر سے دیکھ لے۔ مولانا رحمت اللہ صاحب نے بہت غور وفکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ ازالۃ الاوہام کی تصحیح اور اس کے مضامین ومستدلات پر علمی تحقیقی نظر ڈالنے اور اس کے وزن کو پرکھنے کے لئے مولانا نور الحسن کاندھلوی سے بہتر کوئی عالم اور صاحب نظر نہیں ہے، اسلئے مولانا رحمت اللہ نے ازالۃ الاوہام کا مسودہ مولانا نور الحسن کے پاس پہنچوایا اور اس کے ساتھ ایک خط بھی لکھا جس میں اس کتاب کی وجہ تالیف اور مولانا مملوک العلی کے اس کتاب کو چھپوانے کے لئے بھیج دینے پر اصرار کا ذکر ہے۔ اس گرامی نامہ کی چند سطریں یہاں نقل کی جاتی ہیں جس سے حضرت مولانا مملوک العلی کی ردعیسائیت سے دلچسپی اور ازالۃ الاوہام کی طباعت کے تقاضہ اور اہتمام کا علم ہوگا، مولانا رحمت اللہ نے مولانا نور الحسن کے نام گرامی نامہ میں لکھا ہے:

''وخدام جناب حضرت مولانا مملوک علی صاحب بذریعہ عنایت نامہ وہم بوساطت زبانی آیندگان آں صواب ''رسالہ ازالۃ الاوہام'' را کہ از تالیفات کمترین خلائق است، بارادہ طبع او طلب می فرمایند، وخشک جانی وبے جوہری احقر را اگرچہ بعض اولی الابصار بخوبی واقف اند لیکن بندگان مولانا منتخم بہ سبب ایں کہ ایں بے نصیب گاہے در محفل فیض مشاکل شان استفادہ نہ برداشتہ وتوف کما ینبغی از کم

استعدادی ایں ہیچ میرز ندارد۔

ازیں جہت از ارسال آں توقفے بکار رفت کہ مبادا جناب مولانا پس ملاحظہ اش خیال طلب کردہ وبجیہ رضیہ بزرگاں را کار فرمودہ خطاہارا پوشیدہ بقالب طبع درآند وبعدش زلات وخطایا ایں سراپا خطادست آویز برمخالف عنید گردد، واز اکثر اشخاص مرادسیلہ چشم پیش داشتن شود۔ ایں کار خوردن بہرحال شیوۂ محمود۔

وعلاوہ ازیں چند متنصران راشل ماسٹر رام چندر وغیرہ را ارادہ ردآں بعد دستیابی نسخہ اش دردل موجود۔ زیادہ تر احتیاط بکار بردن راواجب می سازد۔

ودریں ضلع سوائے ذات مصدر حسنات دیگر کدامے نیست کہ دریں باب از ذاتش استصلاحا استفسارے دریں باب تعمیل آید لہٰذا اکثر اجزائش کہ بمقابلہ ونظر ثانی درآمدہ اندروانہ خدمت والامی شوند بشرط فرصت للہ ولرسولہ نظرے برآن فرمایند وجائیکہ بجہت کوتہی استعدادم خطائے سرزدشدہ اصلاح نمایند واگرشومی طالع ام کل قابل محو باشد وبفحوائے لن یصلح العطار ماافسدہ الدھر اصلاحش بغایت شاق برذات مقدس باشد تاہم شرف اطلاعی رود کہ آں چناں اوراگم کنم کہ مانند عنقا احدے بعدش جزنامش نشود، واز پوستین کردن خلائق امنیتی بدست آید۔(۱)

ترجمہ: جناب کے خادم حضرت مولانا مملوک علی صاحب بذریعہ عنایت نامہ اوراس طرف سے آنے والوں کے زبانی پیام سے بھی ''رسالہ ازالۃ الاوہام'' کو جواس کمترین خلائق کی تالیفات سے ہے طباعت کے لئے طلب فرمارہے ہیں اور احقر کی خشک جانی، اور بے جوہری سے اگرچہ بعض اہل بصیرت بخوبی واقف ہیں۔ لیکن مولانا مفخم کی عالی ذات کو (چونکہ اس بے نصیب کو کبھی انکی فیض رسا مجلس سے استفادہ کا موقع نہیں ملا) پورے طور پر اس انجان کی کم استعدادی سے واقفیت نہیں،

(۱) مولانا رحمت اللہ صاحب کا یہ خط اس مجموعہ مکاتیب میں شامل ہے جس میں مولانا نورالحسن صاحب کے فرزند مولانا ریاض الحسن محمد سلیمان نے مولانا نورالحسن صاحب کے نام اس عہد کے مشاہیر علماء مولانا مفتی صدرالدین آزردہ، مولانا فضل حق خیرآبادی وغیرہ کے مکتوبات جمع کئے ہیں، یہ خط حالات مشائخ کاندھلہ تالیف مولانا احتشام الحسن کاندھلوی۔ ص: ۱۳۷ تا ص: ۱۳۸ (طبع جدید کاندھلہ، ۱۴۱۷ھ) وغیرہ میں نقل ہوا ہے۔

اس وجہ سے اس رسالہ کو بھیجنے میں توقف ہو رہا ہے کہ مبادا حضرت مولانا اسکو ملاحظہ کے بعد محض اپنی طلب کی بناء پر (بزرگوں کی پسندیدہ عادت کے موافق) خطاؤں کو نظر انداز فرما کر طبع کرا دیں اور بعد میں اس سراپا خطا کی خطائیں اور لغزشیں مخالف دشمن کیلئے دستاویز بن جائیں اور اکثر لوگوں سے میری نگاہ نیچی کرنے کا ذریعہ بنے۔ یہ ذلت اٹھانا بھی ہر حال میں پسندیدہ شیوہ ہے۔

اور اس کے علاوہ چند نصرانی جیسے ماسٹر رام چندر وغیرہ اس کے نسخہ کی دستیابی کے بعد اس کی تردید کا دل میں ارادہ رکھتے ہیں جس کی وجہ سے بہت زیادہ احتیاط برتنا ضروری ہو جاتا ہے۔

''اور اس ضلع میں سوائے ذات مصدر حسنات کے کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں ہے کہ اسکی ذات سے اس موضوع پر اصلاح طلب کی جائے اور اس بارے میں استفسار کیا جائے۔ لہٰذا کتاب کا اکثر حصہ جس کا مقابلہ اور نظر ثانی ہو چکی ہے خدمتِ والا میں روانہ کیا جاتا ہے۔ بشرط فرصت اللہ اور رسول کے لئے اس پر (اصلاحی) نظر فرمالیں ملاحظہ فرمادیں اور جہاں میری کم استعدادی کی وجہ سے کوئی خطا سرزد ہوگئی ہو اس کی اصلاح فرمادیں۔ اور اگر میری بدبختی سے سب قابل محو ہو اور موافق لن یصلح العطار ما افسده الدهر کے اس کی اصلاح جناب والا کے لئے انتہائی دشوار ہو، تب بھی مجھے اطلاع سے مشرف فرمادیں، تاکہ پھر اس کو اس طرح غائب کروں کہ عنقا کی طرح کوئی اسکے بعد اس کے نام کے علاوہ نہ سنے اور مخلوق کے چیرہ دستی سے نجات ملے''

ازالۃ الاوہام ۱۲۶۷ھ میں لکھی گئی تھی، تکمیل کی تاریخ کی صراحت نہیں، مگر غالباً ۱۲۶۷ھ کے ابتدائی مہینوں میں کسی وقت مکمل ہوئی ہوگی اور اس وقت سے مولانا مملوک العلی نے اس کا مسودہ طباعت کیلئے دہلی بھیج دینے کیلئے خط لکھنے شروع کر دیئے تھے، مولانا مملوک العلی کے اصرار کی وجہ سے مولانا رحمت اللہ نے یہ نسخہ تصحیح و نظر ثانی کے لئے کاندھلہ بھیجا، مولانا نور الحسن کے یہاں یہ نسخہ کب تک رہا اس کا تذکرہ نہیں ملا۔ مگر

۱۲۶۷ھ کے آخر میں مولانا مملوک العلی کی وفات ہوگئی تھی ممکن ہے کہ اس سے پہلے کتاب کا مسودہ مولانا مملوک العلی کو مل گیا ہو، شاید اسی نظام و ترتیب کے مطابق ازالۃ الاوہام کی دہلی میں سرسید کے بھائی کے مطبع سید المطابع میں طباعت شروع ہوئی اور مولانا مملوک العلی کی وفات کے تقریباً پونے دو سال بعد رمضان المبارک ۱۲۶۹ء (جون، جولائی ۱۸۵۳ء) ازالۃ الاوہام کی طباعت مکمل ہوگئی تھی۔

ازالۃ الاوہام بڑے سائز کے پانچ سو چونسٹھ صفحات پر مشتمل ہے، اس کے حاشیہ پر مولانا آلِ حسن موہانی کی مشہور کتاب ''استفسار'' بھی چھپی ہے، اس لئے اس کی طباعت میں دیر ہو جانا غیر متوقع نہیں تھا۔ اگر مولانا مملوک العلی کی زندگی وفا کرتی تو یہ کتاب مولانا کے سامنے چھپ کر آ جاتی۔ لہٰذا ازالۃ الاوہام کی طباعت کو مولانا مملوک العلی کی حسنات میں شمار کیا جانا چاہئے۔ مولانا ہی اس کی طباعت و اشاعت کے محرک ہوئے اور ممکن ہے ناشر (سید المطابع) سے بھی مولانا نے ہی رابطہ قائم فرمایا ہو۔

قاضی محمد اعلیٰ تھانوی کی کشاف اصطلاحات الفنون کے تعارف اور اشاعت کے لئے مولانا کی خدمت

کشاف اصطلاحات الفنون قاضی محمد اعلیٰ تھانوی کی شہرۂ آفاق تصنیف ہے، اور ملت اسلامیہ کے مفاخرِ علمیہ میں شمار کی جاتی ہے اور عالم اسلام کیلئے علمائے ہند کا بڑا تحفہ ہے۔ اس کتاب کا واحد نسخہ جو مصنف (قاضی محمد اعلیٰ) کے قلم سے تھا مولانا مملوک العلی کے خاص دوست اور استاد زادہ، مولانا ابوالحسن کاندھلوی (۱) کے ذاتی ذخیرہ میں موجود تھا جو مولانا

(۱) مولانا ابوالحسن: خلف حضرت مفتی الٰہی بخش بن مولانا محمد عرف شیخ الاسلام کاندھلوی تقریباً ۱۲۰۰ھ، ۱۷۸۶ء میں ولادت ہوئی، والد ماجد سے تعلیم حاصل کی، طب پڑھی اور مثنوی مولانا روم کا درس لیا، نہایت باخدا عارف کامل عالم تھے، متعدد تصانیف یادگار ہیں جن میں مثنوی بحر الحقیقت اور گلزار ابراہیم بہت مشہور ہیں، ۲۱ر جمادی الثانی ۱۲۷۱ھ ۲ر مارچ ۱۸۵۳ء کو کاندھلہ میں وفات ہوئی۔ مفصل معلومات کے لئے دیکھئے راقم سطور کا سلسلہ مضامین حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی کے اساتذہ مشمولہ امداد المشتاق مطبوعہ دلی ۱۹۸۱ء۔

نے دیکھا تھا اور اس کی علمی قدر و قیمت کو محسوس فرمالیا تھا، اسپرنگر دہلی کالج کا پرنسپل مقرر ہوکر دہلی آیا تو اس کا مولانا سے رابطہ ہوا اور مولانا کو بھی اس کے علمی ذوق اور کلکتہ کے علمی اشاعتی مراکز سے اسپرنگر کے قریبی روابط کا اندازہ ہوگیا تھا اس لئے مولانا نے اسپرنگر سے کشاف اصطلاحات الفنون کا ذکر کیا اور غالباً اس نادر روزگار تصنیف کی اشاعت کی ضرورت پر توجہ دلائی ہوگی، اسپرنگر نے اصرار کیا کہ وہ کتاب بہت جلد لاکر دکھائیں، مولانا نے اسپرنگر کے تقاضہ پر اسپرنگر کو لکھا کہ:

''اب کی بار امتحان کے بعد جو وطن کو جاؤں گا اس کتاب کو مالک سے مستعار لے کر اپنے ہمراہ لاؤں گا، بعد ملاحظہ کے صاحب کو نقل اس کی لکھوانے کا اختیار ہے'' (۱)

مولانا نے معلوم نہیں کس طرح اور کس حیثیت سے کشاف اصطلاحات الفنون کا ذکر کیا ہوگا کہ اسپرنگر مولانا کے سفر نانوتہ کے وقت تک بھی اسکا انتظار نہ کرسکا اس نے مولانا سے مکرر اصرار کیا کہ کتاب بہت جلد منگوایئے۔ اسپرنگر کے اصرار پر مولانا نے مولانا ابوالحسن کو خط لکھا اور قاصد بھیجا کہ کشاف اصطلاحات کا نسخہ مصنف ارسال فرمادیں۔ دوست (مولانا مملوک العلی) کی فرمائش تھی اس میں تامل اور دیر کرنیکا کیا موقع تھا، مولانا ابوالحسن نے اس قاصد کے ذریعہ کشاف کا یہ نسخہ بھجوادیا اور اپنی بیاض میں یادداشت لکھدی کہ:

''کشاف اصطلاحات حسب الطلب مولوی محمد مملوک علی، بدست علی بخش شاہ جہاں آباد فرستادہ شد'' (۲)

مولانا مملوک العلی نے نسخہ ملنے پر اسپرنگر کو اطلاع دی، اسپرنگر نے اسکو دیکھا اور اس کی قدر و قیمت کا احساس کر کے اس کی اشاعت کیلئے متوجہ ہوگیا۔ اسپرنگر نے (مولانا کے شاگرد) کریم الدین پانی پتی سے کشاف اصطلاحات کی نقل کرائی اور کلکتہ کے ممتاز علمی ادارہ ایشیاٹک سوسائٹی (ASIATIC SOCIETY) کلکتہ سے اس کی اشاعت کیلئے رابطہ کیا، یہ ادارہ کشاف اصطلاحات الفنون کو چھاپنے کے لئے تیار ہوگیا۔ اسپرنگر

(۱) مکتوب مولانا مملوک العلی بنام اسپرنگر محررہ ۲۲رذی قعدہ ۱۲۶۲ھ ۱۲رنومبر ۱۸۴۶ء۔ ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص: ۵۳۔
(۲) بیاض قلمی مولانا ابوالحسن کاندھلوی۔

نے علماء اور ولیم ناسولیس کی مدد سے اصطلاحات الفنون پر کام کیا اور یہ کتاب پہلی بار ایشیا ٹک سوسائٹی سے شائع ہوئی (۱) مذکورہ تفصیلات سے ظاہر ہے کہ اس کتاب کی طباعت کی پہلی کوشش اور بنیادی تحریک بھی مولانا مملوک العلی نے فرمائی تھی، اس طرح کی اور بھی متعدد کتابیں ہوں گی جو حضرت مولانا کے فیضِ کرم سے مرتب یا شائع ہوئی ہوں گی، مگر ان کی تفصیلات ہماری دسترس میں نہیں۔

---

(۱) تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہوں قاضی محمد اعلیٰ تھانوی پر راقم سطور کے مضامین۔

الف: سہ ماہی فکر ونظر اسلام آباد پاکستان اکتوبر، دسمبر ۱۹۸۹ء۔

ب: رضا لائبریری جنرل رام پور شمارہ۔۱، ۱۹۸۹ء۔

باب (۱۸)

حضرت مولانا مملوک العلی کا کتب خانہ

علم وکمال کے لئے مطالعہ اور مطالعہ کی ترقی اور آبیاری کے لئے ذاتی کتب خانہ بے حد ضروری ہے۔ مولانا مملوک العلی نے بھی جو سراسر علم وفضل، ہمہ تن علم وافادہ اور بزرگانِ سلف کی دینی علمی روایات کے امین تھے، اسلام، دینی علوم وفنون اور اپنی دلچسپی کے خاص موضوعات ادب، لغت معانی اور تاریخ وغیرہ کی عمدہ کتابوں کا ایک متوسط لیکن وقیع اور قابل ذکر ذخیرہ فراہم کرلیا تھا۔ حضرت مولانا کے زمانہ میں چھپی ہوئی کتابوں کا چلن عام نہیں ہوا تھا، اگرچہ طباعت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور برابر نئی نئی کتابیں چھپ کر آتی رہتی تھیں مگر پھر بھی اصل ذوق کتابوں کی نقل کا تھا، اسی لئے حضرت مولانا کے ذخیرہ کا بھی بڑا حصہ نادر قلمی کتابوں پر مشتمل تھا۔

حضرت مولانا نے اس کتب خانہ کی ایک مجمل فہرست جس میں صرف کتابوں کے نام لکھے تھے۔ ان کی کیفیت، سنہ کتابت، کاتب یا طباعت وغیرہ کی تفصیل نظرانداز کی گئی ہے، شعبان ۱۲۶۶ھ (جولائی ۱۸۵۰ء) میں مرتب کی تھی، یہ فہرست کالج کے پرنسپل اسپرنگر کی فرمائش پر بنائی گئی تھی، اسپرنگر قلمی کتابوں کا نہایت ذوق رکھتا تھا، وہ مختلف علماء اور نئے پرانے ذخیروں اور کتب خانوں کی فہرستیں بنوا کر اپنے پاس رکھتا تھا، اسی سلسلہ کی ایک کڑی حضرت مولانا کے ذخیرہ کی یہ فہرست بھی ہے۔

اس فہرست میں تقریباً ڈھائی سو کتابوں کا اندراج ہے، مگر اس فہرست میں درج کتابوں کی بڑی تعداد عربی کی ہے، فارسی کتابوں کا آخر میں تذکرہ ہے جن میں اٹھائیس

کتابوں کے نام ذکر کیے ہیں، جس سے خیال ہوتا ہے کہ اس فہرست کا مقصد صرف عربی کتابوں کا تذکرہ ہے فارسی اردو کتابوں پر توجہ نہیں کی گئی۔ اردو کی ایک کتاب بھی اس فہرست میں شامل نہیں، ممکن ہے کہ مولانا کی مملوکہ فارسی اردو کتابوں کا ذخیرہ اس وقت دہلی میں موجود نہ ہو، نانوتہ میں مولانا کے گھر پر ہو، اس فہرست میں ان کا ذکر نہ آیا ہو۔ کیوں کہ اس کی امید کم ہے کہ حضرت مولانا کو فارسی ادبیات اور علمی سرمایہ سے دلچسپی نہ ہو، اس طرح اس وقت تک اردو میں بھی معیاری کتابیں آنی شروع ہوگئی تھیں، خصوصاً نامور شاعروں کے کئی دیوان شائع ہو چکے تھے۔ حضرت مولانا، غالب، مومن، ذوق اور اس عہد کے نامور شاعروں کے دوست اور دہلی کی علمی ادبی محفلوں کی رونق تھے، وہ اپنے مجموعے اور کتابیں حضرت مولانا کو پیش کرتے ہوں گے۔ اور بھی کتابیں آتی رہتی ہوں گی بہ ظاہر اس قسم کی کتابوں کا حضرت مولانا نے جان بوجھ کر ذکر نہیں کیا۔

مختصر یہ ہے کہ یہ فہرست جو مولانا نے اسپرنگر کیلئے تیار کی تھی، مولانا کی جملہ کتابوں کی اور مکمل فہرست نہیں بلکہ غالباً منتخب کتابوں کی اجمالی یادداشت ہے، حضرت مولانا نے کتابوں کے جو نام لکھے ہیں اس سے ایک کتاب پر بھی کسی طرح کی روشنی نہیں پڑتی مگر اور ذرائع سے ان میں سے چند کتابوں کی اہمیت اور قدر و قیمت کا کچھ علم ہو جاتا ہے۔

حضرت مولانا کے شاگرد کریم الدین پانی پتی نے مذکورہ فہرست کی ترتیب سے کئی سال پہلے حضرت مولانا کی کتابیں دیکھی تھیں اور اپنی کتاب فرائد الدھر (تاریخ ادب عربی) میں کئی موقعوں پر مولانا کے ذخیرہ کی چند کتابوں کا ضمناً ذکر کیا ہے، جس سے حضرت مولانا کے کتب خانہ میں موجود چند کتابوں کی اہمیت و معنویت کا علم ہوتا ہے۔ کریم الدین نے سب سے پہلے باخرزی (علی بن الحسن بن علی باخرزی وفات ۴۶۷ھ، ۱۰۷۵ء) کی دمیۃ القصر کے ذیل تیمیۃ الدہر (ابوالمنصور عبدالملک بن محمد ثعالبی وفات ۱۰۳۸ء) کے ایک نسخہ کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں:۔

"واضح ہو کہ دمیۃ القصر ایک تذکرہ ذیل تیمیۃ الدہر کے تصنیف ابوالحسن علی بن الحسن کی ہے، جس کا ذکر آگے آوے گا۔ اس مؤلف نے اپنے ہم عصروں کا ذکر

اس میں بہت لکھا ہے، وہ تذکرہ میں نے بھی دیکھا اور اس سے چند شاعروں کے شعر جن کی ضرورت تھی لکھے۔

میرے استاد جناب مولوی مملوک علی مدرس اول مدرسہ دہلی کے پاس وہ تذکرہ دہلی میں موجود ہے، گر چہ خط اسکا بہت خوب اور پرانا لکھا ہوا ہے، لیکن غلط بہت ہے'' (۱)

مقامات حریری (قاسم بن علی بن محمد بصری حریری وفات ۵۱۶ھ،۱۱۲۲ء) کی شروحات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ایک شرح ابوالبقا ہے اور ایک شرح مولوی مملوک العلی صاحب مدرس اول مدرسہ دہلی کے پاس موجود ہے مگر اس کا نام مجھ کو معلوم نہیں، وہ شرح بھی بہت مطول ہے، میں نے دیکھی ہے'' (۲)

قلائد العقیان للفتح بن خاقان کے بھی ایک نسخہ کی موجودگی کی اطلاع دی ہے، تحریر ہے:

(قلائد العقیان) یہ تذکرہ مولوی مملوک العلی مدرس اول مدرسہ دہلی کے پاس موجود ہے، میں نے بھی دیکھا ہے'' (۳)

کریم الدین نے مولانا کے ذخیرہ میں موجود دیوان ابن الفارض اور اس کے قصیدہ تائیہ کی ایک شرح کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

''اس کا دیوان بہت مشہور ہے، لوگوں کے پاس موجود ہے۔ ایک نسخہ قلمی میرے ہاتھ کا میرے پاس بھی ہے اور ایک نسخہ میرے استاد مولوی مملوک العلی صاحب مدرس اول مدرسہ دہلی کے پاس ہے'' (۴)

اسی تذکرہ میں ہے:

ایک شرح اس کی قصیدہ تائیہ کی جناب مولوی مملوک العلی مدرس اول کے پاس موجود ہے (۵)

مولانا کی مملوکہ کتابوں میں سے آخری کتاب جس کا کریم الدین نے تعارف کرایا

(۱) فرائد الدھر ص.۳۰۵ (۲) فرائد الدھر ص:۳۰۷ (۳) فرائد الدھر ص:۳۱۱
(۴) فرائد الدھر ص:۳۱۶ (۵) فرائد الدھر ص:۳۱۶

ہے ریحانۃ الالباء وزھرۃ الحیوۃ الدنیا (تالیف شہاب الدین احمد خفاجی) کا ہے، اس کا ایک عمدہ صحیح نسخہ مولانا مملوک العلی مکہ مکرمہ سے خرید کر لائے تھے، فرائد الدھر میں ہے:

''یہ کتاب نسخ خط بہت صحیح میرے استاد مولوی مملوک العلی صاحب کے پاس موجود ہے، بروقت جانے کعبۃ اللہ الحرام کے وہاں سے خرید کر لائے تھے، چند ادباء اور شعراء کا حال اس میں لکھا ہے، وہ خوب نسخہ ہے''(۱)

حضرت مولانا کا کتب خانہ مولانا کی وفات بلکہ مولانا محمد یعقوب صاحب کی حیات تک محفوظ اور افادۂ عام کا سامان تھا، جب مدرسہ عربیہ (دارالعلوم ۱۲۸۳ھ، ۱۸۶۶ء میں) دیوبند قائم ہوا، مدرسہ کا افتتاح ہوتے ہی مولانا محمد یعقوب نے مدرسہ کی ضرورت کیلئے بنیادی کتابیں حضرت مولانا کے ذخیرہ سے عنایت فرمادی تھیں، جو مولانا یعقوب صاحب کی وفات تک مدرسہ میں رہیں، اہل مدرسہ کو ان کتابوں کی وجہ سے بہت آسانی ہوگئی تھی اور مدرسہ میں کتابوں کے حاصل کرنے کیلئے پریشانی نہیں ہوتی، مدرسہ کے استاد اور طلبہ دونوں ان کتابوں سے استفادہ کرتے تھے۔ مدرسہ کی انتظامیہ نے مولانا محمد یعقوب کی اس عنایت کیلئے ممنونیت اور تشکر کا بار بار اظہار واعلان کیا، مدرسہ کی روداددوں میں اس کا شکریہ اور مولانا محمد یعقوب کی عنایت کی ہوئی مستعار کتابوں کی فہرست پابندی اور اہتمام سے چھپتی رہی۔

حضرت مولانا مملوک العلی کا یہ ذخیرہ مولانا محمد یعقوب کی وفات ۱۳۰۲ھ تک تقریباً جوں کا توں محفوظ تھا، مگر مولانا کی اولاد میں کسی بڑے صاحب علم کے موجود نہ رہنے کی وجہ سے مولانا کے بعد منتشر ہونا شروع ہوا، لیکن بکھرتے بکھرتے بھی ۱۹۴۷ء (۶۷-۱۳۶۶ھ) تک اس کی کچھ کتابیں خصوصاً مولانا مملوک العلی اور مولانا محمد یعقوب کی خودنوشت مؤلفات وتحریرات موجود تھیں، مگر پھر اس پر ایسا زوال آیا کہ اس وقت اس کا شاید ایک ورق بھی موجود نہیں۔ اگرچہ یہ سرمایہ ضائع ہوچکا ہے مگر اس کی فہرست سے حضرت مولانا

(۱) فرائد الدھر ص: ۳۷۰

مملوک العلی کے علمی ذخیرہ اور ذوقِ مطالعہ کا علم ہو جاتا ہے، اس لئے اس ذخیرہ کی جو فہرست مولانا مملوک العلی نے مرتب فرمائی تھی، وہ یہاں درج کی جا رہی ہے۔

کلام اللّٰہ و ما یتعلق به

حمائل خوشخط۔ کلام اللہ صحیح، حوالہ محمد یعقوب، کلام اللہ مترجم بفارسی۔ کلام اللہ مطبوع ترجمہ اردوی۔ لغات کلام اللہ بعبارت فارسی معہ مجموعہ صرف۔ نصف اول بیضاوی۔ تفسیر بیضاوی (جلد اول، دوم، سوم، لغت القرآن، خلاصہ از لغات راغب اصفہانی۔ غرائب اللغات کلام اللہ۔

کتب الحدیث و ما یتعلق به

ترمذی شریف (جلد اول، دوم) مسند امام اعظم مع مؤطا امام مالک، ترجمہ حصن حصین مطبوع معہ رسالہ قرأت، شرح مسلم از امام نووی (جلد اول تا خامس) نہایہ جزری، پارہ شرح مصابیح، نصف اخیر ترغیب وترہیب۔ حاشیہ بخاری شریف۔ نسائی شریف مطبوع۔ مفاتیح شرح مصابیح نصف اول مجلد، ابوداؤد مطبوع، بلوغ المرام مطبوع، ربع مسلم شریف، تیسیر الاصول مطبوع، جلد اول ترجمہ مشکوٰۃ در ہندی مطبوع، ربع مسلم شریف، تیسیر الاصول مطبوع۔ جلد اول ترجمہ مشکوٰۃ شریف در ہندی مطبوع۔ حصن حصین معہ دلائل الخیرات در یک جلد۔ حصن حصین مجلد۔ جلد ثالث ترجمہ مشکوٰۃ۔ دلائل الخیرات۔

کتب الفقه و الاصول

ہدایہ نصف اول۔ فتاویٰ مغرب۔ فتاوی قنیہ۔ شرح وقایہ۔ تعظیم الطہارۃ در فارسی۔ مفتاح الجنۃ در ہندی، عضدی ناقص۔ غایۃ التحقیق حسامی۔ حاشیہ تلویح، مجلد نامعلوم الاسم۔ تلویح مجلد تا مقدمات اربع، تلویح از مقدمات اربع، آخر ناقص۔ جز تصریح۔ حاشیہ تلویح۔ منار بسیار محشی۔ ربع متخلص حسامی محشی، دایر خورد، دائرہ شرح منار، فتاوی حمادیہ در دو جلد مطبوع۔ فتاوی در مختار مطبوع، فتاوی فصول عمادی۔ شرح مسلم الثبوت مولوی مبین، مالابدمنہ مطبوع دہلی، عنایہ حاشیہ ہدایہ جلد ثالث از کتاب البیوع۔ ایضاً جلد ثانی، جلد رابع عنایہ از کتاب

الودیعۃ تا آخر، ہدایہ مع الکفایہ مطبوع از کتاب الصلوٰۃ تا کتاب الحج، ہدایہ مع الکفایہ (جلد ثالث، رابع) حاشیہ ہدایہ کہ مصنف او معلوم نیست جلد دوم۔ ہدایہ مطبوع، فتاویٰ عالمگیری (جلد اول تا رابع) عنایہ جلد ثانی از کتاب النکاح۔ مالا بد منہ مطبوع، فتاویٰ لکھنؤ۔

کتب الکلام

حاشیہ مسعود بر موقف امور عامہ۔ نواقض الروافض، رسالہ رد متعہ تصنیف خاں صاحب مرحوم۔ میر زاہد امور عامہ تمام محشی، شرح عقائد محشی، خیالی خوشخط محشی، عبدالحکیم بر خیالی، شرح عقائد ملا جلال، حاشیہ ملا کمال بر حاشیہ ملا جلال، حاشیہ مولوی مبین بر میر زاہد امور عامہ، حاشیہ ملا عبداللہ بر میر زاہد امور عامہ، حاشیہ مولوی برکت بر میر زاہد امور عامہ، حاشیہ مولوی حسن بر میر زاہد امور عامہ، حاشیہ قاضی مبارک بر میر زاہد ایضاً، موقف ثانی تا ختم دو موقف شرح موافق پنجم و ششم۔

کتب الادب والصرف والنحو واللغۃ والبلاغۃ

تاریخ تیموری مطبوع، دیوان قیس معہ دیوان دیگر دو جز، مقامات حریری، شرح سبعہ معلقہ مکتوبہ۔ مجموعہ قصاید بانت سعاد مجلد خورد مع بعض اجزاء قصاید شاہ عبد العزیز۔ اجزاء مقامات بدیعی ناقص۔ شرح قصاید تائیہ شیخ ابن فارض۔ دیوان متنبی مطبوع، الف لیلہ جلد اول مکتوبہ عرب۔ الف لیلہ جلد دوم مطبوع۔ الف لیلہ نصف اخیر مطبوع ناقص۔ شافیہ محشی مطبوع۔ کافیہ مطبوع۔ ہدایۃ النحو مطبوع۔ کتاب صرف کبیر۔ جلد اول حاشیہ عبدالحی۔ مجموعہ معراج الارواح و دستور المبتدی۔ مجموعہ شرح لاطائل وغیرہ۔ فقہ اللغۃ نصف اول۔ تاج المصادر۔ مختصر معانی، کہنہ محشی۔ دمیۃ القصر، تیمیۃ الدہر تکملہ شعرائے عرب، خزانۃ الادب معہ بدیعیات مصباح بخط نسخ۔ فراید در معانی، رسالہ محیط الاوراد۔ شرح مقامات حریری مجلد۔ شرح دیوان متنبی در دو جلد۔ صراح در یک جلد مطبوع۔ دیوان شیخ علوی مدار۔ دیوان ابن فارض۔ تاریخ یمینی از کتب مالکان خریدہ شد۔ قاموس مطبوع۔ بدیع الادب مطبوع۔ انشاء دیگر عربی۔ تاریخ فرانس عربی مطبوع۔ مجموعہ ریحانہ وقلاید العقیان و مسجع المنطوق دیوان ابن علی الجزری مکتوبہ عرب، شرح سبعہ معلقہ مطبوع۔

کتب ادعیہ وفنونِ متفرقہ دیگر

صحیفہ کاملہ خوشخط، بیاض خورد مع بعض ادعیہ صحیفہ کاملہ، عین العلم، شرح رسالہ امام رازی در احوال میت، چند جزو حاشیہ شرح ملا، واجزاء از دویم کتاب بلاغت، اجزاء از کتاب فرائض از اول وآخر ناقص، سر رویات از اجزاء مختلفہ در جزدان سفید، سہ رویات در جزدان، مجموعہ قصیدہ عروض وقصیدہ من بیاض مع اجزاء کشکول، مجلد، رسالہ اساس المصلی در رسالہ لباس وغیرہ، رویات در جزدان سفید یہ خطوط وغیرہ حساب در بستہ سفید، مجموعہ رسالہ مولوی رفیع الدین در احوال میت وفضل تعزیرات، ودو رسالہ شاہ ولی اللہ۔ شرح مقدمہ جزری در قراءت۔ جلد اول احیاء العلوم، مع جلد دویم تمام مجلد، صحیفہ کاملہ مطبوع مع ادعیہ ملحقات۔ دمغ الباطل، قرۃ العینین در مناظرات ومسائل علوم۔

کتب المنطق والمناظرۃ

عبدالحکیم برقطبی میر، سلم العلوم شرح مسلم مولوی حسن، شرح سلم مولوی عبداللہ، شرح سلم فیروز، شرح سلم قاضی مبارک، شرح سلم مولوی حمداللہ۔ شرح میر زاہد جلد کلاں، میر زاہد رسالہ تمام در یک جلد یک جز میر زاہد، حاشیہ مولوی عبداللہ وحاشیہ مولوی مبین بر میر زاہد رسالہ، حاشیہ غلام یحییٰ وحاشیہ مولوی عظیم بر میر زاہد رسالہ، حاشیہ مولوی فضل امام بر میر زاہد رسالہ، حاشیہ ملا عماد وحاشیہ مولوی اسد اللہ در یک جلد، میر زاہد جلالیہ تا تحت موضوع بسیار محشیٰ حاشیہ مولوی فضل امام، میر زاہد جلالیہ تمام من رسالہ قطبیہ، حاشیہ مولوی عبد العلی و قاضی مبارک ومیر زاہد جلالیہ در یک جلد، منہیہ قاضی مبارک، شرح مطالع مجردات، نافعہ منہ چند جزو، حاشیہ صدرا یک جزو، شرح تہذیب ملا جلال تحت موضوع اساس الافناس، دو جزو حاشیہ جلالیہ تا تحت موضوع حاشیہ مولوی مبین بر میر زاہد جلالیہ۔

کتب الحکمۃ والریاضی

میبذی بخط خود، صدرتا فلکیات بسیار محشی، حاشیہ ملا نظام الدین بر صدرا، شمس بازغہ، حاشیہ ملا نظام الدین بر شمس بازغہ، مع حاشیہ شرح حکمۃ العین، حاشیہ مولوی حمداللہ بر شمس بازغہ، صراط مستقیم از باقر داماد، تقویمات از باقر داماد، شرح ہیاکل، حاشیہ مولوی ظہور

الدین روضۃ الجنان ابوالحسن کاشی، اجزاء شرح حکمۃ العین، شرح چغمنی، قوشجی تمام شرح، شرح قوشجی فارسی مکتوبہ مولوی حیدر حسن، مجموعہ تشریح الافلاک، رسالہ خورد، عجائب الحساب، کتاب مطبوع در ہیئت انگریزی، مفتاح الافلاک چند اوراق قوشجی وتشریح الافلاک ناقص، بیاض کتاب حساب، رسالہ بطور سوال جواب مطبوعہ در ہیئت انگریزی، میبذی محشی مطبوعہ لکھنؤ، ترجمہ خلاصۃ الحساب تذکرہ در ہیئت۔

بیاض اشعار خوشخط، سبحۃ الابرار وتحفۃ الابرار، مثنوی نامعلوم الاسم، بیاض مثنویات، مثنوی نامعلوم الاسم، زلیخا ناظم ہروی، رسالہ تصوف دراحوال مرزا جان جاناں، رسالہ کلاں تصوف، تحفۃ العرقین محشی، دیوان حافظ، سکندر نامہ ترکی از میر علی شیر مرحوم ہفت پیکر لیلیٰ مجنوں ترکی، مخزن اسرار محشی، کلیات عرفی ناقص، آداب المریدین، بیاض کلاں بطور کتاب، ہفت مثنوی سلیم قلی مع مثنوی دیگر، دریک جلد، کلیات خاقانی، اقبال نامہ جہانگیری، انشاء طاہر وحید اجزا زلیخا بیاض خورد، دیوان قاسم، دیوانہ نلدِمن مثنوی مرزا بیدل، چند جز از دفتر اول مثنوی شریف، ترجمہ کلیات مطبوع۔

حضرت مولانا کی کتابوں کی یہ فہرست مولانا کے قلم سے اسپرنگر کے ذاتی کاغذات میں محفوظ ہے جو جرمنی کی قومی لائبریری میں (IBLIOTHEK PREUSSISCHER KULTURVESITZ STAATSB) برلن میں محفوظ ہیں، یہ کاغذات اکرام چغتائی صاحب نے دیکھے ہیں اور انہیں کی تحریر سے یہاں پیش کئے گئے ہیں۔

باب ۱۹

وفات اور مدفن

حضرت مولانا معمول کے مطابق دینی علمی تدریسی خدمات میں مشغول تھے کہ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ (ستمبر اکتوبر ۱۸۵۱ء) کی پہلی تاریخ کو بیمار ہوئے، بخار ہوا تھا جو یرقان میں تبدیل ہو گیا اور یہی بیماری جان لیوا اور مرض الموت ثابت ہوگئی، گیارہ دن بیمار رہ کر وفات ہوگئی، جس سے آخری پانچ دن بہت تکلیف اور غفلت رہی، مرض کی شدت اور حضرت مولانا کی بے چینی کی کیفیت (اور غالباً موسم کی سختی) کی وجہ سے حضرت مولانا کو ہر وقت دوا سنگھانے اور پنکھا کرنے کی ضرورت تھی اس وقت حضرت مولانا کے صاحبزادے مولانا محمد یعقوب کے علاوہ حضرت مولانا کے اور شاگرد بھی خدمت میں حاضر رہتے ہوں گے اور ہر اک کام کو پورا کرنے اور ضرورت کی تکمیل میں ایک سے بڑھ کر ایک پیش قدمی کرتے ہوں گے، مگر مولانا محمد یعقوب کی اطلاع ہے اس خدمت وسعادت میں سب سے بڑا اور متواتر حصہ مولانا محمد قاسم صاحب کا تھا۔ مولانا محمد یعقوب جو حضرت مولانا کے فرزند تھے وہ بھی ہر وقت کی حاضری اور مصروفیات کی وجہ سے تھک جاتے تھے مگر حضرت مولانا محمد قاسم نے استاد والا مقام کی خدمت وراحت کیلئے اپنی تمام مصروفیات اور نیند وآرام قربان کر دیا تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم نہایت جانفشانی سے دن رات مسلسل حضرت مولانا کی خدمت و تیمارداری میں مشغول رہتے تھے، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے لکھا ہے کہ:

"ہم سو جاتے تھے اور مولوی صاحب (حضرت مولانا محمد قاسم) برابر بیٹھے رہتے تھے؟"

بہر حال جن باتوفیق شاگردوں کی قسمت میں استاد والا تبار (مولانا مملوک العلی) کی آخری خدمت کی سعادت لکھی تھی انہوں نے اس میں پورا پورا حصہ لیا اور مولانا کی خدمت میں دن رات ایک کر دئے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب نے حضرت مولانا کے

مرض وفات کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

اس عرصہ میں والا مرحوم کا گیارہویں ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ کو بمرض پر تان قبل السابع انتقال ہو گیا۔ ایام مرض والا مرحوم کے ممتد نہ تھے گیارہ روز کل مرض رہا مگر چار پانچ روز بہت غفلت اور کرب رہا تخلخہ سنگھایا اور پنکھا کرنا ہر وقت تھا، ہم سو جاتے اور مولوی صاحب برابر بیٹھے رہتے تھے (۱)

دوا اور خدمت کا پورا پورا اہتمام ہوا مگر آخری وقت آچکا تھا کسی خدمت اور تدبیر نے کام نہ کیا" ان اجل اللّٰہ اذا جاء لا یؤخّر " وقت موعود آچکا تھا، گیارہ دن کی علالت کے بعد (تقریباً) تریسٹھ سال کی عمر میں (ولادت ۱۲۰۴ھ) ۱۱؍ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ (۷؍ اکتوبر ۱۸۵۱ء) سہ شنبہ کو اپنے مکان (کوچہ چیلان دہلی) میں وفات ہوئی۔ دفن کیلئے مسجد مہندیان کا انتخاب ہوا جو دلی دروازہ کے پیچھے خواجہ میر درد روڈ پر واقع ہے حضرت مولانا کو مسجد مہندیان کے صحن میں حضرت شیخ عبدالعزیز شکر بار کے قدموں قدرے مغرب کی جانب دفن کیا گیا، یہ جگہ حضرت شاہ ولی اللہ کے خانوادہ کے مشہور قبرستان سے کوئی دو سو قدم پہلے شمال میں واقع ہے۔ مولانا مملوک العلی صاحب کی قبر پر ایک عرصہ تک کتبہ نصب نہیں ہوا تھا جس کی وجہ سے حضرت مولانا کی قبر کو تلاش کرنے میں پریشانی ہوئی تھی، بعد میں تقریباً ۱۳۵۰ھ میں ایک کتبہ نصب کیا گیا جو بعد میں ایک یا شاید دو بار بدلا گیا ہے۔ مگر اس کتبہ پر کندہ سنہ وفات صحیح نہیں، صحیح سنہ وفات ۱۲۶۷ھ مطابق ۱۸۵۱ء ہے۔ اس وقت جو کتبہ نصب ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

۷۸۶
استاذ الکل
مولانا مملوک العلی نانوتوی
وفات ۱۱۔ ذی الحجہ ۱۲۶۶ء
نصب کردہ محمد ایوب
نبیرہ

(۱) تذکرہ مولانا محمد قاسم نانوتوی۔ ص: ۹ (طبع اول بہاولپور ۱۲۹۷ھ

باب (۲۰)

اولاد و احفاد

اور فرزند گرامی مرتبت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ

مولانا مملوک العلی کا حکیم امانت علی نانوتوی کی دختر سے نکاح ہوا تھا مگر حضرت مولانا کی تاریخ نکاح، اہلیہ محترمہ کی تاریخ ولادت وفات اور متعلقہ معلومات دریافت نہیں۔ مولانا مملوک العلی کی جملہ اولادوں کا تذکرہ بھی نہیں ملا، تاہم جو اولادیں عمر طبعی کو پہنچیں ان میں سے دو لڑکیوں اور ایک فرزند والا مقام کے نام عموماً ملتے ہیں۔ دختران نجیب النساء اور مبارک النساء، فرزند مولانا محمد یعقوب، ان تینوں میں نجیب النساء غالباً سب سے بڑی اولاد تھیں حضرت مولانا کی زندگی میں جوان ہوگئیں تھیں۔

حضرت مولانا کی زندگی میں تینوں کے نکاح ہو گئے تھے اور ان کی پہلی اولادیں بھی مولانا کی حیات میں تولد ہوگئی تھیں۔

مولانا کی بڑی بیٹی کے گمنام شوہر حافظ محمود نانوتوی

نجیب النساء کا پہلا نکاح حافظ محمود نانوتوی سے ہوا تھا، تعجب ہے کہ مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی تحریرات، مکتوبات اور بیاض میں اور اس خانوادہ کی مؤلفات اور تحریرات کے ناشرین اور تذکرہ نگاروں نے اس نکاح اور حافظ محمود صاحب کا کہیں کچھ تذکرہ نہیں کیا، اسلئے کسی قدر وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

حافظ محمود نانوتوی، مولانا مملوک العلی کے چچا حکیم محی الدین کے فرزند تھے، سلسلۂ

نسب یہ ہے:

حافظ محمود بن حکیم غلام محی الدین بن غلام شرف، بن عبداللہ (۱)

حافظ محمود، نیک سیرت سادہ طبیعت اور اللہ والوں سے محبت رکھنے والے شخص تھے حضرت میانجیو نور محمد کے خاص مریدوں اور متوسلین میں سے تھے، اکثر میانجیو صاحب کی خدمت میں خادم کی حیثیت سے حاضر رہتے تھے اور میانجیو صاحب کے خطوط وغیرہ لکھا کرتے تھے، حضرت میاں جیو صاحب کے ایک گرامی نامہ (بنام مولانا شیخ محمد تھانوی) کے آخر میں حافظ صاحب نے مولانا شیخ محمد کے نام یہ چند سطریں لکھی ہیں۔

''واز حاضر الوقت خاکسار بندہ حافظ محمود نانوتوی عفی اللہ عنہ بخدمت جناب مولوی صاحب و حافظ محمد ضامن صاحب و حافظ امداد اللہ صاحب بعد نیاز وانکسار و آداب تسلیمات، قبول بعد'' (۲)

حضرت حاجی امداد اللہ کے ملفوظات میں بھی حافظ محمود کا ایک واقعہ درج ہے، فرمایا:

''حافظ محمود صاحب داماد مولانا مملوک العلی صاحب ایک مرتبہ حضرت پیر مرشد کی خدمت میں بعد بیعت کے حاضر ہوکر عرض کرنے لگے کہ مجھے تصور شیخ کی اجازت دیجئے تاکہ تصور شیخ کیا کروں، حضرت نے فرمایا کہ جب محبت وعقیدت غلبہ کرتی ہے تب تصور شیخ کون کرتا ہے، غلبۂ محبت سے تصور شیخ خود بہ خود بڑھ جاتا ہے۔ (۳)

حافظ محمود صاحب حج کے لئے گئے تھے سفر حج سے واپسی میں دہلی کے قریب ان کی وفات ہوگئی تھی، مولانا شیخ محمد تھانوی نے لکھا ہے کہ:

''حاجی حافظ محمود صاحب ساکن قصبہ نانوتہ در ضلع سہارنپور بودند و مرید خاص آں عالی جناب مرشد حق قدس سرہٗ بودند، وقت مراجعت بیت اللہ شریف قریب شاہجہاں آباد وفات یافتن و برحمت حق پیوستند'' (۴)

(۱) نسب نامہ صدیقیان نانوتہ، ص: ۷

(۲) مکتوبات حضرت میانجیو نور محمد جھنجھانوی مندرجہ انوار محمدی، تالیف مولانا شیخ محمد تھانوی ص: ۴۵ (۱۲۱۹ھ)

(۳) شمائم امدادیہ تالیف حاجی محمد مرتضیٰ خاں قنوجی ص: ۱۵۸ (قومی پریس لکھنؤ ۱۳۱۴ء)

(۴) مکتوبات حضرت میانجیو نور محمد جھنجھانوی مندرجہ انوار محمدی، تالیف مولانا شیخ محمد تھانوی ص: ۴۵ (۱۲۱۹ھ)

ترجمہ: حافظ محمود صاحب جو نانوتہ ضلع سہارنپور کے رہنے والے تھے اور عالی جناب مرشد برحق (میاں جیونور محمد) کے خاص مرید تھے، انہوں نے حج کیا اور بیت اللہ شریف سے واپسی کے سفر میں دہلی سے قریب پہنچ کر وفات پائی اور رحمت حق سے مل گئے۔

صراحت تو نہیں ملی لیکن غالباً نجیب النساء کی حافظ محمود سے کوئی اولاد نہیں تھی، حافظ محمود کی وفات کے بعد نجیب النساء کا مولوی انصار علی انبہٹوی سے نکاح ہوا جو پہلے سے بھی حضرت مولانا مملوک العلی کے گھر کے ایک فرد کی طرح تھے، انکا سلسلہ نسب اس طرح ہے:

''انصار علی بن احمد علی بن قطب علی.................''

ان کے تین بیٹے تھے، احمد حسین، عبدالرحمٰن، اور مولانا عبداللہ انصاری (جو حضرت مولانا محمد قاسم کے تربیت یافتہ، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے خلیفہ اور ایم، اے، (M.A.O. COLLEGE) علی گڑھ کے سب سے پہلے ناظم دینیات تھے)(۱)

دوسری بیٹی مبارک النساء مولانا انصار علی کے حقیقی بھائی شاہ مجید علی (خلف احمد علی) انبہٹوی سے منسوب ہوئیں، ان کے بھی تین صاحبزادے تھے، حضرت مولانا خلیل احمد انبہٹوی (مہاجر مدنی شارح سنن ابوداؤد)، مولانا نظیر احمد (جو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے شاگرد اور حضرت حاجی امداد اللہ کے خلیفہ مجاز تھے)، مولانا رشید احمد سالم انصاری (ایم، اے او کالج و فارسی کے نامور استاد، محقق، مصنف، مخطوطات کی معلومات و بصیرت میں ممتاز اور امیر خسرو کی تصانیف کے ماہر تھے) اور تینوں ہی صاحب فضل و کمال تھے۔

---

(۲) راقم سطور نے مولانا عبداللہ انصاری کا بھی مختصر تذکرہ مرتب کیا ہے جو زیر اشاعت ہے۔ (نور)

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی

حضرت مولانا مملوک العلی کے کوئی فرزند نہیں تھا صرف لڑکیاں تھیں، حضرت مولانا کو تمنا ہوگی اور دوسرے بھی چاہتے تھے کہ مولانا کے فرزند ہو، جو مولانا کے کمالات کا بھی وارث بنے۔ حضرت مولانا کے ایک خاص شاگرد، مولانا محمد حسن رام پوری تھے جو خاصانِ خدا میں سے تھے انکے زمانۂ طالب علمی سے عجیب حالات تھے، حضرت مولانا نے انکے مرتبہ کو پہچان لیا تھا، اسلئے انکو رہنے کیلئے ایک علیحدہ مکان دیدیا تھا اور سب شاگردوں کو ہدایت فرمادی تھی کہ ان کے مکان میں کوئی بھی کسی وقت بھی بلا اجازت داخل نہ ہو۔(۱)

حضرت مولانا کے شاگردوں اور نیاز مندوں کی طرح مولانا محمد حسن کو بھی اس کا احساس تھا کہ حضرت مولانا کے لڑکا نہیں ہے، ایک اور مولانا محمد حسن نے حضرت مولانا کے یہاں فرزند کے تولد کیلئے دعاء اور التجا کی جو بارگاہِ الٰہی میں قبول ہوئی اور ان کو امید ہو گئی کہ اس مرتبہ انشاء اللہ فرزند تولد ہوگا، مولانا محمد حسن صاحب نے اپنی تمنا اور اس دعاء کی قبولیت کا حضرت مولانا سے بھی ذکر کردیا، مولوی نذیر حسین دیوبندی نے لکھا ہے کہ:

"ایک روز مولانا مملوک العلی سے کہا کہ شاہ غریب اللہ صاحب نے اپنے پیر ومرشد کے واسطے اولاد اور لڑکا مانگا خداوند تعالیٰ نے ان کی دعاء قبول کی، میں نے بھی اپنے استاد کے واسطے دعاء کی کہ خداوندا میرے استاد کو اب کی مرتبہ لڑکا دے کہ جو حافظ قرآن و عالم اور ولی ہو، سو قبول ہوگئی۔ مولانا مملوک العلی صاحب یہ سن کر ہنس پڑے اور مولوی محمد حسن نے اس واسطے دعاء کی کہ ان کے استاد کے لڑکیاں تھیں، چنانچہ اسی مرتبہ مولوی محمد یعقوب صاحب پیدا ہوئے اور الم نشرح ہے کہ وہ ان جملہ صفات کے ساتھ موصوف تھے اور اسی وجہ سے مولوی محمد یعقوب صاحب کبھی کبھی جوش میں آکر فرمایا کرتے تھے کہ میں ازلی ولی ہوں۔"(۲)

---

(۱) تذکرۃ العابدین، تالیف حاجی نذیر حسین دیوبندی ص:۵۴ (دہلی: ۱۳۳۳ھ) (۲) تذکرۃ العابدین ص ۵۶

ولادت مولانا محمد یعقوب کی ۱۳؍صفر سنہ ۱۲۴۹ھ (۲ جولائی ۱۸۳۳ء) کو پیدائش ہوئی، منظور احمد، غلام حسنین اور شمس الضحیٰ تاریخی نام ہیں، ان کے اعداد سے سنہ ولادت معلوم ہو جاتا ہے۔ مولانا محمد یعقوب نے لکھا ہے کہ:

''بندہ کی پیدائش صفر کی تیرھویں سنہ بارہ سو انچاس ہے۔''(۱)

مولانا یعقوب حضرت مولانا محمد قاسم کے بچپن کے رفیق اور ساتھی تھے، مولانا نے حضرت مولانا محمد قاسم کے حالات میں اپنی زندگی کے بعض واقعات کا کچھ تذکرہ یا اشارہ کیا ہے اور حضرت مولانا محمد قاسم سے بچپن کی رفاقت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''احقر اور مولوی صاحب کے (بیچ میں) علاوہ قرب نسب بہت سے روابط اتحاد تھے، ایک مکتب میں پڑھا، ایک وطن ایک استاد سے ایک وقت میں علم حاصل کیا۔''(۲)

مولانا محمد یعقوب نے دس سال کی عمر میں قرآن شریف کا حفظ مکمل کر لیا تھا، جب حضرت مولانا مملوک العلی حج کیلئے گئے اسوقت قرآن شریف پورا ہو چکا تھا، دور کر رہے تھے۔

مولانا مملوک العلی سفر حج سے واپسی پر سیدھے دہلی آگئے تھے کیوں کہ مدرسہ سے منظور رخصت کی مدت پوری ہو چکی تھی، اسلئے اس وقت وطن نہیں گئے، سالانہ چھٹی میں گھر جانا ہوا، اور جب اس سفر کے بعد نانوتہ سے دہلی آئے تو مولانا محمد یعقوب اور مولانا محمد قاسم، دونو عمر طالب علم مولانا کے ساتھ دہلی آئے تھے، جب نانوتہ سے آخر ذی الحجہ سنہ ۱۲۶۰، ۲؍محرم سنہ ۱۲۶۱ھ (۱۱ جنوری ۱۸۴۵ء) کو دہلی پہنچے اور فوراً ہی (چار محرم) کو سبق شروع ہو گئے تھے اگر چہ مولانا محمد یعقوب نے اسکی صراحت نہیں کی مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن شریف کی تعلیم کے درمیان ہی مولانا نے فارسی کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھ لی ہونگی، کیوں کہ دہلی پہنچ کر میزان اور گلستاں سے اسباق کا آغاز ہوا تھا، اگر مولانا نے پہلے سے فارسی کی کتابیں نہ پڑھی ہوتیں اور فارسی سے کسی قدر مناسبت نہ ہوگئی ہوتی تو ان

(۱) و (۲) قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی احوال و آثار باقیات و متعلقات۔ ص: ۱۷۰ مرتبہ نور الحسن راشد کاندھلوی (کاندھلہ ۱۴۲۱ھ)

کتابوں کا شروع کرانا بے فائدہ تھا، اسلئے کہا جاسکتا ہے کہ مولانا یعقوب کی تقریباً آٹھ سال کی عمر میں فارسی درسیات شروع ہوگئی ہوں گی۔ اردو کی تعلیم درسیات میں شامل نہیں تھی کیونکہ علمی گھرانوں کی مائیں اور سرپرست اپنے بچوں کو باتوں باتوں میں اردو پڑھا دیتے تھے۔

مولانا مملوک العلی کا خاص طریقہ یہ تھا کہ وہ چھوٹے طلبہ کے سبق اعلیٰ درجات کے طلبہ کے سپرد فرما دیا کرتے تھے کہ وہ سبق یاد کرائیں اور سنیں، اسی ترتیب اور معمول کے مطابق مولانا محمد یعقوب کا سبق سننا اور تعلیلات پوچھنا مولانا محمد قاسم کے سپرد فرما دیا تھا۔ اس زمانہ میں حضرت مولانا جمعہ کی شب میں ابتدائی کتابوں کے طلبہ کا ہفتہ وار جائزہ لیتے تھے جس سے نئے پرانے طلبہ کی صلاحیتوں اور رفتارِ تعلیم کا اندازہ ہوجاتا تھا۔

خیال ہے کہ مولانا کا یہ تعلیمی سفر عمدہ صلاحیت اور تیز رفتاری سے آگے بڑھا ہوگا مگر اس میں کب کیا کتابیں پڑھیں اور حضرت مولانا مملوک العلی کے علاوہ دہلی کالج کے اور کن استادوں یا حضرت مولانا کے کس شاگرد سے تلمذ واستفادہ کا رشتہ رہا اس کی اطلاع نہیں، تاہم متوسطات کی تکمیل سے پہلے دہلی کالج میں داخلہ ہوگیا تھا، دہلی کالج میں زیر تعلیم کتابوں کی تفصیل بھی معلوم نہیں اور اس کا بھی علم نہیں کہ دہلی کالج سے کب تک وابستگی رہی، ہرچند کہ اہم بنیادی کتابیں حضرت مولانا مملوک العلی نے خود پڑھائی ہونگی مگر کالج کے نظام اور ترتیب اسباق کی پاسداری بھی ضروری تھی، اس لئے ممکن ہے کہ مولانا نے کالج کے اور اساتذہ خصوصاً مولانا سید محمد صاحب دہلوی اور مولانا سبحان بخش سے بھی پڑھا ہو۔

مولانا دہلی کالج کی تعلیم سے کب فارغ ہوئے اس کی بھی صراحت نہیں ملتی لیکن ڈاکٹر افتخار احمد صاحب صدیقی نے محمد حسین آزاد کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مولانا محمد یعقوب نانوتوی ڈپٹی نذیر احمد کے ہم جماعت اور دوست تھے۔(۱)

اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو یہ رفاقت اور ہم جماعتی پہلے تین چار سال میں رہی ہوگی، کیونکہ ڈپٹی نذیر احمد آخر تک کالج سے وابستہ رہے اور درجہ بدرجہ تمام جماعتوں کی تعلیم اور

---

(۱) مولوی نذیر احمد دہلوی احوال وآثار، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ص:۷۹ (لاہور: ۱۹۷۱ء)

امتحان سے فارغ ہو کر نکلے، لیکن مولانا محمد یعقوب کی کالج سے مسلسل وابستگی کا ثبوت نہیں ملا، بظاہر مولانا نے تین یا چار سال کے بعد کالج چھوڑ دیا تھا، دہلی کالج نے کالج کے طلبہ کی تفصیلات پر مشتمل ایک مفصل گوشوارہ یا رجسٹر سنہ ۱۸۴۷ء میں شائع کیا تھا اس میں مولانا یعقوب کا نام درج نہیں۔ یعنی وہ اس سال کالج کی کسی جماعت میں شامل نہیں تھے۔ اس وقت سے مولانا نے تین یا چار سال کالج سے باہر گذارے، اس درمیان ان کی تعلیم کس منزل تک پہنچی تھی اور کالج چھوڑنے کے بعد اس میں کس قدر ترقی ہوئی اور کالج سے علیحدہ ہو کر کس استاذ سے وابستہ رہے، اسکا سراغ نہیں ملا، مگر سنہ ۱۸۵۱ء (۱۲۶۷ھ) میں حضرت مولانا مملوک العلی کی وفات سے ایک سال پہلے دوبارہ کالج سے وابستہ ہو گئے تھے اور کالج کی اعلیٰ ترین جماعت اسکالرس میں شامل تھے جس کو نو روپیہ مہینہ وظیفہ ملتا تھا۔

شاید اسی وجہ سے یا کچھ اور علمی مصروفیت تھی کہ مولانا محمد یعقوب دہلی میں ہوتے ہوئے بھی حضرت مولانا مملوک العلی کے ساتھ نہیں رہتے تھے، دہلی میں کسی اور جگہ رہائش تھی، والد ماجد کی وفات کے بعد اپنے مکان میں منتقل ہوئے، خود مولانا نے لکھا ہے کہ:

> ''بعد انتقال مولانا والد مرحوم کے احقر اپنے مکان مملوک میں جو چیلوں کے کوچہ میں ہے جا رہا، مولوی صاحب بھی میرے پاس آ رہے۔'' (۱)

غیر متوقع نہیں کہ مولانا محمد یعقوب کا یہ وقت حضرت مولانا احمد علی کے مطبع احمدی میں تصحیح کتب کی خدمت میں گزرتا ہو، حضرت مولانا احمد علی نے صحیح بخاری کا جو نسخہ بہت اہتمام سے پہلی مرتبہ شائع کیا تھا، حضرت مولانا احمد علی نے اپنی بیاض میں اس کا حساب لکھا ہے، اس میں ایک نسخہ بمد تصحیح برائے محمد یعقوب کا اندراج ہے۔ حضرت مولانا احمد علی کے قریبی لوگوں میں مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے علاوہ کسی اور محمد یعقوب کا نام مجھے نہیں ملا اس لئے اس سے مولانا محمد یعقوب نانوتوی ہی مراد ہوں گے، بخاری شریف کے متن کی تصحیح اور کتابت کی نظر ثانی کی خدمت بہت نازک نہایت وسیع اور اہم کام تھا قرین قیاس ہے کہ اس

---

(۱) حالات طیب یا تذکرہ مولانا محمد قاسم نانوتوی، مع تصحیح وحواشی مشمولہ قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی (احوال آثار باقیات ومتعلقات ص:۱۸۶ مرتبہ نور الحسن راشد کاندھلوی (کاندھلہ: ۱۴۲۱ء)

خدمت میں خاصا وقت صرف ہوتا ہوگا ممکن ہے کہ اسی زمانہ میں یا اس سے پہلے حضرت مولانا سہارنپوری سے حدیث پڑھی ہو، ان مصروفیات کی وجہ سے گھر پر رہنے میں زحمت ہو اسلئے حضرت مولانا احمد علی کے یہاں مطبع احمدی میں قیام کر لیا ہو۔

درسِ حدیث

مولانا کی دہلی کالج کی تعلیم کی تفصیل کی طرح تعلیم حدیث کی معلومات بھی مبہم اور نا تمام ہیں، مولانا نے لکھا ہے کہ میں نے حدیث شریف کی چند کتابیں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سے اور چند حضرت مولانا احمد علی محدث سے پڑھیں، معروف روایت کے مطابق حضرت مولانا کو حضرت شاہ عبد الغنی سے بھی تلمذ واجازت ہے مگر اس تلمذ واجازت کا مولانا محمد یعقوب کی ذاتی تحریرات ومؤلفات (بیاض مکتوبات وغیرہ) میں ذکر نہیں ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب نے اپنی بیاض میں حضرت شاہ عبد الغنی سے حضرت مولانا محمد قاسم کی سند لکھی ہے مگر شاہ صاحب سے اپنے تلمذ کا ذکر نہیں کیا۔ مولانا محمد یعقوب کی بیاض میں نقل حضرت مولانا محمد قاسم کی سند پر جو عبارت درج ہے وہ یہ ہے:

صورة الاجازة التي كتبها مولانا عبد الغنى لمولانا محمد قاسم.

اور اس کے اختتام پر نام رقم کئے ہیں نیز لکھا ہے:

صورة ما خط شيخ شيخنا لشيخنا (۱)

یعنی یہ وہ تحریر (یا سند) ہے جو میرے استاد کے استاد نے میرے استاد کیلئے لکھی تھی۔

"قال الشيخ الاجل مولانا المولوى محمد قاسم ، انه قال شيخى و استاذى قدو ة العلماء مقتدى الفضلاء صاحب البركات مولانا عبد الغنى بن "(۲)

مگر اس تحریر میں مولانا محمد یعقوب صاحب کے حضرت شاہ عبد الغنی سے براہِ راست تلمذ واجازت کا کوئی اثر ونشان نہیں ملتا ان اقتباسات سے صرف یہ جھلکتا ہے کہ مولانا محمد یعقوب کو شاہ عبد الغنی سے براہِ راست تلمذ نہیں صرف حضرت مولانا محمد قاسم کے ذریعہ سے ہے۔

---

(۱) و (۲) بیاض یعقوبی۔ ص: ۱۵۷ (طبع اول تھانہ بھون: ۱۹۲۹ء)

تاہم قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ حضرت مولانا مملوک العلی کی زندگی کے آخری ایام میں یا اس کے بعد کے سال (سنہ ۱۲۶۸ھ،۱۸۵۲ء) میں حضرت شاہ عبدالغنی سے پڑھا ہوگا، اس کے علاوہ کوئی اور وقت ایسا نہیں ہے جس میں مولانا حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو سکتے، کیوں کہ جب مولانا دہلی کالج میں تھے اس وقت درس حدیث کیلئے ان کی عمر کم تھی اور حضرت مولانا مملوک العلی کی وفات کے ایک سال بعد اجمیر چلے گئے تھے وہاں سے سنہ ۱۸۵۷ء میں اس وقت واپس ہوئے جب سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک شباب پر تھی، اس تحریک کا پوری طرح اختتام نہیں ہوا تھا کہ حضرت شاہ عبدالغنی ہندوستان سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہو گئے تھے اور اس کی بھی کوئی اطلاع نہیں کہ مولانا محمد یعقوب نے مدینہ طیبہ حاضر ہو کر شاہ صاحب سے استفادہ کیا ہو۔

حضرت مولانا محمد قاسم سے درسِ حدیث

مولانا محمد یعقوب نے حضرت مولانا محمد قاسم سے صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں جس کا ذکر آچکا ہے آخر میں حدیث شریف کی اعلیٰ ترین کتابوں کا درس لیا، جن میں صحیح بخاری و مسلم شامل ہیں۔ صحیح بخاری اس وقت پڑھی تھی جب حضرت مولانا محمد قاسم سنہ ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۲ء) کے پہلے حج سے واپسی کے بعد سنہ ۱۲۷۸ھ کے تقریباً آخری مہینوں (شوال ذی الحجہ) میں نانوتہ اور دیوبند میں تھے، مولانا محمد یعقوب صاحب نے لکھا ہے کہ:

''اسی وقت میں احقر نے حضرت سے بخاری قدرے پڑھی۔'' (۱)

اس زمانہ میں منشی ممتاز علی نے اپنا مطبع دوبارہ جاری کیا اور حضرت مولانا محمد قاسم کو زحمت دی کہ وہ میرٹھ تشریف لائیں، مولانا میرٹھ تشریف لے گئے اور منشی جی کے یہاں قیام فرمایا، اس وقت حضرت مولانا محمد قاسم سے ایک جماعت نے صحیح مسلم پڑھی تھی (۲) اس میں بھی مولانا محمد یعقوب حاضر رہتے تھے۔

مولانا محمد یعقوب کی مؤطا مالک کی سند بھی مولانا محمد قاسم کے واسطہ سے ہے جو اس

(۱) و (۲) مولانا محمد قاسم نانوتوی، احوال و آثار باقیات و متعلقات ص: ۲۰۵، ۲۰۶

طرح ہے:

"محمد یعقوب عن مولانا محمد قاسم عن مولانا احمد علی"(۱)

حضرت مولانا احمد علی سے تلمذ

مولانا کا حضرت مولانا احمد علی سے بھی تلمذ تھا مولانا نے اپنے خطوط میں حضرت مولانا کو اپنا استاد لکھا ہے، راقم کو اس تلمذ کی تفصیلات کا علم نہیں۔

دہلی کالج میں ملازمت کیلئے کوشش

حضرت مولانا مملوک العلی دہلی کالج کے صدر مدرس یا مدرس اول تھے، حضرت مولانا کی وفات کے بعد یہ جگہ خالی ہوگئی تھی، اس پر نئے تقرر کی ضرورت تھی، اس لئے دہلی کالج کے مدرس دوم، مولانا سید محمد دہلوی کو مدرس اول بنادیا گیا تھا، اب مدرس دوم کی جگہ خالی تھی یہ جگہ ضابطہ کے مطابق مدرس سوم مولانا سبحان بخش شکار پوری کا حق تھی مگر کالج کے مستقل ممتحن، مشیر علمی، مولانا مفتی صدر الدین آزردہ چاہتے تھے کہ مدرس دوم کے عہدہ پر مولانا محمد یعقوب کا تقرر ہوجائے مگر اس منصب کے لئے مولانا سبحان بخش اور مولانا محمد یعقوب کے علاوہ ایک امیدوار اور بھی سامنے آگئے تھے، اسلئے انتظامیہ نے یہ طے کیا کہ اس کا امتحان لیا جاوے، جو امیدوار اعلیٰ درجہ میں کامیاب ہو اس کا اس جگہ تقرر کردیا جائے، امتحان کیلئے بھی مولانا مفتی صدر الدین آزردہ کا انتخاب ہوا مگر مفتی صاحب کے طریقۂ کار پر کالج کے پرانے طالب علموں کو اعتراض تھا، ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ جگہ مولانا سبحان بخش کا حق ہے، وہ کالج کے پرانے، نہایت جید استعداد والے مستعد محنتی استاد ہیں انہی کو مدرس دوم بنایا جائے، اس قصہ میں غالباً کالج کے سابق پرنسپل اسپرنگر نے مداخلت کی جس کی وجہ سے یہ منصب کالج کے ضابطہ کے مطابق مولانا سبحان بخش کو مل گیا۔

دورِ ملازمت سنہ ۱۸۵۷ء تک

کالج میں مولانا سبحان بخش کے تقرر کے بعد مولانا نے کسی دوسری ملازمت کی جستجو کی، بالآخر مولانا کا حضرت مولانا کی وفات کے تقریباً ایک سال بعد اجمیر کے سرکاری مدرسہ یا

(۱) مجموعہ اسانید مولانا محمد ناصر بلیاوی (مکتوبہ ۱۳۵۰ھ) نسخہ مولف مملوکہ راقم سطور

کالج میں عربی کے مدرس اول کے عہدہ پر تقرر ہو گیا، مولانا نے لکھا ہے کہ:

''ایک برس دن کے قریب بعد انتقال والد صاحب مرحوم احقر دہلی رہا، پھر نوکری اجمیر کے سبب دہلی چھوٹی۔''(۱)

اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ مولانا سنہ ۱۲۶۸ھ کے آخر یا شروع سنہ ۱۲۶۹ھ (۵۳-۱۸۵۲ء) میں اجمیر گئے ہوں گے، اجمیر کالج میں مولانا کی بہت قدر و منزلت اور نہایت احترام تھا، مولانا کی اعلیٰ درجہ کی لیاقت کی وجہ سے کالج کے پرنسپل نے حکومت سے سفارش کی کہ مولانا بہترین صلاحیت کے بڑے باکمال شخص ہیں ان کیلئے ڈپٹی کلکٹر کا منصب موزوں ہے، مولانا کو ڈپٹی کلکٹر بنا دیا جائے۔ سفارش جو کسی تجربہ کار جہاں دیدہ افسر نے بھیجی تھی حکومت نے منظور کر لی اور مولانا کو ڈپٹی کلکٹر بنانے کے احکامات جاری ہو گئے مگر جب مولانا کو اس کی خبر ملی تو مولانا نے اس باوقار اور کروفر کے عہدہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور تعلیم و تدریس کو چھوڑ کر صاحب بہادر بننا گوارہ نہیں کیا۔

اگرچہ اس وقت مولانا آزادی کی زندگی گزار رہے تھے مگر پھر بھی یہ پسند نہیں کیا کہ وہ ظاہری اعزاز و احترام کی ملازمت کی وجہ سے تعلیم و تدریس کی خدمت ترک کر دیں، اسکے کچھ دنوں کے بعد مولانا کا بنارس کالج میں تبادلہ ہوا، جو سرکاری مدارس یا کالجوں میں ایک بڑا اور باوقار ادارہ تھا، مولانا کے بنارس جانے کی وجہ سے اجمیر کالج کی جگہ خالی ہوئی تھی اس کے لئے دلی کالج کی انتظامیہ نے (ڈپٹی) نذیر احمد کا نام پیش کیا مگر نذیر احمد صاحب نے اس کو پسند نہیں کیا اور آئندہ کی توقعات کے لحاظ سے ڈپٹی انسپکٹری کو منظور کر لیا۔

مولانا علمی خدمت انجام دینا چاہتے تھے اور ڈپٹی صاحب بڑے عہدہ و منصب اور اعلیٰ تنخواہ والی جگہ کی تلاش میں تھے، ڈپٹی صاحب کے سوانح نگار نے دونوں کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''نذیر احمد کے ہم جماعت اور دوست مولوی محمد یعقوب صاحبؒ نے اپنے والد اور استاد مولانا مملوک العلی صاحب، صدر مدرس عربی دہلی کالج کے نقش قدم کو

(۱) قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، احوال و آثار باقیات و متعلقات ص:۱۸۶

اپنے لئے مشعل راہ بنایا، اسی اجمیر کالج میں جہاں سے نذیر احمد کو آفر آیا تھا وہ عربی کے مدرس تھے، پرنسپل صاحب نے آپ کی ذہانت وذکاوت دیکھ کر آپ سے پوچھے بغیر گورنمنٹ کو سفارش کر کے ڈپٹی کلکٹر کا عہدہ منظور کرالیا، جب آپ کو اس کی اطلاع دی تو آپ نے تعلیم وتدریس کو مقدم سمجھ کر منظور نہیں کیا اور آخر کار جب مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے سنہ ۱۲۸۳ھ میں دیو بند کا مدرسہ قائم کیا، اس وقت ان کے بلاوے پر ڈیڑھ سو روپئے کی ملازمت چھوڑ کر تیس روپئے تنخواہ پر دیو بند آگئے'' (۱)

مولانا محمد یعقوب ایک ڈیڑھ سال بنارس میں رہے، بنارس سے انسپکٹر تعلیم بنا کر رڑکی بھیج دیئے گئے، رڑکی میں تھے کہ سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک برپا ہوئی، جس کی وجہ سے مولانا ملازمت ترک کر کے وطن آگئے۔

اگر چہ مولانا کے سنہ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد میں شامل ہونے کی صراحت نہیں ملی، مگر یہ ممکن نہیں تھا کہ خاندان اور بستی کے ذمہ داران تو اس میں شریک ہوں اور مولانا اس سے یکسو رہے ہوں مگر مولانا پر مقدمہ وغیرہ قائم نہیں ہوا، اس لئے جب حالات درست ہو گئے تو انگریز گورنمنٹ نے ڈیڑھ سو روپئے ماہوار کے حساب سے ان چھ مہینوں کی تنخواہ (جو اس تحریک کی نذر ہو گئے تھے) مولانا کو بھجوائی، مگر مولانا نے اس کو لینے سے انکار کر دیا۔ حکیم امیر احمد عشرتی نے لکھا ہے کہ:

''ڈیڑھ سو روپیہ کی تنخواہ پر ڈپٹی انسپکٹری پر سہارنپور تشریف لائے، پھر کچھ عرصہ بعد غدر سنہ ۱۸۵۷ء کا واقعہ پیش آیا، اس کے فرو ہونے کے بعد آپ کو چھ مہینہ کی تنخواہ نو سو روپئے بھیجا گیا اور اصل جگہ پر بلائے گئے (مگر) آپ نے وہ نو سو روپیہ واپس فرمایا اور کہا میں نے ان چھ مہینہ میں کچھ کار سرکار انجام نہیں دیا اس لئے میں یہ روپیہ نہیں لے سکتا۔ اور نیز ملازمت سے بھی استغنائی ظاہر کی اور متوکلاً متفرق کار کرتے رہے۔'' (۲)

(۱) مولوی نذیر احمد دہلوی احوال وآثار، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ص ۷۹ (لاہور: ۱۹۷۱ء)

(۲) تمہید مکتوبات مولانا محمد یعقوب نانوتوی۔ مرتبہ حکیم امیر احمد عشرتی نانوتوی۔ ص: ۳ (مطبع احمدی علی گڑھ: ۱۳۲۷ھ)

۱۸۵۷ء کے بعد کی ملازمت اور ذرائع معاش

سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد کئی سال تک حالات ایسے سنگین تھے کہ اس وقت کہیں آنا جانا مشکل تھا، ہر طرف تفتیش اور سرکاری مخبروں کا جال بچھا ہوا تھا، معمولی اطلاع اور شکایت پر سزائیں ملتی تھیں اور بہت سے افراد بلا وجہ اور معقول ثبوت کے پھانسیوں پر لٹکا دیئے گئے اور ان لوگوں کے لئے تو جینا دوبھر ہوگیا تھا جو اس تحریک میں شریک یا شریکوں کے مددگار یا عزیز وقریب تھے، ان کو ہر وقت مخبری گرفتاری اور زمین و جائداد کی ضبطی کے احکامات کا ڈر رہتا تھا۔ جان کا خطرہ اور نقصانات سے کہیں بڑھ کر تھا اس لئے اکثر ذمہ دار اصحاب اپنے گھروں سے دور اِدھر اُدھر روپوش رہتے تھے۔

ابھی حالات درست ہوکر معمول پر نہیں آئے تھے، حضرت حاجی امداد اللہ اور حضرت مولانا محمد قاسم کی تلاش جاری تھی، حاجی صاحب کی مخبری اور گرفتاری کے لئے انگریزوں نے بڑے انعام کا بھی اعلان کر رکھا تھا، اس لئے حضرت حاجی صاحب ہجرت کے ارادہ سے ہندوستان سے نکل گئے تھے، مگر حضرت مولانا محمد قاسم وطن کے اطراف ونواح میں نیم روپوشی کی زندگی گذار رہے تھے۔ جب حالات کے بہتر ہونے کے آثار نظر نہ آئے تو حضرت مولانا نے حج کا ارادہ کرلیا، حضرت مولانا محمد یعقوب وغیرہ چند اور اصحاب واعزاء بھی ساتھ ہوگئے، بہ ظاہر یہ سفر اطلاع واعلان کے بغیر خاموشی سے ہوا ہوگا، جمادی الاخریٰ سنہ ۱۲۷۷ھ (۱۵ نومبر ۱۸۶۰ء) میں نانوتہ سے چلے، پنجاب ہوتے ہوئے کراچی سندھ پہنچے، شعبان کے آخر میں کراچی سے کشتیوں کا سفر ہوا، آخر ذی قعدہ (۳ جون ۱۸۶۱ء) میں مکہ مکرمہ حاضر ہوئے، بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہوئے، حج کی سعادت حاصل کی اور حضرت حاجی امداد اللہ سے شرفِ نیاز اور دولت استفادہ حاصل رہی، صفر سنہ ۱۲۷۸ھ (اگست ۱۸۸۱ء) میں واپسی کا سفر شروع ہوا جمادی الاخریٰ (ستمبر ۱۸۶۱ء) میں ایک سال سفر میں گزار کر بخیر وعافیت وطن واپس پہنچے، اسی دوران حکومت نے عام معافی کا اعلان کر دیا تھا، جہاں چاہے بے تکلف آجا سکتے تھے۔ واپسی کے بعد وطن میں قیام تھا، پھر ملازمت کے سفر پر نکل گئے۔

مطبع مجتبائی میرٹھ

حضرت مولانا محمد قاسم کے پرانے نیاز مند منشی ممتاز علی نے اس موقع پر پھر یہ کوشش کی کہ ان کو حضرت مولانا نانوتوی کی صحبت حاصل رہے اور مولانا کی خدمت کا دوبارہ موقع ملے، حضرت مولانا ان کے اخلاص کے قدرداں تھے، اس لئے یہ درخواست و دعوت منظور فرما کر میرٹھ چلے گئے، میرٹھ میں منشی جی کا مطبع مجتبائی نشر و طباعت کا کام کر رہا تھا، حضرت مولانا محمد قاسم اس سے وابستہ ہو گئے، مولانا محمد یعقوب صاحب بھی وہیں آ گئے تھے اور وہ بھی مطبع کی متوقع اور پرانی کتابوں کو تازہ اشاعت کے لئے تیار اور صحیح کرتے رہتے تھے، حضرت مولانا محمد قاسم بھی اسی مقصد سے میرٹھ قیام فرماتے تھے۔

مطبع مجتبائی کی اس ملازمت کے دوران میں حضرت مولانا محمد قاسم اور مولانا محمد یعقوب نے جن کتابوں کی تصحیح فرمائی ان میں سے خاص کتاب اور اہم تحفہ مظاہر حق شرح مشکوٰۃ نواب قطب الدین دہلوی کے آخری حصہ کی تصحیح ہے۔ یہ حصہ اگر چہ اس سے پہلے ایک مرتبہ مطبع فخر المطابع دہلی سے مولانا سبحان بخش شکار پوری کی تصحیح سے چھپ چکا تھا، مگر اس میں بعض غلطیاں رہ گئی تھیں، دونوں صاحباں نے حضرت مصنف کے اصل مسودہ سے مقابلہ کر کے اسکے مطابق کیا اور اس میں بھی جو فروگذاشتیں رہ گئی تھیں ان کی تصحیح کی، یہ تصحیح شدہ نسخہ سنہ ۱۲۸۱ھ (۶۵-۱۸۶۴ء) میں چھپنا شروع ہوا تھا سنہ ۱۲۸۲ھ میں اس کی طباعت پوری ہوئی۔

میرٹھ میں اس زمانہ میں ایک اور مطبع، مطبع ہاشمی کے نام سے بھی تھا، حضرت مولانا محمد قاسم اور مولانا محمد یعقوب اس سے بھی وابستہ رہے۔ مجتبائی اور ہاشمی سے وابستگی ایک ساتھ تھی اس میں کچھ فاصلہ اور کیا ترتیب و تفصیل تھی، اس کا علم نہیں، بظاہر آخر میں مطبع ہاشمی سے وابستہ تھے، میرٹھ وغیرہ کی اپنی ملازمت کا مولانا محمد یعقوب نے خود بھی ضمناً مختصر ساذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''احقر اس زمانہ میں بریلی اور لکھنؤ ہو کر میرٹھ میں اسی چھاپہ خانہ میں نوکر

ہوگیا، اس وقت ایک جماعت نے مسلم پڑھی احقر بھی اس میں شریک رہا۔"(۱)

مگر راقم سطور کو حضرت مولانا کی ملازمتوں کی اس ترتیب کی واقعیت میں شبہ ہے، جس کی مولانا محمد یعقوب کی تصحیح کی ہوئی مطبوعہ کتابوں سے تائید ہوتی ہے۔ سنہ ۸۲-۱۲۸۱ھ (۶۵-۱۸۶۴ء) میں نول کشور میں تصحیح کتب پر مامور تھے اور احیاء العلوم کی درستگی و طباعت میں مولانا محمد مظہر کے معاون تھے اور اس کے فوراً بعد مطبع صدیقی بریلی میں علمی کتابوں کی صحت و ترجمہ میں معاون نظر آتے ہیں اور جب مدرسہ دیوبند (دارالعلوم) قائم ہوا اس وقت مولانا بریلی میں تھے اس لئے بظاہر مولانا کی تحریر میں کچھ غلطی ہے، ملازمت کے مراحل نول کشور، میرٹھ، بریلی، دیوبند صحیح معلوم ہوتے ہیں، تاہم مزید معلومات کی ضرورت ہے۔

مطبع نول کشور لکھنؤ سے وابستگی

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا محمد یعقوب کا میرٹھ میں قیام بہت زیادہ نہیں ہوا، میرٹھ کی ملازمت ترک کر کے لکھنؤ چلے گئے تھے، لکھنؤ میں منشی نول کشور کا پریس قائم ہو چکا تھا اور تیزی سے ترقی کر رہا تھا، اس مطبع اور ادارہ سے اسلامی علوم وفنون کی بڑی بڑی اہم اور نہایت نادر کتابیں بہت اہتمام اور آب و تاب سے چھپ رہی تھیں، مولانا محمد یعقوب سے پہلے مولانا محمد مظہر نانوتوی مصحح کی حیثیت سے وہاں ملازم تھے، مولانا کی کشش اور اہل مطبع کی طلب و پذیرائی مولانا محمد یعقوب کو بھی مطبع منشی نول کشور لے گئی، مولانا نے مولانا محمد مظہر کی شرکت میں کئی بڑی کتابوں کے مقابلہ اور تصحیح کی خدمت نہایت دقت نظر اور خوبی کے ساتھ سرانجام دی۔ ان کتابوں میں حضرت امام غزالی کی احیاء العلوم بطور خاص شامل تھی، نول کشور میں اور بھی کئی کتابوں کی تدوین ان کے علمی نسخوں سے مقابلہ اور تصحیح وحاشیہ نگاری میں مولانا محمد یعقوب کی خدمات شامل رہی ہوں گی مگر افسوس ہے کہ ان سب کے نام راقم سطور کے علم میں نہیں، تاہم اس قسم کی جن چند کتابوں کا علم ہو سکا ہے ان کا تالیفات کے ذیل میں ذکر آئے گا۔

(۱) حالات طیب یا تذکرہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی مع تصحیح حواشی مشمولہ قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی احوال وآثار باقیات ومتعلقات ص:۲۰۶

مطبع صدیقی بریلی میں

جب مولانا محمد یعقوب لکھنؤ گئے تھے تقریباً اسی وقت مولانا محمد احسن نے اپنی جائے ملازمت بریلی میں کتابوں کی طباعت واشاعت کے لئے ایک بڑا ادارہ قائم کیا تھا، ایک پریس بھی لگالیا تھا، جس کو مطبع صدیقی کے نام سے موسوم کیا تھا، اس ادارہ اور مطبع نے برصغیر ہند میں علوم اسلامیہ کی بڑی بیش قیمت خدمات انجام دیں اور ایک سے ایک اعلیٰ کتابیں شائع کیں جو متاعِ علم و ہنر ہونے کے علاوہ جاذب قلب ونظر بھی تھیں، مولانا محمد احسن کو جلد ہی اس کی ضرورت ہوگئی تھی کہ ان کے مطبع میں اعلیٰ سے اعلیٰ ترین استعداد کے علماء جمع ہوں، اس سلسلہ کے ایک بدر منیر مولانا محمد یعقوب نانوتوی بھی تھے۔

مولانا محمد احسن نے مولانا محمد یعقوب کو لکھنؤ سے بریلی بلا کر اپنے کام میں شامل کرلیا بریلی میں مولانا محمد یعقوب کی یہی خدمت تھی، بعض قرائن وتحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں اور علمی مشاغل بھی رفیق تھے، درس وتعلیم سے بھی وابستگی ہوگئی تھی اور فتاویٰ وغیرہ بھی لکھے: بریلی میں مولانا محمد یعقوب کی ڈیڑھ سو روپئے تنخواہ تھی اور بہت یکسوئی سے کام کر رہے تھے کہ دیوبند میں مدرسہ اسلامیہ (جو بعد میں دار العلوم کے نام سے شہرۂ آفاق ہوا) شروع ہوگیا، مدرسہ میں اعلیٰ درجہ کے مدرس کی ضرورت تھی حضرت مولانا محمد قاسم کی ہدایت مشورہ پر مدرسہ کے سرپرستان یا خود حضرت مولانا نے مولانا محمد یعقوب کو مدرسہ کے لئے مدرس اول بنا کر بلایا۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت اور اجازت وخلافت

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی جس خانوادہ اور ماحول میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے تھے، اس میں ذاتی اصلاح اور تربیت اخلاق اور باطنی کمال حاصل کرنے کیلئے کسی شیخ کامل اور ممتاز مرشد سے رابطہ، ان سے بیعت اور اصلاح وتربیت کے مراحل سے گزرنا جیسے ایک عام معمول تھا، کم اہل علم تھے جو کسی بڑے شیخ کے دامن سے وابستہ نہ ہوں اور کم پرانے خاندان تھے جن کا کسی سے اصلاحی سلسلہ سے تعلق نہ ہو۔ نانوتہ اور رام پور خود کئی

بڑے مشائخ کا وطن تھا، یہاں سے کئی سو برس کے دوران کئی کاملین اٹھے، جن سے بہت فیض ہوا، اس لئے مولانا محمد یعقوب صاحب کا کسی شیخ یا سلسلہ ارشاد و تربیت سے وابستہ ہونا ان کی خاندانی اور وطنی روایت کے عین مطابق تھا۔

معلوم نہیں کہ زمانہ طالب علمی میں مولانا یعقوب صاحب کو مشہور مشائخ میں کس سے زیادہ نسبت و مناسبت تھی اور کیا ان کا بھی حضرت مولانا گنگوہی کی طرح حضرت شاہ عبدالغنی سے بیعت ہونے کا خیال تھا یا کوئی اور شخص یا سلسلہ جلوہ نگاہ تھا مگر جب مولانا کی جماعت کے ممتاز رفقاء اور دوست حضرت مولانا رشید احمد اور مولانا محمد قاسم حضرت حاجی صاحب سے بیعت ہو گئے تو مولانا نے بھی حاجی صاحب کا دامن پکڑ لینے کا فیصلہ کر لیا ہوگا۔

مولانا حضرت حاجی صاحب کو بچپن سے جانتے تھے، حاجی صاحب اپنی رشتہ داریوں کی وجہ سے نانوتہ آیا کرتے تھے، حاجی صاحب کے رشتہ دار اور مولانا مملوک العلی کا خانوادہ غالباً ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں تھیں، اس لئے مولانا اور ان کے رفیق و عزیز حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے بچپن کا خاصا وقت حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں گزرا، حاجی صاحب کی ان پر عنایت کی نظر تھی، وہ ان کو چھوٹی چھوٹی کام کی باتیں سکھاتے اور بتاتے تھے، حضرت نے دونوں صاحبان کو کتابوں کی جلدیں بنانی سکھائیں، حضرت حاجی صاحب سے مولانا محمد یعقوب کا یہ پہلا تعارف اور گھر جیسا رابطہ تھا، ظاہر ہے کہ یہ رابطہ وقت گزرنے کے ساتھ بڑھا ہوگا، خصوصاً اس وقت مولانا کے دل میں حضرت حاجی صاحب کی قدر و منزلت بہت زیادہ ہوگئی ہوگی، جب مولانا نے یہ دیکھا ہوگا کہ ان کے والد ماجد، حضرت مولانا مملوک العلی جو حضرت حاجی صاحب سے عمر میں بہت بڑے اور اپنے دور کی بڑی مقبول اور ممتاز شخصیت ہیں، حاجی صاحب کا بہت احترام کرتے ہیں اور ان سے ایسی دوستی رکھتے تھے کہ جب گھر سے دہلی جاتے تو تھانہ بھون اور کاندھلہ میں ضرور ٹھہرتے، اور جب دہلی سے گھر آتے اس وقت بھی دونوں جگہوں پر اترتے، ظاہر ہے کہ مولانا کے ننھے اور معصوم دل نے اس کا خاص اثر لیا ہوگا اور حاجی صاحب کی وقعت اور قدر و منزلت کا گہرا رنگ طبیعت میں جم گیا ہوگا۔ نیز مولانا یعقوب یہ بھی دیکھتے تھے کہ

جب کبھی حضرت حاجی صاحب دہلی آجاتے تو مولانا مملوک العلی کی تعلیمی مصروفیات کم ہوجاتیں اور حاجی صاحب کے ساتھ وقت گزرتا، حضرت مولانا مملوک العلی کا حاجی صاحب سے یہ رابطہ اور معاملہ ایسا نہیں تھا جس سے مولانا محمد یعقوب صاحب متاثر نہ ہوتے، مولانا مملوک العلی کی حاجی صاحب سے حسن ارادت، حاجی صاحب کے کمالات، بزرگی اور محاسن کی وجہ سے حاجی صاحب کی محبت وعقیدت کے جذبات روز افزوں ترقی کرتے رہے ہوں گے، تاہم حاجی صاحب سے محبت ومناسبت اپنی جگہ، لیکن اس وقت تک حاجی صاحب سے بیعت واسترشاد کا غالباً ارادہ نہیں ہوا تھا۔

مولانا حضرت حاجی صاحب سے کب بیعت ہوئے اس کی تاریخ یا سنہ مجھے نہیں ملا، لیکن منشی محمد قاسم نیا نگری کے نام مولانا کے ایک خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اجمیر کی ملازمت کے دور تک حاجی صاحب سے وابستہ نہیں ہوئے تھے، اجمیر وغیرہ کی ملازمت سے جب تقریباً پانچ سال بعد واپس ہوئے، اس وقت حاجی صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ دیا ہوگا، مولانا نے منشی قاسم کے نامہ میں تحریر فرمایا ہے کہ:

> ’’تم اس عاجز کا حال اہل اجمیر سے معلوم کرو کہ کس قدر ابتر تھا کہ ستار اور راگ ناچ میں گزرتی تھی، نماز وجماعت وتقویٰ وطہارت سے کچھ بحث نہ تھی، اب ہر چند کہ بہ ظاہر اور باتوں سے توبہ کی اور حضرت مرشد الانام حاجی مدظلہم کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا‘‘(۱)

یہ دور وہ ہے جب سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک شروع ہو چکی تھی، مولانا ملازمت چھوڑ کر وطن آگئے تھے، غالباً اسی وقفہ میں اس تحریک کے دنوں میں یا حاجی صاحب کے سفر حجاز سے پہلے کسی وقت مولانا حضرت حاجی صاحب سے بیعت ہوئے ہوں گے، مولانا کی سیر وسلوک اور سفر اصلاح ومعرفت کی تفصیل بھی مفقود ہے، مولانا کو حاجی صاحب سے بیعت کے بعد کامل استفادہ اور رابطہ کا موقع ہی نہیں ملا تھا کہ حاجی صاحب ہندوستان سے مکہ

(۱) مکتوب مولانا، ص: ۱۸ (طبع تھانہ بھون ۱۹۲۹ء مشمولہ بیاض یعقوبی محمد یعقوب نانوتوی، مکتوب محررہ یکم رجب ۱۲۸۳ھ، (۱۰ر نومبر ۱۸۶۶ء) (مطبع احمدی، علی گڑھ: ۱۳۲۷ھ)

معظّمہ کے لئے روانہ ہو گئے، اس وقت مکہ معظّمہ خط و کتابت کی سہولت کم تھی اور چونکہ حاجی صاحب سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک میں سرگرم رہے تھے اور انگریز حکومت کے ممتاز باغیوں میں سے تھے اسلئے حاجی صاحب سے خط و کتابت اور روابط میں احتیاط کی ضرورت تھی۔

اگر چہ حضرت مولانا تھانوی کے ایک ملفوظ میں ہے کہ:

''جب حاجی صاحب تھانہ بھون تشریف رکھتے تھے رات کو سب ذاکر شاغل لوگ اٹھتے، یہ بھی اٹھتے مگر حضرت اوروں کو تو منع نہیں فرماتے تھے ان کو فرماتے، سو رہو ہم وقت پر خود اٹھا دیں گے، اس ناز سے ان کی تربیت فرمائی گئی'' (۱)

مگر خود مولانا محمد یعقوب کی تحریرات سے یہی جھلکتا ہے کہ ان کو حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں زیادہ وقت گزارنے کا سنہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کم موقع ملا ہے، مولانا تھانوی نے جس واقعہ کا ذکر فرمایا ہے ممکن ہے کہ اسی درمیانی وقفہ کا ہو۔

بعد میں جب حضرت حاجی صاحب نے حضرت مولانا محمد قاسم کو اجازت وخلافت سے نواز دیا جو حضرت مولانا محمد یعقوب کے استاد اور مطاع بھی تھے اس وقت مولانا یعقوب صاحب نے حاجی صاحب سے گذارش کی کہ مجھے بھی مولانا محمد قاسم سے استفادہ کی اجازت دیجئے اور مولانا کو بھی اس کی ہدایت فرمادیں کہ وہ میری سرپرستی اور تربیت منظور کرلیں، معلوم نہیں کہ اس درخواست کا کیا ہوا، مگر مولانا یعقوب غالبًا حاجی صاحب کی ہی تربیت میں رہے، مولانا کی نسبت حضرت مولانا محمد قاسم کا ایک فقرہ حکیم الامت مولانا تھانوی نے نقل فرمایا ہے کہ:

''ہر شخص میں کچھ نہ کچھ کھوٹ ہوتا ہے، جو مجاہدہ سے زائل ہوتا ہے مگر مولوی یعقوب صاحب بے کھوٹ پیدا ہوئے'' (۲)

اصلاح و تربیت کے مرحلہ سے گزر کر سفر سلوک مکمل ہوا اور حضرت حاجی صاحب نے مولانا کو اجازت و بیعت سے نوازا اور ارشاد و تلقین کی ہدایت فرمائی۔

---

(۱) و (۲) جمیل الکلام (مجموعہ ملفوظات، مولانا تھانوی شامل در الفصل للوصل) مرتبہ مولانا قاضی جمیل احمد تھانوی۔ ص: ۳۷ (طبع اول، بارہ بنکی: ۱۳۵۳ھ)

اجازت کب ملی اس کی تعیین ممکن نہ ہوئی، لیکن مولانا کے حضرت حاجی صاحب کے نام ایک خط سے یہ جھلکتا ہے کہ مولانا کو حاجی صاحب نے سفر ہجرت کے دو یا تین سال بعد مکہ معظمہ سے خط کے ذریعہ سے اجازت بیعت سے مفتخر فرمایا تھا، یہ واقعہ غالباً سنہ ۱۲۷۸ھ کا ہوگا۔ حضرت مولانا کے حضرت حاجی صاحب کے نام جو مکتوبات دریافت ہیں ان میں سے پہلا خط غالباً حضرت حاجی صاحب کے اجازت نامہ کے جواب میں ہے، مولانا نے تحریر فرمایا ہے کہ:

''بے اختیار یہ عرض ہے کہ یہ غلام روسیاہ کسی جانب اور کسی طور سے مناسبت آپ کے خدام سے نہیں رکھتا، باللہ العظیم اپنے آپ کو متوسلین کی جماعت میں گنتے ہوئے یوں یوں شرم دامن گیر ہوتی ہے، کہ ایسے شیخ آفتاب عالم کے ایسے ناکارہ خادم یہ ننگ خام بدنام کنندہ نکونامی چند ہرگز لائق خدمت اور توجہ نہیں مگر فیض عام مخدوم کا وہ ہے جس نے اس ذرہ کو خاک سے اٹھایا اور سربلندی کو پہنچایا، عنایت نامہ جواب وعریضہ امین ہمدست مکرمی مفتی حاجی فضل حق صاحب مرحمت فرمایا اور وہ کچھ امور زبانی ارشاد فرما بھیجے کہ ہر چند سب طرف اپنے آپ کو دیکھا مگر کہیں اس کا مصداق نہ پایا، معاذ اللہ

آپ کا ارشاد غلط نہیں اور یہ یقین اور ایمان ہے کہ کوئی دخل اور احتمال غلط اور وہم وخیال کا شائبہ نہیں مگر ہاں آپ حسن ظن کو کام فرماویں اور عیوب سے چشم پوشی اور خطاؤں سے درگذر اور عطا درعطا، اور عنایت پر عنایت فرماویں اور اس خاک ناپاک کو جو چاہیں بنادیویں: یداللہ فوق ایدیھم وبی یبطش کا وہ ہاتھ مصداق ہے بندہ کو ارشاد حضور سے کوئی جائے درگذر اور عذر نہیں، یہ بندہ کو تصدیق ہے کہ کاملین جس سے چاہتے ہیں اپنا کام لے لیتے ہیں''(۱)

افسوس ہے کہ اس خط پر تاریخ تحریر درج نہیں، بہر حال مولانا لمبے مجاہدہ کے بعد اجازت سے نوازے گئے اور بعد میں خود مرشد کامل ہوئے۔

(۱) مکتوب شامل در مجموعہ مکتوبات قلمی، بنام حضرت حاجی امداد اللہ، فوٹو اسٹیٹ مملوکہ راقم سطور

حضرت حاجی صاحب کے خلفاء میں سے جو (تقریباً ۱۲۹۰ھ یا اس کے بعد) حیات تھے (۱) ان میں حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم کے بعد، مولانا محمد یعقوب کا نام آتا تھا، حضرت حاجی صاحب کی تحریروں اور مکتوبات میں جہاں کہیں ان حضرات کا نام آیا ہے۔ یہی ترتیب ہے۔

حضرت حاجی صاحب کے مولانا محمد یعقوب صاحب کے نام متعدد مکتوبات مرقوماتِ امدادیہ میں شامل ہیں، حاجی صاحب مولانا کو اپنے قائم مقام اور ممتاز وابستگان طریقت میں شمار فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ تحریر فرمایا:

''مولوی قاسم اور محمد یعقوب کو بجائے فقیر سمجھ کر ان کی خدمت سے فیضیاب ہوں'' (۲)

ایک خط میں خود مولانا محمد یعقوب صاحب کو تحریر فرمایا ہے:

فقیر آں عزیزوں کے مرتبہ کو بلند پاتا ہے آں عزیزوں کو بھی ظاہر ہوگا'' (۳)

شیخ محمد بن جعفر کتانوی مغربی دنیائے اسلام کے شہرہ آفاق جلیل القدر مصنف، علامہ عبدالحئی کتانوی مغربی کے پوتے تھے، دو مرتبہ ہندوستان آئے پہلا سفر شعبان سنہ ۱۳۴۳ھ (مارچ سنہ ۱۹۲۵ء) میں ہوا تھا، ان سفروں کے دوران شیخ محمد بن جعفر نے ہندوستان کی دینی علمی سرگرمیوں کا مشاہدہ کیا، علمی آثار و مقامات دیکھے، خصوصاً بمبئی کراچی، دہلی اور دیوبند وغیرہ کا سفر کیا، یہاں کے مدرسوں اور دینی مرکزوں میں گئے، نامور علماء سے استفادہ کیا اور اجازت حدیث حاصل کی، دہلی میں سلسلہ دیوبند کے دو

(۱) حیات تھے کا اضافہ اس لئے کیا گیا ہے کہ حضرت حاجی صاحب کے جملہ خلفاء میں علم و فضل اور مراتب درجہ کے لحاظ سے حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم کے بعد مولانا سید عبدالرحمان کاندھلوی کا نام تھا جس کو شمائم امدادیہ کے مؤلف اور حضرت مولانا تھانوی نے بھی علامہ عصر کے خطاب سے یاد کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان دونوں کے بعد مولانا عبدالرحمان صاحب کو اجازت ہوئی مگر علامہ عبدالرحمان کی نوجوانی میں مکہ معظمہ میں عین حالت طواف میں ۱۲/ ذی الحجہ سنہ ۱۲۷۸ھ (جون ۱۸۶۲ء) کو وفات ہوگئی تھی اس لئے ان کا زیادہ شہرہ نہیں ہوا تاہم حضرت حاجی صاحب کے خلفاء کی فہرست میں نام شامل ہے۔

(۲) ''واوشاں را بعد سلام دعائے خیر فرمودہ دہند کہ مولوی محمد قاسم صاحب و مولوی محمد یعقوب را بجائے فقیر دانستہ از خدمت شاں فیضیاب بودہ باشند'' مرقومات امدادیہ مکتوب ص: ۱۸، مکتوبہ غالباً رجب ۱۲۸۳ھ (دہلی: ۱۹۷۹ء)

(۳) ''واحقر مرتبہ آں عزیزاں را بلندی یابد، انشاءاللہ تعالیٰ بر آں عزیز ہم ظاہر خواہد شد'' مکتوب ص: ۱۳، ۱۲، مرقومات امدادیہ

بڑے علماء مولانا عبدالعلی میرٹھی اور مولانا حکیم عبدالوہاب نابینا سے ملاقات ہوئی تھی، اور مولانا عبدالعلی نے مسلسل بالاولیۃ کی اور مولانا حکیم عبدالوہاب نابینا نے حدیث فقہ اور تفسیر کی اجازت عامہ عنایت فرمائی تھی۔

مولانا محمد یعقوب کو مولانا مملوک العلی سے اجازت وخلافت کی ایک روایت

اس ضمن میں شیخ محمد بن جعفر نے جو کچھ لکھا ہے اس میں نئی قابل توجہ یہ اطلاع ہے کہ مولانا محمد یعقوب نانوتوی کو اپنے والد حضرت مولانا مملوک العلی سے طریقہ چشتیہ اور قادریہ میں اجازت بیعت حاصل تھی اور مولانا مملوک العلی کو حضرت شاہ عبدالعزیز سے اجازت حاصل تھی۔

مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے اسی سلسلہ سے حکیم نابینا کو اجازت دی اور حکیم نابینا نے محمد بن جعفر کتانوی کو، مگر تعجب ہے کہ اس سلسلۂ اجازت وخلافت کا مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی کسی تحریر یا بیاض میں ذکر نہیں، وہ خود کو صرف حضرت حاجی امداداللہ کا مجاز بیعت لکھتے ہیں اور حضرت مولانا محمد یعقوب کے خاص مستفید اور شاگرد حکیم الامت مولانا تھانوی نے بھی اس کا کہیں ذکر نہیں کیا، اس لئے شیخ محمد جعفر کتانوی کی یہ اطلاع مشتبہ معلوم ہوتی ہے، بظاہر اس میں سہو ہوا اور سلسلہ اجازت میں کہیں التباس ہو گیا ہے۔(۱)

مدرسہ اسلامیہ (دارالعلوم) دیوبند کی مسند صدارت پر

دیوبند میں مدرسہ اسلامیہ یا دارالعلوم دیوبند کا قیام ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے، چند برگزیدہ علماء اور اہل بصیرت اصحاب جنہوں نے سنہ ۱۸۵۷ء سے پہلے مغل اقتدار کے غروب کے ایام دیکھے تھے، اور پھر سنہ ۱۸۵۷ء کے خوں آشام روح فرسا واقعات کا بھی مشاہدہ کیا۔ خون مسلم کی ارزانی اور مسلمانوں کی صدیوں کی محنت کو ضائع ہوتا دیکھا تھا اور دہلی کے بڑے بڑے مدارس، علمی مرکزوں اور خانقاہوں کے لٹنے اور ان کو تودۂ خاک بننے

---

(۱) سفرنامہ شیخ محمد بن جعفر کتانی رحلتان الی الهند. مجلة الدراسات الاسلامیه۔ اسلام آباد، پہلی قسط شمارہ ۲، ۲۰۰۰ء ص: ۲۴۲

کے سب واقعات ان کے علم میں تھے اور وہ دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں کا صدیوں کا اقتدار اور نظام حکومت بے نام ونشان ہو گیا ہے، اب بظاہر اُمید نہیں کہ ویسے افراد، ویسے دینی ادارے، ویسے علم ومعرفت کے مرکز پھر قائم ہونگے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی جانتے تھے کہ مسلمانوں کو بہر حال یہیں رہنا ہے تو اُن کی تعلیم وتربیت کے لئے کچھ انتظام کرنا ضروری ہے اور ان کی زندگیوں کو دین کے راستہ پر لانے کی کوشش کرنا سب سے پہلی ذمہ داری اور اہم ترین فریضہ ہے، یہی فکر اور خیال تھا جو دارالعلوم دیوبند کی شکل میں ظاہر ہوا۔

مدرسہ دیوبند کیلئے پہلی تحریک ۱۵ر محرم الحرام سنہ ۱۲۸۳ھ (۳۰ر مئی ۱۸۶۶ء) کو ہوئی تھی، اسی دن مشورہ ہوا، اسی دن عام چندہ ہوا اور اسکے فوراً بعد تعلیم کا آغاز کر دیا گیا۔ تعلیم کب شروع ہوئی اس کی صراحت مجھے نہیں ملی، لیکن اس مدرسہ کی بنیاد کچھ ایسے اخلاص سے قبولیت کی گھڑی میں رکھی گئی تھی کہ اس کو ترقی کرتے دیر نہیں لگی، یہ دینی علمی پودا پھلتا پھولتا چلا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سایۂ عالم اور ایک تنار درخت بن گیا، ایسا مبارک درخت اور ایسا پر بہار اس کا ماحول اور ثمرات کہ جہاں اس کی شاخ پہنچ گئی وہاں دین کے باغیچے لہلہانے لگے، دین کی سرسبزی کی صورت نکل آئی اور علم وعمل کے گلستاں آباد ہو گئے، مدرسہ کے افتتاح کی خبر ملتے ہی دور دراز سے علم کے شوقین طلبہ اور اہل علم وصلاح دیوبند آنے شروع ہو گئے اور سال اول کے اختتام یعنی شعبان سنہ ۱۲۸۳ھ تک مدرسہ میں انہتر (۶۹) طلبہ ہو گئے تھے۔

مدرسہ کی ابتداء کے ساتھ ہی مولانا ملاّ محمود صاحب دیوبندی کو مدرس مقرر کر دیا گیا تھا، مولانا محمود کی تنخواہ پندرہ روپے ماہانہ مقرر ہوئی تھی مگر مدرسہ کے ذمہ داروں کو اس کا احساس تھا کہ یہ تنخواہ کم ہے مگر آمدنی نہیں تھی اس لئے اضافہ مشکل تھا۔ اسی دوران مولانا محمد یعقوب صاحب بھی جو بریلی میں ملازم تھے حضرت مولانا محمد قاسم کی ہدایت پر دیوبند آگئے تھے، مولانا کو مدرسہ کا مدرس اول یا صدر مدرس مدرسہ مقرر کیا گیا تھا، مولانا کا مدرسہ میں کب تقرر ہوا، کیا کیا کتابیں اور کس قدر طلبہ مولانا کے سپرد تھے، اس کی صراحت مجھے نہیں ملی، لیکن مدرسہ کی پہلے سال کی روداد میں مولانا کا نام اور مولانا کی خدمات کا

اعتراف موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ کے آغاز کے بعد مولانا جلد ہی مدرسہ میں آگئے تھے۔ دیوبند آنے سے پہلے جس ملازمت پر تھے اس کی تنخواہ ڈیڑھ سو روپئے مہینہ تھی مگر مولانا کا خدمت دین کا جذبہ، صبر وقناعت اور اپنے بڑوں کی بات بلا تامل مان لینے کا مزاج دیکھئے کہ اکابرین مدرسہ خصوصاً حضرت مولانا محمد قاسم کی ہدایت پر وہ تنخواہ چھوڑ کر مدرسہ دیوبند (دارالعلوم) آگئے، جہاں صرف بیس روپئے ماہوار تنخواہ تھی، ایک سال کی ملازمت کے بعد تنخواہوں میں اضافہ ہوا، مولانا ملاّ محمود کی تنخواہ پندرہ روپے سے بیس روپئے اور مولانا محمد یعقوب کی بیس سے تیس روپے ماہانہ ہوگئی تھی۔ مدرسہ کی سنہ ۱۲۸۴ھ (۶۸-۱۸۶۷ھ) کی روداد میں لکھا ہے:

> ''ناظرین کیفیت سال گزشتہ کو یاد ہوگا کہ ہم نے اپنی تمنا درباب ترقی تنخواہ مدرسین ظاہر کی تھی چوں کہ عنایت الٰہی سے چندہ میں ترقی پائی، لہٰذا اول ترقی مدرسین عمل میں آئی۔
>
> مولوی محمد یعقوب صاحب مدرس اعلیٰ کی بیس روپے سے تیس روپے اور مولوی محمود صاحب مدرس دوم کی تنخواہ پندرہ روپے سے بیس روپے۔''(۱)

مدرسہ میں پہلا سال تعلیم اور اسکے اثرات

یہ خیال ہوتا ہے کہ مدرسہ میں جس وقت سے تعلیم کا باقاعدہ مرتب سلسلہ شروع ہوا کتابوں اور جماعتوں کی درجہ بندی کی گئی اسی وقت سے مولانا محمد یعقوب مدرسہ میں قیام فرماتھے۔ اگرچہ اس سال کی (سب سے پہلی اور ابتدائی) روداد میں مولانا کے ذمہ درسی کتابوں اور طلبہ کی نشان دہی نہیں کی گئی، مگر اس روداد کے بعض اقتباسات کی روشنی میں یہ طے کیا جاسکتا ہے کہ درجہ اول کی سب سے پہلی اور اعلیٰ ترین چار جماعتیں حضرت مولانا کے سپرد کی گئی ہونگی، یہاں چاروں جماعتوں کے نصاب کی ترتیب وار تفصیل نقل کی جاتی ہے:

(۱) روداد مدرسہ عربی (دارالعلوم) دیوبند (سال اول ۱۲۸۴ھ) ص ۳

''درجہ اول:	میں صحیح مسلم، صحیح بخاری، مؤطا''	مسودہ ترجمہ اردو سے عربی میں اور عربی سے فارسی میں
درجہ دوم:	بیضاوی شریف، ہدایہ، ابوداؤد، ابن ماجہ، نسائی	بتفصیل بالا
درجہ سوم:	جلالین، مشکوۃ، ترمذی، تاریخ یمینی، علم ادب	بتفصیل مذکور
درجہ چہارم:	میبذی، شرح عقائد، توضیح تلویح، سراجی، فرائض، دیوان متنبی	بتفصیل مذکور

پہلے سال میں پہلے درجہ میں تین، دوسرے درجہ میں دو، تیسرے میں بھی دو اور چوتھے میں کل سات طالب علم تھے، مگر چوتھے درجہ کے طلبہ میں سے ایک طالب علم جن کے نام کی صراحت نہیں سالانہ امتحان میں موجود نہیں تھے۔

شعبان سنہ ۱۲۸۳ھ (دسمبر ۱۸۶۶ء) میں سالانہ امتحان ہوا، حضرت مولانا محمد قاسم، مولانا مہتاب علی اور مولانا ذوالفقار علی صاحبان نے امتحان لیا، ممتحنین، مدرسین کی کاوش اور طلبہ کی محنت واستعداد دیکھ کر نہایت خوش ہوئے اور ان کی تحسین فرمائی، حضرات ممتحنین کی رائے گرامی ملاحظہ ہو:

> ''ہم نے کئی روز تک امتحان مفصل ہر دفعہ کا لیا اور حتی الوسع سوالات مشکل پوچھے اور نمبر ہر طالب علم کے ہر ایک کتاب کے بابت لگائے، حال مدرسہ بالعموم قابل تعریف پایا۔ مدرسان کی سعی اور طلبہ کی محنت اس امتحان سے بخوبی ثابت ہے، ہم کارگذاری مدرسان سے نہایت خوش ہیں۔
>
> العبد محمد قاسم دیوبندی۔ العبد مہتاب علی دیوبندی۔ العبد ذوالفقار علی دیوبندی''(۱)

مدرسہ کے ذمہ داروں نے اپنے مدرسہ کے مدرسین کی محنت اور اسکے نتائج پر دلی

(۱) روداد مدرسہ عربی (دارالعلوم) دیوبند (سال اول ۱۲۸۳ھ، ۱۸۶۷ء) قلمی ص:۱۲

مسرت کا اظہار کیا، انتظامیہ کے کلماتِ تشکر بھی مدرسہ کی روداد میں چھپے ہیں جو درجہ ذیل ہیں:

''مولانا محمد یعقوب صاحب مدرس نانوتوی خلف مولانا مولوی مملوک علی صاحب مرحوم، اور مولوی محمد محمود صاحب دیو بندی کی محنت اور توجہ کا شکریہ ہم پر واجب ہے کیوں کہ اُنکی توجہ سے اس تھوڑے سے عرصہ میں بہت کچھ ترقی اور استعداد ہوئی''۔(۱)

یہ پہلے سال (یا پہلی ششماہی) کی کارگذاری یا روداد تھی، آنے والے ہر اک دن میں مولانا کی مدرسہ سے وابستگی میں، تعلیمی محنت میں، تربیتی توجہ اور مدرسہ کو زیادہ سے زیادہ آگے بڑھانے، ترقی دینے اور توسیع دلانے پر کوشش میں اضافہ ہوتا رہا، جس سے مدرسہ کی علمی رفعت و شان اور تعلیم کا معیار بلند سے بلند ہوتا گیا اور طلبہ کی تعداد روز افزوں بڑھتی رہی۔

حضرت مولانا مدرسہ میں صرف مدرس نہیں تھے، بلکہ اسکے تمام شعبوں پر نظر رکھتے تھے ہر ایک کی توسیع کے لئے کوشش فرماتے، جو خدمات مدرسہ کی طرف سے سپرد بھی نہیں تھیں ان کو بھی انجام دیتے، مدرسہ کے انتظامی معاملات کی خبر رکھتے تھے، طلبہ کی نگرانی و تربیت فرماتے، مدرسہ کے مقامی تعاون کے لئے جد و جہد کرتے اور مدرسہ کے مفوضہ اسباق کے علاوہ اپنے فارغ اوقات میں اور کتابوں کا درس دیتے۔ کچھ دنوں کے بعد اپنے شوق سے طلبہ کو طب پڑھانے کا سلسلہ بھی شروع فرما دیا تھا، جس نے بعد میں بہت ترقی کی اور طب جو مدرسہ کا مستقل شعبہ بن گیا، یہاں تک اس کی بذات خود ایک اہمیت ہوگئی، اور اس کو اہم طبی مرکز کا درجہ مل گیا، مدرسہ کے مہتمم کی طرف سے اس شعبہ کے لئے جراحی، آپریشن کے نئے آلات (New Instruments) کی ضرورت کا اعلان ہوا اور ان کی فراہمی کی استدعاء کی گئی تھی، حضرت مولانا جب تک زندہ رہے اور علوم کے علاوہ طب کی تعلیم و تدریس بھی اہم مصروفیات میں شامل رہی۔

اگر چہ اس وقت مدرسہ میں دار الافتاء قائم نہیں ہوا تھا لیکن مدرسہ کے مرکز علماء

---

(۱) روداد مدرسہ عربی (دار العلوم) دیو بند (سال اول ۱۲۸۳ھ ۱۸۶۷ء) قلمی ص: ۱۰،۱۱

ہونے کی وجہ سے جلد ہی دینی مسائل کی تحقیق پر مشتمل سوالات آنے شروع ہو گئے تھے، ان کے فقہی جوابات بھی مولانا تحریر فرماتے تھے۔

مولانا کا مدرسہ کے ساتھ ایک اور بڑا تعاون یہ تھا کہ مدرسہ کے آغاز کے بعد سب سے پہلی ضرورت کتابوں کی تھی، جن کا بیک وقت کثیر تعداد میں حاصل ہونا سخت مشکل تھا، مولانا نے اس مشکل کو یوں حل کیا کہ اپنے والد ماجد حضرت مولانا مملوک العلی کے کتب خانہ اور اپنے ذاتی ذخیرہ کا بڑا حصہ مدرسہ کو استفادہ کیلئے مستعار دے دیا، جس سے مدرسہ کی انتظامیہ کو غیر معمولی راحت اور مسرت ہوئی۔ مدرسہ کے علماء اس کتب خانہ سے بے تکلفی سے استفادہ فرماتے اور بار بار مولانا محمد یعقوب کے ممنون وشکر گذار ہوتے کہ مولانا نے اس دولت بے بہا سے فائدہ اٹھانے کا موقع بخشا، مدرسہ کی انتظامیہ بھی اس احسان سے گرانبار تھی، مدرسہ کی سالانہ روداد میں کئی مرتبہ بہت ممنونیت اور تشکر کے جذبات کے ساتھ اس عطیہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

حضرت مولانا کا مدرسہ سے رابطہ بڑھتے بڑھتے اس درجہ کا ہو گیا تھا کہ مدرسہ اور حضرت مولانا محمد یعقوب گویا ایک جان دو قالب بن گئے تھے، جس کا چھوٹے بڑے ہر ایک کی زبان پر تذکرہ اور اقرار واعتراف تھا کہ مدرسہ کی ترقی، مقبولیت اور پذیرائی میں منجملہ اور اسباب کے اس کا بھی خاص دخل اور حصہ ہے کہ مولانا محمد یعقوب اس کے خاص سر پرست اور مربی ہیں۔ حضرت حاجی امداد اللہ، حضرت مولانا کے طالب علمی اور نوعمری سے واقف سرسید احمد خاں اور حضرت مولانا کے متوسلین اور اہل مدرسہ سب ہی اس کے قائل تھے اور یہی تذکرہ فرماتے رہتے تھے۔

حضرت حاجی امداد اللہ کے دل میں مولانا محمد یعقوب کی کیسی قدر ومنزلت تھی اور وہ مدرسہ دیوبند (دار العلوم) کے لئے مولانا محمد یعقوب کو کس قدر ضروری اور اہم سمجھتے تھے اور حضرت حاجی صاحب کے ارشاد کے مطابق مدرسہ کو مولانا سے کس قدر فائدہ تھا اس کا اس ہدایت نامہ اور خط سے علم ہوتا ہے جو حضرت حاجی صاحب نے حاجی عابد حسین صاحب کو لکھا تھا، اس میں تحریر ہے کہ:

"مولوی محمد یعقوب کی خاطر داری اور دل جوئی کو اپنے اوپر لازم کرلیں بظاہر مدرسہ کا وجود ایسے ہی بزرگوں کی موجودگی سے ہے۔"(۱)

نیز مولانا کے ایک متوسل (اور دیو بند کی نواحی بستی املیا کے ایک فاضل شخص) جو مدرسہ کو اول دن سے دیکھنے والوں میں سے تھے، مدرسہ پر اپنی مثنوی میں مولانا کے مرتبہ اثرات اور اہمیت کا یوں ذکر کرتے ہیں:

آپ ہیں دیبن کو وجہ افتخار — مدرسہ کو باعث عز و وقار
آپ ہی ہیں افتخارِ مدرسہ — آپ ہی پر ہے مدارِ مدرسہ
آپ کا چندے نہ ہووے گر قیام — درہم برہم ہوں سب دیبن کے کام
آپ اک اس جا نہیں تھے چند روز — زخم بھرنے نہیں پائے ہنوز
آپکے قدموں کی برکت کے سبب — اور ہی دیبن کو جلوہ ہے اب (۲)

اسی مثنوی کے اس ضمن میں چند شعر اور لائق مطالعہ ہیں، مولانا عبدالکریم فروغ کہتے ہیں:

خیر و برکت مدرسے میں جو ہے اب — ہے وہ حضرت پیر و مرشد کے سبب
یہ سمجھ لینا ذرا اے مہرباں — آج کیا کچھ حق نے دی ہے اس کو شاں
ہے بدولت جس کے یہ سب عز و جاہ — کیسا کچھ ہوگا وہ مقبولِ الٰہ
اور کیا رتبہ ہے اس سے فوق تر — جملہ اہل دین کے ہیں وہ پیشوا
جا نشیں خاص ختم المرسلین — ہادیٔ دین سرگروہ مہتدیں
سنت احمد پہ ہے ان کا عمل — ہیں وہ مقبولِ خدائے عز و جل
حکمت و معقول و منقول و ادب — ایک گوشے میں طبیعت کے ہیں سب
اور جو کچھ علم ہیں دل میں نہاں — ذکر میں ان کا نہیں کرتا یہاں
کیوں کہ اس لائق نہیں میری زباں — کچھ کرے تشریح جو انکی بیاں (۳)

---

(۱) مرقوماتِ امدادیہ، ص:۱۱۵

(۲) مثنوی فروغ، مولانا عبدالکریم فروغ دیو بندی، ص:۳۶ (دیو بند ۱۳۹۸ھ) (۳) مثنوی فروغ ص ۳۹، ۴۰

سرسید احمد کو اگرچہ مدرسہ کے طریقۂ کار سے بہت اتفاق نہیں تھا، مگر وہ دینی مدرسوں اور تعلیم گاہوں کی ضرورت وافادیت کے پوری طرح قائل تھے اور خصوصاً دیوبند کے علماء میں سے متعدد بڑے علماء اور مولانا ذوالفقار علی، حضرت مولانا محمد قاسم اور مولانا محمد یعقوب صاحبان سے ذاتی طور سے زمانۂ طالب علمی سے واقف تھے اور انکے کمالات کے دل کی گہرائیوں سے معترف بھی تھے۔ بہرحال سرسید احمد نے مدرسہ کی ایک رپورٹ (سالانہ روداد) پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس مدرسہ کے چلنے کی وجہ سے وہاں مولانا محمد قاسم جیسے مادرزاد ولی اور مولانا محمد یعقوب صاحب جیسے مخلص کا ہونا ہے، اس میں مولانا محمد یعقوب کے متعلق جو الفاظ لکھے ہیں وہ یہاں درج کیے جاتے ہیں:

''دوسرا بڑا سبب مولوی محمد یعقوب کا ہے جو مدرس اول اس مدرسہ کے ہیں، انہوں نے صرف پینتیس روپیہ ماہواری مدرسہ سے لینا قبول کیا ہے اور قناعت وزہد سے اس قدر قلیل میں اوقات بسر کرتے ہیں، اگر وہ نہیں تو کیا دوسرا کوئی شخص اس قلیل مشاہرہ پر ان کے علوم پڑھانے کو ملے گا، جو اس مدرسہ میں پڑھائے جاتے ہیں۔ بس یہ مدرسہ صرف انہیں بزرگوں کی دعاء پر قائم ہے'' (۱)

اور مدرسہ کے کارکنان اور طلبا بھی مولانا کے مقام ومرتبہ کو خوب پہچانتے تھے اور جانتے تھے کہ مدرسہ کی دینی علمی تعلیمی ترقیات میں حضرت مولانا بھی ایک بنیادی فرد اور رکن رکین کی حیثیت رکھتے ہیں اور مدرسہ کے ابتدائی بزرگوں اور سرپرستوں کی جماعت ایسی مخلص ایسی باخدا اور اس طرح ایک دوسرے سے جڑی ہوئی اور گندھی ہوئی تھی کہ اس میں ہرایک اگرچہ دوسرے کو خود پر ترجیح دیتا تھا اور بنیادی کام اور اثر اسی کا سمجھتا تھا، اپنی خدمات اور قربانی کو معمولی ذمہ داری کی ادائیگی سے تعبیر کرتا، لیکن ان میں سے ہرایک کی حیثیت ایسی تھی کہ ایک کے جگہ سے ہٹ جانے یا ہل جانے سے پوری عمارت ہلتی اور متاثر ہوتی تھی، اس میں حضرت مولانا محمد یعقوب بھی شامل تھے۔

(۱) ماہنامہ تہذیب الاخلاق، ص: ۵۸ (جمادی الثانی ۱۳۰۴ھ)

مولانا کے شاگرد

تعلیم و تربیت مولانا کے والد ماجد کا خاص ورثہ اور مولانا کا بنیادی ذوق تھا، جس کی وجہ سے مولانا نے ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ کو بھی نامنظور کر دیا تھا۔ اسی میں زندگی بسر فرمائی۔ بنارس اور اجمیر کالج میں اور دارالعلوم دیوبند میں مسند صدارت کو زینت بخشی، اس خاصے طویل دور میں طلبہ کی ایک بڑی تعداد نے مولانا سے استفادہ اور تلمذ حاصل کیا ہوگا، جس میں وہ صاحب وافراد بھی ہونگے جو بعد میں علمی دنیا کے افق پر بہت آب وتاب سے چمکے اوران کی خدمات، علمی کارناموں اور بصیرت نے ملک وملت کے مختلف شعبوں ومحکموں کو عزت وتوانائی بخشی، مگر اور علماء کی طرح مولانا کے بھی بہت کم شاگردوں کے نام ہمارے علم میں ہیں۔

حضرت مولانا نے دارالعلوم دیوبند میں تقریباً بیس سال تک مختلف علوم وفنون کی بیسیوں کتابوں کا درس دیا، اور ہر ایک کتاب پڑھنے والوں کی ایک مستقل جماعت ہوتی تھی، کچھ طالب علموں کو درسیات کے مقررہ نصاب کے علاوہ بھی متعدد کتابیں پڑھائیں یعنی یہ چشمۂ علم اپنی زندگی تک پوری آب وتاب سے بہتا رہا، اس کے کناروں پر تشنگانِ علم اترتے اور سیراب ہوتے رہے۔

مولانا کے فیض یافتگان میں سے چند شاگردوں کے نام یہاں ذکر کئے جاتے ہیں، اسی سے اس گلستاں کی طراوت اور گل پروری کا اندازہ ہوجائے گا۔

مولانا سید احمد حسن امروہوی (نیز شاگرد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی)

مولانا محمد مراد پٹنی فاروقی (بانی مدرسہ مرادیہ، مظفر نگر)

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی

مولانا حکیم حسین شریف بنگلوری

حضرت مولانا خلیل احمد انبہٹوی (مہاجر مدنی)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی

مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی

مولانا منفعت علی دیوبندی

مولانا عبد القدیر دیوبندی

مولانا عبد المومن دیوبندی

مولانا فتح محمد تھانوی جلال آباد

مولانا امیر باز خاں سہارنپوری

مولانا کرامت اللہ خاں دہلوی

مولانا سید محمد عرفان ٹونکی

مولانا جمال الدین سہنسپوری، بجنوری، دہلوی

مولانا شیخ عمر حنفی رامپوری

جب دار العلوم دیوبند اور اسلامی مدرسوں کے موجودہ دور کا آغاز ہو رہا تھا اس وقت تعلیم کے ساتھ تربیت ضروری تھی، اور تربیت کا لازمہ اصلاح باطن و سفر معرفت تھا، طالب علم اپنے اپنے ذوق اور سہولت وصلاحیت کے مطابق اپنے استادوں اور مشائخ میں سے کسی کے دامن تربیت سے جڑ جاتے اور فیض و کمال کی منزلیں طے کرتے رہتے تھے، جو استاد و علماء تعلیم کے ساتھ تربیت باطن میں بھی عالی مرتبہ رکھتے تھے ان میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب ممتاز تھے۔ دار العلوم کے متعدد طالب علم اور دوسرے اصحاب بھی مولانا کے توسط سے ارشاد و معرفت میں جڑے اور فیض معنوی حاصل کیا۔

دار العلوم کے زمانۂ تعلیم میں جن طلبہ نے مولانا سے بطور خاص اور ہمہ جہت وسیع استفادہ کیا ان میں سب سے ممتاز اور سرفہرست نام حضرت مولانا کے عزیز اور محبوب شاگرد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کا ہے۔ حضرت مولانا تھانوی نے حضرت مولانا محمد یعقوب سے تلمذ کے علاوہ بھی کثیر استفادہ کیا، مولانا کے علوم، افادات و کلمات محفوظ کئے، حضرت الاستاذ کے کمالات وصفات کو اپنے میں سمونے کی بھرپور کوشش کی اور مولانا کے علوم کے ترجمان و نمائندہ اور مولانا کی زبان ثابت ہوئے۔ یہاں ایک اور نام مولانا کے ایک مسترشد مولانا محمد قاسم نیانگری کا بھی لیا جا سکتا ہے جنہوں نے مولانا کے گرامی قدر مکتوبات کو سینہ سے لگا کر محفوظ رکھا اور ان کو مرتب کر کے ایک قابل قدر دینی علمی یادگار چھوڑی۔

علمی خدمات، تصانیف وتراجم اور تصحیح کتب

مولانا نے اپنے اساتذۂ حدیث حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری اور مولانا محمد قاسم نیز اس دور کے اور ممتاز علماء کی محتاط اور قدیم روایت کے مطابق معاش کے لئے تصحیح کتب کی ملازمت پسند کی تھی، جس کی تفصیلات گذر گئی ہیں۔ان ملازمتوں کے زمانہ میں غالباً بیسیوں کتابوں کی تصحیح کا موقع ملا ہوگا مگر راقم کو ایسی صرف چند کتابوں کا علم ہے جن کے قلمی نسخوں کا مقابلہ اور تصحیح یا حاشیہ لکھنے کے کام میں حضرت مولانا کی شرکت رہی، یہ کتابیں بخاری شریف، مظاہر حق کی آخری چوتھی جلد، امام غزالی کی احیاء العلوم اور کنز الدقائق ہیں۔

صحیح بخاری مرتبہ محشّی حضرت مولانا احمد علی میں تعاون

حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کی شائع کی ہوئی صحیح بخاری جس کے آخری تین پاروں کا حاشیہ حضرت مولانا محمد قاسم کا لکھا ہوا ہے محتاج تعارف نہیں، اس نسخہ کی تصحیح میں مولانا محمد یعقوب کی بھی شرکت رہی تھی، مولانا محمد یعقوب صاحب نے (حالات طیب مولانا محمد قاسم میں) صحیح بخاری کے اس حاشیہ کی تالیف اور اس میں حضرت مولانا محمد قاسم کی شرکت کا تو ذکر کیا ہے مگر اس میں اپنے تعاون اور خدمت کا کچھ تذکرہ نہیں کیا، لیکن بخاری شریف کے اس نسخہ کے اصل مرتب ومحقق، حضرت مولانا احمد علی کی بیاض میں اس نسخہ کی اشاعت سے متعلق جو اندراجات ہیں ان سے اس بڑے کام میں ضمناً مولانا محمد یعقوب کی شرکت کا علم ہوتا ہے۔

حضرت مولانا احمد علی کی بیاض میں اس نسخہ کی طباعت کے جملہ اخراجات کا ذکر ہے، اور جو اہم ترین اصحاب اس عظیم خدمت میں معاون تھے، ان کو دیئے گئے معاوضہ یا کتاب کے نسخوں کا بھی تذکرہ ہے، بیاض کی ترتیب اندراج سے معلوم ہوتا ہے کہ جن کو نقد معاوضہ دیا گیا ان کو نسخہ عطا نہیں ہوا، اور جن صاحبان کو نسخہ دیا ان کو غالباً نقد کچھ نہیں دیا گیا، نقد کا حساب کئی صاحبان کا ہے اور نسخہ عنایت کرنیکا صرف ایک، حضرت مولانا احمد علی

نے لکھا ہے کہ:

''بابت تصحیح دو نسخہ، حافظ احمد علی یک، محمد یعقوب یک''

اس اشاعت کے کل تین سو پچیس نسخے چھپے تھے، جن میں سے ایک حضرت مولانا احمد علی نے خود رکھا دوسرا نسخہ اس نسخہ کی درستگی، مقابلہ اور صحت کے کام میں تعاون کی وجہ سے محمد یعقوب کو دیا گیا جو اس کام میں حضرت مولانا احمد علی کے راست معاون تھے، یعنی اس خدمت کے اعتراف کے طور پر حضرت مولانا نے ان کو یہ نسخہ عنایت فرمایا تھا، یہ خدمت (غالباً) حضرت مولانا محمد یعقوب کے سفر اجمیر و بنارس سے پہلے انجام دی گئی ہوگی اور (جیسا کہ اوپر ذکر ہوا) شاید اسی مصروفیت کے سبب مولانا محمد یعقوب (حضرت مولانا مملوک العلی کی زندگی کے آخری سال) میں اپنے مکان کوچہ چیلان میں قیام پذیر نہیں تھے بلکہ (غالباً) مطبع احمدی میں یا اس کے قریب کہیں رہتے تھے۔

مگر افسوس! اس کا پتہ نہیں چلتا کہ مولانا محمد یعقوب نے اس کام میں کس طرح کا تعاون یا شرکت فرمائی تھی، ممکن ہے متن صحیح بخاری کے قلمی نسخوں سے مقابلہ اور صحت میں مولانا کی خدمت شامل ہو، یا پھر حواشی کے مآخذ اور حضرت مولانا احمد علی کے لکھے ہوئے حاشیوں کی اصول سے مطابقت اور نظر ثانی کا کام مولانا یعقوب کے سپرد کیا گیا۔ ہو سکتا ہے کچھ اور کام ہو مگر بہر صورت اس نہایت عظیم الشان، بابرکت، سراپا تقدس اور غیر معمولی خدمت میں جو مولانا یعقوب کے سپرد فرمائی ہوگی اس کی بھی کچھ خاص وجہ ضرور ہوگی کہ:

''دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر''

تصحیح مظاہر حق ربع چہارم مظاہر حق مولانا نواب قطب الدین دہلوی کا ایک بڑا علمی دینی کارنامہ اور مشکوٰۃ المصابیح کے لئے نہایت اہم شرح ہے۔ اس شرح کی ابتدائی طباعتیں اس وجہ سے بہت اہم ہیں کہ وہ حضرت نواب صاحب کی نگرانی اور سرپرستی میں چھپی تھیں اور بعض کی تصحیح اس زمانہ کے نامور اور برگزیدہ علماء نے کی تھی۔ انہیں طباعتوں میں مظاہر حق کی آخری جلد کی وہ طباعت بھی ہے جو پہلی مرتبہ مولانا سبحان بخش شکارپوری کی تصحیح سے اور دوبارہ مولانا محمد قاسم نانوتوی اور

مولانا محمد یعقوب کی نظر ثانی اور کاوش سے چھپی تھی۔

ذکر آچکا ہے کہ پہلے سفر حج سے واپسی کے بعد مولانا محمد قاسم اور مولانا محمد یعقوب صاحب میرٹھ کے مطبع مجتبائی میں تصحیح کتب کیلئے قیام فرماتے، اس وقت منجملہ اور کتابوں کے مظاہر حق کے ربع چہارم کی تصحیح بھی فرمائی تھی، جس کو منشی ممتاز علی صاحب نے اہتمام سے شائع کیا تھا، اس طباعت کے خاتمۃ الطبع میں اسکا تفصیل سے ذکر آیا ہے، اس کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے جس سے اس میں مولانا محمد یعقوب کی شرکت اور انکے کام کا علم ہوگا۔ منشی ممتاز علی نے حمد ونعت کے بعد مظاہر حق کا کسی قدر تعارف کرایا ہے، پھر لکھا ہے کہ:

''تمہ ربع رابع کا حافظ نیاز احمد صاحب کے مطبع میں اور کچھ منشی باقر کے چھاپہ خانہ میں اور ابواب فضائل صحابہ وغیرہ کہ اس وقت چھپی نہ تھی اس کو تتمہ ربع رابع کا حافظ نیاز احمد صاحب نے چھاپا مگر اکثر کا غیاا اور چھاپا درست نہ تھا بلکہ بعضی جائے تو بالکل مسودہ کی صورت تھی اب باعانت الٰہی اس عاجز کو توفیق اس کے چھاپنے کی ہوئی۔

باجازت من توکل علی اللہ اواخر ن بارہ ۱۲۸۱ھ الیاس میں شروع کیا اور بامداد تصحیح ونظر جناب عالم ظاہر و باطن زیب اودوارزیست زماں جامع معقول ومنقول جناب حاجی حافظ مولوی محمد قاسم صاحب وفرزند رشید جناب مولانا مولوی مملوک العلی صاحب مرحوم مولوی محمد یعقوب صاحب نانوتوی وناظم بے بدل وناثر بے مثل عالم جامع واعظ اہل ایمان آمر بالمعروف مولوی محمد حسین صاحب..........

یک سال کی شب وروز کی مشقت و محنت میں جیسے جی چاہتا تھا انجام کو پہنچی اور بہر صورت تکمل وتمام ہوئی فالحمدللہ''

تقریباً ایک صفحہ کے خاتمۃ الطبع کے اختتام پر تواریخ کے عنوان کے تحت پہلے عربی کا ایک فقرہ تاریخ ہے: قدتم الکتاب بعون اللہ الجواد الوھاب (۱۲۸۲ھ) اس کے بعد پانچ قطعات تاریخ مولانا محمد یعقوب کے لکھے ہوئے ہیں، جن میں چار قطعے اردو میں اور ایک فارسی میں ہے، مذکورہ قطعات کے صرف مصرع ہائے تاریخ ملاحظہ ہوں:

لکھ ترجمہ چھاپا ہے احادیث نبی کا ۱۲۸۲ھ		کہ حدیث نبی مترجم ہے ۱۲۸۲ھ
زہے طبع مظاہر زیب دادا ۱۲۸۲ھ		مظاہر حق چہ زیبا سال طبعش ۱۲۸۲ھ

مقبول ہوئی کتاب چھاپی کیا مرغوب ۱۲۸۲ھ

اس کے بعد دو قطعاتِ تاریخ اور ہیں جو دونوں فارسی میں ہیں، ان میں سے پہلا حضرت مولانا محمد قاسم کا لکھا ہوا ہے دوسرا مولانا عبدالحق پرقاضوی کا، اسی پر اس نسخہ کا اختتام ہو گیا ہے، آخری سطر میں منشی ممتاز علی مطبع مجتبائی کے دستخط و مہر ثبت ہے۔

تصحیح احیاء العلوم حضرت امام غزالی کی شہرۂ آفاق تصنیف احیاء العلوم منشی نول کشور کے شہرۂ آفاق مطبع نے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس وقت مولانا محمد مظہر اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی مطبع نول کشور میں مصحح کی حیثیت سے ملازم تھے، اسلئے یہ بہت اہم اور نازک خدمت انہیں دونوں کے سپرد کی گئی۔ مولانا محمد مظہر صاحب نے احیاء کے آٹھ نسخوں کی مدد سے اس منصوبہ کو مکمل کیا، مولانا کے پیش نظر موجود سات قلمی نسخوں میں سے ایک نسخہ اعلیٰ درجہ کا تصحیح کیا ہوا اور نامور علماء کی تصحیحات سے مزین تھا اور نسخے بھی قابل قدر تھے اور مطبوعہ نسخہ مصر کی اولین طباعت بھی سامنے تھی، ان نسخوں کی مدد سے اپنے نسخے کی تصحیح و تکمیل کی، ضروری اعراب لگائے اور مختصر حاشیہ بھی لکھا، اس کام میں خصوصاً تصحیح کی خدمت میں مولانا محمد یعقوب مولانا محمد مظہر کے رفیق تھے۔ مولانا محمد مظہر نے اس نسخہ کے خاتمۃ الطبع میں اپنے کام کا کسی قدر تعارف کرایا ہے جس میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

"وقد اعاننی فی ذالک اخی و حبیبی الشاب الصالح ووزیری فی المصالح البارع فی العلوم المولوی محمد یعقوب بن......"

اس نسخہ پر بھی مظاہر حق کے مذکورہ نسخہ کی طرح متعدد قطعاتِ تاریخ درج ہیں جن میں پانچ قطعات مولانا محمد یعقوب کی فکر کا نتیجہ ہیں، جو عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اس نسخہ کی طباعت ۱۲۸۱ھ میں مکمل ہوئی تھی، اس کا ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

تصحیح شرح وقایہ

مولانا محمد یعقوب کی تصحیح سے شائع کتابوں میں شرح وقایہ بھی شامل ہے، مولانا نے یہ کام غالبًا اپنے دہلی قیام کے زمانہ میں کیا ہوگا، یا ممکن ہے اجمیر میں اس کا موقع ملا ہو، بہر حال یہ کتاب مطبع احمدی دہلی سے شعبان ۱۲۷۱ھ (اپریل مئی ۱۸۵۵ھ) میں چھپی تھی، اس پر مولانا محمد یعقوب کی تصحیح کی صراحت ہے۔

منہاج العابدین امام غزالی کے اردو ترجمہ مرتبہ مولانا محمد منیر میں شرکت

مولانا محمد منیر نانوتوی نے امام غزالی کی مشہور کتاب منہاج العابدین کا اردو میں ترجمہ کیا تھا، جو سراج السالکین کے نام سے چھپا۔ مولانا محمد یعقوب نے اس ترجمہ کی اصلاح اور نظر ثانی کی اور مختصر حاشیہ لکھا۔ تصحیح ونظر ثانی اور حاشیہ نویسی تینوں کا مولانا محمد منیر نے کتاب کی تمہید میں اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے:

> ''(میں نے ان دونوں مولانا محمد احسن اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی) سے معاونت لی چنانچہ انہوں نے باوجود قلت فرصت کے اس ترجمہ کی اصل سے مطابقت کی بلکہ مولوی محمد یعقوب صاحب نے بکمال عنایت خود تحشیہ فرمایا۔''

یہ حاشیہ لکھنے کا خود مولانا محمد یعقوب صاحب کی تحریر میں بھی ذکر ہے۔

مطبع احمدی اور اس دور کے مطابق اور کتابوں کے معمول کے مطابق اس کتاب کے آخر میں بھی متعدد قطعاتِ تاریخ شامل ہیں جن میں صفحہ ۲۲۸ پر درج تین قطعات جو عربی فارسی اور اردو میں ہیں دوسرے صفحہ ۲۲۹ پر پہلے دو قطعات مولانا محمد یعقوب صاحب کے ہیں، جن میں صراحت ہے کہ اس کا حاشیہ مولانا محمد یعقوب نے لکھا ہے۔ عنوان یہ ہے:

’’قطعہ تاریخ عربی از جناب مولوی محمد یعقوب صاحب نانوتوی متخلص بہ گمنام محشی ایں کتاب‘‘

یہ ترجمہ پہلی مرتبہ ۱۲۸۰ھ میں مطبع صدیقی بریلی سے چھپا تھا اس نسخہ کے آخر میں اس نسخہ کے کاتب کا نام بھی درج ہے جو عبرت کے لئے نقل کیا جاتا ہے۔ لکھا ہے:

’’بقلم کم ترین خلائق متھولال عفی عنہ‘‘

دیکھئے پچھلے ڈیڑھ سو برس میں ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے، جب ہمارے اندر دین کی کچھ رمق اور غیرت تھی تو دوسرے ہماری تقلید میں مسرت محسوس کرتے تھے اور اب ہم دوسروں کے بے دام غلام بنے ہوئے ہیں:.........آہ!

ان نینوں کا یہ ہی بسیکھ وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

ضیاء القلوب تالیف حضرت حاجی امداد اللہ کا عربی میں ترجمہ

ضیاء القلوب اصول سلوک اور حضرت حاجی امداد اللہ کے طریقۂ ارشاد و تعلیم و تربیت اور ان خانوادوں کی تعلیمات پر حضرت حاجی صاحب کی بہت ممتاز اور گویا دستاویزی تالیف ہے جو حضرت حاجی صاحب نے سنہ ۱۲۸۴ھ (۶۸-۱۸۶۷ء) میں تالیف فرمائی تھی اور حضرت حاجی صاحب کی ہدایت کے مطابق اسی وقت مطبع مجتبائی میرٹھ سے چھپ گئی تھی۔ حضرت حاجی صاحب کا حلقۂ ارشاد و ارادت چونکہ بہت وسیع تھا جو ہندو پاک کے علاوہ حجاز، عرب ممالک اور ترکی تک پھیل گیا تھا، اسلئے ضرورت ہوئی کہ اس دستاویزی کتاب کا عربی میں ترجمہ کرایا جائے تاکہ وہ مریدین اور متعلقین جو فارسی یا اردو سے استفادہ نہیں کر سکتے اس سے فائدہ اٹھا سکیں، اس ضرورت کی وجہ سے حضرت حاجی صاحب نے مولانا محمد یعقوب صاحب کو ہدایت فرمائی کہ وہ اس کا ترجمہ کریں، مولانا محمد یعقوب صاحب اس خدمت کو بجالائے، ترجمہ کر کے حاجی صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا، حضرت حاجی صاحب کو اس سے بہت خوشی ہوئی اور اس کی طباعت کا اہتمام کیا اور ہدایت فرمائی۔

چونکہ یہ کتاب یا ترجمہ قطعاً ناپید و نایاب ہے اور ایک قلمی نسخہ کے علاوہ اس کا کوئی اور نسخہ اس وقت تک دریافت نہیں ہوا اس لئے اس کا کسی قدر مفصل تعارف مناسب ہے۔

اس ترجمہ کی تمہید یا ابتدائی کلمات کا درج ذیل الفاظ سے آغاز ہوا ہے:

"الحمد لله الذی ضیاء القلوب والارواح، والشکرله نورالبواطن والا شباح، وجودُه محیط لا اول له ولا آخروجوده، بحرلا تنفی منه ولا تنهر، نورالسمٰوٰت والارض، قیوم لا یئوده حفظهما، لاتأخذه سنة ولا نوم، بیده رفعهما وخفضهما، ذکره نورالقلوب والاسرارغذاء الارواح ومطئی طی الا ستار، الفکرفیه حیران اعمی، والعقل سعی الی جنابه فأحفیٰ، ظهرمن جبین کل موجود نوره، وبطن فی قلب کل شی ظهوره، اول لا اول قبله آخر لاآخر مثله، لیس کمثله شیء، بل حقیقة کل شی واصله، من راقب اسمَه زمانا فازالی المطلوب، ومن لاحظ نوراً منه نجیٰ من مدانات الکروب.

والصلوة علی ابی الا شباح وروح الا واح ثمرة الکون مغزاه مبداء الکمالات و منتهٰا ها، أولی الصفات و أخراها جمع الجمع بالانفراد، وواسطة العقود بلانفاد، سیدالانبیاء، وتاج الاصفیا، وامام الرسل، هادی السبل، سید العالم سیدنا ومولانا محمد نالمصطفی صلی الله علیه وعلی اصحابه، اساطین الهداء ونجوم الاهتداء، ورجوم الاشقیاء، الاشداء علی الکفار رحماء بینهم، اذلة علی المومنین اعزة علی الکفٰرین، نفوسهم مرتاضة مطمئنة بنور النبوة، واخلاقهم سمحة لطیفة بکمال الفتوة، وعلی آله سفینة النجاة ووسیلة الشفاعاة، انموذج النبی والبقیة وابقیة ومعاکس الکمالات.

ومظاهر النقیة بلا تقیة و بعد. فیقول محمد یعقوب النانوتوی۔ غفرالله ذنوبه وسترعیوبه فان قضاء الله جذ بنی الی زیارة الحرم بل شرفنی بلَثْمِ تراب اقدام حضرت الشیخ المحترم میزاب رحمة

للعالمين نورجمال الكاملين لامنيتهى أوصافه العلىٰ بلسانى و قلمى، ولا استطيع ان افوه بها بنطقى و فمى فانه امداد الله، جاء نا بصورة بشرية وصفات ملكيَة وانوارمحمدية واخلاق رحمية، سيدى و سندى ووسلية يومى وغدى حضرة الشيخ الحاج امداد اللّٰه الفاروقى الچشتى القادرى النقشبندى السهروردى ثم المهاجر المكى ادام الله ظِله علينا و افاض من بر كاته الينا.

اس کے بعد مولانا محمد یعقوب صاحب نے اس کی وجہ ترجمہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قضاوقدر کے فیصلے نے مجھے حرم شریف کی زیارت کی توفیق بخشی، اس موقع سے اپنے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ کی خدمت عالی میں حاضر ہونے کی سعادت بھی میسر آئی، تو معلوم ہوا کہ اس علاقہ (حجاز اور عرب) کے حضرت حاجی صاحب کے مریدین و مستفیدین ضیاء القلوب سے استفادہ کے خواہشمند ہیں، جو فارسی میں ہے، اس لئے اس کتاب کے عربی ترجمہ کی ضرورت ہے۔ جب اس کا اصرار ہوا تو میں نے استخارہ کیا اور اپنے پیرومرشد اور کتاب کے مؤلف حضرت حاجی امداد اللہ سے اس کی اجازت طلب کی، اس کے بعد اس کام کا ارادہ کیا اور اللہ کا شکر ہے کہ اس کے فضل کرم سے یہ خدمت میرے ہاتھوں انجام پائی اور جو کام میرے سپرد کیا گیا تھا وہ امید کے مطابق پورا ہو گیا۔ آخر میں حضرت شیخ اور اس کتاب سے استفادہ کرنے والوں سے دعاء کی درخواست کی ہے کہ حق تعالیٰ شانہ اس خدمت کو کامیاب فرمائے اور مجھے اس کا اجر وثواب عطا فرمائے۔

قلت: ضياء القلوب بالعربى کے اعداد سے اس کا سنہ ترجمہ ۱۲۹۵ھ معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب کی تمہید کا حاصل ہے اس کے بعد اصل کتاب کے ترجمہ سے پہلے چار پانچ سطروں میں حضرت حاجی صاحب کا نام نامی لکھا ہے، تحریر ہے:

”قال الشيخ الاجل الاكمل اوحَدُ زمانه وشمس اوانه تاج الشريعة سَبّاح تَيّار الحقيقة سياح بيداء الطريقة، عريف العالم ابن بجد ته جهنة الحق و قطب كرته ميزاب الرحمة، سيدى و سندى مرشدى شيخى و شيخ العالمين قطب الزمان و غوث العالم حضرة

الحاج امداد الله مدالله تعالیٰ ظلال کرامتہ الی یوم التناد آمین."

پھر اصل فارسی کتاب کا ترجمہ شروع ہو گیا ہے۔ ذیل میں اصل ضیاء القلوب کے ابتدائی فقرے اور ان کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

"تمامی مراتب حمد مر ذات واحد را کہ اوست معبود کل و موجود مطلق تعالیٰ شانہٗ و جمیع مدارج نعت خاص رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کہ اوست مظہر عالم و نائب حق، صلی اللہ علیہ وسلم و علی آلہ و اصحابہ اجمعین (۱)

"جميع المحامد .لذات الواحد الذى هوالذى المعبود للكل والموجود المطلق تعالىٰ شانه، وكل مدارج النعت خاصة برسولنا الاكرم، هومظهرالعالم وخليفة الحق، صلى الله عليه وسلم وعلى اله واصحابه اجمعين"

یہ ترجمہ ۹؍صفر ۱۲۹۵ھ (فروری ۱۸۷۸ء) کو بیت اللہ شریف کے سامنے مکمل ہوا مترجم نے کتاب کی آخری سطور میں اس کی بھی صراحت کی ہے:

"الحمد لله الذى بجلاله ونعمته تتم الصالحات والصلوة والسلام على رسوله صاحب الشفاعات وعلى اله شقائق البركات، وعلىٰ اصحابه نجوم الهدايات.

شكراً لک على ماانعمتَ من تمام ما وفقنى لابتدا ئهٖ وأيّدنى فى اثنائهٖ من نقل ضياء القلوب من كسوة اللسان الفارسية الى خلعة اللغة العربية، فى الحرم المحترم والبلدالمكرم مكة المعظمة تجاه البيت الشريف والمقام الحنيف۔

لتسعة مضين من صفر المظفر من شهرسنة خمس و تسعين من المائة الثانية بعدالالف من سنين الهجرة، فالحمد لله اولا وآخراً۔ فقط"

---

(۱) ضیاء القلوب فارسی (طبع اول مجتبائی دہلی: شعبان: ۱۲۸۴ھ)

یہ نسخہ جو راقم سطور نے دیکھا ہے نہایت خوبصورت، خوش قلم نسخہ ہے، جو نسخ میں کتابت ہوا ہے، حضرت حاجی صاحب کی خدمت کے حاضر باش خادم، مولوی کوثر علی خیر آبادی نے تالیف کے دو سال بعد ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) میں نقل کیا ہے۔

اس ترجمہ کی طباعت

اس ترجمہ کی تکمیل سے حضرت حاجی صاحب کو بہت خوشی ہوئی تھی، حضرت حاجی صاحب کے ایک ممتاز خلیفہ مولانا شاہ محمد حسین الہ آبادی نے اس کی طباعت کا انصرام کیا جب مولانا الہ آبادی سفر حج کے بعد ہندوستان واپس آئے تو اس نسخہ کی نقل طباعت کے لئے ساتھ لائے، حضرت حاجی صاحب نے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کو ایک خط میں اسکی اطلاع دی۔ تحریر ہے:

''ترجمہ عربی رسالہ ضیاء القلوب مصنفہ فقیر، عزیزم مولوی محمد حسین صاحب الہ بادی طبع کرنے کو لے گئے ہیں''(۱)

مولانا الہ آبادی کی کوشش سے اس ترجمہ کی نہایت عمدہ طباعت ہوئی جو حضرت حاجی صاحب کو بھی پسند آئی، یہ طباعت غالباً ۱۳۱۶ھ میں مکمل ہوئی تھی، یہ رسالہ مکہ معظمہ پہنچا اور حضرت حاجی صاحب نے ملاحظہ کیا تو پسند فرمایا، مولانا تھانوی کے نام ایک اور خط میں اس کا اس طرح تذکرہ فرمایا ہے:

''ضیاء القلوب عربی بھی پہنچ گئی، فقیر کا جو منبیہ [ہے] شاید اس کا ترجمہ نہیں کیا ہے''(۲)

حاشیہ ضیاء القلوب

مولانا محمد یعقوب نے ضیاء القلوب کے عربی ترجمہ سے فارغ ہوکر اس پر ایک حاشیہ بھی لکھا تھا، یہ حاشیہ بھی بظاہر عربی میں ہوگا، یہ حاشیہ مختصر تھا یا مفصل اور یہ عربی نسخہ پر شائع ہوا یا نہیں اس کا سراغ نہیں ملا، لیکن ضیاء القلوب کے عربی ترجمہ کا جو نسخہ راقم سطور نے دیکھا ہے (جس کا تعارف گذر چکا ہے) اس میں یہ حاشیہ شامل نہیں، حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی کو اس کے مطالعہ کی تمنا تھی مگر حضرت مولانا کو بھی نہیں ملا تھا، حضرت مولانا تھانوی کے ایک ملفوظ سے اس

(۱) مکتوب حضرت حاجی صاحب، بلا تاریخ، مکتوبات امدادیہ مع صد فوائد اشرفیہ (مکتوبات بنام مولانا تھانوی) مکتوب ۸، ص: ۱۴،۱۳ (تھانہ بھون ۱۳۹۱ھ)

(۲) مکتوبات امدادیہ، مکتوب مرقومہ کیم جمادی الثانی ۱۳۱۶ء مکتوب: ۴۳ ص: ۵۰ (۱۷/ اکتوبر ۱۸۹۸ء)

حاشیہ کے ایک نسخہ کی موجودگی کا علم ہوتا ہے جو مولانا حکیم جمیل الدین صاحب (غالبًا نگینوی) کے ذخیرہ میں تھا۔ایک مجلس میں اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

''ہمارے حضرت کے علوم نہایت عالی ہوتے تھے مگر الفاظ بہت سلیس اور فارسی تو اہل زبان کی سی تھی۔ضیاء القلوب کی ایسی اچھی فارسی ہے۔مولانا محمد یعقوب صاحب نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا تھا،مولوی جمیل الدین صاحب کہتے تھے کہ وہ ان کے پاس ہے اور کہتے تھے کہ مولانا نے اس پر حاشیہ بھی لکھا ہے۔میں بھی اس کتاب کی زیارت کا متمنی تھا مگر اتفاق نہیں ہوا اور اب ان کا انتقال ہو چکا ہے۔(۱)

حالاتِ طیب مولانا محمد قاسم

مولانا محمد یعقوب کی جو تصانیف معلوم یا دستیاب ہیں ان میں سب سے زیادہ مشہور کتاب ''تذکرہ یا حالاتِ طیب حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی'' ہے،جس میں فاضل مرتب نے اپنے بچپن کے رفیق،عزیز محبوب دوست،ہم وطن تقریباً ہم عمر اور ہم استاد،حضرت مولانا محمد قاسم کے دیدہ وشنیدہ ضروری مختصر مگر بہت جامع احوال رقم فرمائے ہیں۔

یہ مرتب تذکرہ معلوم نہیں ہوتا بلکہ دراصل ایک یادداشت سی ہے،جو مولانا محمد یعقوب نے حضرت مولانا مرحوم اور اپنے احباب اور متوسلین کی فرمائش پر غالباً بہت عجلت میں مرتب کی اور اسی وقت چھپ بھی گئی،اس میں نہ تمام احوال و واقعات کا احاطہ ہے نہ اس کی ترتیب سوانح وتذکرہ کی ترتیب ہے اور نہ ہی اس کی حیثیت ایک تصنیف کی ہے۔مولانا محمد یعقوب کی ہمہ وقتی اور بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے جو یاد آیا وہ اس میں مختصر مختصر لکھ دیا،لیکن اس اختصار اور ناتمامی کے باوجود اس میں احاطہ اور جامعیت کی خاص جھلک محسوس ہوتی ہے،اس کو مولانا محمد یعقوب کا کمال کہیے یا ان کے تصرف کے اثرات کہ اس کے بعد سے حضرت مولانا محمد قاسم کے احوال پر جو کچھ بھی چھپا وہ تقریباً اسی پر مبنی اور اسی اجمال کی تشریح ہے۔مولانا نے اپنے بعض فقروں کو ایسا دریا بکوزہ بنایا ہے اسکی تفصیل کو جہاں تک چاہے پھیلا لیجئے مگر پھر بھی ایک بات باقی رہ جاتی ہے،مولانا محمد

(۱) جمیل الکلام،مجموعہ ملفوظات مولانا تھانوی مرتبہ:مفتی جمیل شامل الفصل للوصل ص:۲۸،۲۹(بارہ بنکی:۱۳۵۳ھ)

یعقوب اس پر صرف ایک فقرہ یا جملہ لکھ کر آگے بڑھ گئے ہیں، پڑھنے والے اس کی گہرائی اور معنویت پر غور کرتے رہیں اور اسکی روشنی میں نئے معنی و مضامین تلاش کرتے رہیں۔

یہ رسالہ جیسا کہ عرض کیا گیا مختصر سا اور صرف چونتیس (۳۴) صفحات پر مشتمل ہے اور حضرت مولانا محمد قاسم کی وفات (۴ر جمادی الاول ۱۲۹۷ھ) کے صرف چار مہینے کے بعد شوال ۱۲۹۷ھ (ستمبر ۱۸۸۰ء) میں مطبع صادق الانوار بھاول پور سے شائع ہو گیا تھا ظاہر ہے کہ اس کی تالیف و طباعت میں بھی کچھ وقفہ ہوا ہوگا، بہر حال یہ رسالہ چھپتے ہی ہاتھوں ہاتھ نکل گیا تھا، اس لئے جلد ہی شوال میں ہی دوبارہ بھی چھپا اور بعد میں بھی کئی مرتبہ شائع ہوا مگر المیہ یہ ہے کہ دوسری طباعت کے بعد یہ اہم دستاویزی حیثیت کی تالیف جب جب بھی چھپی اس کے متن میں کچھ تبدیلی یا ترمیم کر دی گئی، اس لئے اس کی بعد کی اشاعتوں پر اس قدر اعتماد نہیں کیا جا سکتا جو پہلی ابتدائی طباعتوں پر ہے۔ اس ضرورت کی وجہ سے راقم نے پہلی دوسری طباعت کو سامنے رکھ کر اس کا صحیح نسخہ مرتب کیا ہے۔ جس کو اصل کے مطابق رکھنے کی پوری کوشش کی ہے، مزید افادہ کے لئے اس پر ضروری حاشیے بھی لکھ دیئے ہیں یہ کاوش ۱۴۲۱ھ (۲۰۰۱ء) میں شائع ہو چکی ہے (۱)

موجودہ اطلاعات کے مطابق حالات طیب مولانا محمد قاسم مولانا محمد یعقوب کی پہلی اور آخری اردو تالیف ہے۔

بیاضِ یعقوبی بیاض عموماً ذاتی، علمی اور ادبی دنیا میں متفرق بے ترتیب یادداشتوں کا مجموعہ ہوتی ہے، اسکا تصانیف و مؤلفات میں شمار کرنا اچھا معلوم نہیں ہوتا لیکن مولانا محمد یعقوب صاحب کی بیاض اپنے بعض نسخوں اور اندراجات کی وجہ سے کثرت سے چھپتی رہتی ہے اور عام قارئین اس سے واقف ہیں اسلئے اس کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔

یہ بیاض پانچ بڑے عنوانات پر تقسیم ہے: تاریخیات، علمیات، عشقیات، عملیات، طبیات۔ جن میں سب سے اہم تاریخی اور طبی حصہ ہے، تاریخی حصہ میں مولانا کے پہلے

(۱) یہ نسخہ راقم کی تالیف قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی احوال و آثار باقیات و متعلقات میں شامل ہے۔ مذکورہ کتاب میں ملاحظہ فرمائیں۔

سفر حج کی تفصیلی روداد بھی (جو روزنامچہ کی ترتیب پر ہے) شامل ہے، جس سے مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں اور پھر چند تاریخی حوالے درج ہیں، دوسرے حج کا بھی اجمالاً تذکرہ ہے، طبی حصہ میں امراض کے مختصراً مجرب نسخے اور علاج درج ہیں۔

بیاض کی پہلی اشاعت حضرت مولانا تھانویؒ کی توجہ کی بدولت ہوئی، حضرت نے اس پر ضروری فوائد یا حاشیے لکھے اور ایک جید طبیب مولانا حکیم مصطفیٰ میرٹھی سے اس کے نسخوں کی تحقیق کرائی اور جہاں ضروری ہوا حاشیہ میں کچھ وضاحت فرمادی۔

حضرت مولانا تھانویؒ نے اسکی حاشیہ نویسی کا کام جمادی الاول ۱۳۴۰ھ (۱۹۲۲ء) میں مکمل کیا تھا، صفر ۱۳۴۴ھ (ستمبر ۱۹۲۵ء) میں نظر ثانی اور تکمیل سے فراغت ہوئی اور ۱۹۲۹ء (۴۸-۱۳۴۷ھ) میں اشرف المطابع تھانہ بھون سے کتابی صورت میں پہلی بار چھپی، بعد میں مکتوبات کے ساتھ بھی اور صرف بیاض دونوں طرح سے چھپی ہے، یہ دونوں اشاعتیں عموماً دستیاب ہیں، ایک وہ جس میں مکتوبات شامل ہیں، ابتدائی حصہ مکتوبات کا ہے دوسرا بیاض کا۔ آخر میں حضرت مولانا تھانوی نے دونوں کو یکجا کر کے بھی چھپوادیا تھا، موجودہ بیاض کے ساتھ مولانا کے مکتوبات بھی شامل ہیں مگر جو مکتوبات سب سے پہلے علیحدہ کتابی صورت میں چھپے تھے ان کا علیحدہ تعارف مناسب ہے۔

مکتوبات مولانا محمد یعقوب
مرتبہ مولانا محمد قاسم نیانگری

جس سال مدرسہ دیوبند (دارالعلوم) قائم ہوا اور مولانا محمد یعقوب اس کے صدر مدرس بنائے گئے، اس سال راجستھان کے مشہور قصبہ بیاور جس کو اس وقت نیانگر کہتے تھے مولانا محمد قاسم حضرت مولانا محمد یعقوب کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے اور مولانا سے بہت پابندی سے خط و کتابت کرتے رہے۔ حضرت مولانا کے جو گرامی نامے آتے تھے ان کو اہتمام سے محفوظ رکھتے تھے بعد میں اس کا ایک مجموعہ مرتب کرلیا تھا جس کو حضرت مولانا نے بھی دیکھا تو پسند فرمایا اور ایک صاحب کو خط میں لکھا کہ:

''جو تحریرات میاں قاسم نے نیانگر میں جمع کی ہیں واقعی وہ مجموعہ عجیب ہے، مگر

میاں چھپنا تو ایک امر بعید ہے اور نقل دشوار ہے۔ میرا خود اسکی نقل کو جی چاہتا ہے شائد اوروں کو نفع پہنچے اور اس ناکارہ کو بھی ثواب مل جاوے، اگر تمہیں فرصت ہو تو نقل اس کی کرلو، انشاء اللہ تعالیٰ بہت مفید ہوگا'' (۱)

حضرت مولانا کی تمنا تھی کہ یہ مجموعہ مکتوبات چھپ جاتا، مکتوب علیہ منشی محمد قاسم صاحب نے بھی اس کی کوشش کی مگر حضرت مولانا کی زندگی میں اس کی طباعت نہ ہوسکی۔ مولانا کی وفات کے کئی سال بعد مولانا کے برادرزادہ حکیم امیر احمد عشرتی نے مولانا کے اس خیال کو عمل میں لانے کا ارادہ کیا، اس کے لئے مکتوبات کی نقل حاصل کی، اس پر عمدہ اور جامع مقدمہ لکھا اور اس مجموعہ کو مولانا کے بھانجے مولانا رشید احمد سالم انصاری کے پریس مطبع احمدی علیگڑھ سے ۱۳۲۷ھ میں شائع کرادیا۔

یہ پہلی طباعت متوسط پیمائش کے چھپن (۵۶) صفحات پر مشتمل ہے، اس میں صرف اکیس (۲۱) خط ہیں، یعنی یہ کل مکتوبات کا ایک تہائی سے بھی کم حصہ ہے، اس اشاعت کے آخری صفحہ پر جملہ مکتوبات کی فہرست اور ان کے مضامین کا مختصر تعارف بھی درج ہے، یہ کل اکہتر (۷۱) مکتوبات تھے، حصہ اول کی اشاعت میں دوسرے حصہ کی اشاعت کا اعلان ہوا تھا مگر غالباً اس پر عمل نہیں ہوا۔ مطبع احمدی کا چھپا ہوا مکتوبات کا دوسرا تیسرا حصہ اب تک نہیں ملا غالباً چھپا ہی نہیں جس کی حضرت مولانا تھانویؒ کے الفاظ سے تصدیق بھی ہوتی ہے کہ مکتوبات کا صرف یہی ایک حصہ چھپ کر رہ گیا تھا، علی گڑھ سے بعد کے مکتوبات پر مشتمل اور حصہ شائع نہیں ہوا۔

مکتوبات کے اس مکمل مجموعہ کی طباعت کی سعادت حضرت مولانا تھانوی کے حصہ میں آئی، حضرت مولانا نے اس پر مختصر تمہید تحریر فرمائی، مختصر حاشیہ بھی لکھا اور اس کے ساتھ بیاض یعقوبی کا متن شامل کر کے دونوں کو یکجا شائع کرادیا۔ یہ نسخہ ۱۹۲۹ء میں تھانہ بھون سے چھپا تھا، اس مجموعہ میں بھی کل مکتوبات میں سے صرف چونسٹھ (۶۴) خط آئے ہیں، ان میں سے چند خطوط حضرت مولانا تھانوی کو دستیاب نہیں ہوئے اور دو خط ذاتی حالات

(۱) مکتوبات مولانا محمد یعقوب نانوتوی، ص: ا، طبع اول مطبع احمدی علی گڑھ

پر مشتمل تھے کسی مصلحت کی وجہ سے اس میں شامل نہیں کیے گئے۔ حضرت مولانا تھانویؒ نے لکھا ہے کہ:

''ان مکتوباتِ زائدہ میں سے بعض تو دستیاب نہیں ہوئے اور دو بوجہ استعمال حالات خانگی قصداً درج نہیں کیے گئے'' (۱)

ان مکتوبات میں عجیب وغریب تعلیمات اور جواہرات بکھرے ہوئے ہیں، تصوف کی تعلیمات کا عطر اور جوہر اس میں جمع ہوگیا ہے، ایسی بڑی بڑی گراں قدر باتیں فقروں میں لکھ دی گئی ہیں جو زندگی بھر رہنمائی کریں اور حصول مقصد کی کلید ثابت ہوں، ذاتی حالات اور اس دور کی بعض اطلاعات ومعلومات کا اضافہ مزید ہے، اس مجموعہ مکتوبات کا ذکر کرتے ہوئے ایوب قادری صاحب نے صحیح لکھا ہے کہ:

''(یہ خطوط) سلوک ومعرفت کا مرقع اور حقائق وتصوف کا دستور العمل ہیں، سالک کے لئے وہ ایک مکمل ہدایت نامہ ہیں، ان خطوط میں ہمیں اکابر صوفیہ کی تعلیمات کی مکمل تصویر ملتی ہے، اسی زمانہ میں راقم الحروف کو چشتی سلسلہ کے مشہور شیخ مخدوم جہانگیر اشرف کچھوچھوی (۸۰۸ھ) کے مکتوبات عالیہ کے مطالعہ کا اتفاق ہوا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکتوباتِ اشرفی (فارسی) کا مختصر اردو ایڈیشن ہے'' (۲)

چند اور مکتوبات

مولانا محمد یعقوب صاحب کے اس مجموعۂ مکتوبات کے علاوہ بھی غالباً پچیس، تیس مکتوبات مختلف کتابوں اور قلمی مجموعوں میں بکھرے ہوئے ہیں جن میں تین اہم خط حضرت حاجی امداد اللہ کے نام اور متعدد اپنے اعزہ، دوستوں اور مختلف اصحاب کے نام ہیں۔

فتاویٰ

اوپر ذکر آچکا ہے کہ دار العلوم دیوبند کے قیام کے ابتدائی زمانہ میں جب مدرسہ میں دار الافتاء قائم نہیں ہوا تھا مگر دینی، فقہی خطوط اور سوالات آنے لگے تھے اس وقت ان کے جواب لکھنے کی خدمت مولانا محمد یعقوب صاحب انجام دیتے تھے، چونکہ

(۱) تمہید مکتوباتِ یعقوبی، ص: ۱۵ (تھانہ بھون ۱۹۲۹ء)

(۲) تذکرہ مولانا محمد احسن نانوتوی، محمد ایوب قادری، ص: ۱۹۷ (کراچی ۱۹۶۶ء)

مدرسہ میں ایسے جوابات یا فتاویٰ کی نقل کا اہتمام نہیں تھا اس لئے اس کا کوئی مجموعہ دستیاب نہیں، اس لئے یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ مولانا نے کس قدر فتوے یا جوابات تحریر فرمائے تھے، لیکن اس دور کی مختلف قلمی کتابوں اور یادداشتوں وغیرہ میں مولانا کے لکھے ہوئے بہت سے مفصل و مختصر فتوے مطبوعہ موجود و محفوظ ہیں، ان سب کو جمع کرلیا جائے تو ایک مفید اور مختصر مجموعہ ہوجائیگا۔

مضامین، تحریریں اور تقریریں

مولانا اپنی کثیر مصروفیات اور علمی مشاغل کے باوجود ملک میں جو علمی دینی رسائل چھپتے تھے ان پر بھی نظر رکھتے تھے اور جو مضمون مسلمانوں کو نقصان پہنچانے والے تھے ان کی تصحیح و تنقید پر توجہ فرماتے اور اپنے خیالات و مضامین دینی رسائل و اخبارات میں چھپواتے رہتے تھے۔ مختلف اخبارات و رسائل میں شائع مولانا کے کئی مضامین کا ذکر ملتا ہے، اور مولانا کی متعدد تقریریں بھی مطبوعہ یا قلمی صورت میں موجود ہیں۔ ضرورت ہے کہ حضرت مولانا کے افادات کو مرتب کر کے شائع کیا جائے، حضرت تھانوی کے ملفوظات و مواعظ میں مولانا محمد یعقوب کے جو افادات ہیں وہ سب یکجا ہوکر معارفِ یعقوبی کے نام سے شائع ہو چکے ہیں مگر یہاں جن تحریروں یا افادات کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس مجموعہ سے مختلف عموماً کم یاب اور نامعلوم ہیں۔

زندگی کے آخری المناک ایام اور متواتر حادثے

حضرت مولانا اپنے معمول کے مطابق مدرسہ کی خدمت اور تعلیم و افادہ میں مشغول تھے کہ اچانک حضرت مولانا کو یہ محسوس ہوا کہ قصبہ دیوبند اور نواح پر کوئی قدرتی آفت آنے والی ہے جو کثرت سے صدقہ کرنے سے دور ہوسکتی ہے۔ حضرت مولانا نے اپنے اس کشف اور الہام کو لوگوں پر ظاہر بھی فرمادیا کہ اگر عافیت چاہتے ہو تو کثرت سے صدقہ کرو، بعض ناخدا ترس لوگوں نے مولانا کے اس ارشاد کو جو سراسر خیر و ہدایت تھا، خود غرضی اور مدرسہ کے مفاد کی وجہ سے سمجھا اور کہہ دیا کہ معلوم ہوتا ہے مدرسہ میں کچھ ضرورت پیش آگئی ہے،

یہ فقرہ مولانا کو پہنچا تو مولانا بہت ناراض ہوئے اور فرمایا:

''یعقوب اور یعقوب کی اولاد اور سارا دیوبند، یعقوب اور یعقوب کی اولاد اور سارا دیوبند''

اس فقرہ کو کئی مرتبہ دہرایا اور پھر اللہ تعالیٰ نے کیا کہ وہی ہوا جو مولانا کے منہ سے نکلا تھا۔ دیوبند اور اس کے آس پاس سخت وبا آئی ایسی کہ گھر کے گھر خالی ہو گئے، بیس پچیس جنازوں کی نماز ایک ساتھ ہوتی تھی، یعنی دیوبند قصبہ حقیقتاً آبادی سے محروم ہو گیا۔

اس وبا میں مولانا کے خاندان کے اور اصحاب کے علاوہ صرف گھر کے چودہ پندرہ افراد فوت ہو گئے تھے۔ یہ وبا آخر ذی قعدہ ۱۳۰۱ھ (ستمبر ۱۸۸۴ء) میں شروع ہوئی اور لمحوں میں آندھی اور طوفان کی صورت اختیار کر گئی، اس حادثہ میں سب سے پہلے مولانا کی اہلیہ (بی بی اکرامن) کا انتقال ہوا، پھر مولانا کے محبوب فرزند (مولوی علاء الدین) جن کو چند مہینوں پہلے دارالعلوم سے سند فراغت ملی تھی اور وہ علم و عمل میں جانشیں ہو سکتے تھے رخصت ہو گئے، مولانا کو انکی وفات کا بے انتہا رنج و غم ہوا، مگر سلسلۂ حوادث اسی پر نہیں رکا، بلکہ اسکے بعد مولانا کے گھر سے اس تیزی سے جنازے نکلنے شروع ہوئے جیسے صدمات و حوادث کی لڑی ٹوٹ گئی ہو، تقریباً پچاس دنوں کے معمولی وقفہ میں مولانا کے گھر کے چودہ افراد انتقال کر گئے، اس غیر معمولی اور ناقابل برداشت سخت حادثہ کا حضرت مولانا گنگوہی نے اپنے ایک خط میں بہت صدمہ اور حسرت وافسوس کے ساتھ یوں ذکر فرمایا کہ:

''یہاں کے حادثات کیا لکھوں مولوی علاؤالدین پسر مولوی محمد یعقوب صاحب، جن کو سال گذشتہ میں دستار اجازت بندھائی تھی ذی الحجہ کی دسویں کو فوت ہوئے تھے اور سوائے ان کے تین پسر اور چار پوتے اور دو پوتیاں ایک زوجہ ایک بہو اور ایک نواسہ مولوی محمد یعقوب صاحب مرحوم کا فوت ہوا۔ اب ۲؍ربیع الاول کو خود مولوی محمد یعقوب صاحب مرحوم نے نانوتہ آکر وفات پائی اور ایک سخت حادثہ مدرسہ اور لوگوں پر ڈالا'' (۱)

---

(۱) مکاتیب رشیدیہ، ص: ۶۳ (طبع اول میرٹھ: ۱۳۲۴ھ)

اس غیر معمولی وبا اور نہایت غیر معمولی حادثہ میں مولانا کے خاندان کے چودہ افراد چار بیٹے ایک بیوی ایک بہو چار پوتے دو پوتیاں ایک نواسہ فوت ہوئے۔ مگر مولانا صبر د استقامت کا پہاڑ بنے رہے، پائے صبر میں ذرا بھی جنبش نہیں ہوئی۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ اس دوران ایک مرتبہ میں نے مولانا کو یہ شعر تو پڑھتے ہوئے سنا کہ:

غیر تعلیم و رضا کو چارۂ   در کفِ شہر نر خونخوارۂ(۱)

کوئی اور بات بے صبری کی مولانا سے ظاہر نہیں ہوئی- اس وبا کی وجہ سے جب گھر اور تقریباً پوری بستی ہی خالی ہوگئی تو مولانا کو دیکھا گیا کہ آسمان کی طرف منہ کئے ایک دن یوں فرمارہے ہیں:

"میں نے تو سمجھا تھا کہ میرا بھی وقت آ گیا، کیا ابھی دیر ہے"

وفات اور مدفن

شاید یہ وقت قبولیت کا تھا، اس بات پر چند دن ہی گذرے تھے کہ مولانا دیوبند سے اپنے وطن نانوتہ گئے، وہیں ۲؍ربیع الاول ۱۳۰۲ھ (۲۲؍دسمبر ۱۸۸۴ء) کو مختصر بیماری کے بعد وفات ہوگئی

مرض وفات کیا تھا اس کے متعلق کئی روایتیں ہیں، مدرسہ عربیہ (دارالعلوم) دیوبند کی روداد میں لکھا ہے کہ:

"بہ مرض فالج جنت الفردوس کو تشریف لے گئے" (۲)

مولانا کے قریبی دوست مولانا فیض الحسن سہارنپوری کی اطلاع ہے کہ مولانا کو کسی نے حلوہ کھلایا تھا جس میں زہر ملایا گیا تھا، اس کو کھاتے ہی مولانا کی حالت غیر ہوگئی، اسی میں وفات ہوئی۔ مولانا نے لکھا ہے کہ:

"والناس عجب من موته حيث كان قداكل نوعامن الحلاوى فشرب عليه الماء فتغير حاله، فمات غدا من غيرماقال شيء، ولذالك ظن انه سم" (۳)

(۱) ارواحِ ثلاثہ، مرتبہ مولانا ظہور الحسن، ص: ۲۴۰ (طبع اول سہارنپور ۱۳۵۲ء)

(۲) روداد مدرسہ عربیہ (دارالعلوم) دیوبند ص:

(۳) مجلہ شفاء الصدور، لاہور شارہ ۱۵؍جنوری ۱۸۸۵ء ص: ۴

اور مولانا کی ذاتی بیاض کے آخر میں (غالباً خاندان کے کسی قریبی اور عزیز فرد نے لکھا) ہے کہ:

''در ہیضہ مبتلا شدہ بیہوش شدند''(۱)

ہیضہ میں مبتلا ہو کر بیہوش ہو گئے، پیر کی شب میں تقریباً ایک بجے وفات ہوئی، نانوتہ میں اپنے بیٹے حکیم معین الدین کے باغ میں جو سہارنپور جانے والی سڑک پر سرراہ واقع ہے، دفن کئے گئے۔ رحمة الله عليه رحمة واسعة"

(۱) بیاض یعقوبی، ص:۱۵۳، طبع اول (تھانہ بھون ۱۹۲۹ء)

باب (۲۱)

حضرت مولانا مملوک العلی کے چند شاگرد
فہرست اور تعارف

حضرت مولانا مملوک العلی نے تمام زندگی تعلیم و تدریس اور پڑھنے پڑھانے میں گذاری۔ مولانا کی زندگی کا اصل سرمایہ اور تمام محنتوں کا بہترین حاصل ان کے شاگرد تھے جو حضرت مولانا کی زندگی میں ہی برصغیر ہند (و پاکستان) کے دینی، علمی، عملی افق پر نمودار ہونے شروع ہو گئے تھے، جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ان کی چمک اور خوبی بڑھتی گئی اور پھر ایک دور وہ بھی آیا کہ دین و شریعت، علم و عمل، تصنیف و تالیف، ارشاد و تلقین، وزارت و حکومت اور سیاست و اقتدار ہر اک شعبہ میں حضرت مولانا کے شاگرد صف اول میں شامل ہوئے اور اپنی اپنی جگہ قائد و رہنما سمجھے گئے۔

دین و علم کی بات ہو یا تعلیم و افادہ کی، تربیت و تلقین کا تذکرہ ہو یا تصنیف و ترجمہ کا، دینی علمی ادارے ہوں یا مشرقی تعلیم کے مراکز، کالج ہوں یا اعلیٰ تعلیم کی درسگاہیں، ہر اک میں مولانا کے شاگرد اونچے مرتبوں اور عہدوں پر فائز تھے، ہر جگہ دین و شریعت، اخوت و انسانیت کی دولت بانٹنے اور نئی نسلوں کو بہترین مسلمان، بہترین انسان اور سراپا اخلاص و تربیت بنانے کی کوششوں میں محو نظر آتے تھے۔

ہندوستان کی دینی علمی تاریخ پر حضرت مولانا کے شاگردوں کے اثرات ایسے گہرے اور لازوال ہیں کہ ان کو برصغیر کی تاریخ اور مستقبل کی دینی علمی تعلیمی ترقی سے علیحدہ کرنا ممکن ہی نہیں، جب کہیں بھی اور جہاں بھی برصغیر ہند کے دینی علمی سفر کا ذکر آئیگا، حضرت مولانا مملوک العلی کے فخر روزگار شاگردوں کا تذکرہ ضرور ہوگا، اور جیسے جیسے ہمیں اپنے

بڑوں بزرگوں کی دینی علمی خدمات کا ادراک اور انکے علمی احسانات کا عرفان بڑھے گا، اسی قدر حضرت مولانا مملوک العلی اور انکے شاگردوں کی خدمات وعنایات کی قدر ومنزلت زیادہ ہوگی اور یہ خیال تازہ رہیگا کہ اخلاص کا درخت کس قدر گھنا، ثمر دار اور پر بہار ہوتا ہے، اور ایک شجر سایہ دار کی ہوائیں کہاں سے کہاں تک پہنچ جاتی ہیں، اور انکے اثر سے فضائیں کیسی تروتازہ، شاداب ودلربا ہوجاتی ہیں، اور یہاں تو معاملہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

مولانا کے شاگردوں کے اثرات، ان کے دائرہ کار کی وسعت، ان کے دیرپا فائدوں، اس کے منافع اور تقریباً پونے دوسو سال پر محیط تاریخ کے علمی تعلیمی گوشوں پر ان کی چھاپ بلکہ گہری گرفت کا جائزہ بلکہ تعارف بھی ایک بڑی کتاب کا موضوع ہے، اس کا مختصر تذکرہ بھی آسان نہیں ہے۔

یہ تعارف وتذکرہ اس وقت بھی آسان نہیں تھا جب حضرت مولانا حیات تھے، اس وقت بھی ہندوستان کے کونہ کونہ میں حضرت مولانا کے شاگردوں کا غلغلہ بلند تھا، مولانا کے فضل وکمال اور بے نظیر شاگردوں کی شہرت ہندوستان سے نکل کر افغانستان تک پہونچی ہوئی تھی، قدیم غیر منقسم ہندوستان اور افغانستان کے شہروں میں مولانا کے ایسے ایسے شاگرد موجود تھے جو اپنے علم وکمال کی وجہ سے ممتاز تھے اور جو کریم الدین پانی پتی کے الفاظ میں (اپنا) ''نام پیدا کر گئے تھے'' کریم الدین پانی پتی جو مولانا کا شاگرد، دہلی کالج کا فیض یافتہ اور مولانا کی علمی مصروفیات اور طلبہ سے خوب واقف ہے، لکھتا ہے:

> ''رات دن سوائے مدرسہ کے اُن کے گھر پر طلبا پڑے رہتے ہیں۔ ہر وقت ان کو گھیرے رہتے ہیں اور وہ خلیق اس طرح کے ہیں کہ کسی سے انکار نہیں کر سکتے۔ سب کو پڑھاتے ہیں تمام شب اور دن میں شائد دو پہر رات کو آرام کرنا اُن کو نصیب ہوتا ہوگا۔ والاّ نہ رات دن درس دہی طلبہ میں گذرتا ہے اور باوجود اس کثرت درس اور فیض رسانی کے پابند شرع شریف کے ایسے ہیں کہ اس طرح کے آدمی کم دیکھنے میں آئے ہیں۔ غرض کہ جتنی اُن کی تعریف میں لکھوں بجا ہے'' (۱)

(۱) طبقات شعرائے ہند، کریم الدین پانی پتی صفحہ ۴۶۴ (لکھنؤ ۱۹۸۳)

''صد ہا شاگرد اس ذات بابرکات سے فیض اٹھا کر اطراف واقطارِ ہندوستان میں فاضل ہو کر گئے، درمیان اکثر بلاد افغانستان کے اور ہندوستان کے اپنا نام پیدا کر گئے۔(۱)

ذیل میں حضرت مولانا کے شاگردوں کی ایک فہرست اور ان کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے جس سے کم سے کم یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت مولانا کے حلقۂ تربیت سے کیسے ابر گہر بار نکلے اور ان سے ہمارا معاشرہ، تمدن، تعلیمی ادارے اور علمی دینی حلقے کس طرح فیض یاب ہوئے۔ اس کا دائرہ یا حلقۂ اثر کس قدر وسیع ہوا اور کہاں کہاں تک پہنچا۔

مولانا کے معلوم شاگردوں کی اجمالی فہرست

حضرت مولانا مملوک العلی نے کم سے کم چھتیس سال درس وافادہ میں مشغول بسر فرمائے خصوصاً دہلی کالج کی ملازمت اور دہلی میں مستقل رہائش کے بعد سے مولانا کی طرف طلبہ کا رجوع اور حضرت مولانا کی درسی مشغولیات بہت بڑھ گئی تھیں، طلبہ ہر وقت مولانا کو گھیرے رکھتے تھے، جو طلبہ مولانا سے مولانا کے گھر پر پڑھتے تھے ان کی فہرست تو اس وقت بھی موجود نہیں ہوگی کیوں کہ یہ طلبہ مختلف علاقوں اور دور دراز خطوں کے رہنے والے تھے جو دہلی کی مختلف مسجدوں اور محلوں میں اپنے اپنے انتظام سے رہتے تھے، اور اپنی اپنی سہولت اور اوقات کی ترتیب کے مطابق حضرت مولانا کی خدمت میں تعلیم واستفادہ کے لئے آتے تھے، اور چند طالب علم (جن کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی) حضرت مولانا کے مکان پر بھی مستقل رہتے تھے، ان کے مصارف بہ ظاہر حضرت مولانا ہی برداشت کرتے ہونگے، مگر افسوس کہ حضرت مولانا کے ان شاگردوں کی بھی جامع فہرست دستیاب نہیں جو دہلی کالج میں مولانا سے فیض یاب ہوئے تھے۔

حضرت مولانا کے دہلی کالج کے چھبیس سالہ دورِ تدریس میں سے ہر اک سال میں اگر کالج میں صرف بیس طالب علم بھی مولانا کے درجہ میں شامل رہے ہوں (یہ تعداد کم سے کم ہے، مولانا کے شاگرد اس سے زیادہ ہوتے ہوں گے) تب بھی کالج میں حضرت

(۱) تاریخ شعرائے عرب (ترجمہ فرائد الدہر) ص:۱۰۳ (طبع اول دہلی ۱۸۴۷ء)

مولانا سے تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد تقریباً سوا پانچ سو تک پہنچتی ہے مگر ہمیں دہلی کالج کے ایسے پچاس طلبہ کے نام بھی معلوم نہیں جو مولانا کے شاگرد تھے، اور جو طلبہ حضرت مولانا سے گھر پر پڑھتے تھے ان کا شمار اس سے بھی زیادہ ہوگا کیوں کہ گھر پر پڑھنے والے طلبہ کی تعداد کالج سے بھی زیادہ رہتی تھی اور ان کے اسباق اور کتابیں بھی کالج کے نصاب اور معمول سے زیادہ متنوع موضوعات پر مشتمل ہوتی تھیں، لہٰذا قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ حضرت مولانا کے دہلی کے قیام کے زمانہ میں تقریباً ایک ہزار طالب علموں نے حضرت مولانا سے استفادہ کیا ہوگا اور ان کو حضرت سے تلمذ ہوگا مگر افسوس کہ ہمیں اس بڑی تعداد میں سے گنتی کے چند نام معلوم ہیں جو سب ملا کر پچاس تک پہنچتے ہیں، ان کی اجمالی فہرست یہاں درج کی جا رہی ہے۔

﴿قسم اول﴾

(۱) منشی جمال الدین کتانوی

﴿قسم دوم﴾

(۲) مولانا سبحان بخش شکارپوری
(۳) مولانا نور الحسن کاندھلوی
(۴) مولانا شیخ محمد تھانوی
(۵) مولانا احمد علی سہارنپوری
(۶) قاری عبد الرحمٰن پانی پتی
(۷) سید عالم مرادآبادی
(۸) مولانا محمد مظہر نانوتوی
(۹) مولانا محمد حسین رامپوری

(۱۰) مولانا محمد سعید اندرابی

(۱۱) مولانا عبدالحمید خاں جلال آبادی

﴿قسم سوم﴾

(۱۲) حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی

(۱۳) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی

(۱۴) مولانا محمد یعقوب نانوتوی

(۱۵) مولانا محمد احسن نانوتوی

(۱۶) مولانا مفتی محمد ایوب پھلتی

(۱۷) مولانا محمد منیر نانوتوی

(۱۸) مولانا ذوالفقار علی دیوبندی

(۱۹) مولانا فصیح الدین عثمانی دیوبندی

(۲۰) مولانا فضل الرحمٰن عثمانی

(۲۱) مولانا انصار علی انبہٹوی

(۲۲) مولانا محمد حسن رامپوری

(۲۳) مولانا حکیم امین الدین دیوبندی

﴿قسم چہارم﴾

(۲۴) مولانا محمد یوسف خلف مفتی عبدالقیوم بڈھانوی

(۲۵) مولانا سدید الدین دہلوی

(۲۶) ڈپٹی نذیر احمد بجنوری

(۲۷) مولوی ضیاء الدین دہلوی

(۲۸) منشی ذکاء اللہ دہلوی

(۲۹) مولوی سمیع اللہ دہلوی
(۳۰) مولوی انوار الحق دہلوی
(۳۱) مولانا سید عبداللہ دہلوی
(۳۲) مولانا سید ہاشم علی دہلوی
(۳۳) مولوی علی احمد بجنوری
(۳۴) مولوی کریم الدین پانی پتی
(۳۵) مولوی حکیم عبدالرحمٰن حیرت
(۳۶) مولوی کریم بخش دہلوی
(۳۷) مولانا محمد یعقوب علی بدایونی
(۳۸) حکیم مرزا منور علی ہاپوڑی
(۳۹) قطب الدین دلاور علی طرزی پوڑی

﴿قسم پنجم﴾

(۴۰) مشتاق احمد
(۴۱) وجیہ اللہ
(۴۲) مولانا علیم اللہ بجنوری
(۴۳) حافظ فخر الدین گنگوہی کے والد ماجد
(۴۴) مولوی خدا بخش
(۴۵) عبدالرحمٰن
(۴۶) شمس الدین
(۴۷) ریاض الدین
(۴۸) حاجی احمد علی احراری رامپوری

﴿قسم ششم﴾

(۴۹) مولوی برکت علی تھانیسری

(۵۰) علی اکبر سونی پتی

(۵۱) علی اصغر سونی پتی

اس فہرست پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ حضرت مولانا کے علمی فیوض کا بادل کہاں کہاں تک برسا ہے اور اس سے کیسے کیسے لعل و گہر پیدا ہوئے ہیں، حضرت مولانا نے جس کسی سنگ پارے کو تراش دیا وہ لعل شب چراغ کی صورت اختیار کر گیا اور جس کسی کو حضرت مولانا کی صحبت میسر آ گئی وہ علم و عمل کا خوگر اور علمی دنیا کا کیسا مرد میدان ثابت ہوا۔

یہ فہرست اگر چہ بہ ظاہر چند اصحاب پر مشتمل ہے مگر ان میں سے اکثر اصحاب وہی ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر ایک دبستان، ایک مکتب فکر اور مرکز علم و عمل کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کی دینی خدمات دیکھئے تو ان کی حدود کا سراغ ملنا مشکل، ان کے علمی تدریسی کام کو دیکھئے تو اس کا احاطہ دشوار، اور ان کی تصنیف اور علمی آثار کو ملاحظہ کیجئے تو اس کا جائزہ بے پناہ اور ان کے شاگردوں پر نظر کیجئے اور بعد کے دور پر ان کے اثرات کا جائزہ لیجئے تو اس کے اثرات یہاں سے وہاں تک بکھرے ہوئے، حضرت مولانا کے براہِ راست شاگردوں کا تو کہنا ہی کیا ہے ان کے شاگردوں کے شاگرد بھی اس مرتبہ کے ہیں کہ ان میں سے بہت سے اپنے اپنے دور کے قائد و رہنما اور دینی علمی قافلوں کے میر کارواں تھے، ہر ایک کے احوال و خدمات ایک مستقل جامع کتاب بلکہ کتابوں کا موضوع ہیں، جوں جوں وقت گزرتا رہیگا اس دریا کی روانی اور اس سے سیراب علاقوں کی وسعت اور مردم خیزی میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

آئندہ صفحات میں اسی ترتیب کے مطابق ان حضرات کا مفصل یا مختصر تعارف درج ہوگا مگر تعارف کے مطالعہ سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ فہرست نہ حروف تہجی کی

ترتیب پر ہے نہ سن وفات پر، بلکہ اس میں ترتیب مراتب کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور اسی ترتیب کا خیال رکھتے ہوئے چھ (۶) درجات پر تقسیم کی گئی ہے۔

﴿۱﴾ قسم اول میں صرف ایک ہی شاگرد کا تعارف آئے گا۔ یہ شاگرد مولانا منشی جمال الدین کتانوی مدار المہام، ریاست بھوپال ہیں۔ منشی جی حضرت مولانا کے ایسے معلوم منفرد شاگرد ہیں جو حضرت مولانا کے ہم استاد بھی ہیں، منشی جی صاحب نے امام الکل زبدۃ المحدثین حضرت شاہ عبدالعزیز اور حضرت شاہ رفیع الدین سے براہِ راست استفادہ کیا ہے، ان کو حضرت شاہ عبدالعزیز سے تلمذ بھی حاصل ہے اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب سے استفادہ میں حضرت مولانا مملوک العلی سے فائق ہیں، ان کا خاصا وقت حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں گذرا ہے اور شاہ صاحب سے کثیر استفادہ کیا ہے، اور یہ بھی قرین قیاس ہے کہ مولانا منشی سید جمال الدین، دہلی میں حضرت مولانا مملوک العلی کے سب سے پہلے شاگرد یا ابتدائی چند شاگردوں میں سے ایک ہوں۔ ان وجوہات وخصوصیات کی وجہ سے ان کا تذکرہ حضرت مولانا کے اور شاگردوں سے مقدم ہے۔

﴿۲﴾ دوسری قسم کے تحت حضرت مولانا کے ان شاگردوں کا تعارف درج ہوگا جو حضرت شاہ محمد اسحاق کے براہِ راست شاگرد ہیں، ان کو شاہ محمد اسحاق سے تلمذ اور اجازتِ حدیث حاصل ہے۔ راقم سطور کو معلوم حضرت مولانا مملوک العلی کے شاگردوں میں اس مرتبہ کے صرف دس (۱۰) اصحاب ہیں ان سب کا اس قسم میں ذکر آئے گا۔

﴿۳﴾ تیسری قسم کے تحت حضرت مولانا کے ایسے شاگردوں کا تعارف ہے۔ جو برصغیر ہندو پاکستان میں احیائے اسلام، احیائے دین نیز مدارسِ اسلامیہ کے مؤسس اور داعی ونقیب ثابت ہوئے، ہمارے دور میں حضرت مولانا مملوک العلی کا تذکرہ وتعارف عموماً ان ہی اکابر علماء کی وجہ سے ہے، مگر ان حضرات کی دینی خدمات اور علمی کمالات کے پورے اعتراف کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ (حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی کے علاوہ) ان میں کوئی بھی حضرت شاہ محمد اسحاق کے دامن فیض سے براہِ راست وابستہ نہیں،

اسلئے ان حضرات و علماء کا تذکرہ حضرت شاہ صاحب کے تلامذہ کے بعد ہی آنا چاہئے۔

﴿۴﴾ چوتھی قسم ان صاحبان کے تذکرہ پر مشتمل ہوگی جو برصغیر میں اردو زبان وادب کے ممتاز ترین افراد میں شمار کئے جاتے ہیں، ان کی کوششوں اور تصانیف و تحریرات سے اردو کی نثری روایت، زبان وادب، تصنیف و تحریر اور صحافت و اخبار نویسی کو نئی زندگی، نئی سوچ، نیا رنگ اور مستقبل کے طویل سفر کیلئے نئے نشانِ قدم ملے اور یہ اصحاب ملی تحریکات کے بھی رفیق اور سرگرم قائد رہے اور ان کے متعدد خیالات کی صدائے بازگشت اب بھی سنائی دیتی ہے اور کبھی کبھی نوائے جرس کا کام کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ان اصحاب کی متعدد تحریریں، کوششیں اور پیام ایسے ہیں کہ ان سے اہل نظر فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ہمارے عہد کے دانشوروں کے ایک بڑے گروہ نے ان کے نظریات و خیالات سے گہرا اثر قبول کیا ہے اور تازہ تحریرات اور کتابوں میں حضرت مولانا کے اس طبقہ کے شاگردوں کی فکر اور تحریروں کا اثر اور ترجمانی صاف نظر آتی ہے۔ اگرچہ علمائے کرام کو ان کے متعدد نظریات سے صاف اور برحق اختلاف ہے مگر اس کی وجہ سے ان کو حضرت مولانا کے تلامذہ سے خارج نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس کتاب میں ان کے تعارف و تذکرہ کے شامل کئے جانے سے ان کے خاص نظریات کی تصدیق و تحسین متوقع ہے، ہمیں ان کے بعض خیالات و نظریات سے ہزار اختلاف ہو مگر حضرت مولانا مملوک العلی سے ان صاحبان کا تلمذ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔

﴿۵﴾ پانچویں قسم میں حضرت مولانا کے غیر متعارف یا ایسے شاگردوں کا ذکر ہے جن کے حالات مفقود ہیں اور ان کی کسی دینی علمی تصنیفی خدمت کا ہمیں علم نہیں، تاہم وہ حضرت مولانا کے شاگرد تھے، اس فہرست اور تعارف میں ان کا تذکرہ ضروری ہے، ممکن ہے کہ اہل علم و ذوق کو ان کے حالات یا کوئی ایسی تحریر و تالیف مل جائے جو ہمارے علمی ذخیرہ میں اضافہ ثابت ہو۔

﴿۶﴾ چھٹی اور آخری قسم میں حضرت مولانا کے ایسے شاگردوں اور مستفیدین کا تعارف ہوگا جو عقیدہ و نظریہ کے لحاظ سے حضرت مولانا کے عقیدہ و نظریہ سے

بالکل مختلف تھے، یہ مولانا کے شیعہ تلامذہ ہیں جو دہلی کالج میں اپنی اپنی جماعت کے عمدہ طالب علم گنے جاتے تھے، جس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ پرانے زمانے سے چلی آرہی یہ روایت حضرت مولانا میں بھی پوری طرح موجود اور کارفرما تھی کہ وہ تعلیم وافادہ میں صرف لیاقت کو دیکھتے تھے، نظریہ اور عقیدہ کا اختلاف بھی ان کی راہ اور افادہ میں رکاوٹ اور مانع نہیں ہوتا تھا۔

﴿قسم اول﴾

[مولانا مملوک العلی کے وہ تنہا شاگرد، جو مولانا کے ہم استاذ بھی ہیں]

[۱] مولانا منشی جمال الدین کتانوی (۱)

(مدار المہام ریاست بھوپال)

حضرت مولانا کے شاگردوں میں سب سے پہلے مولانا منشی جمال الدین کتانوی بھوپال کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ مولانا جمال الدین مولانا مملوک العلی کے ایسے منفرد شاگرد ہیں جو حضرت مولانا مملوک العلی کے ہم استاذ بھی ہیں، منشی جی مولانا مملوک العلی کے استاذ الاساتذہ حضرت شاہ عبد العزیز کی خدمت میں برسوں پابندی سے حاضری ہوئے ہیں اور بہت استفادہ کیا ہے۔ منشی جی نے حضرت شاہ رفیع الدین کی بھی صحبت اٹھائی ہے اور اس خانوادہ کے علماء کی متأخر نسل یا سلسلہ میں سے حضرت شاہ محمد اسماعیل، شاہ محمد یعقوب، شاہ محمد اسحاق رحمہم اللہ تعالیٰ میں سے ہر ایک کی خدمت میں منشی جی کو حاضری کا موقع ملا ہے، ہر ایک سے استفادہ کیا ہے۔ منشی جی کو حضرت شاہ محمد یعقوب سے تلمذ و تعلم کی نسبت بھی حاصل ہے۔ حضرت مولانا مملوک العلی کے معلوم شاگردوں میں منشی جی کے علاوہ کسی شاگرد کو بھی حضرت شاہ عبد العزیز اور شاہ رفیع الدین کی خدمت میں حاضری کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ اسلئے منشی جی کا احوال دیگر تذکروں پر مقدم کیا گیا۔

وطن اور خاندان

ایک صدیقی خاندان جس کا سلسلۂ نسب حضرت قاسم بن محمد کے واسطہ سے حضرت صدیق اکبرؓ سے ملتا ہے(۱) سہارنپور کی ایک چھوٹی سی بستی یا قصبہ بوڑیہ میں رہتا تھا۔ مگر مغلوں کے آخری دور میں جب یہ سارا علاقہ گوجروں، جاٹوں اور سکھوں کی چیرہ دستیوں کی وجہ سے تاراج و خاشاک ہوا، اس وقت اس خانوادہ کے ایک ممتاز شخص حسام الدین بوڑیہ سے سکونت ترک کر کے کتانہ(۲) (ضلع میرٹھ، حال ضلع باغپت مغربی یوپی) آگئے تھے، مولانا منشی جمال الدین انہی کی اولاد میں سے تھے، مولانا منشی جمال الدین کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے:

مولانا منشی سید جمال الدین بن حسام الدین بن محی الدین بن حسام الدین الخ (۳)

ولادت اور تعلیم

منشی جمال الدین کی ۱۲۱۷ھ (۱۸۰۳ء) میں کتانہ میں ولادت ہوئی۔(۴) غالباً بارہ تیرہ سال کی عمر میں تعلیم کے لئے دہلی بھیج دیئے گئے تھے۔ حکیم نورالدین (قادیانی) کے حوالے سے اکبر شاہ نجیب آبادی نے منشی جی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

میں نے دہلی میں حضرت مولانا مملوک العلی سے تعلیم حاصل کی (یہ دہلی کالج کے قائم ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے) اور حضرت شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالعزیز کی

---

(۱) مآثر صدیقی یا سیرت والا جاہی۔ ص ۴۸، ۴۷ جلد دوم لکھنؤ۔

(۲) کتانہ دورِ مغلیہ میں اچھی آبادی کا قصبہ یا شہر تھا جو بیگم شمرو کے عہد تک پر بہار قصبہ اور تجارت کا بڑا مرکز رہا، اب اجڑی بستی اور ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اس قصبہ میں متعدد بڑے مشہور بزرگ علماء اور کاملین پیدا ہوئے۔ قدیم دور کے بزرگوں میں حضرت سید طٰہٰ کتانویؒ (وفات ۱۰۸۴ھ) سب سے ممتاز تھے اور آخری دور میں مولانا منشی جمال الدین صاحب سرآمد روزگار شخص تھے۔ اس قصبہ میں اور بھی ممتاز اور معزز علماء پیدا ہوئے۔ موجودہ دور کے کئی نامور اہل دانش اسی بستی سے تعلق رکھتے ہیں۔ پاکستان کے موجودہ فوجی حکمراں پرویز مشرف بھی اسی بستی کے صدیقی خاندان سے ہیں مگر یہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ: امتی باعث رسوائی پیغمبر ہیں

(۳) مآثر صدیقی یا سیرت والا جاہی، نواب نورالحسن۔ ص ۴۴ ج ۲ (لکھنؤ: ۱۳۴۴ھ) نزہۃ الخواطر مولانا عبدالحئی حسنی رائے بریلوی۔ ص ۱۲۴ ج ۷ (حیدرآباد۔ ۱۴۰۲ھ)

(۴) نزہۃ الخواطر مولانا عبدالحئی حسنی۔ صفحہ ۱۲۴ ج ۷ (حیدرآباد: ۱۴۰۲ھ) مآثر صدیقی میں سن ولادت ۱۲۱۶ھ چھپا ہوا ہے جو بظاہر کتابت کی غلطی ہے، مولانا حسنی کی اطلاع درست اور محقق معلوم ہوتی ہے۔

خدمت میں اور ان کی مجالس وعظ وارشاد میں مسلسل حاضر ہوتے رہے۔

دہلی میں قیام کے زمانہ میں دہلی کی ایک خاتون جو منشی جی کی والدہ کی ملنے والی تھیں تیس روپے ماہوار تعلیم کے مصارف کے لئے دیتی تھیں، پیسے کی وجہ سے منشی جی بری صحبت میں پڑ گئے، یہاں تک کہ حضرت شاہ صاحب کے وعظ میں جانا بھی بند ہو گیا، شاہ صاحب نے جب کئی دن تک منشی کو مجلس وعظ میں موجود نہ پایا تو معلوم کیا اور خود منشی جی کے گھر تشریف لائے۔ شاہ صاحب کی اس عزت افزائی نے منشی جی پر گہرا اثر ڈالا اور اس وقت سے ہمیشہ کیلئے مستعد طالب علم، اتباعِ سنت اور خدمت دین کا نمونہ بن گئے تھے۔

حضرت شاہ غلام علی سے بے حد استفادہ کیا اور سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے شیخ کامل، شاہ محمد آفاق سے بیعت کی ان کی خدمت میں حاضر رہے، شاہ محمد یعقوب اور شاہ محمد اسحاق سے بھی پڑھا۔

خاندان شاہ ولی اللٰہی کے آفتاب و ماہتاب علماء اور دہلی کے بڑے مشائخ اور کاملین سے استفادہ کے ساتھ ہی ادبی محفلوں سے بھی گہرا رابطہ تھا، مومن خان مومن، شیخ ابراہیم ذوق، امام بخش صہبائی سے روابط اور مراسم تھے، منشی جی ان کی صحبتوں سے فائدہ اٹھاتے اور شعر وسخن سے رشتہ استوار رکھتے تھے۔

تعلیم سے فارغ ہو کر تلاش معاش میں اندور پہنچے، ملازمت کو زیادہ وقت نہیں ہوا تھا کہ ایک خواب دیکھا جس کی وجہ سے اس ملازمت سے نفرت ہوگئی، ملازمت چھوڑ کر اندور سے بھوپال آ گئے، اس وقت منشی جی کی عمر تینتیس سال تھی اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ منشی جی ۱۲۴۷ھ (۳۲-۱۸۳۱ء) میں بھوپال پہنچے ہوں گے۔ (۱)

بھوپال میں اول ایک معمولی کام کیلئے ملازم ہوئے، محنت و دیانت اور عمدہ کارکردگی کی وجہ سے ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں نائب اول کے عہدہ کے لئے تقرر ہوا، اسی ملازمت

(۱) مآثر صدیقی یا سیرت والا جاہی تالیف نواب نور الحسن خاں میں لکھا ہے کہ منشی جمال الدین کی ملازمت کے لئے شاہ رفیع الدین نے سفارشی خط لکھا تھا۔ (ص ۴۶ حصہ دوم) مگر یہ اطلاع صحیح نہیں۔ منشی جی شاہ رفیع الدین کی وفات کے تقریباً چودہ سال بعد سنہ ۱۲۴۷ھ (۳۲-۱۸۳۱ء) میں بھوپال ملازمت کے لئے گئے تھے۔

کے زمانہ میں ایک مرتبہ نواب سکندر جہاں بیگم، والیہ بھوپال پر قاتلانہ حملہ ہوا تو مولانا نے ان کو بچانے کی بھرپور کوشش کی جس کی وجہ سے بیگم صاحب کا مولانا پر اعتماد بہت بڑھ گیا تھا اور مولانا تمام معاملات میں بیگم صاحب کے مشیر اور معتمد بن گئے تھے، مولانا کے منصب میں اس قدر ترقی ہوئی کہ وہ ریاست بھوپال کے تمام ملازمین اور عہدہ داروں سے ممتاز شمار کئے جاتے تھے۔

۱۲۶۸ھ (۱۸۵۲ء) میں مدار المہام کے ممتاز عہدے اور اس کے خطاب سے نوازے گئے، ریاست کی طرف سے بڑی جاگیر عطا ہوئی اور نہایت اعزاز اور قدر و منزلت کا معاملہ ہوتا رہا۔

منشی جی نے پوری زندگی نہایت اعزاز و احترام سے گزاری، دیانت داری بیدار مغزی اور معاملہ فہمی میں بے نظیر تھے، مولانا کی ہوشیاری اور انصاف پسندی کی وجہ سے ریاست کے حکام اور انگریز افسران، دونوں کو مولانا پر یکساں اعتماد تھا، منشی جی دونوں کی نگاہوں میں محترم اور لائق اعتماد تھے، زندگی کے آخری لمحات تک اسی شان بان سے زندگی بسر کی، نواب نورالحسن خاں کے الفاظ میں:

''اس وقت کوئی دعوے دار ریاست اور حریف ان کا مدمقابل نہ تھا''(۱)

مولانا اگرچہ اپنی درباری ملازمت کی وجہ سے ایک بڑے منصب دار اور ریاست بھوپال کے غالباً سب سے بااثر شخص تھے، لیکن منشی جی کی نظر میں اس عہدہ و منصب کی کچھ وقعت نہیں تھی۔ مولانا کا اصل ذوق و مزاج درسِ قرآن و حدیث، علماء و صلحاء کی محبت اور طلبہ کی خدمت و نگہداشت کا تھا، سرکاری مصروفیات سے فارغ تمام وقت منشی جی کے یہاں علمی مجلس گرم رہتی تھی۔ منشی جی قرآن شریف کا درس دیتے تھے، حدیث وغیرہ کے سبق پڑھاتے تھے اور طلبہ کی معاشی سرپرستی اور دینی و اخلاقی تربیت میں مشغول رہتے تھے، نواب نورالحسن نے لکھا ہے:

''سب سے بڑھ کر جس شئے سے ان کو شیفتگی تھی وہ وعظ و نصیحت اور قرآن حکیم

(۱) مآثر صدیقی یا سیرت والا جاہی ص۔ ۴۷، ۴۸ جلد دوم لکھنؤ

کا ترجمہ تھا، یہ شیفتگی درجۂ عشق تک پہنچ گئی تھی، ترجمہ قرآن کریم کے درس و تدریس کے ذوق میں ہمیشہ سرشار رہا کرتے، انہوں نے ایک کتاب فرہنگ قرآن لکھی تھی جس کا نام کوکب دری رکھا تھا، وہ بذاتِ خاص طلبہ کو قرآن مجید و کتب حدیث کا درس دیا کرتے تھے اور طلبہ کی تکمیل تعلیم کے لئے انہوں نے بیش قرار تنخواہوں پر متعدد اساتذۂ علم کو اپنے صرف خاص سے مقرر کیا تھا۔''(۱)

بھوپال کے علماء اور اکثر طلبہ منشی جی کے ممنونِ احسان رہتے تھے، منشی جی کا ہاتھ نہایت کھلا ہوا تھا، ہر وقت سخاوت و عطایا کا سلسلہ جاری رہتا تھا، جس کا جب جی چاہے منشی جی کی دولت سرا میں منشی جی سے مل سکتا تھا، دربان و ملازم سے سفارش یا تعاون کی ضرورت نہ تھی، جہاں تک منشی جی کے اختیار اور گنجائش میں ہوتا وہ کسی کی درخواست اور سوال کو رد نہیں کرتے تھے، دن رات کی سخاوت اور دریا دلی کے علاوہ منشی جی کا دسترخوان بھی بہت وسیع تھا، جس میں تقریباً پانچ من (دو کوئنٹل) آٹا روزانہ پکتا تھا، منشی جی کے ساتھ پچاسوں علماء اور طالب علم دونوں وقت کھانے میں شریک رہتے تھے۔

منشی جی نے اپنے محل (نور محل) میں ایک بڑا مدرسہ قائم کیا تھا، جس میں معقول تنخواہوں پر متعدد علماء ملازم تھے، طلبہ کی بھی خاصی تعداد رہتی تھی، ان سب کی تنخواہوں، کھانے کپڑے کا خرچہ اپنی جیب خاص سے ادا کرتے تھے، علماء اور طلبہ سے نہایت خوش دلی سے ملتے، بہت اعزاز کرتے اور ان کے سامنے گویا بچھ جاتے تھے۔

منشی جی کو مسجدیں اور مدرسے بنوانے کا خاص شوق تھا، جن میں دینی تعلیم کا اہتمام کرتے اور ان پر پوری توجہ رکھتے تھے، مولانا عبدالحئی حسنی نے لکھا ہے کہ بھوپال میں جو دینی چرچا ہے اور ہر طرف مسجدیں آباد نظر آرہی ہیں یہ منشی جمال الدین کا ہی فیض اور لامتناہی صدقۂ جاریہ ہے۔(۲)

منشی جی کا ایک بہت بڑا ناقابل فراموش کارنامہ (بلکہ ہندی مسلمانوں پر ایک بڑا

(۱) مآثر صدیقی یا سیرت والا جاہی ص ۴۹ جلد دوم لکھنؤ

(۲) نزہۃ الخواطر مولانا عبدالحئی حسنی۔ص ۱۲۵ ج ۷ (حیدرآباد: ۱۴۰۲ھ)

دینی احسان) یہ ہے کہ منشی جی نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی نادر روزگار تصانیف خصوصاً حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفاء کو چھپوا کر عام کیا۔ ان کتابوں کے نسخے کم یاب تھے، منشی جی نے ہندوستان کے ایک مشہور ناشر، جید عالم اور مصنف و محقق مولانا محمد احسن نانوتوی سے جو حضرت شاہ صاحب کی کتابوں کے ماہر تھے، فرمائش کی کہ وہ دونوں کتابوں کو مقابلہ و تصحیح کے بعد شائع کر دیں، مصارف کی منشی جی نے ذمہ داری لی، مولانا محمد احسن نے قلمی نسخوں سے مقابلہ کر کے دونوں کے متن کی اغلاط درست کیں، صحیح متن مرتب کیا، دونوں پر مختصر مگر جامع اور فاضلانہ حاشیے لکھے اور برسوں کی محنت و جانکاہی کے بعد دونوں کتابوں کو نہایت عمدہ شایانِ شان طریقہ پر شائع کر دیا۔ ان دونوں کتابوں کی یہ اشاعتیں ایسی بابرکت اور مبارک ثابت ہوئیں کہ آج تک دنیا بھر میں حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفاء کے جو نسخے چھپ رہے ہیں وہ سب انہی اشاعتوں پر مبنی ہیں، ازالۃ الخفاء اس کے بعد ایک مرتبہ ہی چھپی جو مولانا احسن کے اسی نسخہ کا عکس ہے، حجۃ اللہ البالغہ بار بار چھپی ہے اور کثرت سے پڑھی جاتی ہے مگر اس کی بھی اس وقت تک کی تمام اشاعتیں اسی پہلی اشاعت پر مبنی ہیں، ان کتابوں کی طباعت منشی جی کا امت کے لئے بہت بڑا علمی تحفہ اور لافانی صدقۂ جاریہ ہے جس کا فیض ہمیشہ جاری رہے گا۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تصانیف کے علاوہ منشی جی نے تفسیر و حدیث شریف وغیرہ کی اور بڑی کتابیں بھی اسی اہتمام و فیاضی سے چھپوائیں، جس میں مخدوم علی مہائمی کی تفسیر مہائمی (تبصیر الرحمٰن) اور فتح الباری بھی شامل تھی۔

منشی جی کی ایک بڑی خدمت اور انکی اشاعت و خدمتِ قرآن کا مظہر قرآن شریف کے متعدد نسخوں کی اشاعت اور تقسیم ہے، منشی جی نے بڑی رقم خرچ کر کے قرآن شریف کے ترکی اور پشتو میں ترجمے کرائے اور دونوں ترجموں کو اہتمام سے چھپوا کر ترکی اور افغانستان میں تقسیم کرا دیا۔ منشی جی نے ایک قرآن شریف اور شائع کرایا تھا جس میں فارسی، اردو اور پشتو کے تین ترجمے شامل تھے، یہ ترجمہ تین بڑی جلدوں میں چھپا تھا اور منشی جی کی طبع کرائی ہوئی کتابوں کی طرح بلا قیمت علماء اور مستحق اصحاب کی خدمات میں بھیجا گیا۔ (۱)

(۱) اس طباعت کا ایک مکمل نسخہ ہمارے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے۔

منشی جی کی خدمات، محاسن اور کمالاتِ کا دائرہ بہت وسیع ہے، زیرِ نظر سطور میں اس کی گنجائش نہیں، مولانا عبدالحئیؒ حسنی نے منشی جی کے تذکرہ میں لکھا ہے:

"وبا لجملة انه كان علىٰ قذم الصحابة"(۱)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ وہ حضرات صحابہؓ کے قدم بہ قدم تھے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا صفت و تعریف ہوسکتی ہے جس کا ذکر کیا جائے۔

منشی جی کی تقریباً بیاسی سال کی عمر میں ۲۷ محرم الحرام ۱۲۹۹ھ (۲۰ دسمبر ۱۸۸۱ء) کو وفات ہوئی، رات کے گیارہ بجے باغ دل کشا میں پہلی نماز جنازہ ہوئی جو نواب صدیق حسن خاں نے پڑھائی مگر لوگوں کے آنے کا سلسلہ چلتا رہا اس لئے وقفہ وقفہ سے نماز جنازہ ہوتی رہی، گیارہ مرتبہ نمازِ جنازہ ہوئی، مختلف مدرسوں میں اور اہل حدیث علماء نے غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کی، شاعروں نے مرثیے لکھے، اہل ذوق نے فقراتِ تاریخ کہے اور مدت تک ماتم بپا رہا۔(۲)

منشی جی کے پسری اولاد نہیں تھی، فقط دو لڑکیاں تھیں، رجبی بیگم اور ذکیہ بیگم، دونوں کے پہلے نکاح رام پور منہیاران (ضلع سہارنپور) میں ہوئے تھے، دونوں کے شوہر انتقال کر گئے تھے، اسلئے چھوٹی بیٹی ذکیہ بیگم کا دوسرا نکاح نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپال سے ہوا، جن سے نواب علی حسن اور نواب نورالحسن وغیرہ تولد ہوئے۔(۳)

---

(۱) نزهة الخواطر ص ۱۲۵ ج ۷ (حیدرآباد: ۱۴۰۲ھ)

(۲) مآثر صدیقی یا سیرت والا جاہی نواب علی حسن خاں ص: ۵۶ ج دوم (لکھنؤ ۱۳۴۲ھ)

(۳) منشی جی کے اوصاف و کمالات کی تفصیل اور مزید معلومات کے لئے دیکھئے:

۱- تذکرہ روز روشن۔ از مظفر حسین صبا صاحب۔ ص: ۵۹۳ تا ۵۸۸ (بھوپال ۱۲۹۶ھ)

۲- مآثر صدیقی یا سیرت والا جاہی۔ نواب علی حسن خاں ص: ۴۴ تا ۵۷ ج: ۲

۳- نزهة الخواطر مولانا عبدالحئی حسنی ص: ۱۲۴-۱۲۵ ج: ۷

۴- مرقاۃ الیقین فی حیات نورالدین (حالات حکیم نورالدین قادیانی) مرتبہ: اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔ ص: ۸۰-۸۷ اور ص: ۱۲۸-۱۳۱ (طبع اول لاہور: بلا سنہ)

﴿قسم دوم﴾

[مولانا مملوک العلی کے وہ شاگرد جو حضرت شاہ محمد اسحٰق کے بھی شاگرد تھے]

[۲] مولانا سبحان بخش شکار پوری (۱)

شکار پور ضلع مظفر نگر (مغربی یوپی) کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، جو مظفر نگر سے بڑھانہ جانے والی سڑک پر شاہ پور سے سات کلومیٹر جنوب مغرب میں واقع ایک پرانی آبادی ہے، جو کبھی نہایت آباد اور پر رونق بستی تھی (۱) اور اب گویا اک ویرانہ ہے، جس کی صحیح تاریخ، وہاں کے اصحابِ فضل وکمال اور مصنفین کے حالات اور علمی وادبی شخصیتیں خواب وخیال ہوکر رہ گئی ہیں۔

مولانا سبحان بخش کے والد اور خاندان کی تفصیلات کا علم نہیں، مگر یہ خاندان صدیقی نسبت سے مشہور ہے، اس خاندان کے افراد سنہ ۱۸۵۷ء تک شکار پور میں رہتے تھے، اس وقت تک شکار پور اچھا خاصا قصبہ تھا، مگر معلوم نہیں اس قصبہ پر کیا آفت آئی کہ وہاں کی آبادی ختم ہوگئی۔ جو پرانے خاندان اور گھرانے رہ گئے تھے وہ بھی یہاں سے دوسری جگہوں پر منتقل ہو گئے تھے، جن میں مولانا سبحان بخش کا گھرانہ بھی شامل تھا، مولانا سبحان بخش صاحب غالباً طالب علمی کے زمانے سے ہی دہلی میں رہتے رہے، مولانا کے ایک بھائی

(۱) کہا جاتا ہے کہ شکار پور خاصی پرانی آبادی ہے۔ مگر اس کی قدیم تاریخ نہیں ملتی جو چند روایتیں نقل کی جاتی ہیں ان کی تصدیق وتحقیق بہت مشکل ہے، شکار پور کی بستی کا پہلا حوالہ تیمور کے دور کا ہے کہا جاتا ہے کہ تیمور سنہ ۸۰۱ھ (۱۳۹۹ء) میں یہاں آیا تھا۔ دوسرا حوالہ عہد سلطنت کا ہے جب سکندر لودی کے عہد حکومت (۸۹۴ھ-۹۲۳ھ-۱۴۸۹ء-۱۵۱۷ء) میں مخدوم جہاں گشت کے پڑپوتے شیخ عبدالدین قطب الدین (بن سید کبیر بن سید اسماعیل بن ناصر الدین محمود بن مخدوم جہانیاں) یہاں آئے۔

شیخ اپنے وطن اوچ (سندھ) سے دہلی پہنچے تھے، جہاں شکار پور ہے یہاں قیام کا ارادہ کیا اس وقت یہاں گھنے جنگلات تھے، شیخ نے اسی میں اپنی زندگی گذارنے کا فیصلہ کرلیا تھا، بہلول لودھی نے شیخ کے ساتھ آنا چاہا تھا مگر شیخ نے سختی سے منع فرمادیا، بہلول لودھی شیخ کی زیارت وملاقات کے لئے شکار کے بہانے سے شکار پور آیا تھا، غالباً اسی نے شیخ کا مقبرہ بھی تعمیر کرایا تھا، شیخ عبداللہ قطب اور بہلول لودھی کے یہاں آنے کا شیخ عبدالرشید قادری کیرانوی نے اپنی تالیف تاریخ قادریہ مؤلفہ سنہ ۱۱۵۰ھ (۱۷۳۷ء) میں ذکر کیا ہے، (عکس نسخہ مخزونہ خدابخش لائبریری پٹنہ) مملوکہ راقم سطور۔

مولوی عبد الرحمان سنہ ۱۸۵۷ء میں شکار پور سے ترکِ وطن کر کے جلال آباد (ضلع مظفر نگر) چلے گئے تھے، مولانا عبد الرحمٰن بھی عالم وفاضل شخص تھے کچھ دنوں کے بعد مولوی عبد الرحمٰن کی اولاد جلال آباد سے کیرانہ ضلع مظفر نگر آ گئی تھی۔(۱)

ولادت مولانا سبحان بخش کی صحیح تاریخ ولادت یا سنہ پیدائش معلوم نہیں، مگر کریم الدین پانی پتی نے طبقات شعرائے ہند میں لکھا ہے کہ:

''اس وقت سنہ ۱۸۴۷ء میں عمر اُن کی قریب چالیس برس کی ہے''(۲)

اگر کریم الدین کا یہ اندازہ صحیح ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ مولانا کی تقریباً سنہ ۷-۱۸۰۶ء (۲۲-۱۲۲۱ھ) میں ولادت ہوئی ہوگی۔

تعلیم مولانا کی تعلیم کا حال دریافت نہیں، مگر اس میں شک نہیں کہ مولانا نے درسیات کی اعلیٰ کتابیں دہلی میں پڑھیں، مولانا دہلی کالج کے طالب علم رہے یا نہیں، اس کی صراحت نہیں ملتی، قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ مولانا کالج کے ابتدائی دور کے طالب علموں میں شامل ہوں گے۔ مولانا نے مولانا مملوک العلی نانوتوی سے غالباً کالج کے آغاز کے بالکل ابتدائی سالوں میں اور بظاہر علیحدہ بھی پڑھا ہے۔(۳)

---

(۱) مولانا عبد الرحمٰن شکار پوری کے پوتے، حکیم نجیب الرحمان کیرانوی جید عالم، دار العلوم دیوبند کے فاضل، فنون عقلیہ، فلسفہ وکلام کے ماہر تھے اور طب میں بھی اچھی دسترس رکھتے تھے، تقریباً ستر سال عمر ہوئی، حکیم صاحب کے عقیدہ اور فلسفہ وکلام کے موضوع پر تین چار چھوٹے رسائل یا مختصر مطبوعہ تالیفات ہیں، ان کی اس وقت کے جید علماء اور اہل نظر نے تعریف کی تھی، ان ہی میں سے ایک تالیف ''عقیدۂ توحید و مسئلہ تقدیر'' میں حکیم صاحب نے اپنے دادا تک اپنے نسب اور مولانا سبحان بخش سے نسبت کا ذکر کیا ہے۔ لکھا ہے کہ:

''احقر حکیم نجیب الرحمان ولد مولوی عزیز الرحمٰن ابن مولوی عبد الرحمٰن برادر مولوی سبحان بخش مرحوم تلمیذ شاہ اسحاق محدث دہلی''

گذارش و دیباچہ عقیدۂ توحید و مسئلہ تقدیر، حکیم نجیب الرحمان (مطبوعہ: ۱۹۵۷ء)

(۲) طبقات شعرائے ہند۔ کریم الدین پانی پتی ،ص: ۴۶۶ (عکس طبع اول لکھنؤ: ۱۹۸۳ء)

(۳) مولانا مملوک العلی کے ایک نامور معاصر اس عہد کے دہلی کے قاضی القضاۃ اور غالب کے ممدوح مولانا مفتی رحمت علی خاں دہلوی عرف میرلال نے اپنی کتاب'' سراج المعرفت میں ایک موقع پر مولانا سبحان بخش کا ضمناً ذکر کیا ہے اور مولانا سبحان بخش کو مولانا مملوک العلی کا شاگرد لکھا ہے۔ سراج المعرفت نسخہ قلمی (مملوکہ راقم سطور)

مولانا سبحان بخش نے حدیث شریف کی اعلیٰ کتابیں دہلی (بلکہ ہندوستان کے) نامور عالم اور محدث حضرت شاہ محمد اسحاق سے پڑھیں۔ مولانا سبحان بخش نے شاہ محمد اسحاق سے اپنے تلمذ کا دو موقعوں پر ذکر کیا ہے، اپنی تصحیح کی ہوئی سنن ترمذی کی تمہید میں لکھا ہے:

"انّی سمعت هذاالكتاب من الشيخ المكرم المفخم المشتهر بين الآفاق المرحوم المغفور مولانا اسحاق و اجازني به"(۱)

مولانا سبحان بخش کو شاہ محمد اسحاق سے حصن حصین کی بھی اجازت ہے، جس کا مولانا محمد احسن نانوتوی نے خیر متین ترجمہ حصن حصین کے مقدمہ میں ذکر کیا ہے، مولانا محمد احسن نے لکھا ہے کہ:

"میری سند اس کتاب کی یہ ہے کہ مجھ کو اسکی اجازت تین شخصوں سے حاصل ہوئی اول مولانا احمد علی صاحب سہارن پوری، دوم مرشدی شاہ عبدالغنی مجددی، سوم مولانا سبحان بخش شکار پوری۔ اور ان تینوں حضرت کو اجازت مرشد آفاق مولانا محمد اسحاق دہلوی سے ہے"(۲)

مولانا سبحان بخش کے حقیقی بھائی مولانا عبدالرحمان شکار پوری کے پوتے حکیم نجیب الرحمٰن کیرانوی نے بھی اپنی تالیف عقیدۂ توحید و مسئلہ تقدیر میں مولانا سبحان بخش کو حضرت شاہ محمد اسحاق کا شاگرد لکھا ہے۔(۳)

مولانا کی تعلیم کی معلومات کی کم یابی کے باوجود کہا جا سکتا ہے کہ مولانا سبحان بخش نے بہت محنت اور توجہ سے پڑھا ہوگا اور ان کا اپنی جماعت اور ہم عصر طلبہ میں ممتاز درجہ ہوگا، قرین قیاس ہے کہ امتحانات میں بھی اول آتے ہوں گے اور اپنی اسی اعلیٰ صلاحیت اور عمدہ تعلیمی ریکارڈ کی وجہ سے نوعمری میں دلی کالج کے مدرسِ سوم بنائے گئے ہوں گے۔

---

(۱) مقدمہ سنن ترمذی (مطبوعہ فخر المطابع، دہلی: ۱۲۷۰ھ)

(۲) خیر متین ترجمہ حصن حصین، مولانا محمد احسن نانوتوی، (مطبع مجتبائی دہلی) نیز تذکرہ مولانا محمد احسن نانوتوی، ایوب قادری ص: ۳۲ (کراچی ۱۹۸۶ء)

(۳) عقیدہ توحید و مسئلہ تقدیر حکیم نجیب الرحمٰن کیرانوی، ص: ۲ (مطبوعہ دیوبند: ۱۹۵۷ء)

دہلی کالج میں تقرر

مولانا کا ۵/۱اکتوبر سنہ ۱۸۳۴ء (یکم جمادی الاخریٰ ۱۲۵۰ھ) کو دہلی کالج میں مدرس سوم کے منصب کیلئے تقرر ہوا(۱) اس تقرر سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ کالج کی انتظامیہ خصوصاً کالج کے مدرس اول و دوم مولانا مملوک العلی اور مولانا سید محمد دہلوی (۲) دونوں زمانہ طالب علمی سے مولانا سبحان بخش کی اعلیٰ علمی اور اخلاقی خوبیوں سے خوب واقف ہوں گے اور سب کی نظر میں مولانا سبحان بخش کی خاص وقعت ہوگی، دونوں مولانا سبحان بخش کا خاص خیال رکھتے ہوں گے اور انہی کی وجہ سے مولانا کالج میں اعلیٰ درجوں کے استاد نامزد کیئے گئے ہوں گے، ان دونوں کی نگاہِ توجہ اور منظوری کے بغیر مولانا سبحان بخش کا کالج میں تقرر مشکل تھا۔

کالج میں مولانا کی عمدہ کارکردگی

مولانا نے جلد ہی کالج کے عہدہ داروں، استادوں اور طلبہ میں اپنا ایک خاص مقام بنا لیا تھا، مولانا کی اعلیٰ لیاقت، محنت و صلاحیت اور عمدہ طریقۂ تعلیم کا سب کی زبانوں پر تذکرہ اور تحسین تھی (۳) کالج کے پرنسپل اساتذہ اور سب ہی طلبہ مولانا کی لیاقت اور علمی کمال کے مداح و معترف رہتے تھے، بابائے اردو مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ:

''مولوی سبحان بخش........دلّی کالج کے قابل اور کارگزار مدرس تھے، پرنسپل نے اپنی رپورٹوں میں جابجا ان کی تعریف کی ہے''(۴)

سنہ ۱۸۴۷ء (۶۳-۱۲۶۲ھ) میں مولانا سبحان بخش کے درجہ میں اکیس طالب علم پڑھتے تھے،(۵) انکی علمی صلاحیت اعلیٰ درجہ کی تھی اور وہ امتحان میں بھی اچھے نمبر لاتے تھے۔

(۱) مولانا محمد احسن نانوتوی، ایوب قادری، ص:۱۷۳۔ قادری صاحب نے اس اطلاع کے لئے رپورٹ جنرل کمیٹی آف پبلک انسٹرکشن سنہ ۳-۱۸۴۲ء کا حوالہ دیا ہے۔

(۲) مولانا سید محمد تعشق دہلوی (ولادت تقریباً ۱۷۷۱ء وفات ۱۸۵۴ء) دہلی کالج کے مدرس سوم پھر مدرس دوم ہوئے دہلی کی نامور علمی شخصیت اور دہلی کالج کے ممتاز استاد تھے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ایک نادر مجموعۂ مکاتیب مرتبہ محمد اکرام چغتائی: ۳۰۳ تا ۳۰۵۔

(۳) مولانا محمد احسن نانوتوی۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری، ص:۱۷۳ (کراچی: ۱۹۶۶ء)

(۴) مرحوم دہلی کالج، ص:۱۵۳ (دہلی: ۱۹۴۵ء)

(۵) ایک نادر مجموعہ مکاتیب، مرتبہ ڈاکٹر محمد اکرام چغتائی۔

مدرسِ سوم سے مدرسِ دوم کے عہدے پر ترقی

مولانا متعلقہ خدمات انجام دے رہے تھے کہ ۱۱/ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ (۷/اکتوبر ۱۸۵۱ء) کو کالج کے مدرس اول، مولانا مملوک العلی نانوتوی کی چند روزہ بیماری کے بعد وفات ہوگئی، اس وقت مولانا سید محمد دہلوی مدرس دوم اور مولانا سبحان بخش مدرس سوم تھے، مولانا مملوک العلی کی وفات کے بعد کالج کی انتظامیہ نے مدرس دوم، مولانا سید محمد دہلوی کو مدرس اول نامزد کردیا جس کی وجہ سے مدرس دوم کا عہدہ خالی ہوگیا تھا، یہ عہدہ نظام کی ترتیب اور منصب کے مطابق مولانا سبحان بخش کا حق تھا، لیکن مولانا سبحان بخش کے تقرر میں دیر ہوئی، الجھن یہ تھی کہ اس عہدہ کے لئے دو امیدوار اور بھی سامنے آگئے تھے، مولوی حسن علی خان، جو فارسی شعبہ میں استاد تھے اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی، جو مرحوم مدرس اول مولانا مملوک العلی کے فرزند تھے۔

مولانا یعقوب اگر چہ کالج میں مدرس یا ملازم نہیں تھے کسی جگہ کی تلاش میں تھے مگر دہلی کے اصحاب جو دہلی کالج کے لئے مولانا مملوک العلی کی خدمات سے واقف اور ان کے قدردان تھے، چاہتے تھے کہ مولانا مملوک العلی کا منصب ان کے بیٹے مولانا یعقوب کو مل جائے، مولانا مفتی صدر الدین آزردہ (جو دہلی کالج کے مشیر اور ممتحن بھی تھے) اور مولانا سید محمد (جو اَب مدرس اول ہوگئے تھے) ان دونوں کی بھی یہی کوشش تھی کہ اس عہدہ پر مولانا محمد یعقوب کا تقرر ہو جائے (۱) کالج کی انتظامیہ کے لئے ان دونوں کی سفارش کو نظر انداز کرنا مشکل ہو رہا تھا، اس لئے انتظامیہ نے طے کیا کہ متوقع تینوں امیدواروں کا ایک امتحان لے لیا جائے، جس کے جوابات سب سے عمدہ ہوں، اس کا اس منصب پر تقرر کردیا جائے۔ اس امتحان کے لئے بھی مفتی صدر الدین آزردہ ممتحن بنائے گئے تھے مگر

(۱) مولانا مملوک العلی کی وفات کے بعد اس عہدہ کے لئے امیدواروں اور متعلقہ امتحانات وغیرہ کی تفصیل کا علی اکبر اور برکت علی کے ان خطوط سے پتہ چلتا ہے جو دونوں نے اسی وقت اسپرنگر کو لکھے تھے۔ یہ خطوط ایک نادر مجموعہ مکاتیب مرتبہ جناب محمد اکرام صاحب چغتائی سہ ماہی اردو کراچی (۸۶-۱۹۸۴ء) میں شامل ہیں۔ ملاحظہ ہو: ۳۲۴-۳۳۶-۳۳۷ اور ۳۷۲-۴۲۳۔

کالج کے چند پرانے طالب علموں کا (جن میں سے ایک کالج میں غالباً ابتدائی درجہ کے استاد بھی تھے) خیال تھا کہ یہ امتحان دیانت داری سے نہیں ہو رہے ہیں بلکہ مفتی صاحب نے اپنی پسند کے امیدوار (مولانا محمد یعقوب نانوتوی) کی تقرری کیلئے یہ راستہ نکالا ہے، اسی لئے مفتی صاحب نے سوالات کا پرچہ بھی بہت آسان بنایا ہے جس کا مقصد امتحان میں مولانا یعقوب کو فائدہ پہنچانا ہے، دہلی کالج کے پرانے طالب علم یہ چاہتے تھے کہ اس منصب پر مولانا سبحان بخش کا ہی تقرر ہو، جو اپنے علم وفضل کی وجہ سے کالج کے تمام مدرسین سے ممتاز ہیں اور یہ منصب انکا حق بھی ہے، انہوں نے اس مقصد کیلئے دہلی کالج کے پرنسپل اسپرنگر (L.SPRENGER) کو خطوط بھی لکھے تھے کہ وہ اس معاملہ میں مداخلت کر کے مدرس دوم کے عہدہ پر مولانا سبحان بخش کا تقرر کرا دیں، علی اکبر سونی پتی نے اسپرنگر کو جو خط لکھا تھا اس کا اقتباس اوپر گذر چکا ہے۔

یہی بات دہلی کالج کے ایک اور پرانے طالب علم (اور کالج میں مدرسی کے امیدوار) مولوی سید برکت علی نے بھی لکھی تھی (۱) اس امتحان کے نتائج کا تو سراغ نہیں ملا، لیکن برکت علی وغیرہ کی یہ کوشش کامیاب ہوگئی اور مولانا سبحان بخش کالج کے مدرسِ دوم کے عہدہ کے لئے نامزد کر دیئے گئے، جو سنہ ۱۸۵۷ء (میں کالج کے ختم ہونے) تک اسی اعلیٰ منصب پر فائز رہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد کالج کی تجدید، مولانا کا کالج میں دوبارہ تقرر اور سبکدوشی

سنہ ۱۸۵۷ء میں مولانا سبحان بخش کہاں تھے، اس کا علم نہیں۔ سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک میں مولانا کا کیا کردار رہا اس کا بھی سراغ نہیں ملتا، لیکن سنہ ۱۸۵۷ء کے معرکہ کے سات سال بعد سنہ ۱۸۶۴ء میں جب کالج دوبارہ کھلا (۲) تو اس وقت بھی مولانا کو مدرس اعلیٰ نامزد کیا گیا۔ کالج کے دوسرے دور

(۱) مولوی برکت علی کے اس خط کے لئے ملاحظہ ہو: ایک نادر مجموعہ مکاتیب، چغتائی، ص: ۴۲۳-۴۲۴۔

(۲) مرحوم دہلی کالج، ص: ۶۳ (دہلی: ۱۹۴۵ء)

میں مولانا صرف عربی درجات کے مدرس اول نہیں تھے بلکہ عربی، فارسی، اردو تینوں شعبوں کے سربراہ تھے۔ مولانا سبحان بخش نے ''محاوراتِ ہند'' کی وجہ تالیف میں اپنے تعارف میں لکھا ہے کہ:

''سبحان بخش ساکن شکار پور، ضلع مظفرنگر کہ غدر سے پہلے دہلی کالج میں مدرس دوم عربی اور بعد غدر کے پھر کالج دہلی میں مدرس عربی و فارسی و اردو تھا اور اب پنشن دار ہے، عرض کرتا ہے کہ:''(۱)

مولانا سبحان بخش کے ان الفاظ سے معلوم ہو رہا ہے کہ مولانا ملازمت کی قانونی عمر (یا مدت) پوری ہونے تک کالج سے مسلسل وابستہ رہے، مگر اس کا سراغ نہیں ملتا کہ یہ ملازمت کب ختم ہوئی، بہ ظاہر دہلی کالج کے ٹوٹنے یا لاہور منتقل ہونے سے پہلے مولانا کالج سے سبکدوش ہو گئے ہوں گے۔

دہلی کالج اپریل سنہ ۱۸۷۷ء میں ختم کر کے لاہور کالج میں ملا دیا گیا تھا، اور دہلی کالج کے تمام استاد اور ملازمین بھی دہلی سے لاہور بھیج دیئے گئے تھے(۲) ملازمین کے اس قافلہ میں مولانا سبحان بخش صاحب شامل نہیں ہوں گے کیوں کہ اس وقت مولانا کی عمر تقریباً ستر (۷۰) سال ہو چکی تھی، قیاس چاہتا ہے کہ مولانا اس سے پہلے ہی کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہوں گے۔

مولانا اگرچہ کالج سے سبکدوش ہو گئے تھے، مگر لمبی ملازمت اور خاصی عمر کے باوجود اس کے بعد بھی آخر تک خوب سرگرم اور علمی کاموں میں مشغول رہے، تصنیف و ترجمہ کا کام ہوتا رہا بلکہ اس میں شاید کچھ اور وسعت اور تیزی آ گئی تھی، درس و تعلیم کا مشغلہ بھی جاری تھا جو زندگی کے آخری دنوں تک اس طرح چلتا رہا۔

علمی مرتبہ

مولانا سبحان بخش جید عالم، ماہر مدرس، عمدہ مترجم و مصنف تھے۔ دہلی کالج کی انتظامیہ اور طلبہ دونوں مولانا کی لیاقت و صلاحیت کے مداح اور

(۱) محاوراتِ ہند، مولانا سبحان بخش شکار پوری، ص:۲ (مکتبہ جامعہ دہلی: ۱۹۹۴ء)

(۲) مرحوم دہلی کالج، ص:۱۱۱۔

مولانا کے علمی مرتبہ کے معترف تھے، مولوی عبدالحق کی اطلاع ہے کہ:

''(مولوی سبحان بخش) دہلی کالج کے قابل اور کارگزار مدرس تھے، پرنسپل نے اپنی رپورٹوں میں جابجا ان کی تعریف کی ہے''(۱)

دہلی کالج کے طالب علم بھی مولانا کے فضل وکمال اور طریقۂ تعلیم کی منہ بھر بھر کر تعریف کیا کرتے تھے، مثلاً کریم الدین پانی پتی نے سنہ ۱۸۴۷ء میں لکھا ہے کہ:

''مولوی سبحان بخش صاحب مدرس سوم عربی، مدرسہ دہلی کے بہت فہمیدہ اور عقلمند اور عالم آدمی ہیں، علم ان کو اچھا ہے، مہارت فنون مستعملہ میں اچھی رکھتے ہیں مدت سے مدرسہ دہلی میں ملازم ہیں۔''(۲)

اسی کالج کا ایک بہت ذہین اور تیز طالب علم (علی اکبر سونی پتی) مولانا کے متعلق اپنا خیال یوں ظاہر کرتا ہے:

''یہ شخص یعنی مولوی سبحان بخش مستحق عہدہ مدرسی دویم عربی کے ہیں، جب کبھی خیال ہو، اور کیوں مستحق نہ ہوں کہ وے بڑے عالم ہیں، رات دن پڑھنے پڑھانے میں مصروف رہتے ہیں، اپنے مکان پر بھی یہی چرچا رکھتے ہیں اور مدرسہ میں تو اس کام کی نوکری ہی پاتے ہیں اور اسی واسطے کتابیں تحصیل ان کو خوب یاد ہیں، ابتداء سے لے کر انتہاء تک کئی بار پڑھایا ہے، فی الحقیقت بڑی استعداد کامل رکھتے ہیں۔ سوا اس کے بڑی بات یہ ہے کہ وے طالب علموں پر بڑی محنت کرتے ہیں اور ان سے بہت محنت لیتے ہیں، خواندگی سننے اور ترکیب عبارات عربی کے لکھوانے اور جواب مضمون کا لکھوانا اور ان میں اصلاح دینی، تمام دن ان کا انہیں باتوں میں جاتا ہے، چاہئے کہ کوئی دم ذرا آپ دم لیں یا طالب علم کو دم لینے دیں، کیا ممکن!

حقیقت حال یہ ہے کہ طالب علم کی انہیں کی جماعت میں آن کر استعداد درست ہوتی ہے، وجہ اسکی یہ ہے کہ آپ بھی شوق سے پڑھاتے ہیں اور طالب علموں

(۱) مرحوم دہلی کالج: مولوی عبدالحق، ص:۱۵۳ (انجمن ترقی اردو، دہلی: ۱۹۴۵ء)

(۲) طبقات شعرائے ہند، کریم الدین پانی پتی، ص:۴۶۶ (عکس طبع اول لکھنؤ: ۱۹۸۳ء)

کو بھی شوق دلاتے ہیں، اور محنت پر برانگیختہ کرتے ہیں، پس طالب علم خواہ مخواہ مستعد اور محنت کش ہوا چاہیے''(۱)

اس زمانے کے اور اہل فضل وکمال بھی مولانا سبحان بخش کے کمالِ علمی کے مدح خواں تھے، گارساں دتاسی کا قول ہے:

''تذکرۃ الحکماء اور تذکرۃ المفسرین ان دونوں کے مؤلف مولانا سبحان بخش ہیں، اس زمانے کے فرزانہ اور ظریف ہندوستانی مصنف ہیں''(۲)

دتاسی نے اپنی دوسری تالیف میں مولانا سبحان بخش کو فضلائے کبار میں سے شمار کیا ہے(۳) مولانا مملوک العلی کی وفات کے بعد مولانا سبحان بخش کا مدرس دوم کے عہدہ پر تقرر ان اطلاعات کی تصدیق کرتا ہے۔ اس ترقی اور مدرس دوم نامزد کئے جانے سے ضمناً یہ بھی معلوم ہورہا ہے کہ کالج کی انتظامیہ بھی مولانا کی مرتبہ شناسی اور ان کے علم وفضل کے اعتراف میں کسی سے پیچھے نہیں تھی۔

دینی علمی تصانیف، تراجم اور حاشیے

مولانا سبحان بخش تعلیم وافادہ میں اپنے استادوں کے قدم بہ قدم تھے ہر وقت درس اور سبق کا سلسلہ جاری رہتا، کالج سے فارغ اوقات میں گھر پر بھی طلبہ کو پڑھاتے تھے، جب تک کالج سے وابستہ رہے اس زمانہ میں شاید تعلیم اور کالج کی ذمہ داریوں کے بوجھ کی وجہ سے تحریر وتصنیف کا کام بہت زیادہ نہیں ہوتا تھا تاہم کالج اور دہلی سوسائٹی کی جانب سے جو کتابیں ترجموں کے لئے مولانا کے سپرد کی گئی تھیں مولانا نے ان کے اعلیٰ درجہ کے ترجمے کئے، ان میں سے کئی کتابوں کے ترجمے کالج سے شائع بھی ہوئے، لیکن کالج کے زمانۂ تدریس میں کالج کی جانب سے مفوضہ خدمات یا ترجموں کے علاوہ اس دور کی کسی اور تالیف یا ترجمہ کا راقم کو علم نہیں، لیکن مولانا جب کالج کی ذمہ داریوں سے

(۱) مکتوب علی اکبر، بنام اسپرنگر۔ مکتوبہ ۱۷؍اکتوبر سنہ ۱۸۵۱ء ایک نادر مجموعہ مکاتیب (مکتوبات مشاہیر ہند بنام اسپرنگر) مرتبہ ڈاکٹر محمد اکرام چغتائی، ص ۳۳۴-۳۳۵ (سہ ماہی اردو، کراچی: اپریل، جون ۱۹۸۶ء)

(۲) ہندوستانی مصنفین اور ان کی تصانیف، ص: ۹۷ (سہ ماہی اردو اورنگ آباد: اپریل ۱۹۲۸ء)

(۳) ملاحظہ ہو: رسالہ تذکرات دتاسی، مترجمہ مولوی ذکاء اللہ، مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ص (دہلی: ۱۹۶۸ء)

سبکدوش ہو گئے تھے اس وقت تحریری تصنیفی کام تیزی سے ہوا، اس وقت سے وفات تک مولانا ہمیشہ علمی کاموں اور تصنیف وترجمہ وغیرہ میں مصروف رہے، کئی کتابوں کے ترجمے اور تصانیف کیں، علمی اشاعتی کاموں میں نامور علماء خصوصاً مولانا نواب قطب الدین دہلوی کے رفیق ومعاون رہے۔

مولانا سبحان بخش کی معلوم تصانیف اور ترجموں کو تین موضوعات پر تقسیم کیا جا سکتا ہے، علوم اسلامیہ (حدیث، فقہ، دینیات وغیرہ)، تاریخ اور اردو ادب، پہلی قسم کی تالیفات اور خدمات میں پہلا اہم کام سنن ترمذی کی پہلی طباعت (جو مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کے حاشیہ اور تصحیح واہتمام سے چھپی تھی) کا دوبارہ مقابلہ اور تصحیح کی، اس کے حوالوں کو جانچا پرکھا، اور دوسری اشاعت کے لئے تیار کیا۔

سنن ترمذی کی تصحیح وتعلیق کے علاوہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مشہور کتاب مجالس الابرار کا اردو ترجمہ کیا، فقہ شافعی کے نامور عالم شیخ ابوشجاع اصفہانی کی فقہ شافعی پر مختصر کا بھی اردو ترجمہ کیا، ابن حجر کندی کی منبہات کو فارسی میں منتقل کیا، شیخ عبدالحق کی ماثبت بالسنۃ کا بھی اردو ترجمہ کیا، ایک فارسی کتاب کے اردو ترجمہ میں مولانا نواب قطب الدین دہلوی کے رفیق رہے۔

ادبی لسانی موضوعات میں محاوراتِ ہند پر مولانا کی دستاویزی تالیف تقریباً سو برس سے اہل ذوق کی مدد اور رہنمائی کر رہی ہے۔

مولانا کے معلوم ترجموں اور تالیفات کا مختصر تعارف آئندہ صفحات میں پیش ہے۔

حاشیہ وتصحیح سنن ترمذی
(مطبوعہ دہلی: ۱۲۷۰ھ)

سنن ترمذی علم حدیث کی بنیادی اور چند اہم ترین کتابوں میں سے ہے، یہ کتاب پوری دنیا میں سب سے پہلے حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری نے شائع کی تھی۔ حضرت مولانا احمد علی نے ترمذی کا جو نسخہ شائع کیا تھا، اس کی تصحیح، مقابلہ اور نظر ثانی کی خدمت مولانا مملوک العلی نے انجام دی تھی، اس نسخہ کی طباعت سنہ ۱۲۶۵ھ (۴۹-۱۸۴۸ء) میں مولانا احمد علی کے (ذاتی پریس) مطبع احمدی

میں مکمل ہوئی تھی۔ سنن ترمذی کو دوسری اشاعت کیلئے مولانا سبحان بخش نے مرتب کیا، نیا حاشیہ لکھا اس کے متن کا مقابلہ اور تصحیح کی۔ مولانا سبحان بخش نے لکھا ہے:

"یقول العبد الضعیف الراجی الی رحمة رب العرش سبحان بخش الساعی فی انطباع ھذا الکتاب المستطاب ثانیا و تصحیحه و مقابلته مع الطبع الاول"

کمزور بندہ رب عرش کی رحمت کا امیدوار سبحان بخش کہتا ہے جو اس کتاب کی دوسری طباعت کے لئے کوشش کر رہا ہے اور اس نے اس کا پہلی طباعت سے مقابلہ و تصحیح کی ہے"۔

سنن ترمذی کا یہ نسخہ حافظ نیاز احمد (جوش) کیرانوی (۱) کے مطبع فخر المطابع دہلی سے شائع ہوا تھا، اس کی طباعت شوال میں شروع ہو کر ذی الحجہ سنہ ۱۲۷۰ھ ستمبر (۱۸۵۴ء) میں مکمل ہوئی۔

---

(۱) شیخ اللہ دیا معروف بہ نیاز احمد: فرزند حافظ عبداللہ بن مولوی الٰہی بخش کیرانوی ان کا خاندان کیرانہ کا رہنے والا ہے، حافظ عبداللہ اور ان کے والد بہادر شاہ ظفر کے ولی عہد مرزا فخرو کے مصاحب اور معتمد افراد میں سے تھے، اور قلعہ معلی میں شاہی پریس (سلطان المطابع) کے نگراں تھے۔ جوش کے والد آخر تک قلعہ کے مطبع سلطانی سے وابستہ اور قلعہ کی مطبوعات وغیرہ کے نگراں رہے مگر جوش نے مرزا فخرو کی مناسبت سے فخر المطابع کے نام سے اپنا الگ چھاپہ خانہ بھی کھول لیا تھا، اس مطبع نے بھی متنوع موضوعات پر عمدہ کتابیں شائع کیں۔

جوش کا عین نوجوانی میں صرف پچیس سال کی عمر میں سنہ ۱۲۷۱ھ (۵۵-۱۸۵۴ء) میں انتقال ہو گیا تھا۔ جوش اور اس کے والد کا علمی ادبی مقام، ذوق کے شاگردوں میں نیاز کا مرتبہ اور نیاز کا رنگ کلام اور دریافت اشعار کا اور اُن کے مطبع کی مطبوعات کا تعارف ایک علیحدہ مفصل مضمون کا طالب ہے۔ جوش نہایت ذہین ذکی طباع اور باصلاحیت شخص تھے، شعر و سخن میں ذوق سے استفادہ کیا تھا، ذوق اپنے سب شاگردوں میں انہیں کو قابل ترین اور طباع سمجھتے تھے۔ اگر جوش کی زندگی وفا کرتی تو ذوق کے جانشین ہوتے جوش لالہ سری رام کے بقول:

"از سرتا پا استاد کے حق میں ڈوبے ہوئے تھے، وہی زبان بندش وہی لطف محاورہ، غرض سارے اسلوب وہی تھے" خم خانہ جاوید ص: ۲۸۴ ج: ۲

جوش کے تعارف کیلئے دیکھئے طبقات شعرائے ہند کریم الدین پانی پتی ص: ۴۳۰-۴۳۱ لکھنؤ سنہ ۱۹۸۳ (۲) گلستان سخن قادر بخش صابر مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی ص: ۳۷۹-۳۸۰ جلد اول لاہور: سنہ ۱۹۶۶ (۳) سخن شعراء انساخ ۱۱۴-۱۱۵

خزینۃ الاسرار ترجمہ مجالس الابرار
(مطبوعہ:۱۲۷۹ھ)

حضرت شیخ عبد القادر جیلانی وفات سنہ ۵۶۱ھ (۱۱۶۶ء) کا دنیائے اسلام میں جو مقام و مرتبہ ہے، اس سے کوئی لکھا پڑھا مسلمان شاید ہی ناواقف ہو۔ مجالس ابرار حضرت شیخ جیلانی کی مشہور ترین تالیف ہے، یہ کتاب اور ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی خاصی مقبول تھی، اس کتاب کی تعلیمات و ہدایات کو عام لوگوں تک پہنچانے کیلئے مولانا سبحان بخش نے اس کا اردو ترجمہ کیا تھا جو اس بڑی کتاب کا پہلا اردو ترجمہ ہے۔

یہ خاصا رواں صاف ستھرا ترجمہ ہے، یہاں اس کتاب کے عربی کے چند جملے اور ان کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے جس سے ترجمہ کی زبان کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

"المجلس السبعون فی بیان حرمة الاحتکار و سائر ما یتعلق به من الاحکام الشرعیة قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من احتکر فهو.......... هذاالحدیث من صحاح المصابیح رواه عمر بن عبد الله و معناه ان من جمع الطعام الذی یجلب الی البلد ویحبسه لیبیعه وقت القلاء فهو اثم"

ترجمہ: سترویں مجلس میں بیان احتکار کی حرمت کا، اور تمام احکام شرعی جو اس سے متعلق ہیں، "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے احتکار کیا پس وہ خطاوار ہے، یہ حدیث مصابیح کی صحیح حدیثوں میں سے ہے، عمر بن عبد اللہؓ کی روایت سے اس کے یہ معنی ہیں کہ جو شخص غلہ جمع کرے جو کہ شہر کی طرف رسد آتی ہے اور اس کو روک رکھے اس لئے کہ گراں کر کے بیچے تو وہ گنہگار ہے"(۱)

خزینۃ الاسرار کا جو نسخہ میرے پاس ہے اس کے شروع کے چند صفحات ضائع ہو چکے ہیں، اس لئے یہ معلوم نہیں کہ کتاب کے آغاز پر مترجم نے اس ترجمے کے متعلق کیا لکھا ہے، مگر کتاب کی آخری سطور میں مولانا سبحان بخش کی یہ صراحت درج ہے کہ میں نے یہ

(۱) خزینۃ الاسرار ترجمہ مجالس الابرار، ص ۵۲۸ (طبع اول ۱۲۷۹ھ)

ترجمہ مولانا نواب قطب الدین دہلوی کی فرمائش اور ہدایت پر کیا ہے۔

یہ ترجمہ ربیع الثانی سنہ ۱۲۷۹ھ (ستمبر اکتوبر ۱۸۶۲ء) میں پورا ہوا تھا، مولانا کی چند سطریں ملاحظہ ہوں:

''امابعد احقر العباد سبحان بخش عفی عنہ ساکن قصبہ شکار پور ضلع مظفر نگر عرض کرتا ہے کہ کتاب مجالس الابرار ....نواب صاحب مستغنی عن الاوصاف جناب مولانا واولٰنا مولوی حاجی قطب الدین صاحب کو واسطے افاضہ عام اور فیض تمام کے اس کے ترجمہ کا خیال آیا کہ اس کتاب کے مضامین عام فہم ہو جاویں...... اور اس کا نام خزینۃ الاسرار ترجمہ مجالس الابرار تجویز کر کر جناب موصوف کی خدمت میں پیش کیا۔ مولانا صاحب نے سارے ترجمہ کو بالاستیعاب ملاحظہ فرمایا اور پسند کر کر اجازت طبع کی دی''

ترجمہ مجالس الابرار کی مطبع مصطفائی دہلی میں طباعت شروع ہوئی تھی اور مطبع مجتبائی دہلی میں مکمل ہوئی، آخر میں سنہ طباعت درج نہیں، ممکن ہے ان ابتدائی صفحات میں ہو جو راقم کے نسخہ میں موجود نہیں۔

یہ کتاب مع متعلقات بڑے سائز کے چھ سو سترہ صفحات پر مشتمل ہے، اصل کتاب صفحہ ۶۱۵ پر ختم ہوگئی ہے، کتاب کے صفحہ ۶۱۶ پر مولانا محمد حسین فقیر بنی دہلوی کی عربی میں تقریظ ہے، صفحہ ۱۸-۶۱۷ پر غلط نامہ۔ اس طباعت کا ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

ترجمہ رسالہ فقہ شافعی

تالیف ابوشجاع احمد اصفہانی (مطبوعہ: ۱۲۸۶ھ)

غایۃ الاختصار مذہبی شرعی مسائل و معاملات پر شافعی مسلک کے ایک بڑے عالم اور فقیہ، شیخ ابو شجاع احمد بن حسین بن احمد اصفہانی (ولادت ۵۳۳ھ، ۱۱۳۸ء، وفات ۵۹۳ھ، ۱۱۹۷ء) کی مشہور اور معتبر کتاب ہے، جس کو التقریب بھی کہتے ہیں، یہ کتاب فقہ شافعی کے اہم ترین مراجع میں شمار کی جاتی ہے۔ مولانا سبحان بخش صاحب نے اس کا اردو ترجمہ کیا تھا،

مگر اس میں مترجم نے اس ترجمہ کی وجہ، اسکی ضرورت بلکہ اپنا نام تک ذکر نہیں کیا، صرف سرورق پر مترجم مولانا سبحان بخش کا نام چھپا ہوا ہے، جسکے الفاظ یہ ہیں:

''مؤلفہ مولانا سبحان بخش صاحب مدظلہ''

یہ ترجمہ فقہ شافعی کے نام سے مطبع احمدی دہلی سے سنہ ۱۲۸۶ھ (۷۰-۱۸۶۹ء) میں شائع ہوا تھا، چھیاسٹھ صفحات پر مشتمل ہے، ترجمہ صاف اور رواں ہے، اس کی بھی ابتدائی چند سطریں نقل کی جاتی ہیں:

''کہتا ہے قاضی ابوشجاع احمد بیٹا حسین کا پوتا احمد کا، رہنے والا اصفہان کا، رحمت اللہ کی اوس پر۔

تمام ستائش اللہ کی ہے کہ پروردگار تمام عالم کا ہے، اور درود اللہ کے خاتم النبیین پر، اور انکے تمام اصحاب پر، پھر بعد اس کے یہ ہے کہ بعضے یاروں کے اللہ کی رحمت ان پر ہو، مجھ سے یہ خواہش کی کہ میں ایک رسالہ مختصر علم فقہ میں موافق مذہب امام شافعی رضی اللہ عنہ کے تالیف کروں نہایت مختصر اور موجز کہ طالب کو اس کا پڑھنا میسر ہو سکے، اور مقتدی کو اسکا یاد کرنا آسان ہو جائے''

اس کتاب کا بھی ایک نسخہ ہمارے ذاتی ذخیرہ میں محفوظ ہے۔

فارسی ترجمہ منبہات ابن حجر کندی

(مطبوعہ: ۱۲۸۸ھ، ۱۸۷۱ء)

منبہات ابن حجر کندی کی، احادیث نبوی کی (ایک غیر معتبر) مگر مشہور تالیف ہے، جو عوام میں کثرت سے پڑھی جاتی ہے، یہ کتاب عربی میں ہے، مولانا سبحان بخش نے شیخ ناصر علی کی فرمائش پر اس کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا، یہ ترجمہ تحت اللفظ ہے مگر سادہ، رواں اور تعقید سے پاک ہے۔

ترجمہ کی ابتداء ایک تمہید سے ہوئی ہے جو ایک صفحہ پر مشتمل ہے، جس میں مولانا نے لکھا ہے کہ میں نے یہ ترجمہ شیخ ناصر علی تاجر کتب دہلی کی فرمائش پر کیا ہے اور یہ خدمت ماہ رجب سنہ ۱۲۸۸ھ (اکتوبر ۱۸۷۱ء) میں انجام پائی ہے، مولانا کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''امابعد احقر الناس سبحان بخش ساکن قصبہ شکار پور ضلع مظفر نگر میگوید کہ دریں زمان خجستگی توامان یعنی ماہ رجب المرجب سنہ ۱۲۸۸ھ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، حسب فرمائش مشفقی شیخ ناصر علی صاحب تاجر کتب متوطن شہر دہلی و بہ ترغیب و وساطت صاحب مراتب علیا و مدارج عظمی موردِ الطاف سرمدی مظہر فتوحات ایزدی، مجمع اخلاق مرزا عبد الرزاق منصرم مطبع مجتبائی دہلی لازالت شموس کمالاتہم ترجمہ کتاب افاضت انتساب اعنی منبہات ابن حجر عسقلانی بفارسی کردہ شد باین لحاظ کہ مترجم اردو وآن دیار کہ مسلمان آنجا ازیں زبان بہرہ ندارند بیکاری بودوآنکساں از فوائد چنیں کتاب محروم می مانند'' (۱)

تمہید کا اختتام اس اطلاع پر ہوا ہے کہ میں نے اس کتاب کا حق طباعت شیخ ناصر علی صاحب کو دے دیا ہے، اس کے بعد اس کتاب کی طباعت کی کسی اور کو اجازت دینے کا مجھے بھی حق نہیں رہا۔

''وواضح باد کہ حق تصنیف ترجمہ کتاب مذکورۃ الصدر شیخ ناصر علی صاحب مولوف دادہ مالک طبع آن کردہ شد بعد ازیں ماراد رطبع آن حقے نیست ونماندہ، و دیگر اہل مطابع ہم بے اجازت موی الیہ قصد طبعش نفرمایند'' (۲)

اس کا بھی ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے۔

اعمال الماثورۃ فی الایام المشہورۃ
ترجمہ ماثبت بالسنۃ (مطبوعہ: ۱۳۰۹ھ)

ہندوستان کے مشہور عالم شیخ عبد الحق محدث دہلوی (وفات: ۱۰۵۲ھ، ۱۶۴۲ء) نے ہجری سال کے بارہ مہینوں کی خصوصیات، انکے خاص فضائل ومسائل پر ایک کتاب ماثبت بالسنۃ فی احکام السنۃ کے نام سے لکھی تھی مگر اس وقت تک غالباً اس کا اردو ترجمہ نہیں ہوا تھا، مولانا سبحان بخش نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا، یہ ترجمہ

(۱) منبہات ابن حجر عسقلانی، ص: ۳

(۲) اس ترجمہ کا بھی ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں ہے۔

عربی متن کے ساتھ شائع ہوا تھا، پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ماثبت بالسنہ کا تعارف کراتے ہوئے اس ترجمہ کا بھی ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں:

''سنہ ۱۳۰۹ھ میں (مولانا) سبحان بخش شکار پوری نے دہلی سے اس کو مع ترجمہ شائع کیا اور اعمالِ ماثورہ نام رکھا تھا'' (۱)

اس سے پہلے بھی مطبع مجتبائی نے اس کا ایک ایڈیشن اور شائع کیا تھا جو تقریباً دوسو صفحات پر مشتمل تھا۔ (۲)

تکمیل ترجمہ فلاحِ دارین

فلاحِ دارین اسلامی عقائد اور سلوک وتصوف کے موضوع پر مشہور عالم دین مولانا نواب قطب الدین دہلوی کی تالیف ہے جو نواب صاحب کے خاندان کے بزرگ (پردادا) بحر العلوم علامہ محمد مصطفیٰ تھانیسری کی کتاب مغنی الطالب فارسی کے آخری باب کا ترجمہ ہے، اس ترجمہ کا ابتدائی حصہ مولانا قطب الدین کا کیا ہوا ہے، مولانا سبحان بخش نے نواب قطب الدین کی فرمائش پر اس ترجمہ کی تکمیل کی ہے، فلاحِ دارین مطبع منشی نول کشور لکھنؤ سے سنہ ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) چھپی تھی، فلاح دارین کا بھی ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

تلاش کیا جائے تو مولانا کی اور بھی علمی تالیفات وتراجم دستیاب ہوں گے، مولانا کی تالیفات وتراجم سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے اکثر اوقات تحریری وتصنیفی کام میں گذرتے تھے۔ اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا ترجمہ کا کام خاصی تیزی سے کرتے تھے، اس لئے قرین قیاس ہے کہ مولانا کی اور بھی متعدد تصانیف یا ترجمے ہوں۔

علمی تصنیفی کام میں مولانا کی نواب قطب الدین کے ساتھ شرکت اور تعاون

مولانا کی کتابوں کے تعارف میں گذر گیا ہے کہ مولانا نے کئی علمی کام اور ترجمے اپنے استادوں یا نواب قطب الدین کی رفاقت میں کئے ہیں اور مشترک تصنیف کی روایت کو

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، خلیق احمد نظامی ص:۱۷۱ (ندوۃ المصنفین دہلی: ۱۳۷۳ھ)

(۲) فہرست مجتبائی دہلی۔

آگے بڑھایا ہے، ان کتابوں کے علاوہ جن کا یہاں ذکر ہوا، مولانا سبحان بخش نے اور بھی کئی کتابوں کی اشاعت اور تصحیح میں نواب صاحب کی خاصی مدد کی جن میں مولانا نواب قطب الدین دہلوی کی مشہور کتاب مظاہر حق (شرح مشکوۃ المصابیح) کی طباعت و تصحیح بھی شامل ہے، مظاہر حق کی پہلی جلد مولانا سبحان بخش کی کوشش سے مولانا کی اصلاح کے بعد پہلی مرتبہ مطبع فخر المطابع دہلی سے سنہ ۱۲۶۸ھ میں چھپی تھی۔

دہلی کالج کے تحریری و تصنیفی کام میں مولانا کا حصہ

دہلی کالج کے کئی شعبے اور متعدد پہلو تھے، جن میں تعلیم کے بعد سب سے اہم پر جوش اور فعال شعبہ تصنیف و اشاعت کا شعبہ تھا، دہلی کالج نے مغربی اور مشرقی دونوں قسم کی زبانوں کی اعلیٰ ترین علمی اور مفید کتابوں کے اردو میں ترجموں اور انکی طباعت و اشاعت کا بڑا اور اہم منصوبہ مرتب کیا تھا، جسکے لئے دہلی کالج کے ممتاز استادوں کا ایک بورڈ اور علمی تصنیفی کمیٹی بنائی گئی تھی، اگرچہ اس شعبہ کی ابتداء ایف بتروس (F. Boutros.) کے زمانے میں ہوگئی تھی، مگر اس کو ایک طاقتور بڑے علمی ادارہ یا اکیڈمی کی شکل اسپرنگر نے دی، بتروس کے بعد جب مسٹر اسپرنگر (سنہ ۱۸۴۴ء میں) پرنسپل بنائے گئے تو انہوں نے اس کام کو بڑی توجہ اور اہتمام سے آگے بڑھایا۔ اسپرنگر کے دور میں کالج کے اس شعبہ میں اہم عنوانات و موضوعات پر اول درجہ کی طبع زاد کتابیں لکھی جارہی تھیں، ہندوستانی اور مشرقی ومغربی زبانوں کی عمدہ کتابوں کے اردو میں ترجمے ہورہے تھے۔ جس کی وجہ سے علمی حلقوں میں ایک نئی جان پڑ گئی تھی۔ کالج کے بڑے استاد مدرس اول اور مدرس دوم وسوم یعنی مولانا مملوک العلی، مولانا سید محمد دہلوی اور مولانا سبحان بخش اس تحریک کے رہنما اور اس قافلہ کے سالار تھے، یہ اساتذہ خصوصاً مولانا مملوک العلی اور ان کے بعد مولانا سبحان بخش کالج کے تمام علمی کاموں، تصنیف و اشاعت اور کالج کے اخبارات ورسائل کی نگرانی کرتے تھے ان کی تصحیح ودرستگی کی فکر اور ان کے علمی معیار کی نگرانی کرتے تھے۔

حضرت مولانا مملوک العلی زندگی کے آخری لمحات تک کالج کے مدرس اعلیٰ اور اس

کے علمی سرپرست اور نگرانِ اعلیٰ رہے، جب مولانا کی (ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ میں) وفات ہوئی تو مولانا سید محمد مدرس اول اور مولانا سبحان بخش مدرس دوم بنائے گئے۔

حضرت مولانا مملوک العلی مدرس اعلیٰ، مدرسہ دہلی (یا دہلی کالج) کے ہمہ جہت سربراہ تھے کالج کا ہراک کام مولانا کے مشورہ سے اور مولانا کی نگرانی میں ہوتا تھا، مولانا مملوک العلی کی وفات کے بعد مولانا ہے کے اکثر معاملات اور شعبوں کی ذمہ داری مولانا سبحان بخش پر آ گئی تھی۔

مولانا سبحان بخش نے کالج کی تصنیفی تحریک میں سرگرم حصہ لیا، مولانا کالج کے ایک ذیلی مگر اہم شعبہ دہلی سوسائٹی (VERNACULAR TR......) کے بھی روحِ رواں تھے، مولانا نے کالج کے شعبہ تصنیف و تالیف اور دہلی سوسائٹی دونوں کیلئے بھرپور علمی کام کیا، کئی کتابوں کے ترجمے کئے، خلاصے تیار کئے، نئی کتابیں بھی لکھیں، اگرچہ مولانا کی کتابوں کا کم تذکرہ ملتا ہے۔ تاہم جس قدر کتابوں یا ترجموں کا راقم سطور کو علم ہے ان کا آئندہ صفحات میں ذکر کیا جائے گا۔

وہ تصانیف اور ترجمے جو دہلی کالج کیلئے کئے

مولانا کی تعلیمی اور تحریری دونوں صلاحیتیں دہلی کالج میں پہنچ کر کھلیں اور عام ہوئیں، نصاب کی کتابوں کے پڑھانے کی عمدہ لیاقت اور تعلیم کی قوت کی شہرت ہوئی، تصنیفی، قلمی، تحریری کام بھی وہیں شروع ہوئے اور عروج کو پہنچے۔

مولانا نے سب سے پہلے کیا کتاب لکھی تھی اور کس کتاب کا ترجمہ کیا تھا اس کی تحقیق نہیں، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے تحریری کام جلد ہی شروع کر دیا ہوگا، جس کو دہلی کالج کی انتظامیہ کے اعتماد کی وجہ سے خاص طاقت اور پذیرائی حاصل ہوئی، مولانا نے کالج کے تصنیفی تحریری منصوبوں کو آگے بڑھانے اور پورا کرنے میں بڑی توجہ اور لگن سے بھرپور حصہ لیا۔

مولانا نے دہلی کالج یا دہلی سوسائٹی کے لئے کس قدر کتابیں لکھیں یا ترجمے کئے اور ان میں سے کون کون سی کتابیں یا ترجمے شائع ہوئے اور کالج کی مطبوعات میں شامل

مولانا کی پہلی تالیف یا ترجمہ کونسا ہے اس کا صحیح علم نہیں، مگر مولانا کی جس قدر تالیفات اور ترجموں کا راقم سطور کو سراغ ملا ہے، ان میں سب سے پہلی کاوش تاریخ ہند کے اردو ترجمہ میں مولانا کی شرکت ہے، اس کے علاوہ مولانا کے کئے ہوئے چار اور کتابوں کے ترجمے دہلی کالج سے چھپے تھے، یوں کالج سے مولانا کی کل پانچ کتابیں شائع ہوئیں جن کے نام یہ ہیں:

(۱) ترجمہ تواریخ ہند (۲) ترجمہ تزک تیموری

(۳) ترجمہ تذکرۃ العلماء (۴) ترجمہ تذکرۃ المفسرین

(۵) ترجمہ وفیات الاعیان

(۱) ترجمہ تواریخ ہند

اردو ترجمہ میں مولانا کی دہلی کالج نے تاریخ ہند پر کم سے کم تین کتابیں چھاپی تھیں، جن میں سے ایک کتاب وہ ہے جس کا عموماً ترجمہ تاریخ ہند کے نام سے ذکر آتا ہے، یہ ایک بڑی کتاب ہے، جو تین حصوں پر مشتمل ہے، اس کا کالج کے تین استادوں نے مل کر ترجمہ کیا تھا۔

پہلا حصہ جو ہندوستان میں ہندوؤں کے ابتدائی نظام حکومت اور ریاستوں کے عہد سے عہد مغلیہ تک کے احوال پر مشتمل ہے۔ یہ مارش مین (MARSHMAN) کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے، جو کالج میں انگریزی درجہ کے استاد ماسٹر نور محمد نے کیا تھا، دوسری جلد مغلوں کے عہد حکومت کی روداد ہے، یہ دو حصوں میں ہے، اسکے پہلے حصہ یا دفتر کا ترجمہ مولانا امام بخش صہبائی نے کیا تھا، دوسرے حصہ کو مولانا سبحان بخش نے اردو کا لباس پہنایا۔

تیسرے حصہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ابتدائے عملداری سے سنہ ۱۸۴۰ء تک کے حالات ہیں، یہ تینوں جلدیں (یا چاروں حصے) ایک جگہ چھپے تھے۔

شاید اسی وجہ سے اس کتاب یا ترجمہ کا مولانا امام بخش صہبائی اور مولانا سبحان بخش کی تالیفات و ترجموں اور دہلی کالج کی مطبوعات کی فہرستوں میں نام نہیں آیا، اس پہلو سے یہ کتاب ایک دریافت شمار کی جاسکتی ہے۔ اس کتاب کے ناشر نے کتاب کے تعارف میں

لکھا ہے کہ:

”تواریخ ہند مشتمل تین حصوں پر، حصہ اول تواریخ ہند، پہلے سے پہلے زمانہ ہندوؤں سے سلطنت مغلیہ تک، منشی نور محمد مدرس مدرسہ انگریزی نے مارش صاحب کی کتاب سے زبان اردو میں ترجمہ کیا۔ حصہ دوم خلاصہ سیر المتاخرین کا ابتدائے سلطنت تیموریہ سے محمد شاہ تک۔ پہلے دفتر کا ترجمہ مولوی امام بخش مدرس اول فارسی کالج نے مولوی عبدالکریم کے خلاصہ سے زبان اردو میں ترجمہ کیا، دوسرے دفتر کا ترجمہ مولوی سبحان بخش مدرس چہارم عربی نے کیا، تیسرے دفتر کا ترجمہ مولوی احمد علی مدرس سوم فارسی نے کیا۔

حصہ سوم تواریخ بنگال، ابتدائے عملداری کمپنی سے سنہ ۱۸۴۱ء عیسوی تک منشی نور محمد مذکور صدر نے ترجمہ کیا۔

دہلی اردو اخبار پریس مکان مولوی محمد باقر گذر اعتقاد خان میں باہتمام پنڈت موتی لعل سنہ ۱۸۴۳ء“

اس اندراج سے معلوم ہوا کہ دوسرے دفتر یا حصہ کا ترجمہ مولانا سبحان بخش نے کیا تھا، یہ حصہ ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہے، (صفحہ ایک سو چھیتر سے صفحہ تین سو چھبیس تک) یہ حصہ یا دفتر ۳۲۶ صفحہ پر ختم ہو گیا ہے۔ اس کے بعد تیسرے دفتر کا آغاز ہوا ہے۔

(۲) ترجمہ تزک تیموری

تزک تیموری امیر تیمور گورگانی کی یادداشتوں پر مشتمل مشہور روزنامچہ یا تاریخ ہے، ابو طالب خراسانی نے ان یادداشتوں کا ترکی سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا، پھر شاہ جہاں کے زمانہ (۱۰۴۷ھ، ۳۸-۱۶۳۷ء) میں محمد افضل بخاری نے اس کو دوبارہ مرتب کیا۔ ابو طالب خراسانی نے اس میں جو الحاق کر دیئے تھے، وہ نکال دیئے اور تیمور کی یادداشتوں میں سے جو یادداشتیں اس میں شامل ہونے سے رہ گئی تھیں ان کا اضافہ کیا، افضل بخاری کی اس فارسی کتاب کا مولانا سبحان بخش نے اردو ترجمہ کیا تھا۔

یہ ترجمہ غالباً سنہ ۱۸۴۵ء (۶۱-۱۲۶۰ھ) میں مکمل ہوا، اور اسی سال دہلی اردو اخبار

پریس سے پنڈت موتی لعل کے اہتمام سے شائع ہوا، یہ نسخہ آٹھ سو چوراسی صفحات پر مشتمل ہے، آخر میں دو صفحات کا غلط نامہ بھی ہے، اس اشاعت کے سرورق پر انگریزی اور اردو میں کتاب اور مترجم کا نام تحریر ہے۔ اردو میں مطبع وغیرہ کی تفصیل بھی موجود ہے، ملاحظہ ہو:

ترجمہ توزک تیموری

ترجمہ اس کتاب کا اول سے آخر تک مولوی سبحان بخش مدرس سوم عربی مدرسہ نے سنہ ۱۸۴۵ء میں کیا۔

باہتمام پنڈت موتی لعل پرنٹر پبلشر، دہلی اردو اخبار اوفس مکان متعلقہ امام باڑہ موقوفہ مولوی باقر صاحب، واقع گذر اعتقاد خاں میں چھاپہ ہوا سنہ ۱۸۴۵ء۔

(۳) نسخہ رہنما یعنی قانونِ مال کا اردو ترجمہ

قانون مال پر ایک اہم فارسی تالیف کا کالج نے اردو ترجمہ کرایا تھا، یہ ضخیم کتاب تینتیس ابواب پر مشتمل ہے جن میں سے پہلے نو باب کا ترجمہ مولانا سبحان بخش نے کیا، دسویں باب کا مولوی احمد علی (مدرس دہلی کالج) نے، گیارہ سے چودہ تک تین باب مولانا امام بخش صہبائی نے اردو میں منتقل کئے، پندرہ سے تئیسویں باب تک میر سید محمد خوش نویس نے اور چوبیس سے آخر کتاب یعنی تینتیسویں باب تک کا ترجمہ مولوی حسن علی خان مدرس فارسی کا کیا ہوا ہے۔

یہ کتاب بڑے سائز کے ساڑھے پانچ سو (۵۴۸) صفحات پر مشتمل ہے۔ دہلی اردو اخبار پریس دہلی سے سنہ ۱۸۴۶ء (۱۲۶۲ھ) میں شائع ہوئی تھی۔ اس ترجمہ یا کتاب کا مولوی عبدالحق نے ذکر نہیں کیا (۱) مگر مالک رام صاحب نے مختصر تعارف کرایا ہے۔ (۲)

(۱) ملاحظہ ہو مرحوم دہلی کالج سوسائٹی کے ترجموں اور تالیفات کی فہرست، مولوی عبدالحق ص۔ ۱۳۹ تا ۱۴۵۔ (انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۴۵ء)

(۲) قدیم دلی کالج، مالک رام ص۔ ۴۷ (مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۷۶ء)

(۴، ۵، ۶) ترجمہ تذکرۃ الحکماء، ترجمہ تذکرۃ المفسرین اور ترجمہ تذکرۃ الفقہاء

یہ تینوں کتابیں دہلی کالج کے شعبہ تصنیف وترجمہ کے منصوبہ تالیف واشاعت کا ایک حصہ تھیں، ان تینوں کا دہلی کالج کی مطبوعات کی فہرست میں علیحدہ علیحدہ ذکر آتا ہے۔ اور مولوی سبحان بخش کی علمی باقیات میں بھی تینوں کے نام شمار کئے جاتے ہیں، یہ تینوں ترجمے ایک ساتھ چھپے تھے۔ مترجم مولانا سبحان بخش نے تذکرۃ الحکماء اور تذکرۃ المفسرین کو (دنیائے اسلام کے نامور عالم اور مصنف) علامہ جلال الدین سیوطی (وفات ۹۱۰ھ) سے منسوب کیا ہے، یہ اطلاع تذکرۃ المفسرین کے لئے تو درست ہوسکتی ہے، علامہ سیوطی کی مؤلفات میں تذکرۃ المفسرین کا نام آتا ہے، مگر اس کے تعارف میں یہ بھی صراحت ہے کہ علامہ کی یہ تالیف ناتمام ہے، مکمل نہیں ہوئی تھی (۱) لیکن مولانا سبحان بخش کے اس ترجمہ کا ایک اہم اور قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ مولانا سبحان بخش کی صراحت کے مطابق مولانا نے علامہ سیوطی کے اصل نسخہ سے یہ ترجمہ کیا ہے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ:

''تمام ہوا یہ رسالہ جس قدر کہ مؤلف کے خط میں تھا''

اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو تذکرۃ المفسرین کے خطی نسخوں کی تکمیل میں مولانا سبحان بخش کے ترجمہ سے کسی قدر مدد ملنی چاہئے۔

لیکن تذکرۃ الحکماء کا علامہ سیوطی سے انتساب درست معلوم نہیں ہوتا، علامہ سیوطی کی تالیفات و مصنفات کی فہرستوں اور علامہ سیوطی کے تعارف اور تراجم میں بھی اس موضوع پر علامہ سیوطی کی کسی تالیف کا نام درج نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ ابن القفطی کی کتاب (تاریخ الحکماء) کا خلاصہ ہو، مگر یہ خلاصہ بھی علامہ سیوطی کا نہیں ہے۔

یہ کتاب یا ترجمہ علامہ ابن خلکان (وفات ۶۸۱ھ، ۱۲۸۳ء) کی شہرہ آفاق تالیف

---

(۱) دلیل مخطوطات السیوطی واماکن وجودھا، احمد الخازندار، ص: ۲۳۹ (مکتبہ ابن تیمور، کویت: ۱۴۰۳ھ) مولانا شکار پوری کی ان تینوں ترجموں کا گارساں دتاسی نے اپنے خطبات، ص: ۱۷۲، ۱۷۶، ۱۸۸ (اورنگ آباد: ۱۹۳۵ء) اور رسالہ تذکرات (ترجمہ منشی ذکاء اللہ مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی) ص: ۴۵ (دہلی: ۱۹۶۸ء) میں بھی ذکر کیا ہے۔

وفیات الاعیان کے ایک خلاصہ کا ترجمہ ہے، وفیات الاعیان ایک بڑی کتاب ہے، یہ ترجمہ وفیات الاعیان میں مذکور فقہاء کے حالات پر کسی مختصر ترین خلاصہ کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے، مگر اس میں شبہ ہے کہ یہ علامہ سیوطی کی تالیف یا تلخیص ہو، اگر چہ علامہ سیوطی کی تالیف کی فہرستوں میں "نثر الهميان في وفيات الاعيان" کے نام سے ایک کتاب کا اندراج ہے (۱) مگر اس کی کسی اشاعت کا مجھے علم نہیں، اس کے قلمی نسخے بھی کم یاب ہیں، اس لئے یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ وفیات الاعیان کے کس خلاصہ کا ترجمہ ہے، اور یہ خلاصہ کس نے کیا تھا۔

تذکرۃ الحکماء اور خلاصہ وفیات الاعیان کے مؤلف جو بھی ہوں، تینوں کا مولانا سبحان بخش نے ترجمہ کیا تھا، یہ ترجمہ ایک مشترک کتاب کی صورت میں دہلی کالج کے پریس مطبع العلوم سے سنہ ۱۸۴۸ء میں چھپا تھا، اس کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے:

"ترجمہ تاریخ الحکماء اور تذکرۃ المفسرین مؤلفہ علامہ عبدالرحمان جلال الدین سیوطی اور تذکرۃ الفقہاء خلاصہ وفیات الاعیان ابن خلکان کا، مولوی مولانا سبحان بخش مدرس سوم، عربی مدرسہ دہلی میں چھپا سنہ ۱۸۴۸ء"

یہ مجموعہ تراجم و تالیفات تین حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں ایک سو پینتیس حکماء اور طبیبوں کا تذکرہ ہے، جس کو تذکرۃ الحکماء کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

دوسرا حصہ ترجمة الاسماء (یا تذکرۃ الفقہاء) از کتاب وفیات بن خلکان ہے۔

تیسرا حصہ ترجمة الاسماء طبقات مفسرین از علامہ حافظ جلال الدین عبدالرحمٰن سیوطی شافعی۔

اس مجموعہ پر صفحات کا شمار مسلسل نہیں ہے، تینوں کتابوں کیلئے علیحدہ صفحات ڈالے گئے ہیں، پہلے حصہ میں ایک سو اٹھائیس صفحات، دوسرے میں ایک سو انہتر، تیسرے میں صرف چوالیس صفحات ہیں، پوری کتاب تین سو اکتالیس صفحات پر مشتمل ہے۔

---

(۱) ملاحظہ ہو: کشف الظنون، امیر کاتب چلپی، کالم: ۱۹۲۸ء جلد ۲ (دار المثنی بغداد: بلا سنہ) اور دلیل مخطوطات السیوطی و اماکن وجودھا۔ احمد الخازندار، ص: ۲۴۳ شمار ۸۲۶ (بیروت: ۱۴۰۳ھ)

بیاگرافیکل ہسٹری کا ترجمہ
(مطبوعہ: ۱۸۴۸ء)

مرحوم دہلی کالج نے جو علمی تصنیفی کام کرائے تھے، اس کا اکثر حصہ چھپا نہیں اور جو چھپا ہے وہ ناپید اور مفقود ہے اور اس کی معتبر اور مکمل فہرست بھی دریافت نہیں، اسلئے اس کا فیصلہ آسان نہیں کہ کالج کے لئے تصنیف و ترجمہ کا جو کام ہوا اس میں کس استاد کا کس قدر حصہ ہے، اور اس کی مکمل روداد کیا ہے۔ کالج کی مصنفات یا ترجموں کی جو فہرستیں مولوی عبدالحق یا مالک رام صاحب نے ذکر کی ہیں وہ ناتمام ہیں، اس میں بہت سی کتابوں کے مترجمین کے نام موجود نہیں، جن کتابوں پر مترجمین کے نام درج ہیں، ان میں سے بھی کئی ایک تحقیق طلب ہیں، دونوں فہرستوں پر اضافہ اور ترمیم ہر وقت متوقع ہے، ایسی کتابوں میں سے ایک کتاب جس کا مرحوم دہلی کالج اور قدیم دہلی کالج دونوں میں ذکر نہیں بیاگرافیکل ہسٹری (Biographycal) کا اردو ترجمہ ہے، اس ترجمے کے متعلق کم معلومات ہیں، ڈاکٹر مرزا حامد صاحب نے سجاد مرزا دہلوی کی مرتبہ الفہرست (حیدرآباد دکن: ۱۹۳۳ء) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مولانا سبحان بخش نے اس کتاب کا ترجمہ کیا تھا، جو دہلی سے سنہ ۱۸۴۸ء (۶۵-۱۲۶۴ھ) میں چھپا تھا۔ (۱)

دہلی کالج کی تالیفات و مطبوعات کی فہرست میں مولانا کی اور تالیفات یا ترجموں کا شامل ہونا غیر متوقع نہیں، مگر ان کا تذکرہ نہیں ملتا، اگرچہ مولانا کے کئے ہوئے ترجموں کی تاریخی حیثیت ہے اور اردو نثر کے ارتقاء میں مولانا کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا، مگر یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ یہی چند تالیفات یا ترجمے مولانا کی یادگار ہیں، مولانا نے اس کے علاوہ بھی بڑے بڑے کام کئے، جن میں سے اکثر دینی موضوعات پر مشتمل ہیں، جس کا کچھ تذکرہ گذر گیا ہے۔

مولانا کی ایک اور تالیف محاوراتِ ہند
(مؤلفہ: ۱۳۰۴ھ، ۸۷-۱۸۸۶ء)

مولانا کی تصانیف میں سے ایک کتاب ایسی بھی ہے جو نہ دہلی کالج کی مطبوعات میں شامل ہے، نہ مولانا کی

(۱) کتابیات تراجم، مرتبہ: ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، ص: ۴۷ شمار نمبر ۸۳ (اسلام آباد: ۱۹۸۸ء)

دینی کتابوں کے ترجموں میں شمار کی جا سکتی ہے، اس کی وجہ تالیف دونوں سے مختلف ہے، مگر غلطی سے اس کا دہلی کالج کی تصانیف اور مطبوعات میں ذکر کیا جاتا ہے، یہ تالیف محاوراتِ ہند ہے، مولوی عبدالحق اور متعدد اہل قلم نے اس کو دہلی کالج کے مؤلفات و مطبوعات میں ذکر کیا ہے، جو صحیح نہیں ہے۔

مولانا سبحان بخش نے یہ کتاب اس وقت مرتب کی تھی جب مولانا کو دہلی کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے برسوں گذر گئے تھے اس درمیان دہلی کالج بھی تحلیل کر دیا گیا تھا، اسکا کام اور تذکرہ تاریخ کا حصہ بن چکے تھے، مولانا سبحان بخش نے محاوراتِ ہند کی تمہید میں اسکی وجہ اور سنہ تالیف کا ذکر کیا ہے، یہ اقتباس گذر چکا ہے، ایک مرتبہ اور پڑھ لیجئے:

> ''بندہ ہیچ میرز سبحان بخش ساکن قصبہ شکار پور ضلع مظفر نگر کہ غدر سے پہلے کالج دہلی میں مدرس دوم عربی اور بعد غدر کے پھر کالج دہلی میں مدرس عربی و فارسی وارد و تھا اور اب پنشن دار ہے عرض کرتا ہے''

پھر اسی صفحہ میں چند سطروں بعد لکھتے ہیں کہ:

> ''اس خاکسار نے حسب تحریک مولوی حافظ محمد عبدالاحد مالک و مہتمم مطبع مجتبائی دہلی کے یہ خدمت اہل ملک کی اپنے اوپر واجب سمجھ کر ایک رسالہ محاورات و امثال کا مرتب کیا، اور ان کے معانی اور مراد بولنے کا محل بھی بیان کیا اور اس کا نام محاوراتِ ہند رکھا''(۱)

اس صراحت سے یہ صاف ہو جاتا ہے کہ محاوراتِ ہند کی تالیف کا دہلی کالج سے کچھ تعلق نہیں، یہ کتاب مطبع مجتبائی دہلی کے مالک مولوی عبدالاحد کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔

اس کتاب میں مؤلف نے اردو کے محاورات کا اچھا ذخیرہ جمع کر دیا ہے، خصوصاً ان محاوروں کا جو مغربی یوپی اور دہلی میں بولے جاتے ہیں، مؤلف نے اپنے علاقہ یعنی ضلع مظفر نگر (مغربی یوپی) کے چند قصبوں میں جو چند محاورات ان قصبات کی نسبت سے زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں وہ بھی اس کتاب میں شامل کر لئے ہیں، جیسے ایک محاورہ لکھا ہے:

(۱) محاوراتِ ہند، مولانا سبحان بخش شکار پوری، ص:۲ (مکتبہ جامعہ دہلی: ۱۹۹۴ء)

''ڈنڈا سی پونچھ بڈھانہ کا راستہ''

ایک جگہ ہے:

''یا گورِ غریباں یار خصت جھنجھانہ''

مرتب نے محاورہ کے مفہوم کی طرف اشارہ کر دیا ہے، کہیں کہیں کسی قدر وضاحت بھی کی ہے، یہ کتاب مولانا کی مشہور ترین مؤلفات میں سے ہے اور اسی کی وجہ سے آج تک مولانا کا نام زبانوں پر ہے، محاوراتِ ہند کی تالیف سنہ ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۵ء) میں شروع ہو کر سنہ ۱۳۰۴ھ (۱۸۸۷ء) میں مکمل ہوئی، لطائف بے نظیر کے اعداد ۱۳۰۲ھ سے سنہ تالیف کا آغاز اور بیان ظرفاء ہند ۱۳۰۴ھ سے سنہ اختتام کا علم ہو جاتا ہے، محاورات تالیف کے فوراً بعد اسی سال مطبع مجتبائی سے پہلی بار شائع ہوئی۔ اسی مطبع مجتبائی سے دوسرا ایڈیشن بھی چھپا۔

دہلی کالج کے پریس میں حصہ داری

جب اسپرنگر (Sprenger) دہلی کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے، تو اسپرنگر نے کالج کے اور شعبوں کی توسیع و ترقی کے علاوہ کالج کے لئے ایک پریس کا بھی انتظام کیا اور اس پریس کو آسانی سے چلانے کیلئے اس کے حصص فروخت کئے، اسپرنگر کے اثرات اور پریس کے کاروبار سے نفع کی امید برآئی، دہلی کالج کے کئی استاد بھی پریس کے کاروبار کے حصہ دار (شیئر ہولڈر) ہو گئے تھے، جن میں مولانا سبحان بخش بھی شامل تھے، مگر سنہ ۱۸۴۸ء میں اسپرنگر کو مخطوطات اودھ کا جائزہ لینے اور ان کی فہرست بنانے کیلئے لکھنؤ بھیج دیا گیا، اسپرنگر اودھ کے مخطوطات کی ترتیب سے فارغ ہی ہوا تھا کہ اس کو مدرسہ عالیہ کلکتہ کا پرنسپل بنا کر کلکتہ جانے کا حکم ہوا، اس وقت کالج کے پریس پر بھی زوال آیا اس کی کتابوں کی فروخت کم ہو گئی، طباعت کا کام بھی متاثر ہوا، اس کو نقصان میں دیکھ کر پریس کے حصہ داروں نے اپنے اپنے حصے فروخت کرنے شروع کر دیئے، جن میں مولانا سبحان بخش بھی شامل تھے، مطبع کے مہتمم اشرف علی نے مطبع کے نقصان اور حصہ داروں کے اس معاملہ کا اسپرنگر کے نام اپنے ایک خط میں یوں ذکر کیا ہے:

''اور جنابِ عالی جس روز سے حضور یہاں سے تشریف لے گئے تو شرکائے مطبع نے مثل مولوی مملوک العلی مرحوم اور مولانا سبحان بخش اور مولوی امام بخش اور میر سید محمد خوشنویس اور اکثر طلبہ وغیرہ نے قریب پچاس حصوں کے بعض نے پورے اور بعض نے کچھ کم پر بیچ دیئے، درصورت لاچاری واسطے جاری رکھنے چھاپہ خانہ کے اس نیازمند نے قریب تیس حصوں کے اور قریب بیس حصوں کے لالہ رادھا کشن خزانچی نے خرید لئے''(۱)

اشرف علی نے پریس کے حصوں کی فروخت اور اپنی مشکلات کا مطبع کے باقی حصہ داروں کے نام اپنی ایک اپیل یا مفصل خط میں بھی ذکر کیا ہے، مگر یہ معلوم نہیں کہ مولانا سبحان بخش اور مطبع کے اور شرکاء کو اس پریس سے کتنی آمدنی تھی، اور کس قدر عرصہ تک اس میں حصہ داری رہی۔

مولانا سبحان بخش کا اسپرنگر کے نام ایک خط اسپرنگر کے ذاتی ذخیرہ سے ڈاکٹر محمد اکرام چغتائی صاحب نے دریافت کیا ہے، مگر یہ خط (غالباً) اب تک شائع نہیں ہوا، افسوس ہے کہ مولانا سبحان بخش کی زندگی کی اور خدمات و مصروفیات اور آخر دور کی سرگرمیوں کا حال دریافت نہیں، یہ بھی معلوم نہیں کہ مولانا زندگی کے آخری ایام میں کہاں رہتے تھے، دہلی میں، اپنے وطن شکارپور میں یا کہیں اور، مولانا کی تاریخ وفات بھی معلوم نہیں اور یہ بھی اطلاع نہیں کہ وہ کہاں دفن کئے گئے، قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ مولانا سبحان بخش کی سنہ ۱۳۰۹ھ (۱۸۹۱ء) کے قریب وفات ہوئی ہوگی، اور اگر دہلی کالج میں تقرر کے وقت سنہ ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۴ء) میں مولانا کی عمر پچیس سال رہی ہو تو سنہ ۱۳۰۹ھ (۱۸۹۱ء) میں اسی (۸۰) سال سے زائد ہونی چاہئے، اگرچہ معلومات کا فقدان ہے، مگر تاثر یہی ملتا ہے کہ مولانا نے آخر تک مصروف زندگی گذاری اور گراں قدر علمی سرمایہ اور تصنیفات اپنی یادگار چھوڑ گئے۔

---

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب، ص: ۲۳

[۳] مولانا نورالحسن کاندھلویؒ (۲)

کاندھلہ کے مشہور دینی علمی خاندان سے وابستہ تھے، سلسلۂ نسب اس طرح ہے:

''مولانا نورالحسن بن مولانا ابوالحسن بن حضرت مفتی الٰہی بخش بن مولانا حکیم محمد عرف شیخ الاسلام بن حکیم قطب الدین بن شیخ عبدالقادر'' (۱)

۲۶ر ربیع الثانی ۱۲۲۷ھ (مئی ۱۸۱۲ء) کو پیدا ہوئے، محمد میاں نام رکھا گیا تھا مگر والد کے نام کی مناسبت سے نورالحسن کے نام سے مشہور ہوئے۔

نہایت ذہین وفطین اور بچپن سے پاکیزہ اطوار اور نیک طینت تھے، سات سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کرلیا تھا۔ اس وقت سے تاحیات تلاوت کا معمول رہا۔ اپنے دادا اور نامور عالم حضرت مفتی الٰہی بخش سے فارسی عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ شافیہ تک درسی کتابیں گھر پر والد صاحب اور دادا سے مکمل کیں، مزید تعلیم کیلئے دہلی بھیج دیئے گئے، پرانے خاندانی روابط وتعلقات کی وجہ سے حضرت شاہ محمد اسحاق کے مدرسہ میں قیام رہتا تھا۔ دہلی میں کیا کیا کتابیں کن علماء اور استادوں سے پڑھیں اسکی تفصیل مجھے نہیں ملی۔

دہلی کالج میں تعلیم کا اعلیٰ درجہ کا انعام اور مولانا مملوک العلی سے تلمذ

مولانا ۱۲۴۵ھ (۱۸۲۹ء) میں دہلی کالج میں نورالانوار وغیرہ پڑھتے تھے، اس سال کالج کی عربی فارسی جماعتوں کا نتیجہ اعلیٰ درجہ کا نکلا تھا، جس سے کالج کے منتظمین، پرنسپل اور استادوں کو قدرتی طور پر بہت خوشی ہوئی۔ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ یہ سال کالج کے بڑے عروج کا سال تھا، امتحان کی کامیابی پر عام طور سے بڑی تعریف وتحسین ہوئی، سکریٹری صاحب اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ:

''جس قدر انعام ہم نے رکھے تھے اس سے زیادہ دینے پڑے'' (۲)

---

(۱) نسب نامہ کی تفصیل اور متعلقات کے تعارف کیلئے دیکھئے اشاعت خاص سہ ماہی احوال وآثار کاندھلہ بیاد مولانا انعام الحسن ص: ۳۵ تا ۱۰۳ (کاندھلہ: ۱۹۹۷ء)

(۲) مرحوم دہلی کالج ص ۲۸

اس وقت کالج کے طلبہ اور اس امتحان میں مولانا نورالحسن بھی شامل تھے، مولانا کو اس موقع پر جو تعریفی انعامی سرٹیفکٹ دیا گیا تھا وہ بفضلہٖ تعالیٰ ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے، اس پر مولانا کا نام لکھا ہوا ہے، اور یہ فقرہ تحریر ہے:

"قد جوزی بهذا العطاء لحسن التحصيل فی نور الانوار"

اس توصیف نامہ پر .... کے دستخط ہیں اور ۳۰ جنوری ۱۸۲۹ء (۲۳ر رجب ۱۲۴۴ھ) کی تاریخ درج ہے۔ اس توصیف نامہ سے مولانا نورالحسن کے کالج کے اعلیٰ درجہ کے عمدہ طالب علم ہونے کی تصدیق ہورہی ہے اور اس اطلاع سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ مولانا، مولانا مملوک العلی کے بھی شاگرد تھے۔

اگرچہ مولانا نورالحسن کی جو تحریریں اور یادداشتیں میری نظر سے گذری ہیں ان میں اس کی صراحت نہیں کہ مولانا نورالحسن کو مولانا مملوک العلی سے بھی تلمذ تھا، مگر دہلی کالج کے درج بالا توصیف نامہ سے مولانا کے کالج میں نورالانوار پڑھنے کی تصدیق ہورہی ہے۔

نورالانوار کالج کی متوسط درسیات میں شمار تھا جو اس وقت مولانا مملوک العلی پڑھاتے تھے، مولانا نورالحسن نے بھی مولانا مملوک العلی ہی سے پڑھی ہوگی، اسلئے مولانا نورالحسن کو مولانا مملوک العلی کے شاگردوں میں بلاتردد شامل کیا جانا چاہئے۔

مولانا مفتی صدرالدین آزردہ اور مولانا فضل حق خیرآبادی سے تلمذ

دہلی کالج کی تعلیم سے فارغ ہوکر مولانا مفتی صدرالدین آزردہ اور مولانا فضل حق خیرآبادی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل، اور مفتی صاحب کے شاگردوں میں داخل ہوئے اور طویل استفادہ کیا، اسکے لئے دہلی میں کب تک قیام رہا اسکی تفصیل معلوم نہیں، مگر ۱۲۴۷ھ (۳۲-۱۸۳۱ء) تک دہلی میں تھے۔ مولانا نورالحسن نے دہلی کے اسی زمانۂ قیام میں ۱۲۴۷ھ میں حضرت شاہ محمد اسحاق سے پہلی مرتبہ بخاری شریف پڑھی تھی، جس کی مولانا کی تحریروں میں صراحت ہے۔

ممکن ہے کہ مولانا فضل حق سے بھی دہلی میں کچھ پڑھا ہو لیکن جب مولانا خیرآبادی

تحصیلدار ہوکر نکوڑ ضلع سہارنپور چلے گئے تو مولانا نور الحسن صاحب بھی سہارنپور پہنچ گئے تھے۔ ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۵ء) میں سہارنپور میں تھے اور مولانا خیرآبادی سے معقولات پڑھ رہے تھے، مولانا نور الحسن کی متعدد تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ۱۲۵۲ھ (۳۷-۱۸۳۶ء) تک نکوڑ میں تھے اس کے بعد وطن آکر اپنے والد مولانا ابوالحسن سے بخاری شریف پڑھی، ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ء) میں دوبارہ دہلی چلے گئے، یہ سفر حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب سے حدیث شریف کی تکمیل کے لئے ہورہا تھا، اس مرتبہ شاہ صاحب سے پہلے بخاری شریف پڑھی جو ذی قعدہ ۱۲۵۵ھ (جنوری ۱۸۴۰ء) میں شروع ہوکر ۲۸ / جمادی الثانی ۱۲۵۶ھ (اگست ۱۸۴۰ء) کو ختم ہوئی، پھر مسلم شریف وغیرہ حدیث کی اور اعلیٰ کتابیں شاہ صاحب کے درس میں پڑھیں، غالباً یہی مولانا نور الحسن کے تعلیمی سفر کا اختتام ہے۔

اعلیٰ قابلیت کی وجہ سے تعلیم سے فارغ ہوتے ہی آگرہ کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر کردیئے گئے، مولانا کی اس ملازمت اور اس عہدہ کے امتیاز کا سرسید احمد نے بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

> ''مولانا اس زمانہ میں آگرہ کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے جب ایسے کالجوں میں عربی کی اعلیٰ درجہ کی عمدہ تعلیم دی جاتی تھی۔'' (۱)

تقریباً چار سال تک اس منصب پر کام کرتے رہے۔ اس ملازمت کے زمانہ میں سرسید احمد نے مولانا سے تعلیم حاصل کی، مولانا کا آگرہ اور نواح میں بڑا اعزاز واحترام تھا لیکن مولانا کو کالج کے سکریٹری کے متعصبانہ رویہ کا بہت احساس تھا، اسی وجہ سے کالج کی ملازمت سے استعفاء دے دیا۔

آگرہ سے آکر ۵ / محرم الحرام ۱۲۶۲ھ (۴ / جنوری ۱۸۴۶ء) کو نکوڑ میں قائم مقام تحصیلدار مقرر ہوئے، دو سال بعد تحصیلدار ہوگئے تھے، جمادی الثانی ۱۲۶۷ھ (اپریل

(۱) یہ الفاظ سرسید احمد نے مولانا علاء الحسن کاندھلوی کے سارٹیفکیٹ میں لکھے ہیں۔ یہ اصل سارٹیفکیٹ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

۱۸۵۱ء) میں اس ملازمت کو بھی چھوڑا۔ چند مہینے کاندھلہ میں رہے پھر الور کے مہاراجہ کی طلب پر الور چلے گئے تھے، ذی قعدہ ۱۲۶۷ھ (ستمبر ۱۸۵۱ء) میں الور پہنچے، یہ مولانا کی آخری اور معاشی لحاظ سے سب سے بہتر ملازمت تھی، الور میں سرکاری منصب ومصروفیات کے علاوہ بڑی مشغولیت درس وافادہ کی تھی، طلبہ کی ایک جماعت حاضر خدمت رہتی تھی، جس کے مصارف مولانا اپنی جیب خاص سے ادا کرتے تھے۔

اس دوران مولانا نورالحسن کی کوشش سے مولانا فضل حق خیرآبادی بھی الور آ گئے تھے۔

مولانا نورالحسن نے جمادی الثانی ۱۲۷۶ھ (جنوری ۱۸۶۰ء) میں الور کو بھی خیرباد کہا اور وطن آ گئے، وطن میں تمام اوقات درس وتعلیم کی نذر فرما دیئے، ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے جید طالب علموں کی بڑی بڑی جماعتیں مولانا کی خدمت میں حاضر رہتی تھیں اور حسب صلاحیت حصولِ تعلیم واستفادہ کرتی تھیں۔

چند شاگرد مولانا نورالحسن نے تقریباً تیس سال تک درس وتعلیم کی خدمت کی مگر افسوس کہ مولانا کے صرف چند شاگردوں کے نام ملتے ہیں، جو یہ ہیں:

۱۔ مولانا محمد احسن مرادآبادی وفات ۱۲۸۸ھ (۷۲-۱۸۷۱ء)

۲۔ مولانا مفتی ریاض الدین کاکوری وفات ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء)

۳۔ مولانا لطف علی راج گیری وفات ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء)

۴۔ مولانا عبداللہ بلگرامی وفات ۱۳۰۵ھ (۸۸-۱۸۸۷ء)

۵۔ مولانا عبدالحق بن فضل حق خیرآبادی وفات ۱۳۱۸ھ (۱-۱۹۰۰ء)

۶۔ مولانا شیخ محمد بن غلام رسول سورتی وفات ۱۳۲۴ھ (۷-۱۹۰۶ء)

۷۔ مولانا عبداللہ بایزید پوری وفات ۱۳۳۸ھ (۲۰-۱۹۱۹ء)

۸۔ مولانا محمد حسین بٹالوی وفات ۱۳۳۸ھ (۲۰-۱۹۱۹ء)

۹۔ مولانا سید محمد تقی نصیرآبادی

۱۰۔ مولانا عبدالرحمان کلیانوی جج ریاست اودے پور

۱۱۔ مولانا ابراہیم انصاری کیرانوی

۱۲۔ سر سید احمد

سر سید احمد نے مولانا سے باقاعدہ پڑھا اور مسلسل استفادہ کیا ہے، سر سید احمد نے اپنی تالیفات میں مولانا سے تلمذ و استفادہ کا اعتراف کیا ہے اور آثار الصنادید میں بھی مولانا نور الحسن کا تذکرہ لکھا ہے جس کا اختتام ان الفاظ پر ہوا ہے:

''راقم آثم کے حال پر ان حضرات کی نگاہ توجہ کو اب مصروف کر دیا ہے کہ بدرجہ غایت نظر تربیت استادانہ سے منظور فرماویں تا کہ شاید یہی نظر عنایت بارگاہ کریم میں اس احقر کی نجات کا سبب ہو جائے، کوتاہ شب وفسانہ بسیار، زبان قلم قاصر ہے کہاں تک کہے..........(۱)

تالیفات مولانا کی صرف چار تالیفات کا تذکرہ ملتا ہے جو یہ ہیں:

۱۔ حاشیہ ہدایہ اولین
۲۔ تاریخ ریاست الور (بے نقط الفاظ میں)
۳۔ رسالہ فرائض (میراث)
۴۔ انتخاب احادیث استبصار تالیف مولانا آل حسن موہانی (۲)

یہ چاروں کتابیں عربی میں ہیں، حاشیہ ہدایہ ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے اور کتابوں کے مکمل نسخے دریافت نہیں۔

مولانا احتشام الحسن کاندھلوی نے حاشیہ دیوان متنبی اور مائۃ مسائل حضرت شاہ محمد اسحاق کا بھی بعض روایتوں کی وجہ سے مولانا نور الحسن سے انتساب کیا ہے، مگر یہ اطلاع صحیح نہیں ہے۔(۳)

---

(۱) آثار الصنادید ص: ۰۷ باب چہارم لکھنؤ۔(اکتوبر ۱۹۰۰ء)
(۲) مفصل حالات کیلئے دیکھئے، حضرت مولانا انعام الحسن نمبر (مجلہ احوال وآثار) مرتبہ نور الحسن راشد، (کاندھلہ) لاہور: ۱۹۹۸ء
(۳) تفصیلات کیلئے ملاحظہ ہو راقم سطور کا مضمون باقیات آزردہ مجلہ غالب نامہ دہلی (جنوری ۱۹۸۳ء) ص: ۲۱۲-۲۱۴

وفات مولانا نورالحسن کی تقریباً اٹھاون سال کی عمر میں ۱۱؍محرم الحرام ۱۲۸۵ھ (مئی ۱۸۶۸ء) کو کاندھلہ میں وفات ہوئی۔ خاندانی قبرستان میں جو موجودہ عید گاہ سے ملحق ہے دفن کئے گئے۔

[۴] مولانا شیخ محمد تھانویؒ (۳)

تھانہ بھون ایک پرانی بستی ہے، جس میں ایک فاروقی خانوادہ اکبر کے زمانۂ حکومت میں تھانیسر (پنجاب) سے آکر آباد ہوا تھا، اس خاندان میں علم کی روایت بہت مضبوط اور تابندہ تھی، اس کی مختلف شاخوں میں کئی بڑے عالم اور کاملین پیدا ہوئے، اسی خاندان کی ایک شاخ سے مولانا شیخ محمد بھی وابستہ تھے۔ مولانا کا سلسلہ نسب اس طرح ہے:

''مولانا محمد بن شیخ حمد اللہ بن حکیم محمد بخش بن قاضی محمد ارحم بن حافظ اعظم'' (۱)

مولانا شیخ حمد اللہ فاضل اور باصلاحیت شخص تھے، سرکاری ملازم تھے، مولوی عبدالقادر چیف رامپوری نے مولوی حمد اللہ سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ (۲)

مولانا شیخ محمد کی ۲۰؍جمادی الاول ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۵ء) کو ولادت ہوئی۔ مولانا شیخ حمد اللہ کے اکلوتے بیٹے تھے، پانچ سال کی عمر تھی کہ والدہ رحلت کر گئیں اور دس سال کی عمر میں والد کے سایہ سے محروم ہو گئے تھے مگر خاندان کے افراد نے مولانا کی تعلیم و تربیت کر کے اس محرومی کی تلافی کرنیکی کوشش کی۔ مولانا نے دس سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کر لیا تھا، اسکے بعد فارسی شروع ہوئی، مقامی علماء مولانا عبدالرحیم تھانوی اور مولانا سید محمد قلندر جلال آبادی سے عربی فارسی کی درسیات پڑھیں، (۳) شیخ محمد نے لکھا ہے:

''قد سمعت من استاذی مولانا محمد قلندر الجلال آبادی بحوالة شیخی و استاذه المولوی الٰهی بخش الکاندهلوی

(۱) تحقیق وحدۃ الوجود والشہود مع حالات مولانا شیخ محمد تھانوی مرتبہ ثناء الحق ص: ۱۷

(۲) علم و عمل ترجمہ وقائع عبدالقادر خانی مرتبہ ایوب قادری۔ ص: ۳۴۳ جلد اول (کراچی: ۱۹۷۰ء)

(۳) نثر محمدیہ مولفہ حکیم محمد عمر چرتھاولی ص: ۵ (مولفہ ۱۲۹۷ء) (مطبع عثمانی میرٹھ بلا سنہ)

اور دوسری جگہ لکھتے ہیں:

وقد سمعت شیخی واستاذی مولانا محمد اسحاق قدس سرہ

و مولانا عبد الرحیم الفقیہ التھانوی..''

بظاہر مولانا شیخ محمد نوجوانی میں اعلیٰ تعلیم کیلئے دہلی بھیج دیئے گئے تھے۔ دہلی کب پہنچے اس کی صراحت مجھے نہیں ملی لیکن مولانا نے جامع مسجد دہلی میں مختلف مؤذنوں کی موجودگی اور اس مسئلہ کی شرعی حیثیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں سنہ ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۵ء) میں دہلی میں موجود تھا۔(۱)

اس وقت مولانا کی عمر صرف دس سال تھی، اس لئے یہ کہنا تو مشکل ہے کہ اس کم سنی میں یہ سفر تعلیم کے لئے ہوا ہوگا، مگر اس سے یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ مولانا نوعمری سے دہلی کے علماء اور علمی حلقوں سے کچھ واقف تھے، اسلئے جب ابتدائی یا متوسطات کی تعلیم سے فارغ ہوئے تو اپنے علاقہ کے باذوق اور مستعد طلبہ کی طرح مزید تعلیم کیلئے دہلی پہنچے، دہلی کے نامور علماء کی مجلسوں میں حاضر ہو کر سیراب ہوئے اور مرتبۂ کمال حاصل کیا۔

مولانا نے دہلی میں جن علماء سے پڑھا، ان میں حضرت مولانا مملوک العلی، مولانا فضل حق خیرآبادی اور حضرت شاہ محمد اسحاق کے نام ممتاز اور سرفہرست ہیں مگر مولانا نے ان کے علاوہ اور علماء سے بھی استفادہ کیا ہے، مولانا کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سبحان بخش شکار پوری، مولانا عبد الرزاق بانچتی اور مولوی نصیر الدین سونی پتی دہلوی بھی مولانا کے استادوں میں ہیں۔

مذکورہ استادوں میں سے کس سے کیا کیا پڑھنے کی توفیق ملی، اس کی تفصیل دریافت نہیں، تاہم اس تلمذ کی مولانا کی ایک تحریر سے اجمالاً تصدیق ہو رہی ہے، مولانا نے اپنی کتاب **دلائل الاذکار فی اثبات الجھر و الاسرار** میں لکھا ہے کہ:

''واما اکتساب علوم ظاہری نقلی از پیش خدمت استاد وقت مسند آفاق مولانا وبفضل اولانا حضرت الحاج مہاجر محمد اسحاق المحدث الشاہ جہاں آبادی نبیرہ حضرت

(۱) افادات سنن نسائی، حاشیہ باب ہل یوذنان جمیعا اوفرادیٰ مشمولہ آخر سنن نسائی۔ ص:۳۸۱ جلد اول (مجتبائی دہلی ۱۳۱۶ھ)

مولانا شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ المحمد وحین است۔

امادرفن معقول ہم ازیں خاندان عالیشان بذریعہ مولانا الحاج المدرس مولوی مملوک العلی نانوتوی مرحوم ومولانا الحاج مولانا قلندر جلال آبادی مغفور وغیرہ وہم از خاندان بحرالعلوم مولانا عبدالعلی قدس اسرارہم، بوساطت عنایت افضل الفضلاء النبلاء موجد المعقول مزین المنقول حافظ مولانا محمد فضل حق خیرآبادی مدظلہ العالی'' (۱)

مولانا مملوک العلی سے تلمذ اور دہلی کالج میں تعلیم

مولانا شیخ محمد نے مولانا مملوک العلی سے کیا کیا پڑھا دیگر معلومات کی طرح اس کی تفصیل بھی موجودہ مآخذ میں دستیاب نہیں ہے، مگر مولانا شیخ محمد نے مولانا سبحان بخش شکارپوری کو بھی اپنا استاد لکھا ہے، اس لئے یہ خیال شاید غلط نہ ہوگا کہ مولانا شیخ محمد نے دہلی کالج میں بھی تعلیم پائی ہے جس میں مولانا مملوک العلی مدرس اول اور مولانا سبحان بخش مدرس سوم تھے، یہ تعلیم کب ہوئی اس کے سنہ کا تذکرہ نہیں ملتا مگر یہ واقعہ ۱۲۴۵ھ اور ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۵ء-۱۸۲۹ء) کے درمیان کا ہوسکتا ہے۔

حضرت شاہ محمد اسحاق کی خدمت میں

آخر میں سندالمحدثین حضرت شاہ محمد اسحاق کی خدمت میں حاضر ہوئے، حدیث پڑھی اور سند واجازت حاصل کی۔ مولانا نے حضرت شاہ صاحب سے کیا کیا پڑھا اسکی تفصیل بھی مفقود ہے مگر مولانا کی سند حدیث حضرت شاہ محمد اسحاق کے واسطہ سے ہے۔

مولانا شیخ محمد نے حاشیہ سنن نسائی میں ایک جگہ ضمناً صراحت کی ہے کہ مجھے حضرت شاہ صاحب سے صحاحِ ستہ کی اجازت ہے۔

مولانا کو حضرت شاہ صاحب سے بہت عقیدت ومحبت تھی، جو مولانا کی تحریروں سے جھلکتی ہے، مولانا نے شاہ صاحب کے درسی افادات قلم بند کئے تھے، اور نسائی کے حاشیہ میں بھی حضرت شاہ صاحب کے افادات کثرت سے نقل کئے ہیں۔

---

(۱) دلائل الاذکار فی اثبات الجہر والاسرار: ص: ۳۷ (مطبع فخر المطابع دہلی: ۱۲۷۰ھ)

حضرت شاہ صاحب کی مولانا پر خاص شفقت وعنایت کی نظر تھی، شاہ صاحب چاہتے تھے کہ اپنی صاحبزادی کا نکاح مولانا شیخ محمد سے کردیں، مگر شیخ محمد کی والدہ اس پر تیار نہ ہوئیں اس لئے یہ رشتہ نہ ہوسکا۔

تعلیم کے بعد مولانا کی مصروفیات کی تفصیل موجود نہیں کہ کیا مشاغل رہے اور کہاں قیام تھا، صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں تھانہ بھون میں تھے، مگر اس وقت انگریز کے خلاف جدوجہد سے متفق نہیں تھے، ۱۸۵۷ء کے معرکہ میں تھانہ بھون کے اجڑ جانے کے بعد رام پور منہیاران ضلع سہارنپور چلے گئے تھے، کئی سال وہیں رہے، جب حالات کچھ بہتر ہوئے تو رام پور سے نکلے، کچھ دن میرٹھ میں قیام کیا پھر نواب ٹونک کی طلب پر ۱۲۷۸ھ (۶۲-۱۸۶۱ء) میں ٹونک چلے گئے۔ ۱۲۸۳ھ تک ٹونک میں قیام ہوا، ٹونک سے واپسی کے بعد زیادہ وقت وطن میں گذارا، وہیں وفات ہوئی۔

سفر سلوک ومعرفت

مولانا شیخ محمد کو زمانۂ طالب علمی سے سیر سلوک کا شوق تھا اس لئے سب سے پہلے مولانا نصیر الدین سونی پتی دہلوی (جو شیخ محمد کے استاذ بھی تھے) سے بیعت ہوئے، استفادہ کیا، اس کے بعد حضرت میاں جیو نور محمد جھنجھانوی کے زمرۂ خدام میں داخل ہوئے، آخر میں حضرت شاہ محمد اسحاق کے بھائی شاہ محمد یعقوب کا دامن پکڑا، مولانا نصیر الدین سے کب بیعت ہوئے تھے اور کس قدر وقت مولانا کی تربیت میں گذرا اس کی صراحت نہیں ملی، مگر حضرت میانجیو نور محمد کی خدمت میں کم وقت گذرا، کیوں کہ (۱۲۵۶ھ) تک مولانا نصیر الدین حیات تھے، ان کی وفات کے بعد ہی میانجیو صاحب سے وابستہ ہوئے ہوں گے اور رمضان المبارک یا شوال ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) میں میانجیو بھی رحلت فرما گئے تھے (۱) اس لئے خیال یہ ہے کہ مولانا کو میانجیو صاحب سے استفادہ کا زیادہ موقع نہیں ملا لیکن آخر میں میانجیو نے اجازت وخلافت سے نواز دیا تھا۔

میانجیو کی وفات کے بعد میانجیو صاحب کی ہدایت کے مطابق میانجیو کے خلیفۂ اول

(۱) بیاض دلکشا مولانا نصر اللہ خویشگی۔ ص: ۵۹ (مطبع فتح الاخبار کول: ۱۲۶۸ھ؟)

حافظ محمد ضامن شہید سے استفادہ کیا(۱) سفر حج کے وقت حضرت شاہ محمد یعقوب کی خدمت میں حاضر رہ کر سلسلہ نقشبندیہ کا فیض حاصل کیا اور اس سلسلہ میں اجازت پائی۔

مولانا شیخ محمد کے کئی خلفاء تھے، جن میں قاضی محمد اسماعیل منگلوری کو بہت شہرت ہوئی، ایک اور مجاز بیعت مولانا حکیم محمد عمر چرتھاولی تھے، حکیم صاحب نے مولانا شیخ محمد کی تالیفات خصوصاً دفتر ہفتم مثنوی مولانا روم کی طباعت کا اہتمام کیا اور مولانا کے حالات پر نثر محمدیہ کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی۔

تصانیف

مولانا شیخ محمد نے مختلف موضوعات پر تقریباً تیس کتابیں لکھیں جن میں سے اکثر شائع نہیں ہوئیں، دس بارہ کتابیں چھپی ہیں، مگر اب ان میں سے بھی اکثر معدوم ومفقود ہیں، اور ان کے قلمی نسخے بھی کم یاب ہیں۔ یہ کتابیں نہ ملنے کی وجہ سے تذکرہ نگاروں نے ان کتابوں کے متعلق کچھ باتیں ایسی لکھ دی ہیں جو بے حقیقت اور ناقابل تسلیم ہیں، یہاں تفصیلات کی گنجائش نہیں۔

مولانا کی جو تالیفات معلوم ہیں ان کے نام ذیل میں تحریر ہیں، جن سے مولانا کے ذوق ومزاج اور تالیفات کے مضامین کا اندازہ ہوجاتا ہے:

(۱) رسالہ گل لالہ یعنی تنقیہ الاعتقاد مؤلفہ (۱۲۵۹ھ)

(۲) رسالہ وحدۃ الوجود والشہود (۱۲۶۳ھ) ❖

(۳) دلائل الاذکار فی اثبات الجبر والاسرار (۱۲۷۰ھ) ❖

(۴) سلک التنقیح فی اثبات جواز التسبیح (۱۲۷۰ھ) ❖

(۵) مثنوی دفتر ہفتم (۱۲۷۶ھ) ❖

(۶) شرح حزب البحر (۱۲۷۷ھ)

(۷) ارشادِ محمدی (۱۲۷۷ھ) ❖

(۸) انوارِ محمدی (۱۲۹۱ھ) ❖

(۹) قسطاس فی موازنۃ اثر ابن عباسؓ (۱۲۹۴ھ) ❖

---

(۱) ارشادِ محمدی، مولانا شیخ محمد تھانوی۔ ص:۱۶ (مطبع دار العلوم میرٹھ)

(۱۰) حاشیہ سنن نسائی (۱۲۹۶ھ) ❖

(۱۱) حاشیہ شرح عقاید نسفی

(۱۲) مناظرہ محمدیہ ❖

(۱۳) تصفیۃ الفواد من الکفر والارتداد

(۱۴) بیاض عملیات (بیاض محمدی) ❖

(۱۵) تاریخ تھانہ بھون ❖

(۱۶) آداب الطالبین (قلمی نسخہ) (۱)

وفات مولانا شیخ محمد اپنی آخری تالیف حاشیہ سنن نسائی کی ترتیب میں مشغول تھے اسی دوران لرزہ اور بخار کی شکایت محسوس ہوئی، اس سے افاقہ ہوا تو رمضان المبارک شروع ہوگیا، رمضان میں قرآن مجید سنایا اور فرمایا آئندہ سال ماہِ صیام تک حیات مقدر نہیں، یہی ہوا۔

رمضان کے بعد طبیعت کچھ سنبھلی تو نسائی کے حاشیہ کو تیزی سے مکمل کیا، اس کے بعد ریاست چھتاری اور میرٹھ کا سفر کیا، اس سفر میں مرض کا دوبارہ حملہ ہوا اور وہی مرض الموت بن گیا، لمبی بیماری کے بعد ۷/ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ (یکم اپریل ۱۸۷۹ء) کو تھانہ بھون میں وفات ہوئی، وہیں دفن کئے گئے۔ (۲)

---

(۱) اس فہرست کی جن کتابوں پر (❖) کا نشان لگا ہوا ہے ان کا ایک ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے، آخر الذکر آداب الطالبین کا ایک قلمی نسخہ پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی کے ذخیرہ میں تھا۔

(۲) مزید معلومات کے لئے دیکھئے حالات نثر محمدیہ از حکیم محمد عمر چرتھاولی۔ مقدمہ تحقیق وحدۃ الوجود والشہود۔ ثناء اللہ صدیقی۔ ص: ۱۶تا۱۰۷ (کراچی)

[۵] حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ (۴)

خاندان ونسب سہارنپور میں ایک قدیم انصاری خاندان جو حضرت ابوایوب انصاریؓ کی اولاد میں سے ہے، صدیوں سے آباد ہے۔ اس خانوادہ میں کئی بڑے علماء اور مشائخ پیدا ہوئے جن میں سے ایک شیخ ابوسعید شیخ چوہر تھے، جو حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی (وفات ۹۴۵ھ) کے خلیفہ اور مکتوب الیہ تھے۔(۱) شیخ ابوسعید کے اخلاف میں سے شیخ لطف اللہ عرف پیر تھو سہارنپور کے معزز اشخاص میں تھے، ان کے کئی بیٹے تھے، جن میں ایک مولانا احمد علی محدث سہارنپوری بھی ہیں۔ حضرت مولانا کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے:

> ''حضرت مولانا احمد علی، بن شیخ لطف اللہ معروف بہ پیر تھو، بن شیخ محمد جمیل معروف بہ شیخ چوہر، بن محمد خلیل، بن شیخ احمد، بن شیخ بدرالدین، بن شیخ صدرالدین، بن شیخ الاسلام شیخ ابوسعید معروف بہ شیخ چوہر انصاری۔''(۲)

ولادت صحیح تاریخ ولادت معلوم نہیں، تقریباً سنہ ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) میں ولادت ہوئی ہوگی۔

مولانا ابتدائے عمر میں تعلیم کی طرف متوجہ نہیں تھے، سولہ سترہ سال کی عمر میں تعلیم کی ابتداء کی، قرآن شریف حفظ کیا اور مولانا ریاض الحسن محمد سلیمان کاندھلوی کی اطلاع کے مطابق:

> ''ان حضرت نے اخیر عمر مفتی صاحب میں تحصیل شروع کی اور حیات حضرت مفتی صاحب مرحوم میں انفراغ تحصیل علوم سے حاصل نہیں ہوا تھا اتمام علوم کا حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب سے فرمایا ہے۔''(۳)

---

(۱) مکتوبات قدوسیہ۔ ص: ۶۰ (دہلی: ۱۲۹۷ھ)

(۲) سراج النسب

(۳) حالات مفتی الٰہی بخش، مکتوبہ ومولفہ مولانا ریاض الحسن کاندھلوی، متوفی: ۱۳۲۵ھ/ ۱۹۰۸ء

دہلی کا تعلیمی سفر اور مولانا مملوک العلی سے تلمذ

مفتی صاحب سے استفادہ کے بعد دہلی گئے، دہلی میں مولانا مملوک العلی سے تعلیم حاصل کرتے رہے، دہلی کب جانا ہوا اسکی تاریخ نہیں ملی مگر جب حضرت حاجی امداداللہ سنہ ۵۰-۱۲۴۹ھ (۱۸۳۵ء-۱۸۳۴ء) میں پڑھنے کیلئے دہلی گئے اس وقت حضرت مولانا احمد علی مولانا مملوک العلی کی خدمت میں موجود تھے، حضرت مولانا نانوتوی نے حضرت حاجی صاحب کا گلستاں کا سبق حضرت مولانا احمد علی کے سپرد فرمایا تھا۔(۱)

اساتذہ

مولانا احمد علی نے چند کتابیں مولانا سعادت علی فقیہ سہارنپوری سے پڑھیں، اور صحیح بخاری کا اکثر حصہ مولانا وجیہ الدین صدیقی محشی سہارنپوری سے، دوبارہ حدیث کی سب کتابیں اور صحاح ستہ حضرت شاہ محمد اسحاق سے دہلی اور مکہ معظمہ میں مکمل پڑھیں۔مکہ معظمہ کے سفر میں مولانا احمد علی حضرت مولانا مملوک العلی کے ساتھ تھے (اس کی تفصیلات اپنے موقع پر گذر چکی ہیں) مولانا نے ایک سال سے زائد حضرت شاہ محمد اسحاق کی خدمت میں گذارا، شاہ صاحب کی مجلس درس میں صحاح ستہ کی تکمیل کی، صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بعض حصہ کی قراءت اور بعض کی سماعت کی، سنن ترمذی کی تمام قراءت خود ہی کی۔صحاح ستہ کی تکمیل کے بعد استادِ عالی مقام نے خدمت حدیث کی وصیت فرمائی اور سند عطاء کی۔

دہلی میں قیام

حجاز سے واپسی کے بعد دہلی میں قیام کیا اور حدیث شریف کی اہم ترین بنیادی کتابوں کو صحت اور مفصل حاشیوں کے ساتھ شائع کرنے کا ایک لمبا منصوبہ شروع کیا، اور ساتھ ہی ایک مطبع بھی شروع کردیا جو مولانا اور دوسرے مصنفین کی نیز درسی کتابیں تصحیح کے اہتمام اور عمدگی کے ساتھ چھاپتا تھا، اس تجارتی ادارہ پریس کا نام مطبع احمدی تھا۔

(۲) شمائم امدادیہ (ملفوظات حضرت حاجی امداداللہ) ص:۲۱۷-۲۱۸ (لکھنؤ:۱۳۱۴ھ)

نیز امدادالمشتاق مرتبہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ص:۱۹۶-۱۹۷ (تھانہ بھون: طبع اول)

مطبع احمدی اور اس کی خدمات

مطبع احمدی نے ہندوستان میں علوم اسلامیہ کی نشر و اشاعت اور ہر موضوع اور فن کی اعلیٰ درجہ کی کتابوں کے اعلیٰ ترین ایڈیشن چھاپنے کا بڑے پیمانے پر کام کیا، جس کا بے حد فائدہ ہوا اور علمی دینی ادبی کتابوں کے ایسے قابل اعتماد نسخے شائع کئے جو اہل علم اور ناشرین کے لئے نمونہ اور مثال بن گئے، خصوصاً درسیات، قرآن کریم اور مختلف مضامین و مباحث پر ایسی ایسی کتابیں چھاپیں کہ ان میں بعض کے عکس آج تک چھپ رہے ہیں۔

اس مطبع نے سنہ ۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴ء) سے سنہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ تک مسلسل کام کیا، اس ہنگامہ میں جب پورا ملک اور پوری دہلی زیر و زبر ہوگئی، تو یہ پریس کیسے باقی رہتا، یہ پریس بھی ختم ہوا اور اس کے ساتھ ہی حضرت مولانا کا تصنیفی و اشاعتی منصوبہ بھی بند ہوگیا۔ سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد جب حالات کچھ درست ہوئے تو مولانا نے اپنے اس مطبع کو اسی پرانے نام سے میرٹھ شہر میں دوبارہ شروع کیا، جس نے صحیح بخاری کا حضرت مولانا احمد علی کا مرتب کیا ہوا نسخہ اور متعدد کتابیں مکرر شائع کیں مگر مطبع احمدی کی اس دور کی مطبوعات میں وہ بات نہیں جو احمدی دہلی کی مطبوعات میں تھی۔

۱۸۵۷ء کے بعد سہارنپور و میرٹھ میں قیام

دہلی میں مطبع ختم ہونے کے بعد تقریباً دو سال تک وطن سہانپور میں قیام کیا، اس کے بعد شیخ الٰہی بخش (لال کرتی میرٹھ) کے یہاں ملازم ہوگئے، شیخ الٰہی بخش اور ان کے بھائی عبدالکریم بڑے تاجر اور ٹھیکیدار تھے، پشاور سے کلکتہ تک انگریزی فوج کی چھاؤنیوں کو ضروری سامان پہنچانے کا ٹھیکہ ان دونوں کے پاس تھا، شیخ صاحب نے حضرت مولانا کو اپنے کلکتہ کے تجارتی دفتر کا نگراں مقرر کر دیا تھا، اس ملازمت کی وجہ سے تقریباً دس سال تک مولانا کا کلکتہ میں قیام رہا۔

کلکتہ سے ترکِ ملازمت اور سہارنپور میں تدریسی خدمات

اس ملازمت کو دس بارہ سال ہوگئے تھے کہ حضرت مولانا حاجی عبدالکریم کے ساتھ حج کے لئے گئے، اس وقت حضرت

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی مکہ معظمہ میں قیام فرما تھے، دونوں کی حضرت حاجی صاحب سے ملاقات ہوئی تو حاجی صاحب نے حضرت مولانا سے فرمایا کہ:

''مولانا مملوک العلی صاحب نے میرا سبق گلستاں آپ کے سپرد کیا تھا اس وجہ سے آپ میرے استاد ہیں، مگر میں ایک بات عرض کرونگا اگر ناگوار نہ ہو، انہوں نے فرمایا کہ میں آپ کو اپنا بزرگ جانتا ہوں جو کچھ فرمایئے بسروچشم منظور ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کا یہ منصب نہیں ہے کہ حافظ عبدالکریم آپ کو کام کا حکم دیں بلکہ ان کو آپ کا محکوم ہونا چاہئے، لیکن نوکری میں بجز محکومی چارہ نہیں، اب آپ اپنے مکان پر درس حدیث نبویہ ﷺ کا فرمایا کریں تا کہ خلق کو فیض ہو، مولانا نے قبول کر کے فرمایا آپ حرم میں میرے لئے دعاء کریں''(۱)

حضرت مولانا نے حاجی صاحب سے فرمایا تھا کہ:

''میں آپکو اپنا بزرگ جانتا ہوں جو فرمایئے بسروچشم منظور ہے''

اسلئے حج سے واپسی کے بعد حضرت حاجی صاحب کے مشورہ کے مطابق کلکتہ کی ملازمت چھوڑ کر سنہ ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴ء) میں سہارنپور واپس آگئے، اس سے آٹھ سال پہلے سہارنپور میں ایک دینی مدرسہ کی ابتداء ہو چکی تھی، جس کا حضرت مولانا نے مظاہر علوم نام تجویز کیا تھا۔ سہارن پور آ کر اس مدرسہ میں حدیث شریف کا درس شروع کیا، جس نے حضرت حاجی صاحب کے الفاظ میں:

''صدہا طلبہ کو محدث بنادیا۔''

سہارنپور آنے کے بعد پہلے گھر پر درس حدیث جاری کیا، مدرسہ مظاہر العلوم کی سنہ ۱۲۹۱ھ (۷۵-۱۸۷۴ء) کی روداد میں لکھا ہے کہ:

''طالب علموں اور علوم دینیہ کے شائقین کو مژدہ ہو کہ امسال مولوی احمد علی صاحب مد فیوضہ کلکتہ سے ترک تعلق کر کے سہارنپور میں مقیم ہیں، غرض اصلی یہی ہے کہ جس قدر بن پڑے علوم دینی کے پڑھانے میں اوقات صرف کیجئے۔

(۱) شمائم امدادیہ (ملفوظات حضرت حاجی امداد اللہ) ص: ۲۱۷-۲۱۸

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ　　جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

چنانچہ طالبان علم حدیث مسافت بعیدہ سے یہ مژدہ سن کر فراہم ہو گئے اور کچھ مدرسہ کے طالب علم بھی ان سے پڑھتے ہیں۔ اکثر روز درس و تدریس میں گزرتا ہے۔ بلکہ رات کو بھی بعض طالب پڑھتے ہیں اور ان کے سہارنپور کے قیام سے کتابوں کی مدد بھی طالب علموں کو بہت ملتی ہے۔"

"امدّ اللہ فیضہ و افاض علی العالمین برکتہ"(۱)

ایک سال تک گھر دار العلوم بنا رہا، سنہ۱۲۹۲ھ سے مدرسہ مظاہر علوم میں حدیث کے سبق شروع کئے جو حضرت مولانا کے مرضِ وفات تک جاری رہے۔ مدرسہ کے علاوہ گھر پر بھی سبق ہوتے تھے، فجر کی نماز سے عشاء کے بعد تک سبق جاری رہتے تھے، کوئی وقت فارغ نہیں تھا، گھر سے مدرسہ جاتے ہوئے اور مدرسہ سے گھر آتے وقت بھی طلبہ ساتھ ہوتے اور افادہ وتعلیم کا دریا بہتا رہتا تھا، شام کو گھوڑے پر سوار ہو کر تفریح کیلئے جانے کا معمول تھا اس وقت بھی طلبہ ساتھ ہوتے، گھوڑے کے ساتھ دوڑتے رہتے اور پڑھتے رہتے تھے:

حضرت مولانا کے اخلاص اور خدمتِ حدیث کی لگن اور طلباء کی محنت اور شوق وولولہ کی وجہ سے ہر سال متعدد کتابوں کے دو-دو، تین-تین مرتبہ پڑھانے کی نوبت آتی تھی۔ مدرسہ مظاہر علوم کی روداد میں مولانا کی پڑھائی ہوئی کتابوں کی تفصیل کئی مرتبہ شائع ہوئی، یہاں سنہ۱۲۹۲ھ کی مقدار خواندگی نقل کی جاتی ہے:

"صحیح مسلم تمام دوبار، سنن ابی داؤد مکرر، بخاری شریف تمام پھر گیارہ پارے، مشکوۃ شریف، نسائی، ابن ماجہ، جامع ترمذی، موطا امام محمد، جامع صغیر، تفسیر جلالین، ترجمہ کلام مجید، احیاء العلوم یک ربع، در مختار ص: ۳۲ تک، شمائل ترمذی، مقدمہ ترمذی، شرح ملاص: ۳۲ تک، قدوری"(۲)

(۱) روداد مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، ص۳-۴ (۱۲۹۱ھ)　(۲) روداد مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور ص:۵

مولانا سعادت علی فقیہ سہارنپوری کی وفات سنہ ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) کے بعد سے مدرسہ کیلئے کسی مہتمم کا انتخاب نہیں ہوا تھا اور یہ عہدہ خالی تھا، حضرت مولانا کے سہارنپور تشریف لانے کے بعد مدرسہ کے جلسۂ عام میں اتفاق رائے سے حضرت مولانا کو مہتمم بنایا گیا اور اس سال سنہ ۱۲۹۱ھ کی روداد پر بحیثیت مہتمم حضرت مولانا کا نام شائع ہوا۔

حضرت مولانا کا دارالعلوم دیوبند سے بھی خاص تعلق رہا ہے، دارالعلوم کے ابتدائی دور کے متعدد اکابر اور اساتذہ حضرت مولانا سے شاگردی کی نسبت رکھتے تھے اور دارالعلوم کی سب سے پہلی عمارت نودرہ کا سنگ بنیاد بھی حضرت مولانا کے ہاتھ سے رکھوایا گیا، روداد مدرسہ عربیہ (دارالعلوم) دیوبند میں اس تاریخی واقعہ کا ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے:

> ''اول پتھر بنیاد کا جناب مولانا مولوی احمد علی صاحب نے اپنے دست مبارک سے رکھا اور بعد میں جناب مولانا مولوی محمد قاسم صاحب و مولانا مولوی رشید احمد صاحب اور مولانا مولوی مظہر نے ایک ایک اینٹ رکھی'' (۱)

حضرت مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ جس کیلئے برصغیر ہندوپاک کے تمام اہل علم مولانا کے ممنونِ احسان ہیں۔ حدیث کی کتابوں کی تصحیح اور ان کی اشاعت ہے۔ حضرت مولانا نے صحیح بخاری، جامع ترمذی اور مشکوۃ المصابیح پر حاشیے لکھے اور ان کی تصحیح کی، صحیح مسلم کی بھی تصحیح کی اور پہلی بار شرح نووی کے ساتھ شائع کی، سنن ابوداؤد کے کئی نسخوں کو سامنے رکھ کر صحیح نسخہ تیار کیا جسے مولانا کے خاص شاگرد مولانا محمد حسین فقیر بنتی دہلوی نے بہت اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔ اس عقد ثریا کا گوہر شب تاب حاشیہ صحیح بخاری ہے، حضرت مولانا نے اس کی تصحیح اور حاشیہ لکھنے میں غیر معمولی کاوش و کوشش فرمائی۔ متعدد ممتاز علماء سے اس میں مدد لی اور خود بھی دس سال سے زائد عرصہ تک اسی خدمت میں مصروف رہے۔

اس بیش بہا تاریخی نسخہ کی پہلی طباعت سید عبد الغفور کے مطبع سید الاخبار میں ۱۸ر جمادی الآخر ۱۲۶۴ھ ۲۲ مئی ۱۸۴۸ء کو شروع ہوئی۔ اس پریس میں صرف ایک سو چوراسی صفحات چھپے تھے کہ مولانا نے طباعت کا کام اپنے مطبع احمدی میں منتقل کرلیا۔ صفحہ

(۱) ملاحظہ ہو روداد سال اول مدرسہ عربیہ (دارالعلوم) دیوبند نیز سوانح قاسمی، مولانا مناظر احسن گیلانی ص ۳۲۵ ج ۲

۱۸۵ سے آخر تک دونوں جلدیں مطبع احمدی ہی سے شائع ہوئیں، جلد اول کی طباعت ۲۷ر رجب ۱۲۶۷ھ ۲۵ر مئی ۱۸۵۱ء کو اختتام پذیر ہوئی اور دوسری جلد کی اشاعت سنہ ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۴ء) میں تکمیل کو پہنچی، اس ایڈیشن کے کل ۳۲۵ نسخے شائع ہوئے اور فی نسخہ بارہ روپے لاگت آئی، اس طباعت کا دوسرا ایڈیشن مطبع عبدالغفور دہلی سے محرم سنہ ۱۲۷۲ھ (ستمبر، اکتوبر ۱۸۵۵ء) میں شائع ہوا۔

اس طباعت کے بعد بھی حضرت مولانا نے صحیح بخاری کی تصحیح اور اس پر نظر ثانی کا کام جاری رکھا۔ پچھلے ایڈیشن میں جو غلطیاں رہ گئی تھیں انکی موقع پر تصحیح کی، اور حواشی میں بھی کسی قدر اضافہ ہوا، سب سے اہم اضافہ رجال کے انساب اور کنی کا ہوا۔ اس نسخہ کی سنہ ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۵ء) میں طباعت شروع ہوئی اور سنہ ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷ء) میں پوری ہوئی۔

صحیح بخاری کی پہلی اشاعت کے خاتمۃ الطبع میں حضرت مولانا نے صحیح مسلم کی طباعت بھی شروع کرنیکا ذکر کیا ہے۔ غالب گمان ہے کہ ایک دو سال میں اسکی طباعت مکمل ہوگئی ہوگی، یہ ایڈیشن طباعت کے بعد جلد ہی ناپید ہوگیا تھا اور اب تک ہمیں اس کے کسی نسخہ کا سراغ نہیں ملا، اس ایڈیشن کے فروخت ہو جانے کے بعد صحیح مسلم کا دوسرا ایڈیشن مولانا محمد حسین فقیر اور شیخ ظفر علی کے اہتمام سے مطبع افضل المطابع شاہدرہ (دہلی) سے شائع ہوا۔

تیسری اہم کتاب جس پر حضرت مولانا نے حاشیہ لکھا اور اس کی تصحیح کی، جامع ترمذی ہے، سنن ترمذی کا پہلا ایڈیشن حضرت مولانا کی تصحیح اور حاشیہ کے ساتھ سنہ ۱۲۶۵ھ (۱۸۴۹ء) میں مطبع العلوم دہلی سے اشرف علی واسطی کے اہتمام سے شائع ہوا۔ دوسرا ایڈیشن رمضان سنہ ۱۲۸۲ھ (جنوری فروری ۱۸۶۶ء) میں پورا ہوا۔

متون حدیث کی ان اہم کتابوں کے علاوہ حدیث کی مشہور کتاب مشکوۃ المصابیح پر بھی حاشیہ لکھا اور اپنے مطبع سے شائع کرایا، مگر حضرت مولانا کو ہمیشہ اس کا افسوس رہا کہ مشکوۃ کی پوری خدمت نہیں ہوسکی، مشکوۃ کا پہلا ایڈیشن کب شائع ہوا اور اس کی کیا اہمیت تھی، افسوس ہے اس کی تفصیلات حاصل نہیں ہوسکیں۔ دوسرا ایڈیشن مطبع احمدی میں سنہ

۱۲۷۲ھ میں شائع ہوا، اس ایڈیشن کے متعلق یہ امر قابل ذکر ہے کہ اسے مفت تقسیم کرنے کے لئے شائع کیا گیا تھا، اس نسخہ کی پہلی جلد کے ٹائٹل اور پہلے صفحہ پر جلی قلم سے الوقف للہ الکریم، اور دوسری جلد کے اکثر صفحات پر الوقف چھپا ہوا ہے۔

حدیث کی کتابوں کی اس جلیل القدر خدمت کے علاوہ مولانا کی کم از کم ایک تالیف او متعدد مطبوعہ فتاویٰ یادگار ہیں۔ یہاں صرف تالیف ''الدلیل القوی علی ترک قراءۃ المقتدی'' کا ذکر کیا جاتا ہے، یہ کتاب قراءۃ خلف الامام کے موضوع پر مولوی محمد شاہ لدھیانوی کے اصرار پر تالیف فرمائی تھی۔ اس میں نہایت متین اور علمی زبان میں قراءۃ خلف الامام کے متعلق حنفی نقطۂ نظر واضح کیا گیا ہے، پیش نظر نسخہ شعبان سنہ ۱۲۷۰ھ (مئی ۱۸۵۴ء) میں مطبع احمدی دہلی سے شائع ہوا ہے۔ یہ رسالہ اسکے بعد کم از کم ایک مرتبہ اور چھپا ہے۔

بعض احباب کے اصرار پر خود حضرت مولانا نے اس کا اردو ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ بھی اسی نام ''الدلیل القوی علی ترک قراءۃ المقتدی'' سے رجب سنہ ۱۲۹۵ھ (جولائی ۱۸۷۸ء) میں مطبع رحیمی واقع سرائے نواب علی محمد خاں (؟) سے شائع ہوا۔

حضرت مولانا نے ان درسی اور تصنیفی خدمات کے ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کی اصلاح اور معاشرہ کی درستی کے لئے بھی مسلسل جد جہد کی، خصوصاً بدعات کی بیخ کنی اور بیواؤں کے نکاحِ ثانی نہ کرنے کی مشرکانہ رسم کو ختم کرنے کیلئے بہت کوشش کی۔ ان موضوعات پر فتاویٰ لکھے، انھیں شائع کرایا اور مختلف علاقوں کے سفر کرکے وعظ ونصیحت کے ذریعہ سے عوام کو بدعات ورسومات کی برائی اوران کے نقصانات سے آگاہ کیا اور صحیح اسلامی طریقہ اور سادہ چلن پر زور دیا۔

حضرت مولانا کے معاصرین میں شاید ہی کسی استاذ و محدث کو اتنی بڑی تعداد میں ایسے منتخب اور بلند مرتبت شاگرد میسر آئے ہوں، جیسے حضرت مولانا کو ملے۔ حضرت مولانا کے تلامذہ کی فہرست بہت طویل ہے، تقریباً ساٹھ شاگردوں کے نام ہمارے سامنے ہیں۔ اس فہرست میں سے صرف چند نام ذکر کئے جاتے ہیں، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی،

مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی، مولانا احمد حسن امروہوی، مولانا عبدالعلی میرٹھی، مولانا محمد علی مونگیری، علامہ شبلی نعمانی اعظمی اور حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی (حضرت حاجی صاحب نے مولانا سے گلستاں کے سبق پڑھے تھے)۔

حضرت مولانا سنہ ۱۲۹۷ھ کے شروع میں فالج کے عارضہ میں مبتلا ہوئے اور اسی مرض میں ۶/ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۹۷ھ (۱۷/ اپریل ۱۸۸۰ء) کوشنبہ کے دن سہارنپور میں وفات ہوئی، عیدگاہ کے قریب قبرستان میں دفن کئے گئے۔ نساخ نے تاریخ کہی:

چو آں احمد علی نیک باطن — بہ سوئے خلد زیں دارالفنا رفت
برائے سال ترحیلش بہ نساخ — ملک گفتا ز دنیا مقتدا رفت(۱)

---

(۱) تفصیلات کیلئے ملاحظہ ہو راقم سطور کا مضمون بر حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری مشمولہ ضمیمہ امداد المشتاق بہ مقدمہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی ص: ۳۵۲ تا ۳۶۵ (دہلی: ۱۹۸۲ء)

[۶] مولانا قاری عبدالرحمٰن انصاری پانی پتیؒ (۵)

مولانا قاری عبدالرحمان پانی پت کے قدیم انصاری خاندان کے چشم و چراغ تھے، اس خاندان میں پہلے بھی کئی بڑے علماء اور کاملین پیدا ہوئے۔ اسی خاندان کے ایک ذی علم صاحب کمال شخص مولانا قاری شاہ محمد، حضرت قاری صاحب کے والد ماجد تھے، سلسلۂ نسب اس طرح ہے:

"قاری عبدالرحمان، بن قاری خواجہ محمد، بن خواجہ خدا بخش، بن غلام بوعلی، بن خواجہ کمال محمد، بن خواجہ غلام محمد" (۱)

مولانا کے والد قاری شاہ محمد نے پانی پت کے فخر روزگار قاری، قاری مصلح الدین عرف قاری لالہ سے قرآن شریف پڑھا، تجوید کی مشق کی، بالغ ہونے کے بعد دہلی گئے، حضرت شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین سے تعلیم حاصل کی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز سے بیعت ہو گئے تھے اور شاہ صاحب کی قربت کے شوق میں دہلی رہتے تھے، سنہ ۱۲۴۰ھ میں چالیس سال کی عمر میں دہلی میں وفات ہوئی۔

قاری عبدالرحمان اپنے نانا پیر محمد ماہ پانی پتی کے گھر میں سنہ ۱۲۲۷ھ (۱۸۱۲ء) میں پیدا ہوئے، تاریخ ولادت محفوظ نہیں۔ پانچ سال کی عمر میں قرآن شریف کی تعلیم سے علمی سفر کی ابتداء ہوئی، والد صاحب نے قرآن شریف، فارسی کی درسی کتابیں، نحو و صرف کے رسالے پڑھائے، ھدایۃ النحو، تک تعلیم کے بعد قراءتِ سبعہ کی مختلف روایتوں کی تعلیم حاصل کی۔

والد صاحب اس وقت دہلی میں تھے، اس لئے قاری صاحب بھی وہیں رہتے تھے، والد صاحب کے ساتھ حضرت شاہ عبدالعزیز کے مواعظ میں جایا کرتے تھے، اگرچہ کم سنی کی وجہ سے شاہ صاحب سے علمی استفادہ نہیں ہوا، مگر اس وقت کے بعض مشاہدات یاد

(۱) تذکرہ رحمانیہ قاری عبدالحلیم انصاری ص: ۱۲ (ادارہ نشریات اسلام لاہور ۱۴۰۰ھ)

تھے، قاری صاحب کی تیرہ سال کی عمر تھی کہ والد صاحب رحلت فرما گئے۔

والد صاحب کی وفات کی وجہ سے سخت صدمہ ہوا اور تعلیم سے طبیعت اچاٹ ہوگئی، دو سال اسی حال میں گذرے۔ سنہ ۱۲۴۲ھ میں والدہ صاحبہ کے سمجھانے اور بعض مفاجات کی وجہ سے دوبارہ تعلیم کی طرف توجہ ہوئی، تعلیم کے لئے دوبارہ دہلی کا سفر ہوا، دہلی میں مولانا رشید الدین خاں دہلوی اور مولانا مملوک العلی نانوتوی اور مولانا سید محمد دہلوی کے حلقۂ درس میں حاضر رہے، مولانا رشید الدین خاں سے نحو کی، حضرت مولانا مملوک العلی سے ادب، فقہ، معقولات و اصول وغیرہ کی کتابیں پڑھیں، جن میں مختصر المعانی پر خاص طور سے محنت کی تھی، قاری عبدالرحمان صاحب فرماتے تھے کہ:

''مجھے خارج از مدرسہ مختصر المعانی پڑھا دیجئے'' مولانا نے فرمایا ایک کچی گھڑی وقت دے سکتا ہوں (موجودہ گھڑیوں کے حساب سے یہ پون گھنٹہ ہوتا ہے)۔

میں نے مختصر المعانی سے زیادہ کسی کتاب پر محنت نہیں کی اور میں اپنی موجودہ قابلیت اسی کتاب کی بدولت پاتا ہوں'' (۱)

تذکرۂ رحمانیہ کی اطلاع میں تضاد ہے۔ ایک واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قاری عبدالرحمان صاحب نے حضرت مولانا مملوک العلی سے مدرسہ دہلی (یا دہلی کالج) میں نہیں پڑھا، مدرسہ سے فارغ وقت میں حضرت مولانا نانوتوی سے پڑھا، مگر دہلی کالج کے ایک امتحان میں شریک ہوئے اور عمدہ طریقہ پر کامیاب بھی ہوئے، مگر تذکرۂ رحمانیہ میں ہی مولانا قاری عبدالرحمان کے استادوں میں مولانا مملوک العلی کے علاوہ دہلی کالج کے دونوں بڑے استادوں مولانا رشید الدین خاں اور مولانا سید محمد دہلوی کے نام بھی درج ہیں جو اس بات کی غمازی کر رہے ہیں کہ مولانا قاری عبدالرحمان دہلی کالج کے باقاعدہ طالب علم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کالج کے تینوں بڑے استادوں سے تعلیم حاصل کی، مولانا سید محمد دہلوی ابتدا میں مدرس سوم تھے مولانا رشید الدین خان کی وفات (محرم ۱۲۴۳ھ) کے بعد مدرس دوم بنا دیئے گئے تھے۔ اس وقت مولانا مملوک العلی مدرس اول

(۱) تذکرہ رحمانیہ مولانا عبدالحلیم انصاری، ص: ۳۶، ۳۷ (لاہور: ۱۴۰۰ھ)

تھے۔قاری عبدالرحمان کے استادوں میں تینوں علماء کے نام شامل ہونے سے یہی تاثر ہوتا ہے کہ قاری صاحب نے دہلی کالج میں پڑھا ہے۔

حضرت مولانا مملوک العلی کے یہاں سبق میں مولانا محمد مظہر نانوتوی قاری صاحب کے ہم سبق تھے، قاری صاحب اور مولانا مظہر نے چند کتابوں کا بغیر پڑھے اعلیٰ درجہ کا امتحان دیا تھا، جس کا مولانا مملوک العلی کے حالات میں تذکرہ آچکا۔ ہے۔

قاری عبدالرحمان صاحب حضرت مولانا مملوک العلی سے استفادہ کے بعد جلال آباد ضلع مظفر نگر پہنچ کر ایک بڑے عالم اور مدرس مولانا سید محمد قلندر جلال آبادی کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور:

''علوم عقلیہ ونقلیہ کی جو کتابیں پہلے مولانا مملوک العلی صاحب سے ناتمام پڑھی تھیں اب پوری توجہ اور نہایت انہماک سے ان کو از سر نو پڑھا۔''(۱)

مولانا عبدالحلیم انصاری پانی پتی کی اطلاع کے مطابق مولانا قاری عبدالرحمان صاحب نے مولانا محمد قلندر سے علوم عقلیہ ونقلیہ کی تکمیل کے علاوہ ثلث صحیح بخاری اور دینیات کی بعض اور کتابیں پڑھیں، اگرچہ اور کتابوں کے نام درج نہیں لیکن صاف معلوم ہو رہا ہے کہ یہ متوسط یا معمولی کتابیں نہیں تھیں بلکہ حدیث وفقہ کی اعلیٰ درجہ کی کتابیں تھیں، جن کی تکمیل حضرت مولانا قلندر کے حلقۂ درس میں کی۔

مولانا قلندر کے درس میں معقولات ومنقولات کی تعلیم واسباق مکمل ہو گئے تھے، اور حدیث شریف کی کچھ کتابیں بھی پڑھ لی تھیں مگر حضرت شاہ ولی اللہ کے سلسلہ بلکہ گھرانے سے قریبی انتساب اور حدیث شریف کی اجازت وسند کیلئے سنہ ۱۲۵۳ھ (۳۸-۱۸۳۷ء) میں حضرت شاہ محمد اسحاق کی مجلس درس میں حاضر ہوئے، شاہ صاحب سے حدیث پڑھی، اجازت وسند حاصل کی اور سنہ ۱۲۵۶ھ (۴۱-۱۸۴۰ء) میں تعلیم ودرسیات کا سفر اختتام کو پہنچا۔

شاہ صاحب کے اسباق میں مولانا سید عالم علی مراد آبادی اور مولانا علیم الدین کاندھلوی، قاری عبدالرحمان کے ساتھ تھے، حضرت قاری صاحب کو یہ بڑی سعادت اور

(۱) تذکرہ رحمانیہ، مولانا عبدالحلیم انصاری، ص:۳۶ (لاہور: ۱۴۰۰ھ)

اعزاز حاصل ہے کہ جب ۱۶ رشوال سنہ ۱۲۵۸ھ (۲۰ رنومبر ۱۸۴۲ء) کو شاہ صاحب نے قاری صاحب کو سند حدیث عطا کی تو فرمایا کہ:

''میں قاری صاحب کو الفاظ حدیث کی تحصیل کی سند دے رہا ہوں، معانیٔ احادیث میں نے خود ان سے اخذ کئے ہیں''(۱)

قاری صاحب نے دوبارہ حدیث پڑھی، یہ درس مکہ معظمہ میں شاہ صاحب کے سفر ہجرت کے بعد ہوا، جس میں حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری مولانا قاری عبدالرحمان کے ہم درس تھے۔

مرزا حسن علی محدث سے استفادہ

مولانا قاری عبدالرحمان کی تعلیم کے زمانہ میں شاہ محمد اسحاق بواسیر کی سخت تکلیف میں مبتلا ہو گئے تھے چھ مہینہ تک عالم یاس رہا، اس وقت حضرت شاہ صاحب نے قاری عبدالرحمان سے فرمایا کہ ''مرزا حسن علی سے پڑھ لیا کرو!'' قاری صاحب نے صحیح مسلم ابوداؤد، ترمذی مولانا مرزا حسن علی سے پڑھیں۔(۲)

ملازمت

تعلیم کے بعد مولانا پانی پت میں تھے کہ حضرت شاہ محمد اسحاق نے مولانا کو باندہ جانے کی ہدایت فرمادی، باندہ کے نواب ذوالفقار علی خاں حضرت شاہ عبدالعزیز سے بیعت تھے، انہوں نے حضرت شاہ محمد اسحاق سے درخواست کی تھی کہ اپنا کوئی خلیفہ باندہ میں رہنے کے لئے مقرر فرمادیں۔ شاہ صاحب نے مولانا کو باندہ کے لئے منتخب فرمایا تھا، مولانا باندہ پہنچے اور سادگی سے اپنا کام شروع کر دیا۔ نواب صاحب کو جب مولانا کے کمالات کا اندازہ ہوا اور قاری صاحب کے جوہر کھلے تو انکا اعزاز واکرام کیا

(۱) تذکرہ رحمانیہ، مولانا عبدالحلیم انصاری، ص: ۴۹ (لاہور: ۱۴۰۰ھ)

(۲) اگرچہ مرزا حسن علی حضرت شاہ عبدالعزیز کے معروف شاگرد ہیں، بالاشبہ مرزا صاحب نے شاہ صاحب سے بھی پڑھا ہے لیکن نواب حبیب الرحمٰن شروانی (صدر یار جنگ) نے خود مولانا قاری عبدالرحمان سے نقل کیا ہے کہ:

''مولوی حسن علی صاحب مولوی الٰہی بخش کے شاگرد تھے، مولوی بخش شاہ عبدالعزیز کے۔''

مضمون: قاری عبدالرحمٰن صاحب محدث پانی پتی مشمولہ مقالات شروانی ص: ۲۸۰ (علی گڑھ ۱۳۶۵ھ)

اور انکے لئے ایک علیحدہ مدرسہ کا انتظام کردیا، جہاں قاری صاحب کا درس ہوتا اور طلبہ کا ہجوم رہتا تھا۔

حضرت قاری عبد الرحمٰن سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک سے بالکل یکسو رہے وہ اس کو مسلمانوں کے لئے نقصان دہ سمجھتے تھے، باندہ میں اس کا زور ہوا تو باندہ سے نکل گئے تھے، اس زمانہ میں لمبے عرصہ تک مختلف علاقوں اور پہاڑوں میں وقت گذارا، حالات پرسکون ہوگئے تو باندہ واپس آکر معمول کے مطابق درس وافادہ میں مشغول ہوگئے۔ حضرت مولانا سنہ ۱۲۸۰ھ (۶۴-۱۸۶۳ء) تک باندہ میں قیام فرمارہے اسکے بعد پانی پت آگئے تھے، اس وقت سے زندگی کے آخری دنوں تک پانی پت میں قیام کیا، درس وتدریس، وعظ، اصلاح وتربیت اور قرآن شریف کی خدمت میں مشغول رہے۔

حضرت قاری صاحب اتباعِ سنت، سادگی، اخلاق نبوی اور بزرگان سلف کا بہترین نمونہ اور ایسی یادگار تھے جو اُس زمانہ میں بھی کم یاب تھی، قاری صاحب نے پوری زندگی اسی روش پر گذاری، قرآن پاک کی تعلیم، حدیث کا درس، اخلاص وتقویٰ کی ہدایت، وعظ ونصیحت اور سراپا کردار وعمل کی زندگی قاری صاحب کا امتیاز تھی۔

قاری صاحب نے تصنیف وتالیف پر کم توجہ کی، چار پانچ مختصر تالیفات تحفۂ نذریہ، فیوض رحمانی، کشف الحجاب، جوابات اسولہ غیر مقلدین، محو الفساد فی تلفظ الضاد، علمی یادگار ہیں۔ قاری عبد الحلیم انصاری (مرتب تذکرۂ رحمانیہ) نے قاری صاحب کے فتاویٰ کا مجموعہ مرتب کرنے کا ارادہ کیا تھا، جو شاید پورا نہیں ہوا۔

قاری صاحب کا ہندوستان کے ممتاز اساتذۂ حدیث میں شمار کیا جاتا تھا اور بڑے بڑے علماء قاری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر سماعت واجازت حدیث کو بڑا اعزاز اور فخر سمجھتے تھے۔ نامور علمائے ہند میں سے مولانا محمد یعقوب نانوتوی، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، حکیم الامت مولانا تھانوی،، مولانا راغب اللہ پانی پتی، نواب حبیب الرحمٰن شروانی (صدر یار جنگ) مولانا پیر جماعت علی شاہ، مولانا الطاف حسین حالی، قاری عبدالرحمان نابینا پانی پتی، مولانا گل حسن سرحدی (مؤلف تذکرہ غوثیہ) کو بھی حضرت

مولانا سے اجازت وسند حدیث یا تلمذ حاصل ہے۔

وفات قاری صاحب کی چند روزہ بیماری کے بعد ۵/ربیع الثانی (۱) سنہ ۱۳۱۴ھ (۱۲/ستمبر ۱۸۹۶ء) کو چھیاسی سال کی عمر میں وفات ہوئی، پانی پت میں دفن کئے گئے۔ افسوس ہے کہ اب اُس جلیل القدر عالم ومحدث کی قبر ایک شمشان گھاٹ کے بیچ میں آگئی ہے، جس کا پتہ نشان بتانے والے افراد بھی پانی پت میں نہیں رہے۔

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

[۷] مولانا سید عالم علی مرادآبادیؒ (۶)

مولانا عالم علی، بن کفایت علی، بن فتح علی۔ نگینہ ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔ مرادآباد آگئے تھے، یہیں رہے یہیں وفات ہوئی۔ مولانا عالم علی کا سن ولادت معلوم نہیں، نگینہ اور رامپور کے علماء سے ابتداء سے متوسطات تک پڑھا، غالبًا اعلیٰ تعلیم اور درسیات مکمل کرنے کیلئے دہلی آئے۔ دہلی میں حضرت مولانا مملوک العلی سے تعلیم حاصل کی، حضرت شاہ محمد اسحاق سے حدیث پڑھی، حکیم شریف خاں کے شاگرد حکیم نصر اللہ خاں اور حکیم غلام حیدر خاں سے غالبًا طب پڑھی۔

تعلیم کے بعد اکثر وقت مرادآباد میں گذرا، کچھ دنوں تک ریاست رام پور سے بھی وابستہ رہے، رام پور سے تیس روپے مہینہ وظیفہ ملا کرتا تھا۔ احمد علی شوق نے لکھا ہے کہ نہایت متواضع اور زاہد تھے، پابندیٔ وقت کا سخت لحاظ تھا (۲) چند کتابیں مولانا نے یادگار چھوڑیں، رسالہ فضائل رسول مقبول ﷺ، رسالہ فضائل صیام، رسالہ قراءت ضاد معجمہ، رسالہ تعددِ جمعہ، اور شرح ضابطہ شرح تہذیب یزدی۔

(۱) تذکرہ رحمانیہ میں ص:۲۶۱ پر تاریخ وفات ۵ ربیع الاول لکھی ہے۔ جو غالبًا سہو کتابت ہے۔ صحیح تاریخ ۵/ربیع الثانی ہوگی۔ جس کی ۱۳/ستمبر سے مطابقت صحیح ہے۔ اسی مہینے میں دوشنبہ کو ۵/تاریخ تھی، ربیع الاول میں نہیں۔

(۱) نزہۃ الخواطر ص:۲۳۵ جلد ۷ اور کاملانِ رامپور ص:۸۸-۸۹ (پٹنہ ۱۹۸۶ء)

تریسٹھ سال کی عمر میں ۲۰؍ رمضان المبارک سنہ ۱۲۹۵ھ (۱۸؍ستمبر ۱۸۷۸ء) کو پنجشنبہ کی شام کو وفات ہوئی، مراد آباد میں دفن کئے گئے۔

[۸] حضرت مولانا محمد مظہر نانوتویؒ (۷)

مولانا محمد مظہر خلف جناب حافظ لطف علی، بن محمد حسن صدیقی نانوتوی۔ حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی کے ہم خاندان ہم جد بلکہ گویا گھرانہ کے ایک فرد تھے۔ سنہ ۱۲۳۷ھ (۲۲-۱۸۲۱ء) میں پیدا ہوئے، محمد مظہر تاریخی نام ہے، جس سے سنہ ولادت معلوم ہو جاتا ہے۔ ابتدائی حالات کا علم نہیں، مگر بظاہر نوعمری سے حضرت مولانا مملوک العلی کے ظل عاطفت میں آ گئے تھے، مولانا کے ساتھ مزید تعلیم و تربیت کے لئے دہلی گئے، دہلی کالج کے طالب علم رہے اور حضرت مولانا سے طویل استفادہ کیا، متعدد درسی کتابیں مولانا سے پڑھیں، مختصر المعانی وغیرہ متوسط درسیات کے سبق میں مولانا قاری عبدالرحمان پانی پتی مولانا کے رفیق تھے۔ دہلی کالج میں کب داخل ہوئے اس کا صحیح علم نہیں۔ خیال کیا جا سکتا ہے کہ مولانا کا ۵۳-۱۲۵۲ھ (۱۸۳۷ء) میں مدرسہ دہلی میں داخلہ ہوا ہوگا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کالج میں اور حضرت مولانا سے علیحدہ تعلیم دونوں بیک وقت جاری تھے۔

دہلی کے بڑے علماء میں سے مولانا مفتی صدر الدین آزردہ سے بھی تعلیم حاصل کی اور حضرت شاہ محمد اسحاق کی خدمت میں بخاری شریف پڑھی، نیز صحیح بخاری اور حدیث شریف کی اعلیٰ ترین کتابیں (صحاحِ ستہ) حضرت شاہ عبد الغنی مجددی سے بھی پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

شاہ عبد الغنی نے حضرت مولانا محمد قاسم کو جو سند عطا فرمائی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد مظہر بعض کتابوں خصوصاً (مؤطا امام مالک) کی قراءت و سماعت میں مولانا

محمد قاسم کے ساتھ تھے، تحریر فرمایا ہے:

"وموطا مالک بن انس سمع بعضه بقراءة ابن اخی المولوی مظهر."(۱)

دورِ ملازمت تعلیم سے فراغت کے بعد عمدہ لیاقت و قابلیت کی وجہ سے تقریباً سنہ ۱۲۶۰ھ (۴۵-۱۸۴۴ء) میں بنارس کالج کے مدرس اول مقرر کئے گئے، بیاسی روپے تنخواہ تھی۔ مولانا نے اس ملازمت اور تنخواہ کا اپنی ایک درخواست میں ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں:

"ایں احقر را مدت چہار سال است کہ مدرس اول عربی مدرسہ بنارس بمشاہرہ ہشتاد و دو روپیہ، بحسب منظوری صدر و خوبی لیاقت خویش مقرر شدہ بود"(۲)

بنارس کے کالج میں دو سال تک خدمت تدریس کے بعد حج کے لئے جانے کا خیال ہوا، اس کیلئے ایک سال کی رخصت کی درخواست گذاری جو منظور ہوگئی۔ اس وقت سرکاری مدرس کا قاعدہ یہ تھا کہ لمبی رخصت پر جانے والے استاد اپنی ملازمت پر اپنے کسی معتمد یا عزیز کو قائم مقام مقرر کرا سکتے تھے، جب تک اصل مدرس واپس آتا قائم مقام اس کی جگہ کام کرتا۔ مولانا محمد مظہر نے بھی اس سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی ملازمت پر اپنے چھوٹے بھائی مولانا محمد احسن کو طے کر دیا تھا، مولانا احسن اس عہدہ پر کام کرتے رہے، ادھر اس سفر میں مولانا محمد مظہر کا اندازہ سے زیادہ وقت گذرا، دو سال صرف ہوگئے۔ رخصت ایک سال کی تھی، اسلئے جب مولانا دو سال بعد غالباً سنہ ۱۲۶۵ھ (۱۸۴۹ء) میں بنارس واپس آئے تو مولانا کا خیال تھا کہ ان کو جلد ہی کلکتہ میں ملازمت مل جائے گی، اس لئے مولانا نے اپنی بنارس کی جگہ پر مولانا محمد احسن کو رہنے دیا اور خود اس سے مستعفی ہوکر دہلی آ گئے۔

مولانا محمد مظہر کو ہندوستان پہنچتے ہی یہ اطلاع ملی تھی کہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے امین مولانا احمد کبیر کی وفات ہوگئی ہے، ان کی جگہ نیا تقرر ہوگا، مولانا نے چاہا کہ میں بھی اس

(۱) اس اصل سند کا عکس سوانح قاسمی، مرتبہ مولانا گیلانی، جلد اول مابین ص: ۲۶۰-۲۶۱ میں شامل ہے۔

(۲) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص:

کے لئے کوشش کروں، مولانا نے اس عہدہ کیلئے درخواست دی مگر یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ غالباً اسی درمیان مولانا بنارس کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہوکر دہلی آ گئے تھے، دہلی میں حضرت مولانا مملوک العلی نے بھی مولانا کے لئے کوشش کی۔

کچھ وقت گزرا تھا کہ مولانا محمد مظہر کو مولانا مفتی صدرالدین آزردہ کی عدالت میں سرشتہ دار کی ملازمت مل گئی تھی، تیس روپے ماہانہ تنخواہ طے ہوئی یہ ملازمت مولانا کو پسند نہیں آئی، اس لئے چند دنوں کے بعد اس سے سبکدوش ہوکر اپنے وطن کے قریب رڑکی میں ایک سرکاری ملازمت قبول کرلی مگر اس ملازمت پر بھی کم رہنا ہوا، مولانا کے دہلی میں قیام کے آخری دنوں میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں مدرسی کیلئے چند نوجوانوں کا ملازمت کے لئے امتحان ہوا تھا جن میں مولانا محمد مظہر بھی شامل تھے، مولانا اس میں کامیاب ہو گئے تھے، لیکن مولانا کو جلد ہی اجمیر کالج میں مدرس اول کی جگہ مل گئی، اس لئے رُڑکی کی ملازمت ترک کر کے اجمیر چلے گئے۔ صراحت نہیں ملی مگر خیال کیا جا سکتا ہے کہ سنہ ۱۸۵۷ء (۱۲۷۳ھ) کے انقلاب تک اجمیر میں تھے۔ سنہ ۱۸۵۷ء میں یہ ملازمت چھوڑ کر وطن آ گئے تھے۔

سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک میں حصہ لینے کی وجہ سے سرکار کے معتوب ہوئے، کئی سال روپوشی میں گذارے، جب حالات معمول پر آ گئے تو وطن سے نکلے اور لکھنؤ پہنچ کر منشی نول کشور کے پریس میں مصحح کی حیثیت سے ملازم ہو گئے، سوروپیہ ماہانہ تنخواہ تھی (۱) چند اہل قلم اور تذکرہ نگاروں نے مولانا کی مطبع منشی نول کشور کی ملازمت کا انکار کیا ہے مگر یہ رائے درست نہیں۔ مولانا نے منشی نول کشور پریس میں بڑی کتابوں کو سخت محنت سے قلمی نسخوں سے مقابلہ کر کے اور تصحیح و حاشیہ کے ساتھ شائع کیا، جن میں امام غزالی کی احیاء العلوم اور علامہ طاہر پٹنی کی مجمع البحار ممتاز ہیں، اس خدمت میں مولانا محمد یعقوب نانوتوی مولانا محمد مظہر کے رفیق و شریک تھے۔ (۲)

---

(۱) مولانا محمد احسن نانوتوی، ڈاکٹر محمد ایوب قادری ص: ۱۵۵ (کراچی: ۱۹۶۶)

(۲) تفصیلات کے لئے راقم سطور کی مختصر تالیف تذکرہ مولانا محمد مظہر نانوتوی کا انتظار فرمائیے۔

مولانا کا ایک اور بڑا علمی کارنامہ اور یادگار تالیف، حاشیہ مؤطا امام مالک

مولانا محمد مظہر غالباً شروع سے تصنیفی ذوق رکھتے تھے، جس کا پہلا اہم مظہر مؤطا امام مالک کا حاشیہ ہے، یہ حاشیہ مولانا نے اپنے اجمیر کے قیام وملازمت کے زمانہ میں تالیف کیا تھا، اسی زمانہ میں شائع ہوا۔ اس حاشیہ کی تالیف واشاعت کا حضرت مولانا مملوک العلی کے ایک شاگرد اور مولانا محمد مظہر سے قریب واقف شخص علی اکبر سونی پتی نے اپنے مکتوبات میں ذکر کیا ہے، علی اکبر اسپرنگر کے نام اپنے خط میں لکھتا ہے کہ:

''مولوی مملوک العلی صاحب نے ایک نسخہ مؤطا کا ہدیہ وتحفہ حضور کے واسطے رکھا ہے جس طرح حکم ہو بھیجا جاوے۔''(۱)

علی اکبر کا یہ خط ۳؍فروری سنہ ۱۸۵۱ء (یکم ربیع الثانی ۱۲۶۸ھ) کا لکھا ہوا ہے، اس کے ڈیڑھ مہینہ بعد خود مولانا مملوک العلی نے اسپرنگر کے نام ایک گرامی نامہ میں علی اکبر کی اطلاع کا اپنے طور پر کسی قدر تفصیل سے ذکر کیا ہے، تحریر ہے:

''بموجب حکم کے تین نسخے 'مؤطا شریف' کے بنام قائم مقام ڈاکٹر مواٹ صاحب کے بدست خط پرنسپل بہادر کے، جو بلحاظ تحریر حضور کے انہوں نے کر دیئے کل کی تاریخ میں روانہ کیئے، یہ عرضی اس نظر سے کہ حضور ان سے ارشاد کر کے دو نسخہ واسطہ مدرسہ کے خرید کریں اور ایک نسخہ بطور ہدیہ کے اپنی خدمت میں رکھیں، پہلے سے لکھ بھیجی۔''(۲)

حضرت مولانا کا یہ خط ۱۱؍جمادی الاول سنہ ۱۲۶۷ھ (۱۵ مارچ ۱۸۵۱ء) کا لکھا ہوا ہے جس سے علی اکبر کی مذکورہ اطلاع کی تصدیق ہو رہی ہے اور علی اکبر کے خط سے ضمناً یہ رہنمائی بھی مل رہی ہے کہ مولانا محمد مظہر کی مرتبہ مؤطا امام مالک فروری سنہ ۱۸۵۱ء (ربیع الثانی ۱۲۶۷ھ) سے پہلے شائع ہو گئی تھی۔ جب یہ نسخہ اسپرنگر کو ملا تو اس نے اپنے معمول کے مطابق ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے علمی مجلہ (جرنل) میں شائع اپنے مضمون میں تازہ کتابوں اور مطبوعات کے ساتھ مؤطا امام مالک مرتبہ مولانا محمد مظہر کا بھی ذکر کیا تھا اور

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب محمد اکرام چغتائی ص:۳۲۸

(۲) ایک نادر مجموعہ مکاتیب محمد اکرام چغتائی ص:۷۹

لکھا تھا ہے کہ:

”مؤطا کو مولوی مظہر نے شائع کرایا، مولوی صاحب ان دنوں اجمیر میں تھے۔“(۱)

یہ نسخہ حضرت مولانا احمد علی کے مطبع احمدی دہلی میں سنہ ۱۲۶۶ھ (۵۰-۱۸۴۹ء) میں شائع ہوا تھا، اس اشاعت کا ایک نسخہ ہمارے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے، اس نسخہ کے سرورق پر درج عبارت سے سنہ طباعت معلوم ہوتا ہے، جو یہ ہے:

” قد شرع طبعه باهتمام احقر الانام ظفر علی فی المطبع الاحمدی الواقع فی الدهلی. “ ۱۲۶۶ھ

علی اکبر سونی پتی کے خط کے درج بالا اقتباس سے معلوم ہوگیا کہ فروری سنہ ۱۸۵۱ء (۱۲۶۶ھ) سے پہلے یعنی سنہ ۱۲۶۶ھ (۱۸۵۰ء) کے آخر میں اس نسخہ کی طباعت کا کام مکمل ہوگیا تھا۔ مؤطا امام مالک کا یہ حاشیہ آج تک بلا کسی وقفہ کے مسلسل چھپ رہا ہے برصغیر ہند و پاکستان کے جملہ دینی مدرسوں اور حدیث کی درسگاہوں میں یہی حاشیہ طلبہ، اساتذہ اور محدثین کے ہاتھوں میں رہتا ہے، عجیب بات یہ ہے کہ اس وقت سے زمانۂ حال تک کی اکثر طباعتوں کا سرورق بھی پہلی طباعت کے مطابق ہے، اس کے پہلے صفحہ پر فارسی میں حضرت امام مالکؒ کے حالات بستان المحدثین وغیرہ سے اخذ کر کے شائع کئے تھے، جو آج تک اسی طرح چھپ رہے ہیں، یہ حضرت مولانا محمد مظہر کے اخلاص کی برکت ہے کہ اس کو عظمت و دوام کی ایسی خلعت نصیب ہوئی اور یہ بھی مولانا محمد مظہر کا اختصاص اور فرطِ اخلاص ہے کہ مولانا نے پوری کتاب میں کہیں بھی اپنا نام نہیں لکھا۔

مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کا قیام اور اس کی سرپرستی

مولانا، منشی نول کشور کے پریس کے لئے کام کررہے تھے کہ سہارنپور میں مولانا سعادت علی سہارنپوری کی تحریک اور سرپرستی میں رجب سنہ ۱۲۸۳ھ (نومبر دسمبر ۱۸۶۶ء) میں ایک دینی مدرسہ کی ابتداء ہوئی، مگر یہ صحیح معلوم نہیں کہ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب اس مدرسہ کی تشکیل میں پہلے سے

---

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب، بحوالہ لٹریری انٹیلی جنس (Litrerary Intelligence) جلد ۲۰، شمارہ ۳، ص: ۲۸۲ (۱۸۵۱ء)

شریک تھے یا بعد میں تشریف لائے، بظاہر شروع سے موجود نہیں تھے، اس کا قرینہ یہ ہے کہ مظاہر علوم کی سال اول، دوم کی روداد میں مولانا کا نام کہیں درج نہیں، مدرسہ کی مطبوعہ روداد میں مولانا کا پہلا تذکرہ مدرس اول کی حیثیت سے سنہ ۱۲۸۵ھ کی روداد میں آیا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ:

''(اس سال) تمام بارِ تعلیم صرف ذمہ مولوی محمد مظہر مدرس اعلیٰ رہا'' (۱)

بہر حال مولانا غالباً سنہ ۱۲۸۵ھ میں مطبع منشی نول کشور کی ملازمت سے فارغ ہو کر سہارنپور آگئے تھے، یہاں پہنچ کر پوری توجہ اور انہماک سے اس مدرسہ کی خدمت و ترقی کے کام میں جٹ گئے۔ اس وقت سے زندگی کے آخری لمحات تک مولانا کی زندگی کا ایک ہی کام ایک ہی مصروفیت تھی، مدرسہ مظاہر علوم کی سرپرستی، تعلیم و تدریس، مدرسہ کے تمام معاملات کی نگرانی، طلبہ اور اہل مدرسہ کی ہر وقت فکر، درس حدیث کا اہتمام مولانا کا شبانہ روز کا مشغلہ اور مقصد حیات بن گیا تھا، اور جیسا کہ اس دور کے علماء کا معمول تھا مدرسہ کی خدمت سے فارغ وقت بھی گھر پر اور مسجد میں درس و افادہ اور طلبہ کی تعلیم و تربیت میں مشغول رہتے تھے۔

حضرت مولانا محمد قاسم کا مولانا محمد مظہر سے تلمذ

مولانا محمد مظہر نے چار سال بنارس کالج میں پڑھایا، چھ سال تک اجمیر کالج میں عربی کے استاد رہے اور تقریباً سترہ سال مدرسہ مظاہر علوم میں علوم عالیہ اسلامیہ خصوصاً حدیث، فقہ و تفسیر وغیرہ پڑھاتے رہے، اس تقریباً ایک تہائی صدی یا ستائیس سال میں مولانا سے کس قدر طلبہ نے فیض حاصل کیا ہوگا، اس کی تفصیل دشوار ہے، مگر اس میں شبہ نہیں کہ حضرت مولانا کے شاگردوں کی بہت بڑی اور نہایت اہم فہرست ہوگی، جس میں بیسیوں شاگرد ایسے ہوں گے، جنہوں نے بعد کے دور میں علمی، دینی اور ملی خدمات انجام دی ہوں گی مگر افسوس ان کی تفصیل دستیاب نہیں۔

(۱) روداد مدرسہ عربی سہارنپور سنہ ۱۲۸۵ھ ص ۲ مطبوعہ در ضمیمہ۔ نجم الاخبار میرٹھ۔ ص: ۲

مولانا کے جو چند شاگرد معلوم ہیں ان میں سب سے پہلا اور اہم ترین نام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا ہے، جب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب تعلیم کے لئے دہلی گئے تو حضرت مولانا مملوک العلی نے جو مولانا محمد مظہر اور مولانا محمد قاسم دونوں کے خاندانی سرپرست اور استاد تھے، مولانا محمد قاسم کی ابتدائی کتابوں کا سبق مولانا محمد مظہر کے سپرد فرمایا تھا۔

''شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے لکھا ہے:

وعن مفاخره ان الشيخ العلامة بحر العلوم النانوتوى اخذ عنه بعض الكتب الابتدائية''(۱)

اگرچہ بعد میں مولانا محمد مظہر حدیث شریف کی چند کتابوں کی قراءت وسماعت میں مولانا محمد قاسم کے ہم سبق رہے، تاہم ابتدائی کتابوں کی تعلیم کی اہمیت اپنی جگہ ہے، اسلئے وہ حضرت مولانا محمد قاسم کے استاد ہیں، مولانا محمد قاسم اس تلمذ کا ہمیشہ خیال اور احترام فرماتے رہے۔

سفر حج عموماً مولانا کے دو حجوں کا ذکر کیا جاتا ہے لیکن سب سے پہلے حج کا، جو پہلی ملازمت کے زمانہ میں کیا تھا اس کا ذکر نہیں کیا جاتا، مولانا نے (جیسا کہ ذکر ہوا) پہلا حج تقریباً سنہ ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۸ء) میں اس وقت کیا تھا جب وہ بنارس کالج میں عربی کے مدرس اول تھے، اس سفر سے دو سال میں واپسی ہوئی۔ دوسرا حج مولانا محمد یعقوب، حاجی عابد حسین وغیرہ علماء کے قافلہ کے ساتھ سنہ ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰-۶۱) میں کیا، تیسرا اور آخری سفر حج شوال سنہ ۱۲۹۴ھ (اکتوبر نومبر ۱۸۷۷ء) میں اس قافلہ کے ہمراہ کیا جس میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بھی شامل تھے۔

وفات مولانا کے گردہ میں پتھری کی شکایت تھی، جس سے سخت تکلیف ہوتی تھی، دو

(۱) مقدمہ اوجز المسالک الی موطا مالک ص:۴۳ جلد اوّل (یحیوی سہارنپور طبع اول ۱۳۴۸ھ)
یہ مولانا ثابت علی صاحب مدرس مدرسہ مظاہر العلوم کی اطلاع ہے وہ خود بھی مولانا مظہر کے شاگرد تھے۔
مکتوب شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا۔ مندرجہ انوار قاسمی ص:۱۶ (طبع اوّل لاہور ۱۳۸۹ھ)

مرتبہ سخت بیمار ہوئے مگر لمبی بیماری کے بعد صحت کچھ بہتر ہو جاتی تھی، ذی الحجہ سنہ ۱۳۰۲ھ میں بھی یہی عارضہ ہوا مگر اس مرتبہ شفا نہ ہوئی، اسی میں مبتلا رہ کر ہفتہ ۲/ ذی الحجہ سنہ ۱۳۰۲ھ (۳/ اکتوبر ۱۸۸۵ء) کو وفات ہوئی، اسی شام سہارنپور کے قبرستان حاجی شاہ کمال میں مدرسہ کے اپنے رفیق اور مدرسہ کے دست و بازو منشی فضل حق کے برابر میں دفن کئے گئے۔(۱)

[۹] مولانا محمد حسین رام پوری سہارنپوریؒ (۸)

مولانا مملوک العلی کے وطن نانوتہ کے قریب ایک قصبہ رام پور منہیاران کے رہنے والے تھے۔نسب وغیرہ اور والد کا نام راقم سطور کو نہیں ملا، غالبًا انصاری خاندان سے وابستہ تھے، کوٹلہ بشارت خاں، محلہ پیرزادگان رام پور میں رہتے تھے۔ان کے دو بھائی اور تھے مولوی محمود اور ناظر جی سلطان احمد جو حیدرآباد دکن میں رہتے تھے۔(۲)

ایک تالیف کشتیٔ نصیحت مولانا کی تحریری یادگار ہے۔

[۱۰] علامہ مولانا محمد سعید اندرابی کشمیریؒ (۹)

علامہ سعید اندرابی نے اپنے والد میر سید جمال الدین اندرابی (وفات سنہ ۱۲۷۱ھ)

(۱) تفصیلات کے لئے راقم سطور کی تالیف تذکرہ مولانا محمد مظہر نانوتوی کا انتظار فرمایئے۔

(۲) مولانا ۱۲۸۵ھ (۶۹-۱۸۶۸ء) میں حج کیلئے گئے تھے واپسی میں جہاز گرداب میں پھنس گیا کئی دن تک ہوا بھی مخالف چلتی رہی، مولانا نے دعاء کی اور اس مصیبت سے نجات ملی جس کی وجہ سے جہاز کے مسافر مولانا کے ممنون ہوئے اور ان سے محبت کا معاملہ کرنے لگے اسی وقت ایک رفیق سفر نے جو ریاست جے پور میں ملازم تھے، مولانا سے پندنامہ عطار کے منظوم ترجمے کے لئے گذارش کی، مولانا نے اسی وقت ترجمہ شروع کر دیا تھا، ترجمہ پورا نہیں ہوا تھا کہ جہاز ممبئی کے ساحل پر پہنچ گیا، بعد میں مولانا نے اس ترجمہ کو پورا کیا، یہ ترجمہ کشتی نصیحت کے نام سے اسی زمانہ میں (حضرت مولانا احمد علی کے) مطبع احمدی دہلی سے چھپا تھا اس کا ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں ہے۔

اور حضرت شیخ اکبر بادی تارہ بلی کشمیری (وفات سنہ ۱۲۴۳ھ) سے بعض علوم اور کتابیں پڑھیں، پھر دہلی گئے، دہلی میں کئی سال قیام کیا اور منطق و فلسفہ کی کتابیں مولانا مفتی صدر الدین آزردہ سے، ہیئت اور ہندسہ مولانا مملوک العلی نانوتوی سے اور حضرت شاہ محمد اسحاق سے حدیث پڑھی۔ مولانا محمد شریف سے سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں تکمیل سلوک کی۔
تعلیم کے بعد کشمیر آگئے تھے لمبے عرصہ تک مخلوقِ خدا کو فیضیاب فرماتے رہے۔ سنہ ۱۲۸۲ھ (۶۶-۱۸۶۵ء) میں واصل بحق ہو گئے کشمیر میں دفن ہیں۔ (۱)

[۱۱] مولانا عبدالحمید خان جلال آبادیؒ (۱۲)

مولانا عبدالحمید خاں جلال آباد، ضلع مظفرنگر کے پرانے اور صاحب اقتدار پٹھان گھرانے کے فرد تھے، اس خاندان میں اور بھی کئی اہل علم و فضل اصحاب ہوئے، مولانا عبدالحمید خاں کے حالات اور سنین تعلیم و وفات دریافت نہیں، لیکن مولانا کے قلم کی نقل کی ہوئی چند کتابیں، رسائل اور فتوے موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت شاہ محمد اسحاق اور حضرت مولانا مملوک العلی کے شاگرد تھے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ میرا سنہ ۱۲۵۹ھ میں تعلیم کے زمانہ میں حضرت مولانا مملوک العلی کے دولت خانہ پر قیام رہا۔ مولانا عبدالحمید کی لکھی ہوئی ایک کتاب کا ترقیمہ ملاحظہ ہو، جس میں اس کی صراحت ہے:

" قد وقع الفراغ من تسوید ھذہ الاوراق فی یوم الخمیس خمسة عشر من محرم الحرام عام تسعة وخمسین و مائتین بعد الالف من ھجرة النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ و سلم اولا و آخراً ،وظاھرا وباطنا، فی البلدة "شاہ جہان آباد" حین استقمت فی مکان مولوی مملوک العلی صاحب دام اقبالہ و افضالہ. کاتبہ و مالکہ عبد الحمید خان ساکن جلال آباد واقع ضلع سہارنپور" (۲)

(۱) تذکرہ اسلاف، مؤلفہ، بہاء الحق قاسمی، ص: ۹۸، ۹۹ (لاہور: ۱۹۶۲ء)

(۲) یہ کتاب مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی کا رسالہ طہر متخلل ہے جس کے ساتھ حضرت شاہ محمد اسحاق وغیرہ کے فتوے اور بعض تحریرات بھی شامل ہیں۔

اگر چہ اس تحریر میں مولانا مملوک العلی سے تلمذ کی صراحت نہیں، مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ایک باذوق طالب علم مولانا کے مکان پر رہے اور مولانا سے نہ پڑھے، اس لئے مولانا عبدالحمید خاں کو بھی مولانا مملوک العلی کے ان شاگردوں میں شمار کیا جا سکتا ہے جو شاہ محمد اسحاق کے بھی شاگرد تھے۔ مولانا نے اپنی نقل کی ہوئی ایک اور کتاب کے اختتامیہ میں خود کو حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق کا شاگرد لکھا ہے۔

قسم سوم

[۱۲] محدثِ عصر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (۱)

برصغیر ہند کی گذشتہ تقریباً سوا سو سال کی دینی علمی تحریک جن اکابر علماء کی ممنون کرم اور خصوصاً تعلیمات ولی اللہی کا گلستاں جن کی خدمات سے سرسبز وشاداب ہے نیز دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور اور ان سے متعلق مدرسے اور علماء جس شجر پر بہار کی شاخیں ہیں، اس میں ایک بہت ہی ممتاز اور برگزیدہ نام محدث عصر، فقیہ جلیل حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا ہے اور بلا تأمل کہا جا سکتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند اور مدارس اسلامیہ کی تاسیس کی جو روایت قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے قائم کی تھی اس کی سب سے زیادہ آبیاری اور سرپرستی حضرت مولانا گنگوہیؒ نے فرمائی، ان مدارس کے ذریعہ سے علم وکمال اور اتباعِ دین وشریعت کی جو فضائیں اور اس کی جو بادِ بہار چلی اس میں بھی حضرت والا کے رسوخ فی العلم اور دعوت واتباعِ سنت کے گہرے اثرات صاف دیکھے جا سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا کی ذاتِ گرامی اپنے آپ میں ایک بڑا مرکز علم، بڑا ادارہ اور دارالعلوم تھی، جس میں علم وتدریس کا سلسلہ بھی تھا اور تربیت باطن کی فکر بھی، قدم

قدم پر اتباعِ سنت کا ذکر اور رسومات و بدعات کی بیخ کنی کا اہتمام بھی تھا اور خانوادۂ ولی اللہی کے بعد حضرت سید احمد شہید اور حضرت شاہ محمد اسماعیل کی کوششوں سے جو ایک دنیائے علم وعمل آباد ہوئی تھی جب اس کی آبادیوں میں شکست و ریخت کے کچھ آثار ظاہر ہوئے تو حضرت مولانا گنگوہی کی توجہ، محنت اور کوششوں سے اس کی تجدید وتزئین ہوئی تھی اور یوں اس روایت کا تسلسل جاری رہا۔

وطن حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اس خانوادہ کے ایک فرد ہیں جس کا آبائی وطن رام پور ضلع سہارنپور تھا، اس خاندان کا ایک گھرانہ رام پور سے گنگوہ منتقل ہو گیا تھا، اسی میں حضرت گنگوہیؒ تولد ہوئے۔(۱)

خاندان چھٹی صدی ہجری میں پیر ہرات حضرت شیخ عبداللہ انصاری کے پوتے شیخ جلال الدین بن شیخ سلیم بن محمد اسماعیل بن شیخ الاسلام عبداللہ انصاری ہندوستان آئے اور میرٹھ کے نواح میں واقع ایک پر رونق اور آباد بستی سَرسَل (۲) میں آباد ہوئے، اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد واخلاف میں بہت برکت عطا فرمائی اور اس وقت یوپی میں قدیم انصاری خاندان اور حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی اولاد کی جس قدر بھی شاخیں ہیں وہ تقریباً سب ہی انہی کی اولاد میں ہیں۔ پانی پت اور نواح کے انصاری خاندان بھی اسی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنے نصابِ تعلیم کے لئے شہرۂ آفاق شخصیت، علامہ نظام الدین سہالوی اور فرنگی محل کے علماء بھی اس شجر کی پر بہار شاخیں ہیں۔(۳)

---

(۱) تذکرۃ الرشید، جلد اول ص: ۱۵ تالیف مولانا عاشق الٰہی میرٹھی (طبع اول میرٹھ)

(۲) سَرسَل بڑوت اور میرٹھ کے درمیان بنولی سے پہلے اور جوہڑی کے بعد واقع مگر راستے سے ہٹ کر ایک چھوٹا سا اور گمنام گاؤں ہے، کسی زمانے میں یہ گاؤں ایک بڑی اور نہایت پر رونق آبادی تھی۔ بعد میں یہ خانوادہ سرسل سے برناوہ آ گیا تھا جو اسی نواح کا ایک اور قصبہ ہے، یہاں اس کو بہت عروج ہوا، بڑے بڑے نامور مشائخ اہل اللہ اور علماء اس میں پیدا ہوئے جن میں شیخ بدرالدین برناوی حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کے خلیفہ ہیں اسی طرح اور بھی متعدد اصحاب ہیں۔

(۳) علمائے فرنگی محل کے احوال پر تمام معتبر کتابوں میں اس کا ذکر بلکہ خاصی تفصیل درج ہے مثلاً ملاحظہ ہوں:
الف: اغصانِ اربعہ۔ ب: احوال علمائے فرنگی محل، شیخ الطاف الرحمان بارہ بنکوی۔ ج: تذکرہ علمائے فرنگی محل، مفتی عنایت اللہ صاحب فرنگی محلی۔

اجداد اسی خاندان کے چند افراد موضع برناوہ سے رام پور منہیاران ضلع سہارنپور چلے گئے تھے بعد میں اسی گھرانہ کی ایک شاخ رام پور سے نواحی بستی گنگوہ منتقل ہوئی، اسی سے حضرت مولانا گنگوہی وابستہ ہیں، مولانا کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے:

حضرت مولانا رشید احمد بن مولانا ہدایت احمد بن قاضی پیر بخش بن قاضی غلام حسن بن قاضی غلام علی بن قاضی علی اکبر بن قاضی محمد اسلم انصاری‘‘(۱)

مولانا کے خاندان میں علم کی روایت اور اس کے اثرات قدیم تھے، حضرت مولانا کے والد مولانا ہدایت احمد کی تقریباً سنہ ۱۲۱۶ھ (۱۸۰۰ء) میں ولادت ہوئی، عالم اور صاحب کمال تھے، خانوادہ حضرت شاہ ولی اللہ کے علماء (غالباً حضرت شاہ محمد اسحاق؟) سے تعلیم حاصل کی اور اس عہد کے جلیل القدر شیخ، شاہ غلام علی (وفات سنہ ۱۲۴۰ھ) سے بیعت ہوئے اور خلافت واجازت سے نوازے گئے۔ علم اور کتابوں کے شائق تھے، کثرت سے کتابیں نقل کیا کرتے تھے مگر عمر بہت کم ملی، ساڑھے پینتیس سال کی عمر میں جمادی الاخریٰ ۱۲۵۲ھ (ستمبر اکتوبر ۱۸۳۵ء) میں وفات ہوگئی تھی۔

مولانا ہدایت احمد کے تین بیٹے اور دو لڑکیاں تھیں، مولوی عنایت احمد، حضرت مولانا رشید احمد اور سعید احمد، مؤخر الذکر کم سنی میں نو سال کی عمر میں فوت ہو گئے تھے، مولوی عنایت احمد حضرت مولانا سے بڑے تھے اور مولانا نے ان سے ابتدائی چند کتابیں بھی پڑھی تھیں۔

حضرت مولانا ۶ رذی قعدہ سنہ ۱۲۴۴ھ (مئی ۱۸۲۹ء) کو دوشنبہ کے دن گنگوہ میں پیدا ہوئے، سات سال کی عمر تھی کہ والد صاحب رحلت کر گئے، دادا اور ماموں نے پرورش اور ہر طرح کی سرپرستی فرمائی اور تعلیم وتربیت کا بہتر سے بہتر انتظام کیا۔

تعلیم استاد دینی گھرانوں اور شرفاء کے معمول کے مطابق سب سے پہلے قرآن شریف کی تعلیم پر توجہ کی گئی، ایک مقامی معلم حافظ قطب بخش گنگوہی سے تعلیم کا آغاز ہوا، چوں کہ والد صاحب کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا اسلئے والدہ کے ساتھ اپنے

(۱) تذکرۃ الرشید جلد اول ص:۱۱

چھوٹے ماموں مولوی محمد تقی صاحب گنگوہی سے کرنال میں رہ کر فارسی پڑھی، فارسی کی چند کتابیں مولوی محمد غوث گنگوہی سے پڑھیں (۱) فارسی کے بعد عربی کی ابتدائی کتابیں شروع ہوئیں، عربی کی تعلیم اپنے آبائی وطن رام پور کے ایک برگزیدہ شخص اور فاضل مولانا محمد حسن (عرف محمد بخش) رام پوری سے حاصل کی (۲) مولانا محمد حسن نے ہدایۃ النحو پڑھانے کے بعد ہدایت کی کہ اور کتابوں کے لئے دہلی جانا چاہئے۔ مولانا محمد بخش (حسن) صاحب بھی دہلی میں تعلیم پائے ہوئے تھے اس لئے مولانا کے ساتھ دہلی آنا ہوا اس وقت حضرت مولانا مملوک العلی دہلی کالج میں استاد اور مرجع العلماء تھے، اطرافِ سہارن پور کے علاوہ دہلی کے بھی ممتاز علماء اور نامور اصحابِ درس میں سے شمار ہوتے تھے، مگر مولانا گنگوہی کو غالباً حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی کی بے پناہ مصروفیت اور وقت کے فقدان کی وجہ سے انکے حلقۂ درس میں جلد داخلہ نہیں ملا، اس میں خاصا وقت غالباً کئی مہینے لگے، مولانا گنگوہی نے اس درمیان اور علماء سے پڑھا، حضرت مولانا کے حوالہ سے مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے نقل کیا ہے کہ:

''ابتداءً ہم دہلی میں دوسرے اساتذہ سے پڑھتے تھے لیکن تسکین نہیں ہوتی تھی، کہیں سبق تھوڑا ہوتا تھا کہیں شبہات کا جواب نہ ملتا تھا، مگر جب مولانا مملوک العلی صاحبؒ کی خدمت میں

---

(۱) مولانا شاہ محمد غوث گنگوہ کی ایک معروف شخصیت اور شیخ طریقت تھے، جو شاہ محمد رمضان ہادی ہریانہ شہید سنہ ۱۲۴۰ھ کے خلیفہ مجاز تھے۔ ہادی ہریانہ، تالیف پروفیسر منظور الحق صدیقی، ص:۱۴۸ (لاہور: ۱۹۶۳ء) مولانا محمد غوث کی چند تحریریں اور متوسلین کے لئے تعلیم وہدایات ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہیں۔

(۲) مولانا عاشق الٰہی نے یہ نام محمد بخش لکھا ہے (تذکرۃ الرشید، ص:۲۷ جلد ۱) صحیح نام محمد حسن ہے، جو مقامی طور پر محمد بخش کے نام سے بھی جانے جاتے تھے۔ مولانا محمد حسن حضرت مولانا مملوک العلی کے شاگرد، صاحب فضل وکمال اور صاحب ارشاد ومعرفت بزرگ تھے۔ مولانا محمد حسن نے مدینہ منورہ جا کر حدیث شریف پڑھی تھی۔
مولانا گنگوہی کو مولانا محمد حسن صاحب سے ابتدائی درسیات میں تلمذ کے علاوہ دلائل الخیرات اور حزب البحر کی اجازت بھی حاصل تھی۔ مولانا محمد حسن شاہ امام علی کے خلیفہ اور بڑے مرتبہ کے بزرگ تھے، مولانا کی ۱۷ ار ذی قعدہ سنہ ۱۲۵۹ھ (دسمبر ۱۸۴۳ء) میں وفات ہوئی۔ مزید معلومات کے لئے ملاحظہ ہو تذکرۃ العابدین، ص:۵۳ تا ۵۷ (دہلی: ۱۳۳۳ھ) اور انوار العاشقین مولانا مشتاق احمد صاحب انبہٹوی، ص:۱۳۴-۱۳۵ (لاہور: ۱۳۹۸ھ)

پہنچے تو ہمیں اطمینان ہو گیا اور بہت تھوڑے عرصہ میں کتابیں ختم کرلیں۔'' (۱)

دہلی کے استادوں کی فہرست میں سب سے پہلا نام اس وقت کے ایک مدرس مولانا احمد الدین پنجابی کا ہے، (۲) مولانا احمد الدین سے غالباً ہدایۃ النحو سے متوسطات تک پڑھنے کا موقع ملا۔ دہلی کے ایک جلیل القدر اور سلسلہ مجددیہ کے شیخ شاہ احمد سعید مجددی سے بھی تلمذ تھا، ایک اور استاد مولانا کریم بخش پنجابی تھے (۳) حضرت مولانا کے اساتذہ میں ایک اور اہم نام مولانا مفتی صدر الدین آزردہ کا ہے جو دہلی کی بزم علم کے گویا صدر نشیں اور مرجع کل تھے، تاہم مذکورہ بزرگوں کی تعلیم و تربیت کے علاوہ حضرت مولانا گنگوہی کی علمی ترقیات اور تعلیم و تربیت میں سب سے بڑا حصہ استاد العلماء حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی کا ہے، اگر چہ مولانا گنگوہی کو مولانا نانوتوی کی خدمت میں حاضری کا دیر سے موقع ملا مگر مولانا کے اسباق میں پہنچ کر اندازہ بلکہ یہ تجربہ ہوا کہ مولانا مملوک العلی کی درس گاہ بعض حیثیتوں سے علمائے دہلی کے حلقوں سے مختلف ہے، مولانا اس طرح پڑھاتے ہیں جیسے گھول کر پلا دیا ہو۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ فرماتے تھے:

''مگر جب مولانا مملوک العلی صاحبؒ کی خدمت میں پہنچے تو اطمینان ہو گیا اور بہت تھوڑے عرصہ میں کتابیں ختم کرلیں، گویا استاد نے گھول کر پلا دیا۔ فرمایا کرتے تھے کہ اس زمانہ میں اچھے اچھے استاد دہلی میں موجود تھے مگر ایسے استاد کہ مطلب پوری طرح ان کے قابو میں ہو اور انواعِ مختلفہ سے تقریر کر کے شاگرد کے ذہن نشین کر دیں، ہمارے استاد مولانا مملوک العلی صاحبؒ، دوسرے ہمارے استاد مفتی صدر الدین آزردہ تھے۔'' (۴)

حضرت مولانا مملوک العلی سے کیا کیا کتابیں پڑھیں اور دوسرے اساتذہ کی خدمت میں کن کتابوں کا درس لیا اس کی تفصیل دریافت نہیں، مگر اس میں شک نہیں کہ مولانا

---

(۱) تذکرۃ الرشید مولانا عاشق الٰہی میرٹھی، ص: ۳۰ جلد اول (عکس طبع اول، سہارنپور: ۱۹۷۷ء)

(۲) مولانا احمد الدین کو مولانا میرٹھی نے جہلمی لکھا ہے۔ لیکن ڈاکٹر سفیر اختر صاحب (اختر راہی) نے اُن کو کرسالی ضلع چکوال کا باشندہ بتایا ہے، اور بظاہر یہی صحیح ہے۔ تذکرہ علمائے پنجاب ص: ۸۰ جلد اول (لاہور ۱۹۹۸ء)

(۳) تذکرۃ الرشید ص: ۱۸۰ جلد دوم

(۴) تذکرۃ الرشید ص: ۳۰، ۳۱ جلد اول

گنگوہی کی تعلیم کے علاوہ مولانا کے فکر و مزاج کی تشکیل میں بھی حضرت مولانا مملوک العلی کا بہت بڑا اور اہم حصہ ہے۔

حضرت مولانا مملوک العلی کی خدمت میں درسیات اور معقولات وادب کی تکمیل کے بعد درسِ حدیث کیلئے دہلی کے نامور محدث، حضرت شاہ عبدالغنی مجددی کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوئے، صحاح ستہ کا درس لیا اور اجازتِ حدیث حاصل کی، دہلی میں حضرت مولانا گنگوہی کا تعلیمی سفر بہت تیزی سے طے ہوا، دہلی پہنچ کر نصاب کی عام ترتیب کے مطابق غالبًا کافیہ وغیرہ متوسطات سے پڑھنا شروع کیا تھا اور چار سال کی قلیل مدت میں دورہ حدیث شریف تک جملہ درسیات کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم پاکر فارغ ہوگئے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

کہا جاتا ہے کہ قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا گنگوہی (رحمہما اللہ تعالیٰ) دونوں ساتھی اور ہم سبق تھے، ساتھ ہی پڑھا، ساتھ ہی فارغ ہوئے، یہ روایت زبانوں پر بھی ہے اور کئی مضامین وتحریرات میں بھی نقل ہوگئی ہے مگر یہ صحیح نہیں، اس میں شک نہیں کہ حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت مولانا نانوتوی کا زمانہ تعلیم تقریبًا ایک ہے اور دونوں کو حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی سے شرفِ تلمذ بھی حاصل ہے، اسی وجہ سے یا غالبًا وطنی نسبت اور قربت کی وجہ سے دونوں میں دوستی اور موانست وملاقات کے گہرے مراسم تھے، اور یہ بھی ہے کہ دونوں چند کتابوں میں ہم سبق اور ساتھ رہے مگر اکثر کتابوں اور تعلیم کی ترتیب میں ایک دوسرے سے مختلف اور علیحدہ علیحدہ تھے۔

حضرت مولانا محمد قاسم سنہ ۱۲۶۱ھ میں مولانا مملوک العلی کے ساتھ نانوتہ سے دہلی آئے تھے اور اسی وقت سے حضرت مولانا کی نگرانی، تربیت اور سلسلۂ تلمذ میں داخل تھے، مولانا محمد قاسم نے اپنی تعلیم کا اکثر وقت حضرت مولانا مملوک العلی کی صحبت وشاگردی میں گذارا اور دہلی کالج میں بھی داخل رہے، حضرت مولانا گنگوہی کس وقت دہلی آئے اس کا تعین مشکل ہے، بہرحال جب بھی آئے دہلی کے مختلف استادوں اور علماء سے پڑھتے رہے، حضرت مولانا مملوک العلی کے شاگردوں کی صف میں دیر سے شامل ہوئے نیز

حضرت مولانا سے تعلیم کے زمانہ میں بھی اور علماء، مولانا احمد سعید مجددی اور مولانا مفتی صدرالدین آزردہ کے درس کے حلقوں میں حاضر ہوتے رہے، نیز حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت مولانا نانوتوی کی زیر تعلیم وتدریس کتابوں کی ترتیب میں بھی یکسانیت نہیں تھی اوراس کی بھی صراحت ملتی ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی تعلیم سے فارغ ہوکر وطن واپس آ گئے تھے مگر حضرت مولانا نانوتوی غالبًا آخری درجات یا حدیث شریف کے اسباق کی تکمیل فرما رہے تھے، اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ میں بھی دونوں میں نہایت دوستی تھی مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ دونوں تمام کتابوں میں ساتھ اور سب اساتذہ کی مجلسوں میں ہم سبق ہوں اور یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم تعلیم کے زمانہ میں حضرت مولانا مملوک العلی کے دولت کدہ پر قیام فرمارہے مگر مولانا گنگوہی کہاں رہے اسکی صراحت نہیں ملتی۔

تعلیم کے بعد

مولانا گنگوہی تعلیم سے فراغت کے بعد وطن آ گئے تھے، اگر مولانا چاہتے یا پسند کرتے تو بڑی سے بڑی سرکاری ملازمت یا ریاستوں میں عہدہ ومنصب مل جاتا، مگر مولانا نے غالبًا طالب علمی کے وقت ہی للہ دینی خدمت اور بلا کسی معاوضہ کے درس وافادہ کا ارادہ فرمالیا تھا اور دہلی میں طالب علمی کے ساتھ ہی طلبہ کو اسباق شروع کرادیئے تھے، دہلی میں حضرت مولانا سے جو طلبہ وابستہ ہوئے اور مولانا سے تلمذ واستفادہ کیا، ان میں مولانا ملاّ محمود دیوبندی بھی تھے (جو دیوبند میں پہلے مدرس مقرر کئے گئے) اسی دور کے شاگردوں میں مولانا ابو النصر گنگوہی اور مولانا ابو القاسم گنگوہی بھی شامل ہیں، (۱) دہلی میں اور طلبہ نے بھی پڑھا ہوگا مگر اسکی تفصیل دستیاب نہیں۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد گنگوہ آئے تو یہاں بھی تدریس کا سامان ہوگیا، سب سے پہلے نکوڑ سے مولوی سید مؤمن علی صاحب تعلیم کیلئے حاضر ہوئے (۲) اور پھر یہ سلسلہ ایسا جاری اور دراز ہوا کہ حیات کے آخری زمانہ تک کم وبیش چلتا رہا، آخری دور میں اس نے ایسی شہرت حاصل کی اور حضرت کے حلقۂ درس میں ایسے ایسے منتخب طالب علم اور شائقین حدیث آئے کہ جن کے دم سے ہندوستان میں حدیث کا گلستاں لہلہا اٹھا اور برصغیر کے دور

(۱) ؛ (۲) تذکرۃ الرشید ص: ۴۷ جلد اول

دراز کونوں تک حضرت کے شاگرد پہنچ گئے، اور ان میں سے اکثر نے اپنی اپنی جگہوں پر خدمت دین اور احیائے سنت کی بے نظیر خدمات انجام دیں، مولانا کے تلامذہ کا سلسلہ کس قدر وسیع ہو گیا تھا اور اس کے کیسے کیسے منافع و اثرات تھے اس کا خود حضرت مولانا نے سنہ ۱۳۰۶ھ میں حضرت حاجی صاحب کے نام اپنے ایک خط میں یوں ذکر فرمایا:

''حضرت مرشد من! علم ظاہری کا تو یہ حال ہے کہ آپ کی خدمت سے دور ہوئے غالباً عرصہ سات سال سے کچھ زیادہ ہوا ہے (۱) اس سال تک دو سو سے چند عدد زیادہ آدمی سند حدیث حاصل کر کے گئے اور اکثر ان میں وہ ہیں کہ انہوں نے درس جاری کیا اور سنت کے احیاء میں سرگرم ہوئے، اور اشاعت دین ان سے ہوئی اور اس شرف سے زیادہ کوئی شرف نہیں اگر قبول ہو جاوے۔ مکتوب محررہ سنہ ۱۳۰۶ھ'' (۲)

بیعت واجازت

حضرت مولانا کی طالب علمی کے وقت حضرت حاجی امداد اللہ حضرت مولانا مملوک العلی کے یہاں تشریف لاتے تھے اور حضرت مولانا نانوتوی حاجی صاحب کا بہت اکرام کرتے تھے، (حالاں کہ مولانا ملک کے نامور علماء میں سے تھے اور حاجی صاحب سے عمر میں بھی بہت بڑے تھے) مولانا کے حضرت حاجی صاحب کے ساتھ خاص معاملہ کی وجہ سے حضرت مولانا گنگوہی کو بھی حضرت حاجی صاحب سے محبت و عقیدت ہو گئی تھی، اس طرح حضرت شاہ عبد الغنی کے علوِّ مرتبت اور اتباعِ سنت کا بھی گہرا اثر تھا، مگر تعلیم کے اختتام تک اس کا فیصلہ نہیں کر سکے تھے کہ کس سے بیعت ہونا چاہئے، زمانہ طالب علمی تک حضرت شاہ عبد الغنی سے بیعت ہونے کا خیال تھا، مگر گنگوہ آنے کے کچھ ہی دنوں بعد ایک ضرورت سے تھانہ بھون آنا ہوا جہاں حاجی صاحب قیام فرماتے تھے، اللہ کا کرنا کہ اس مقصد کے پورا ہونے سے پہلے حضرت حاجی صاحب کی توجہ سے مالا مال ہو گئے اور اسی سفر میں حضرت حاجی صاحب نے بیعت سے مشرف فرمایا۔

---

(۱) حضرت مولانا گنگوہی اپنے تیسرے سفر حج سے سنہ ۱۳۰۰ھ میں گنگوہ واپس پہنچے تھے۔

(۲) مکاتیب رشیدیہ، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی ص: ۱۰ (طبع اول میرٹھ ۱۳۲۴ھ)

طبیعت کا جوہر پہلے سے صیقل شدہ اور تیار تھا اس لئے بیعت کے بعد اس کی آب و تاب میں روز افزوں اضافہ ہوا اور حضرت پیر و مرشد پر بھی غالباً یہ منکشف ہو گیا تھا کہ وہ وقت دور نہیں کہ یہ نوعمر مسترشد اور تازہ دم فارغ طالب علم، دین اور علم کے افق پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے گا اور اس کا وجود ملت کیلئے متاعِ بے بہا ثابت ہو گا اور اس کے دم سے ہزاروں خادمانِ حدیث تیار اور پچاسوں خانقاہیں آباد ہوں گی، یہی اس قافلہ کا قافلہ سالار اور دین و علم کے شائقین کا مرجع ہوگا۔ اس لئے حضرت حاجی صاحب نے دو ملاقاتوں کے بعد، مولانا کے تیسری مرتبہ تھانہ بھون آنے کے وقت اجازت و خلافت عنایت فرمادی تھی اور اس کے بعد جب حضرت حاجی صاحب گنگوہ گئے تو اپنی موجودگی میں ایک خاتون کو حضرت گنگوہی سے اپنے سامنے بیعت کرا کر گویا اس کا اعلان کر دیا کہ اب مولانا گنگوہی میرے قائم مقام ہیں۔

خدمات واثرات

مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کی اطلاع کے مطابق حضرت مولانا گنگوہی اپنی عمر کے اکیسویں سال (یعنی سنہ ۱۲۶۵ھ) میں تعلیم سے فارغ ہو کر گنگوہ واپس آگئے تھے، اس وقت سے زندگی کے آخری لمحات تک وہیں قیام کیا اور اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ دین کی خدمت، تعلیم و تدریس، اصلاح و ارشاد اور معاشرہ کی برائیوں کو ختم کرنے میں گذارا، عقائد و معاملات کے بگاڑ کو دور کرنے کی کوشش کی، فقہی مسائل و مباحث میں عوام و خواص کے سوالات کے جوابات لکھنا ان کے علمی و قلبی سوالات و مشکلات کے حل کی جستجو اور بھٹکے ہوئے آہو کو بہتر سے بہتر طریقہ اور عمدہ سے عمدہ تدبیر کے ذریعہ سے صحیح راستہ پر لانے کی دن رات، بلکہ تمام عمر متواتر جد و جہد حضرت مولانا کا طغرائے امتیاز ہے۔

یہ بات بلا تردد کہی جا سکتی ہے کہ برصغیر ہند و پاکستان میں حضرت شاہ محمد اسماعیل کے بعد اتباعِ سنت اور رسوم و بدعات کی تردید میں کوئی اور اس قدر طاقتور بلند بانگ اور متواتر آواز نہیں اٹھی جیسی حضرت مولانا گنگوہی کی آواز اور تحریک تھی، حضرت مولانا اس سلسلہ کے وہ پہلے اور غالباً سب سے بڑے عالم مرشد اور مصلح ہیں جنہوں نے اسی انداز و

آہنگ میں اس پیام کی تجدید کی اور اس پیغام کو جس پر زمانہ گذرنے کے ساتھ کچھ میل سا آنے لگا تھا اس طرح دور کیا اور اس پیام و دعوت کی اس قوت سے تجدید فرمائی کہ وہ پھر اک نئی قوت، نئی طاقت اور مسلسل تحریک بن کر عام ہوگئی۔

حضرت مولانا گنگوہی کے حلقۂ تربیت سے جو افراد اٹھے ان کی ایک بڑی تعداد وہ تھی جس نے اپنی زندگیاں اس دعوت و پیام کی جد و جہد اور اس کی تبلیغ و ترویج کے لئے وقف کر دی تھیں اور انہوں نے اپنی سادگی، بے نفسی اور بے غرض کوشش سے اس کی جڑیں بہت دور تک اور اس قدر گہرائی تک پہنچا دی تھیں کہ ان سے خود بخود نئی نئی کونپلیں اور نئے نئے پودے پھوٹتے اور پروان چڑھتے رہتے ہیں، جو اس تحریک کے ایسے ہی پر جوش خادم بنتے ہیں اور راہِ شریعت و سنت پر اس طرح قدم بہ قدم چلنے کی کوشش کرتے ہیں جس طرح ان کے بزرگوں اور اس خانوادہ کے اکابر علماء نے چلنے کی کوشش کی تھی۔

یہاں یہ بھی عرض کر دینا چاہئے کہ خانوادۂ ولی اللہی کی وارثت اور نیابت ونمائندگی کا سب سے بہتر نمونہ اور جامع ترین ترجمانی وہ ہے جو علمائے دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور وغیرہ کے ذریعہ سے ہوئی اور ہورہی ہے، مگر ان دونوں کو فکر ولی اللہی کا ایسا وقیع اور شاندار ترجمان بنانے، نیز اتباعِ سنت، شریعت وتصوف کی جامعیت اور حدیث شریف کے اعلیٰ ترین مدارج کے حصول کے ساتھ حنفیت کی پاسداری اور دین وشریعت اور اسلام پر اندورنی و بیرونی جماعتوں، طبقات اور گروہوں کی طرف سے اعتراضات اور رخنہ اندازی کی کوششوں کے دفاع کا سبق کس سے ملا، اس میں صرف دو ہی حضرات کے اسمائے گرامی سرفہرست ہیں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ۔

مگر یہ بات قابل غور ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم کا دیوبند میں کم وقت گذرا اور ابھی مدرسہ دیوبند کو قائم ہوئے چودہ برس بھی پورے نہیں ہوئے تھے اور اس کے قیام کے جو مقاصد تھے وہ تمام پوری طرح بروئے کار نہ آنے پائے تھے کہ حضرت مولانا نانوتوی رحلت فرما گئے، حضرت مولانا گنگوہی کو وقت بھی حضرت نانوتویؒ کی نسبت زیادہ میسر آیا،

حضرت گنگوہی مظاہر علوم کے تو گویا شروع سے سر پرست تھے اگر چہ مدرسہ کے ارکان میں مولانا کا نام بعد میں شامل ہوا مگر مدرسہ کے ذمہ داران خصوصاً مولانا مظہر نانوتوی وغیرہ حضرت مولانا کے خاص نیاز مند اور حضرت مولانا کی خدمت کے حاضر باش تھے، یوں مدرسہ کا عموماً کوئی بھی اہم کام حضرت مولانا کی ایماء کے بغیر نہ ہوتا تھا۔ حضرت مولانا نانوتوی کی وفات کے بعد یہی کیفیت دیوبند کی بھی ہوگئی تھی کہ اب مدرسہ دیوبند کے بھی تقریباً تمام اختیارات حضرت مولانا گنگوہی کے پاس آ گئے تھے اور مدرسہ دیوبند کے اکثر ذمہ دار اور استاد حضرت مولانا کے دامن تربیت سے جڑ گئے تھے، وہاں بھی حضرت مولانا کا حکم نافذ تھا اور یہ دونوں مدرسے اسی طرح پچیس سال یا زائد عرصہ تک حضرت مولانا گنگوہی کی نگرانی اور سرپرستی میں رہے، اور حضرت مولانا کے حسن تربیت اور عنایت و محبت کے سبب حضرت مولانا کے اخلاق و کردار کے تمام محاسن، فکر و خیال کے اثرات، اتباعِ سنت کی رعنائی اور دین خالص پر عمل کا جذبہ مولانا کے شاگردوں اور متوسلین میں پوری طرح اثر انداز تھے۔ اس کے ساتھ ہی تدبر و دانائی، علم و عمل، فقہ و حدیث کی جامعیت اور اصلاح و تربیت کے ساتھ معاشرتی خرابیوں کے خلاف جد و جہد اور ہر اک غیر دینی غیر اسلامی آواز اور فتنہ کے خلاف سینہ سپر ہونے کی بنیادی صفات دونوں مدرسوں اور استادوں میں بہت گہرائی تک منتقل ہوگئی تھیں، جو ان دونوں مدرسوں کے لئے متاعِ بے بہا اور درشہوار ثابت ہوئیں۔ ان مدرسوں کے اکثر طالب علموں نے یہی نہیں کہ ان محاسن کی قدر کی، ان کو سینہ سے لگایا بلکہ ان کو اپنی زندگی کے سفر اور دینی خدمات کیلئے رہنمائے راہ بنالیا، یعنی حضرت مولانا گنگوہی کے فکر و مزاج کی خصوصیات و امتیازات حضرت کی تربیت و صحبت کی برکت سے ان مدرسوں کے متعلقین کے فکر و مزاج میں اس طرح رچ بس گئی ہیں کہ ان کے وجود کا گویا ایک ضروری حصہ بن گئی ہیں، اسی فکر و مزاج کو دیوبندیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

حضرت مولانا کا یہ نہ صرف ان مدرسوں اور ان کے متوسلین اور اُن کے نام لیواؤں پر بلکہ پوری ملت اسلامیہ پر اک بہت بڑا احسان ہے، اور دار العلوم دیوبند نیز مظاہر علوم

سہارنپور کے تربیت یافتہ اوران سے وابستہ علمائے کرام کے ذریعہ سے جو دینی خدمات اب تک انجام پائی ہیں ان کی بنیاد اور اساس میں حضرت مولانا گنگوہی کے گہرے اثرات شامل و پیوست رہے۔ جوانشاء اللہ آئندہ بھی اسی طرح شامل رہیں گے۔

فقہی خدمات

حضرت مولانا کی شخصیت مختلف حیثیتوں اور پہلوؤں کی جامع تھی، حضرت مولانا ایک طرف اگر بڑے محدث بلکہ اپنے عہد میں پیشوائے محدثین تھے تو دوسری جانب فقہ وفتاویٰ میں بھی فخر اقران تھے، حضرت مولانا کے فتوے کی حیثیت سکہ رائج الوقت کی سی تھی، برصغیر میں مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اپنے معاملات اور مسائل کے حل کے لئے حضرت مولانا کی طرف دیکھتا تھا، حضرت مولانا کا جو فتویٰ ہوتا وہ ان سب کے لئے دینی دستاویز اور راہِ ہدایت کی سند ثابت ہوتا تھا۔ عقائد و عبادت، معاملات و معاشرت، سلوک و معرفت، اور رسوم و بدعات کی تحقیق میں سب اس فتویٰ کے محتاج رہتے تھے، جب مولانا کا فتویٰ صادر ہو جاتا تھا تو ضبط و احتیاط کے ساتھ اس پر عمل کیا جاتا تھا اور اکثر مسلمان اس کو اپنے لئے اسوہ سمجھتے تھے۔

مولانا کی خدمت میں ہندوستان کے کونہ کونہ سے بڑی تعداد میں روزانہ مختلف سوالات آتے تھے جن میں ایک خاصا حصہ ممتاز اہل علم اور رہ نوردانِ راہِ سلوک کے خطوط اور سوالات کا ہوتا تھا، جو اپنی علمی مشکلات اور مراتب سلوک کے نکات حل کرنے کے لئے حضرت مولانا کی خدمت میں بھیجتے تھے اور حضرت مولانا کے قلم برداشتہ جوابات سے ان کے دل کی کلی کھل جاتی اور مقصود حاصل ہو جاتا تھا۔ اس کے علاوہ عام مسلمانوں کے سوالات و فتاویٰ کی بھی بہت بڑی تعداد ہوتی تھی، حضرت کے بعض متوسلین ایک ایک وقت میں جو سوالات بھیجتے تھے وہ دو چار نہیں بلکہ کبھی کبھی سو دو سو سے بھی زائد ہوتے تھے، حضرت مولانا اپنی روایتی خندہ پیشانی اور کشادہ قلبی سے ان کے فوراً جواب تحریر فرماتے، اور اکثر قلم برداشتہ لکھتے، جس کیلئے نہ کسی قیمت کا مطالبہ تھا نہ کسی کی خوشی ناخوشی کی پروا، جو کلمۂ حق ہوتا بلا تأمل تحریر فرما دیتے۔ اگرچہ حضرت کے چند فتاویٰ پر مخالفین نے بڑا ہنگامہ برپا کیا، مدتوں مخالفت اور جوابی تحریرات اور رسائل و اشتہارات کا شور رہا، لیکن مولانا نے

اگر کسی مسئلہ کی تحقیق فرما کر اور اُس کو حق جان کر لکھا تھا تو اس سے رجوع کر لینا ناممکن تھا، لاکھ مخالفت ہو۔ لیکن اسی کا ایک اور پہلو یہ بھی تھا کہ اگر کسی فتویٰ کی غلطی پر یا کسی مسئلہ کے سہو پر کسی عامی نے بھی توجہ دلا دی اور واقعۃً وہ جواب غلط لکھا گیا تھا تو حضرت مولانا اس سے برملا اور صاف لفظوں میں رجوع فرما لیتے تھے، ایک دو مرتبہ اس کی تشہیر ہوتی اور اس کا اعلان بھی کرایا جاتا تھا۔

حضرت کا ایک خاص معمول

حضرت مولانا کا ایک اہم معمول یہ تھا کہ اگر کوئی اہم بات پیش آ گئی یا کسی دینی شرعی مسئلہ میں عوام میں اختلاف ہوا یا کسی نئے طور طریقہ کا آغاز ہوا، کوئی بدعت یا رسم عام ہوئی تو حضرت مولانا خود ایک سوال مرتب کرا کر، یا آئے ہوئے سوالات میں سے بہتر اور جامع سوال کا انتخاب کر کے اس کا مفصل جواب تحریر فرماتے تھے اور اس جواب کو اشتہار کی صورت میں بڑی تعداد میں چھپوا کر ملک کے کونہ کونہ میں پہنچا دیا جاتا تھا، اس طرح حضرت مولانا کی رائے بھی سامنے آ جاتی تھی اور صورتِ مسئلہ بھی واضح ہو جاتی تھی۔ حضرت مولانا کے اس طرح چھپوائے ہوئے اشتہارات کی خاصی بڑی تعداد تھی، غالباً سو سوا سو اشتہار چھپے ہوں گے، مگر افسوس وہ کہیں یکجا دریافت نہیں، تاہم اس قسم کے دو اشتہار ہمارے ذخیرہ میں موجود ہیں۔

مولانا کے فتاویٰ کے مجموعے

حضرت مولانا کے فتاویٰ کے سات آٹھ مجموعے حضرت مولانا کی زندگی میں مرتب ہو گئے تھے مگر تعجب ہے کہ ان میں سے ایک بھی شائع نہیں ہوا، حضرت کے فتاویٰ کا صرف ایک مجموعہ جو حافظ عزیز الدین صاحب مراد آبادی (وفات سنہ ۱۳۶۷ھ، ۱۹۴۸ء) نے مرتب کیا تھا چھپا ہے، ایک اور مجموعہ جو حضرت مولانا کے غیر مطبوعہ فتاویٰ کے مجموعوں اور حضرت کے خود نوشت جوابات پر مشتمل ہے، راقم سطور نے مرتب کیا ہے، جو تقریباً نو سو سوالات کے مفصل و مختصر جوابات اور تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے۔(۱)

(۱) اس مجموعہ کی کمپوزنگ اور ابتدائی تصحیح ہو چکی ہے، تصحیح مزید اور نظر ثانی وغیرہ کا کام جاری ہے۔

رسائل اور تصنیفات

حضرت مولانا کی اردو اور فارسی میں متعدد تصنیفات ہیں بلا ترتیب چند نام درج ہیں، مگر یہ حضرت کی تالیفات رسائل کی مکمل فہرست نہیں ہے:

﴿۱﴾ ھدایت الشیعہ مؤلفہ ۱۲۸۸ھ

﴿۲﴾ زبدۃ المناسک، مولفہ: ۱۲۹۹ھ

﴿۳﴾ الرائی النجیح فی عدد رکعات التراویح مولفہ: ۱۳۱۵ھ

﴿۴﴾ رد الطغیان فی اوقاف القرآن مولفہ: ۱۳۱۷ھ

﴿۵﴾ اوثق العریٰ فی تحقیق الجمعۃ فی القریٰ مولفہ: ۱۲۱۷ھ

﴿۶﴾ قطوف دانیہ در کراہت جماعت ثانیہ

﴿۷﴾ سبیل الرشاد

﴿۸﴾ ہدایۃ المعتدی فی قراءۃ المقتدی

﴿۹﴾ الشمس اللامعہ فی کراھۃ جماعت الثانیہ

﴿۱۰﴾ اردو ترجمہ امداد السلوک

﴿۱۱﴾ فتاویٰ میلاد

﴿۱۲﴾ فتویٰ احتیاط الظہر وغیرہ

یہ تالیفات اگر چہ چھوٹے چھوٹے رسائل ہیں بڑی اور مفصل کتابیں نہیں، لیکن مختصر رسائل بھی علوم کی کلید اور بڑے فنی مباحث کا گویا عطر اور جوہر ہیں، ان کا ایک ایک لفظ حل مباحث میں مددگار اور ہر اک فقرہ مخزنِ معانی ہے۔

ان کے علاوہ حضرت کے متعدد وابستگان اور شاگردوں نے حضرت مولانا کے مکتوبات اور افادات یا علمی سوالات کے جوابات مرتب و یکجا کر کے شائع کئے ہیں، جن میں سے کئی حضرت کی تالیف کی حیثیت سے مشہور ہیں مگر وہ درحقیقت حضرت مولانا کی تالیفات نہیں بلکہ افادات ہیں۔

صحیح بخاری ترمذی وغیرہ کی درسی تقریریں

مذکورہ بالاتحریرات ورسائل سے کہیں زیادہ قیمتی اور گراں قدر یادگار حضرت مولانا کے درسِ حدیث شریف کی تقریریں ہیں، حضرت مولانا کے متعدد شاگردوں نے اپنے اپنے زمانۂ تدریس وتعلیم میں حضرت کے وہ ارشادات جو حضرت درس کے موقع پر بیان فرماتے تھے، محفوظ اور قلم بند کرلئے تھے، جن میں سب سے بڑا سرمایہ اوراہم ترین خدمت وہ ہے جو مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی نے انجام دی تھی، یہ افادات محفوظ تھے، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے ان افادات پر مفصل حاشیوں کا اضافہ کر کے ان کو اس شان سے شائع کیا کہ ان میں سے ہراک مجموعہ بڑی شروحات کے قائم مقام اورعلم حدیث کے علماء کیلئے بیش قیمت تحفہ ثابت ہوا۔صحیح بخاری کے افادات لامع الدراری کے نام سے اورسنن ترمذی کے الکوکب الدری کےعنوان سے شائع ہو چکے ہیں اور پوری علمی دنیا میں علمائے کرام اور حدیث شریف کے شائقین کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں اوراپنی بڑی جلدوں اورضخامت کے باوجود کثرت سے چھپتے رہتے ہیں۔

حضرت مولانا کے عرفانِ مراتب، کمالاتِ علمی اور دینی اصلاحی، تدریسی خدمات کا کم سے کم تعارف بھی زیرنظر سطور میں آسان نہیں، اہل نظراور اکابرعلماء کی رائے بلکہ فیصلہ یہ ہے کہ حضرت مولانا حدیث وفقہ، سلوک ومعرفت اورارشادوتربیت میں اپنے عہد کے امام اوراپنے معاصرین میں متعددحیثیتوں سے ممتاز تھے، جس کامختصر سے مختصر تعارف بھی خاصی تفصیل چاہتاہے، جس کی یہاں گنجائش نہیں۔

حدیث شریف کی شرح، اسکی تفہیم، مذاہب فقہاء سےاسکی صحیح تطبیق، متعارض احادیث میں وجہ ترجیح اور مطالب کی وضاحت میں مولانا کی دقت نظراورغیرمعمولی دسترس کا تو حضرت کی درسی تقریروں کے مطالعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے، خصوصاً حضرت مولانا جو توجیہات کرتے ہیں اوربعض مطالب بیان فرماتے ہیں وہ مولانا کاامتیازاورمنفردحصہ ہے۔ ان توجیہات وشروحات کی وجہ سے بلاشبہ حضرت مولانا کوامت کے اہم ترین محدثین اور شارحین حدیث میں شمارکیاجاسکتاہے، مولانا محمد یوسف صاحب بنوری فرماتے تھے کہ:

''ہمارے اکابر دیوبند توجیہات کے باب میں بہت آگے ہیں، حضرت شاہ عبدالعزیز اور ان کے بعد حضرت گنگوہی نے بہترین توجیہات پیش کی ہیں، جب کہ حضرت شاہ عبدالعزیز کے بعد حضرت گنگوہی وہ شخص ہیں جنہوں نے محض اپنے نورِ قلب سے حدیث کی مشکلات حل کی ہیں اور کچھ تھوڑا سا حصہ حضرت شیخ الہند کو بھی اس سے ملا ہے''۔(۱)

مولانا کو حدیث شریف کے معانی و مطالب اور توجیہات پر جو غیر معمولی دسترس تھی اس کا ایک اجمالی اندازہ اس سے بھی ہوسکتا ہے کہ حضرت مولانا کے عہد کے جلیل القدر علماء اور محدثین اپنے سوالات کے جوابات اور حل مشکلات کیلئے حضرت مولانا سے رجوع کرتے تھے، جن میں فخر المتأخرین، حضرت مولانا عبدالحئ فرنگی محلی اور اہل حدیث کے نامور عالم مولانا محمد حسین بٹالوی کے نام بھی شامل ہیں۔فخر المتأخرین، حضرت مولانا کو احادیث کی شرح اور تحقیق کے لئے خطوط لکھتے رہتے تھے، اسی طرح مولانا محمد حسین بٹالوی بھی فقہی اختلاف کے باوجود بعض احادیث کے مطالب و رموز کی شرح و تفہیم کے لئے رجوع کرتے رہتے تھے، حضرت مولانا عبدالحئ فرنگی محلی کے خطوط اور اُن کے جوابات راقم کو نہیں ملے، لیکن مولانا محمد حسین کے چند خطوط کے جوابات محفوظ ہیں۔

اور فقہی موضوعات تو مولانا کی اس طرح دسترس میں تھے جیسے وہ مولانا کے لئے خاص طور سے مسخر کئے گئے ہوں، فقہ حنفی میں مولانا کے علو مرتبت کا کچھ اندازہ کرنے کے لئے محدث جلیل حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کی ایک اہم رائے کا تذکرہ ضروری ہے۔ علامہ کشمیری حضرت مولانا کو مرجع فقہ حنفیہ، علامہ (محمد بن عابد بن) شامی پر ترجیح دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ:

''حضرت مولانا گنگوہی فقیہ النفس تھے، شامی فقیہ النفس نہیں تھے''۔(۲)

---

(۱) ماہنامہ بینات، مولانا محمد یوسف بنوری نمبر ص:۱۲۲(کراچی ۱۳۹۸ھ۱۹۷۶ء)

(۲) حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے لکھا ہے کہ فقیہ النفس فقہاء کی ایک خاص اصطلاح ہے اور اس سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے فقہ میں کثرت ممارست کے بعد ایک ایسا ذوق سلیم عطا فرمایا ہو جس کی روشنی میں وہ کتابوں کی مراجعت کے بغیر بھی صحیح نتیجے تک پہنچ سکتا ہو۔'' ......باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر......

حضرت شاہ صاحب نے بھاول پور میں قادیانیوں کے خلاف مقدمہ میں بیان دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

''روافض کے اکفار میں اختلاف ہے، علامہ شامی ابن عابدین عدم تکفیر کی طرف ہیں اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اکفار کرتے ہیں، ہمارے نزدیک بھی یہی صحیح ہے۔ اصل میں جو ابتلاء حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کو پیش آیا وہ علامہ شامی کو پیش نہیں آیا، مسئلہ کا اختلاف نہیں ابتلاء کا ہے۔ ویسے ہمارے نزدیک حضرت شاہ صاحب علامہ شامی سے زیادہ فقیہ ہیں اور حضرت گنگوہی کو بھی ہم نے شامی سے زیادہ فقیہ النفس پایا''(۱)

حضرت علامہ نے حضرت مولانا گنگوہی کی شان میں جو قصیدہ لکھا تھا اس میں بھی اپنی اس رائے کا اظہار کیا ہے، فرماتے ہیں:

الیہ المنتھیٰ حفظاً و فقھاً — واضحی فی الروایۃ کالمدار
ففی التحدیث رحلۃ کل راوٍ — وفی الاخبار عمدۃ کل قاری
فقیہ النفس، مجتہد، مطاع — وکوثر علمہ بالخیر جاری(۲)

اور جب سنہ ۱۳۳۳ھ میں علامہ رشید رضا مصری دارالعلوم دیوبند آئے تھے اس وقت حضرت شاہ صاحب نے مجلس استقبالیہ میں ایک بے نظیر تقریر کی تھی، اس میں بھی یہ

گذشتہ صفحہ کا بقیہ . میرے والد میرے شیخ، تالیف مولانا محمد تقی صاحب، ص:۵۸ (دہلی:۱۹۹۵ء)

مولانا محمد تقی عثمانی جیسے بڑے فقیہ اور جلیل القدر عالم نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ۔

''مجھ جیسے بے علم وعمل شخص کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ کسی کے بارے میں فقیہ النفس ہونے کا فیصلہ کرے کیوں کہ فقیہ النفس کی پہچان بھی انہی لوگوں کا حصہ ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے تبحر علمی سے نوازا ہو، چنانچہ اس پہچان کیلئے بھی حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری جیسے انسان کی ضرورت ہے۔'' (ص:۵۸ میرے والد میرے شیخ)

مگر آج کل اور اسلامی اصطلاحات وخطابات کی طرح اس لفظ فقیہ النفس کی حرمت بھی پامال ہو رہی ہے، ہند و پاکستان میں متعدد غالی معتقدین جن میں شاید بعض کو اس کے معنی بھی معلوم نہ ہوں، اپنے مدوحین کے لئے اس کا بار بار اور کثرت سے استعمال کرتے رہتے ہیں .. اناللہ وانا الیہ راجعون۔

(۱) انوار انوری (مجموعہ افادات ملفوظات علامہ انور شاہ کشمیری) تالیف مولانا محمد انوری، ص:۵۰ (لائل پور:۱۳۸۷ھ)

(۲) نفحۃ العنبر فی حیات امام العصر الشیخ انور، تالیف مولانا محمد یوسف بنوری، ص:۱۸۴ (کراچی ۱۳۸۹ھ)

فرمایا تھا کہ:

وکثرت الفتيا وازدحمت المسائل على الشيخ رشيد احمد حين التبس الحق بالباطل فاجاب فيها بالصواب كان فقيها مجتهداً فاخذنا ذلک اماما في الاصول و هذا اماما في الفروع"(۱)

ترجمہ: جب اختلافی مباحث اور رسائل کی کثرت ہوئی اور حق کو باطل سے ملایا جانے لگا تو مولانا رشید احمد گنگوہی کی خدمت میں کثرت سے سوالات آنے لگے، حضرت مولانا نے صحیح (اور واضح) جوابات سے امت کی رہنمائی کی وہ فقیہ مجتہد تھے۔ تو ہم نے ان (حضرت شاہ ولی اللہ) کو اصول میں امام قرار دیا ہے اور حضرت مولانا گنگوہی کو فروع میں۔

سلوک وتصوف کے امام

حضرت مولانا، خانوادۂ ولی اللہی کے اکابر اور طریقہ کے مطابق علمی کمالات، محدثانہ شان اور فقیہانہ ژرف نگاہی کے علاوہ سلوک ومعرفت میں بھی کامل اور بلاشبہ فرد فرید تھے، حضرت مولانا کو پیرو مرشد اور برصغیر ہند میں سلوک ومعرفت کے امام، حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی سے اجازت وخلافت حاصل تھی، حضرت حاجی صاحب، حضرت مولانا کو اپنے خلفاء اور وابستگان میں سب سے بہتر اور صفات وکمالات میں اس عہد کے مشائخ واہل معرفت کا پیشوا سمجھتے تھے۔ حاجی صاحب نے اپنی کتاب ضیاء القلوب میں حضرت مولانا اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کا تذکرہ فرما کر یہاں تک لکھ دیا تھا کہ "حق تو یہ تھا کہ میں ان کی جگہ ہوتا وہ میری جگہ" یعنی وہ اس مرتبہ کے بزرگ ہیں کہ مجھے ان سے بیعت کرنی چاہئے تھی اور ان کا نیاز مند ہونا چاہئے تھا، جبکہ معاملہ الٹا ہے، تحریر فرماتے ہیں:

"ونیز ہر کس کہ ازیں فقیر محبت وعقیدت وارادت دارد مولوی رشید احمد سلمہ ومولوی محمد قاسم سلمہ را کہ جامع جمیع کمالات علوم ظاہری وباطنی اند بجائے من فقیر راقم اوراق بلکہ بمدارج فوق از من شمارند، اگرچہ بظاہر معاملہ برعکس شد کہ اوشاں بجائے من ومن بمقام اوشاں شدم، وصحبت اوشاں راغنیمت دانند کہ ایں چنیں کساں دریں زمان نایاب اند، واز خدمت بابرکت ایشاں

(۱) نفحۃ العنبر ص:۷۷ نیز ماہنامہ بینات کراچی، مولانا محمد یوسف بنوری نمبر ص:۱۲۰

29

فیضیاب بودہ باشند‘‘(۱)

حاجی صاحب اپنی کئی تحریروں اور گرامی ناموں میں اسی رائے کا اظہار وتذکرہ فرمایا ہے، ایک زمانہ میں بدعات ورسوم کی تردید کی وجہ سے حضرت مولانا کے خلاف شورش برپا کرنے کی بہت کوشش کی گئی، حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں بھی قسم قسم کی اطلاعات اور روایتیں پہنچائی گئیں اور ادھر ہندوستان میں بھی اس کا چرچا شروع کیا کہ حضرت حاجی صاحبؒ حضرت مولانا گنگوہی سے ناخوش ہیں اور حضرت مولانا کی پیر ومرشد کی نگاہ میں ویسی منزلت نہیں رہی جیسی پہلے تھی، جب حضرت حاجی صاحب کو اس تمام قصہ کی خبر ہوئی تو حضرت حاجی صاحب نے اس کی صاف صاف تردید کی اور متوسلین کو لکھ دیا کہ:

اور مولانا رشید احمد صاحب کے مقدمہ میں بالہامِ غیبی ضیاء القلوب میں جو کچھ لکھ چکا ہوں وہی ہے، جو فقیر سے عقیدت ومحبت رکھتا ہے وہ ان سے بھی محبت رکھتا ہے، اور جو اُن کا مخالف اور دشمن ہے فقیر کا بھی ہے۔ اب فقیر کے اخوان میں مولوی صاحب موصوف پر کسی کو فضیلت نہیں اور جو کوئی کہے کہ فقیر نے مولانا کو علیحدہ کر دیا ہے وہ کذاب ہے، مولانا کی محبت کو فقیر وسیلۂ نجات سمجھتا ہے، فقط۔‘‘(۲)

ایک معاصر مؤرخ کی گواہی

نزھۃ الخواطر کے مصنف اور نامور مؤرخ مولانا عبدالحئ حسنی رائے بریلوی جو ایک بڑے دینی علمی گھرانے کے فرد، ذہین عالم نیز حضرت سید احمد شہید کی نسبتوں کے امین تھے، حضرت مولانا گنگوہیؒ کی وفات سے تقریباً گیارہ سال پہلے سنہ ۱۳۱۲ھ میں گنگوہ حاضر ہوئے تھے، وہ اپنا مشاہدہ اور رائے یوں درج کرتے ہیں:

’’اس میں شک نہیں کہ مولوی صاحب بقیۃ السلف ہیں، ان کا وجود مغتنمات میں سے ہے۔ اس تورع واستقامت کا دوسرا شیخ ان کے سوا اس زمانہ عالم آشوب میں نظر نہیں آتا، علم الٰہی میں جو کوئی ہو اس کی خبر نہیں، مولوی صاحب کے اوصاف میں سب سے بڑا تورع ہے۔‘‘(۳)

---

(۱) ضیاء القلوب ص:۶۰ طبع اول (مجتبائی ۱۲۸۴ھ)

(۲) مکتوب مکتوبہ ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ، مکتوبات اکابر دیوبند، ص:۲۷-۲۸ (دیوبند ۱۹۸۰ء)

(۳) دہلی اور اس کے اطراف، مولانا عبدالحئ حسنی ص:۱۳۷ (طبع اول دہلی ۱۹۵۸ء)

لطافتِ مزاج

حضرت مولانا نہایت نفیس مزاج اور لطیف طبیعت تھے، حضرت مولانا کا لباس، قیام گاہ اور استعمال کی ایک ایک چیز خانقاہ اور کتابیں بھی انتہائی صاف ستھری رہتی تھیں، ہر اک کام میں نفاست اور سلیقہ کو پسند فرماتے تھے۔ معمولی سی بے ترتیبی یا بدسلیقگی کا بھی طبیعت پر اثر ہوتا تھا، سادگی کے ساتھ تجمل کا بھی اہتمام تھا، کوئی بات نفاست کے خلاف ہوئی حضرت مولانا نے اس کا احساس فرمایا۔

حضرت مولانا مسجد میں ماچس جلانے سے منع فرماتے تھے کیوں کہ اس میں گندھک کی خفیف سی بو ہوتی ہے، حضرت مولانا کو اس کا بھی بہت احساس ہوتا تھا، ذوق کی لطافت اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ ایک مرتبہ مغرب کی نماز کے بعد جب حضرت مولانا مسجد سے جا چکے تھے، کسی خادم نے مسجد کا چراغ ماچس سے جلا کر روشن کر دیا لیکن تقریباً ڈیڑھ، دو گھنٹہ کے بعد حضرت مولانا عشاء کی نماز کیلئے مسجد میں آئے لیکن اس وقت بھی حضرت مولانا نے اُس گندھک کی بو محسوس کر لی اور فرمایا کہ فضا میں اس کا اثر ہے اور مکرر ہدایت کی کہ مسجد میں ماچس نہ جلائی جائے۔

اسی طرح ایک مرتبہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی دیوبندی نے (جو حضرت کے ہر وقت کے حاضر باش خادم تھے اور بعد میں دار العلوم دیوبند کے مہتمم ہوئے) چائے بنا کر پیش کی، تو فرمایا کہ چائے میں کچے پانی کی بو آرہی ہے، مولانا نے بہت غور کیا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا، دوسرے دن اور احتیاط کی مگر حضرت کا پھر بھی یہی فرمانا تھا کہ کچے پانی کی بو آرہی ہے، کئی دن کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن کا ذہن ادھر متوجہ ہوا کہ چائے کی پیالی کو ٹھنڈے پانی سے دھو کر صاف کیا گیا ہے اس سے ٹھنڈے پانی کا اثر حضرت محسوس فرماتے ہیں، اس لئے اُس وقت سے اس میں احتیاط کی گئی اور پیالی کو گرم پانی سے دھو کر پیش کیا تو یہ شکایت ختم ہوئی۔

آخری علالت اور وفات

حضرت مولانا لمبی اور سخت بیماریوں کے باوجود اپنے معمولات اور دینی خدمات میں مصروف رہتے تھے کہ اسی درمیان ایک رات جب تہجد کی نماز میں مشغول تھے تو کسی جانور نے پاؤں کی

انگلیوں میں کانٹا، جس سے بہت خون نکلا، مگر حضرت مولانا ایسی محویت اور حضور کے عالم میں تھے کہ نہ اُس کانٹے کا احساس ہوا نہ خون نکلنے کی خبر ہوئی، جب نماز کیلئے حجرہ سے باہر نکلے تو ایک خادم نے خون کے اثرات دیکھے، اس وقت لباس وغیرہ بدل کر نماز پڑھائی اس کے بعد طبیعت میں کمزوری آنے لگی، چند دن کے بعد پیر پر وَرم بھی آنا شروع ہوا جو بڑھتا بڑھتا زانو تک پہنچ گیا تھا، اسی مرض نے شدت اختیار کر لی اسی میں تقریباً بیس دن بیمار رہ کر ۸/ جمادی الثانیہ سنہ ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۱/ اگست سنہ ۱۹۰۵ء جمعہ کو اٹہتر سال سات مہینہ کی عمر میں وفات پائی، اسی دن شام کو مغرب کے بعد گنگوہ میں دفن کیا گیا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ۔

[۱۳] قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (۲)

نانوتہ کے صدیقی خاندان کا اس کتاب کے پہلے باب میں تعارف و تذکرہ آ چکا ہے، حضرت مولانا مملوک العلی اسی خاندانِ والا شان کے آفتاب تھے اور اسی خاندان بلکہ اسی شاخ اور گھرانہ کے ایک اور گل سر سبد اور فخر خاندان شخصیت حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی تھے۔

حضرت مولانا محمد قاسم حضرت مولانا مملوک العلی کے ہم جد تھے، سلسلۂ نسب اس طرح ہے:

''حضرت مولانا محمد قاسم بن شیخ اسد علی بن غلام شاہ بن محمد بخش بن شیخ علاء الدین بن شیخ ابوالفتح''(۱)

شیخ ابوالفتح پر حضرت مولانا مملوک العلی اور اس خانوادہ کے متاخر کے نامور علماء (قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم، مولانا محمد مظہر، مولانا محمد احسن نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی) کا سلسلۂ نسب مل جاتا ہے، یہ سب اکابر و علماء اسی خزانہ کے لعل و گہر اور اسی آسمان منزل درخت کی شاخیں ہیں۔

(۱) تذکرہ یا حالات طیب مولانا محمد قاسم نانوتوی مرتبہ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی مع حواشی و تصحیح نور الحسن راشد کاندھلوی مشمولہ قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی احوال و آثار باقیات و متعلقات ص: ۱۷۲، ۱۷۳ (کاندھلہ ۱۴۲۱ھ)

حضرت مولانا کے والد ماجد

حضرت مولانا کے والد ماجد شیخ اسد علی، مولانا مملوک العلی کے ہم عصر تھے، دونوں تعلیم حاصل کرنے کے لئے ساتھ دہلی گئے تھے، شیخ اسد علی نے فارسی درسیات مکمل کر لی تھیں اوران میں مہارت حاصل تھی، مولانا محمد یعقوب کا قول ہے کہ:

''جناب والد مرحوم (حضرت مولانا مملوک العلی) کے ساتھ دہلی گئے تھے۔اور شاہ نامہ تک کتابیں پڑھیں تھیں''(۱)

لیکن شاید اسی قدر تعلیم کے بعد وطن واپس آ گئے تھے، تعلیم مکمل کرنیکا موقع نہیں ہوا، بہت سادہ مزاج، نہایت محبت واخلاق والے، مہمان نواز، کنبہ پرور اور پرہیز گار شخص تھے۔

اسہال کے مرض میں مبتلا ہو کر ۷/ربیع الثانی سنہ ۱۲۹۱ھ (۲۱/مارچ ۱۸۷۵ء) کو دیوبند میں وفات ہوئی، تکیہ (قبرستان، خاندان) دیوان لطف اللہ میں دفن کئے گئے (۲) دارالعلوم دیوبند کی نئی مسجد رشید کے صدر دروازہ کے سامنے مدفن ہے۔

ولادت اور ابتدائی تعلیم

حضرت مولانا نانوتوی، مولانا محمد یعقوب کی تحریر کے مطابق شوال سنہ ۱۲۴۸ھ (مارچ ۱۸۳۳ء) میں تولد ہوئے، تاریخی نام ''خورشید حسین'' ہے۔

ایک خاندانی قضیہ کی وجہ سے والدین نے بچپن میں ہی دیوبند (جو مولانا کی ننہیال بھی تھی) بھیج دیا تھا، دیوبند میں مولوی مہتاب علی (شیخ الہند مولانا محمود حسن کے چچا) کے مکتب میں پڑھتے تھے۔مولوی صاحب کے ایک شاگرد شیخ نہال احمد دیوبندی سے عربی شروع کی، پھر سہارنپور جانا ہوا، حضرت مولانا کے نانا مولوی وجیہ الدین صاحب سہارنپور میں وکالت کرتے تھے، سہارنپور رہتے ہوئے مولوی محمد نواز سہارنپوری سے عربی کی ابتدائی درسیات اور کچھ فارسی پڑھی، اواخر سنہ ۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴ء) میں نانا صاحب کی وفات ہوگئی جسکی وجہ سے غالباً تعلیم کا سلسلہ متأثر ہوا، اس زمانہ میں حضرت مولانا مملوک العلی بسفر حج

---

(۱) و (۲) تذکرہ یا حالات طیب مولانا محمد قاسم نانوتوی مرتبہ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی مع حواشی وتصحیح نورالحسن راشد کاندھلوی مشمولہ قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی احوال وآثار باقیات ومتعلقات ص: ۱۷۲،۱۷۳،۱۷۲ (کاندھلہ ۱۴۲۱ھ)

کیلئے گئے ہوئے تھے، حج سے واپسی کے بعد جب گھر آئے تو فرمایا میں تمہیں اپنے ساتھ دہلی لے چلوں گا ذی الحجہ سنہ ۱۲۶۰ھ (دسمبر جنوری ۴۵-۱۸۴۴ء) واپسی میں جب حضرت مولانا مملوک العلی نانوتہ سے دہلی واپس گئے تو (حضرت مولانا) محمد قاسم بھی مولانا کے ساتھ تھے، ۲/محرم الحرام سنہ ۱۲۶۱ھ (۲۹/جنوری ۱۸۴۵ء) کو دہلی پہنچے تھے۔

دہلی میں تعلیم

دہلی آنے سے پہلے فارسی کی تعلیم مکمل کر کے ہدایۃ النحو وغیرہ پڑھ چکے تھے۔ دہلی میں کافیہ سے تعلیم شروع ہوئی۔ اپنے ہم مدرسہ طلبہ بلکہ دہلی کے طالب علموں میں ممتاز تھے، ہر اک امتحان میں سب سے اول رہتے تھے۔ معقولات کی اعلیٰ درجہ کی منتہیانہ کتابیں زواہد ثلاثہ، صدرا، شمس بازغہ وغیرہ اس طرح پڑھتے تھے جیسے حافظ قرآن شریف کی منزل سناتا ہے، ترجمہ بھی نہ کرتے تھے۔ اس تیز رفتار تعلیم یا پڑھنے پر بعض طلبہ نے اعتراض کیا تو حضرت مولانا مملوک العلی نے فرمایا:

''میرے سامنے طالب علم بے سمجھے نہیں چل سکتا'' (۱)

اکثر کتابیں اور درسیات حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی سے اخذ کیں دہلی کالج میں بھی رہے، وہاں کے چند استادوں سے بھی فائدہ اٹھایا۔

زمانۂ تعلیم میں اقلیدس کے مشکل اور پیچیدہ مباحث کو اس آسانی سے حل فرما دیتے تھے جیسے گنتی کے ابتدائی اعداد دہرا رہے ہوں، مولانا کی اس غیر معمولی لیاقت اور ذہانت و فطانت کی وجہ سے دہلی کالج کے ہیڈ ماسٹر (اور پرنسپل) چاہتے تھے کہ مولانا کالج کے سالانہ امتحانات میں شریک ہوں اور کالج کے طلبہ میں ان کا نام شامل رہے، اگر ایسا اعلیٰ درجہ کا طالب علم امتحان میں بیٹھتا تو اس کی کامیابی سے کالج کی شہرت و نیک نامی میں کس قدر اضافہ ہوتا محتاج بیان نہیں، لیکن مولانا اور ان کے استاد محترم، حضرت مولانا مملوک العلی نے اس کو پسند نہیں فرمایا۔

حضرت مولانا کا طالب علمی کے ابتدائی دور میں یہ حال تھا کہ اچھے اچھے تیز طالب علم سبق یاد رکھنے سمجھنے اور اس کا تکرار کرانے میں مولانا کی گرد بھی نہیں پا سکتے تھے، معاصر

(۱) قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی احوال و آثار باقیات و متعلقات ص: ۱۸۰

طلبہ سے سوال و جواب اور بحث و مقابلہ میں ہمیشہ مولانا غالب رہتے تھے، رہوارِ علم جس قدر آگے بڑھتا رہا، ذہن دماغ کی صلاحیتوں میں جلا آتی گئی، اس کی درّاکی اور برّاقی اس غضب کی تھی کہ اہل نظر نے اسی وقت محسوس کرلیا ہوگا کہ یہ نیا ستارہ جب طلوع ہوگا تو اس کی روشنی اور تابنا کی نگاہوں کو خیرہ کریگی، یہی ہوا۔ حضرت مولانا جب تعلیم کے اعلیٰ درجوں میں پہنچے تو درسِ کتاب اور علوم کے مباحث پانی نظر آتے تھے، دقیق اور نازک مباحث پر مشتمل بڑی بڑی کتابوں کو مولانا اس طرح پڑھتے تھے جیسے ابتدائی کتابوں کا آموختہ دہرا رہے ہوں کہ اس میں کہیں جھجک ہے نہ تکلف۔

نوعمری سے حضرت مولانا کے فطری جوہر چمکنے لگے تھے، اعلیٰ درجہ کی ذہانت و ذکاوت تعلیم میں اپنی جماعت کے ساتھیوں اور ہم عمر طلبہ پر نمایاں سبقت رکھتے تھے، اکثر یہ ہوتا ہے کہ جو طالب علم بہت ذہین ہوتے ہیں اور ان کی قدرتی صلاحیتیں عام بچوں سے بڑھ کر ہوتی ہیں وہ نوعمری میں بے فکر اور آزاد خیال ہوتے ہیں، دینی کاموں سے بہت زیادہ مانوس نہیں ہوتے، ان کی رہوارِ فکر دینی پابندیوں کی اسیر نہیں ہوتی، کم سے کم نوجوانی کے ایک حصہ تک خاصی آزاد اور کبھی کبھی بالکل بے لگام رہتی ہے، مگر حضرت مولانا محمد قاسم پر منجملہ انعاماتِ الٰہیہ کے یہ بہت بڑا کرم رہا کہ حضرت مولانا بچپن سے فضول کاموں سے دور، دین سے پوری طرح وابستہ اور خرافات سے یکسو رہے، مگر اس ذہن اور خالص اسلامی افتادِ طبع نے مولانا کو اپنے ہم عمروں سے دور نہیں کیا بلکہ وہ ان کے مشغلوں میں بھی پوری دلچسپی رکھتے تھے اور جس ہنر یا کھیل میں اپنے ساتھیوں اور ہم عمروں کو لگا ہوا دیکھتے اس کو پوری طرح سمجھ لیتے تھے، اور جب اس کو آخری حد تک سمجھ لیتے تھے، اور اس میں ماہر مشاق ہو جاتے، تو اس کو چھوڑ دیتے تھے، کوئی کھیل یا بچپن کا معمول مولانا کی طبیعت و مزاج نہیں بنا۔

جرأت و بہادری میں بھی اسی دور سے منفرد تھے، ایسی جگہوں پر جہاں روزانہ آنے جانے والوں کو بھی ڈر محسوس ہوتا، حضرت مولانا رات دیر گئے بھی تنہا بے تکلف چلے جاتے اور ذرا خوف نہ کرتے تھے۔

اسی جرأت و ہمت کا اثر تھا کہ سنہ ۱۸۵۷ء کے ہولناک دنوں میں بھی جب حالات و واقعات دیکھ دیکھ کر اچھے اچھے سورماؤں کا پتہ پانی ہوتا تھا، حضرت مولانا بے تکلف اور نڈر رہے خوف و ہراس کا کچھ اثر نہیں تھا، جب محاذ پر پہنچے معرکہ آرائی ہوئی، گولیاں چلیں اور مقابلہ ہوا، اس وقت بھی سکینت کی کیفیت تھی، گولیاں چل رہی تھیں اور مولانا مقابل کی صفوں میں گھسے جاتے تھے، زخم کھائے مگر حواس اور جرأت و حوصلہ جوں کا توں قائم رہا، نہ قدم پیچھے ہٹے نہ صلابت و استقامت میں فرق آیا۔

حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری سے تعلیم و اجازتِ حدیث

حضرت مولانا سے معقولات وادب وغیرہ کی تکمیل کیلئے حدیث شریف پڑھنے کا ارادہ کیا، علمائے سلف کا معمول چلا آرہا ہے کہ کسی بڑے عالم کی خدمت میں حاضر ہوکر حدیث پڑھتے ہیں اور اس کی سند لیتے ہیں حضرت مولانا محمد قاسم حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے، حضرت مولانا سہارنپوری حضرت شاہ محمد اسحاق کے تازہ دم مگر اہم شاگرد تھے۔ مولانا محمد قاسم نے حضرت مولانا سہارنپوری سے سنن نسائی مکمل، سنن ابوداؤد کا اکثر حصہ کسی قدر ابن ماجہ اور مؤطا امام مالک پڑھی۔ اور کتابیں بھی پڑھی ہوں گی مگر انکی صراحت نہیں ملی۔ حضرت مولانا سے مذکورہ بالا پہلی تین کتابوں کے پڑھنے کا حضرت مولانا محمد قاسم کی تحریرات و مکتوبات میں مختلف موقعوں پر ذکر ہے اور اس تلمذ اور روایت و اجازت کی حضرت مولانا محمد قاسم کے خاص شاگرد مولانا عبدالعلی میرٹھی نے مدرسہ عبدالرب دہلی میں (جہاں وہ شیخ الحدیث تھے) ایک مرتبہ یوں وضاحت فرمائی تھی:

"وقال لی استاذی، قرأت النسائی کاملا و اکثر سنن ابی داؤد و اول ابن ماجة عن المحدث العلامة احمدعلی السهارنفوری"(۱)

---

(۱) مجموعۃ الاسانید العالیہ والشہادات السامیہ، مولانا نازید ابوالحسن فاروقی ص:۱۴۰۶ (عکس نسخہ مؤلف مملوکہ راقم سطور) مولانا نازید، مولانا عبدالعلی کے براہ راست شاگرد تھے، ایک سال تک مولانا سے پڑھا تھا۔

مولانا عبدالعلی صاحب حضرت مولانا محمد قاسم کو حضرت مولانا احمد علی کا سب سے اہم اور ممتاز ترین شاگرد کہا کرتے تھے، فرمایا:

"قرأت اکثر من کتب الحدیث وغیرہ عن الفاضل الاجل الشیخ محمد قاسم ، وھو من اکبر تلامیذ مولانا احمد علی المحدث السھارنفوری ومع ذلک فلہ اجازۃ عن الشیخ عبد الغنی"(۱)

حضرت مولانا نانوتوی کی حضرت مولانا احمد علی کے حوالہ سے مؤطا امام مالک کی اجازت وسند سنہ ۱۳۵۰ھ تک دارالعلوم دیوبند میں معروف تھی، مولانا عبدالباسط بلیاوی نے اپنے مجموعہ اجازات میں لکھا ہے:

"اخبرنا المتقن الفقیہ المفتی مولانا عزیز الرحمان عن العلامۃ مولانا محمد یعقوب عن الشیخ العلامۃ الجلیل مولانا محمد قاسم عن الشیخ الفقیہ المتقن المحدث الولی مولانا احمد علی"(۲)

مولانا نے صحیح مسلم اور جامع ترمذی کا اکثر حصہ شاہ عبدالغنی کی مجلس درس میں پڑھا اور دونوں کا کسی قدر حصہ دوسروں کی قراءت سے سنا، صحیح بخاری کے آخری ایک تہائی حصہ کی قراءت وسماعت میں شریک رہے، مؤطا امام مالک کا کچھ حصہ مولانا محمد مظہر نانوتوی کی قراءت میں سنا اور تفسیر جلالین پڑھی، حضرت شاہ عبدالغنی نے حضرت مولانا نانوتوی کو عنایت کی ہوئی سند میں تحریر فرمایا ہے کہ:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"الحمد للہ اولاً و اخراً والصلوۃ والسلام علی نبیہ وصفیہ دائماً وسرمداً وعلیٰ الہ وصحبہ ابداً ابداً.

امابعد: فاقول وبعون اللہ اصول واحول وانا اضعف عباداللہ القوی عبد الغنی بن ابی سعید المجددی الدھلوی، ان الاخ الصالح الکاظم محمد قاسم

(۱) مجموعۃ الاسانید العالیہ والشہادات السامیہ، مولانا زید ابوالحسن فاروقی ص:۱۵۸

(۲) مجموعۃ الاسانید الحدیث۔ مؤلفہ مولانا محمد ناصر بن عبدالباسط صدیقی شیخوپوری بلیاوی۔ (فاضل دیوبند)

(مؤلفہ سنہ ۱۲۴۳ھ، مکتوبہ بخط مؤلف سنہ ۱۳۵۰ھ) مملوکہ نور الحسن راشد

اصلح الله شانه و اکمل ایمانه ، قد قرأ علی الصحیح لابی الحسین مسلم بن حجاج القشیری النیسابوری و جامع ابی عیسیٰ الترمذی الا القلیل من الکتابین، فانه سماع غیره۔ والثلث الأخر من صحیح البخاری با لقراء ۃ والسماع و مؤطا مالک بن انس سمع بعضه بقراء ۃ ابن اخی المولوی مظهر وتفسیر الجلالین قرأ علی.

فلما رأ یت تاهله لدراسة الحدیث لکمال فطانته و تمام ذهانته: مع صلاحیة الحال فی الاعمال والاقوال والافعال، اجزت له ما تیسر لی من حصول الاجازة من والدی و مرشدی عن الشیخ عبد العزیز المحدث رحمة الله علیهما.

وکذلک حصل لی الاجازة من محدث دارالهجرة الشیخ عابد السندی فانی قرأ ت علیه البخاری وسمعت منه الی کتاب الغسل واجازنی ببقیة الکتب، وقراء ۃ وسمعت علی الناسک المهاجر الشیخ محمداسحٰق رحمه الله البخاری والترمذی وغیرهما .(۱)

﴿والله الغنی وانتم الفقراء﴾

حضرت شاہ عبدالغنی کے الفاظ سے جھلکتا ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم نے شاہ صاحب سے اس وقت پڑھا، یا اجازت لی تھی جب حضرت مولانا کا علماء میں ممتاز مقام اور تعارف تھا اور حضرت مولانا کے علمی کمالات سامنے آ گئے تھے۔

علم و فضل کی وسعت

یہ تو مولانا کی اس لیاقت ظاہری اور علمی استعداد کا تذکرہ تھا جس پر دنیا کا نظام چلتا ہے، کالج و مدارس، علماء اور اہل تصنیف کے یہاں اس کی قدر و منزلت ہوتی ہے لیکن حضرت مولانا کا معاملہ اس سے فزوں تر تھا، ان کا طائر علم ایسا بلند پرواز اور لاہوت آشیاں تھا کہ اچھے اچھے اہل علم کی وہاں

(۱) یہ سند مولانا محمد یعقوب نے بیاض یعقوبی میں نقل کی ہے۔ص:۱۶۳ کلاں (طبع اول تھانہ بھون ۱۳۲۹ھ) اصل سند کا عکس سوانح قاسمی تالیف مولانا مناظر احسن گیلانی ص:۲۶۰ جلد اول (طبع اول دیوبند) میں چھپا ہے۔ بیاض یعقوبی والی نقل میں ایک دو غلطیاں ہیں جس کا اصل سے مقابلہ کر کے تصحیح کر دی گئی ہے۔نور

رسائی دشوار تھی۔ علم ظاہری کا رسوخ، علم باطن کا خداداد سرمایہ، القائے ربانی کے سانچے میں ڈھل گیا تھا، جس کی روانی اور گہرائی میں ہر لحہ اضافہ ہوتا رہتا تھا، جب بھی تحریر و گفتگو فرماتے معلوم ہوتا کہ دریا کا ایک دہانہ کھل گیا ہے، ذرا چھیڑیئے اور علم ملکوتی کی سیر کیجئے، اس علم کی نہ ابتداء کی نہایت تھی نہ اختتام کی انتہا، ہمیشہ ایک سرشاری کی کیفیت رہتی اور علوم کا ایک آبشار جاری رہتا تھا، عقلی و نقلی علوم کے سب پہلو ہمہ وقت حاضر اور جملہ مباحث نوکِ زباں تھے۔

بڑے بڑے اہل علم جن کو اپنے علم اور ذہانت پر ناز تھا حضرت مولانا کے علمی افادات سن کر حیران و ششدر رہ جاتے تھے، یہ علم علم لدنی تھا، کسبی نہیں وھبی تھا، اس کی جلوہ گری کا یہ عالم تھا کہ علوم دین و شریعت ہوں یا فکری عقلی عنوانات، ہراک میں ذہن کی جولانی کی ایک سی کیفیت رہتی تھی، غالبًا کوئی موضوع بھی مولانا کی دسترس سے دور اور رسائی فکر سے باہر نہیں تھا، ہراک موضوع مولانا کی توجہ کی جولان گاہ اور تحقیق و بصیرت کا محور تھا۔

سوعلوم پر ایک تصنیف کا آغاز

حضرت مولانا کے علوم کی کیفیت کچھ ایسی ہے کہ چند سطور بلکہ صفحات میں بھی اس کا تعارف مشکل ہے۔ اس کی وسعت اور ہمہ گیری کا کیا حال تھا اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ حضرت مولانا کے ایک خاص دوست اور مکتوب الیہ (مولانا جمال الدین سہنسپوری) نے حضرت مولانا سے گذارش کی کہ ایک ایسی کتاب لکھدیجئے جو سوعلوم پر مشتمل ہو، جس میں علوم عقلیہ پر خصوصاً بحث کی گئی ہو، مولانا جمال الدین نے علوم عقلیہ میں سے ہندسہ ہیئت، فلاحت طبعی، جبر و مقابلہ، جر ثقیل وغیرہا کا بطور خاص ذکر کیا تھا، یعنی ان علوم کے جملہ مبادی، اصول اور کلیدی بحثیں اس میں سمیٹ لی گئی ہوں اور اس کتاب کے ذریعہ سے ان علوم کی تفہیم آسان ہوجائے، حضرت مولانا کو ان کی خاطر عزیز تھی اسلئے بے تکلف وعدہ فرمالیا۔ جب مولانا جمال الدین نے اصرار کیا تو غالبًا حضرت مولانا نے اپنی عادت اور معمول کے مطابق ایک موضوع پر قلم برداشتہ لکھنا شروع کردیا۔

یہ صفحات مولانا جمال الدین کو ملے تو انہوں نے حضرت مولانا کو لکھا کہ ہراک موضوع پر

صرف ایک صفحہ لکھیے، حضرت مولانا نے جواب میں فرمایا کہ میرا قلم مت روکو، اسکو چلنے دو! امت اور دنیائے علوم کے لئے حسرت اور افسوس کا مقام ہے کہ فرمائش کرنے والوں نے صرف اس موہوم خیال کی وجہ سے کہ حضرت مولانا نے اگر ایک ایک فن یا علم پر اپنے معمول کے مطابق لکھا تو اس کی ضخامت بے پناہ ہو جائیگی اور ان کیلئے اس کی اشاعت ناممکن ہوگی، حضرت مولانا کو اس بڑے کام سے روک دیا(۱) جس کی وجہ سے علم لدنی کا ایک بڑا دروازہ بند ہو گیا اور امت ایک بڑے فیض سے محروم رہ گئی، جس کی تلافی ممکن ہی نہیں۔ اگر حضرت مولانا نے یہ کتاب مکمل فرمادی ہوتی تو اس میں یقیناً ایسے ایسے مباحث آتے اور علوم کی وہ عقدہ کشائی ہوتی کہ جس سے علم وکمال کی دنیا میں زلزلہ بپا ہو جاتا، اور اس سے پوری دنیا قیامت تک فائدہ اٹھاتی مگر:

وکم حسرات فی بطون المقابر

تربیت واصلاح

حضرت مولانا کو بچپن سے اولیاء اللہ اور بزرگوں سے انسیت تھی، خصوصاً حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی اور حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی سے نوعمری سے وابستگی تھی، حضرت حاجی صاحب کی نانوتہ میں قرابت تھی، حاجی صاحب کا نانوتہ جانا ہوتا تو حضرت مولانا حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے، وہ وقت ابتدائی نگرانی وتربیت کا اور چھوٹی موٹی باتیں سیکھنے کا تھا، حضرت حاجی صاحب اس پر توجہ فرماتے تھے، حاجی صاحب نے حضرت مولانا اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی کو کتابوں کی جزبندی سکھائی تھی۔ پھر جب دہلی جانا ہوا اور حضرت مولانا مملوک العلی کے مکان پر قیام اور تعلیم کا انتظام ہوا وہاں بھی حضرت حاجی صاحب کا آنا جانا رہتا تھا، جس کی وجہ سے محبت وعقیدت کا وہ بیج جو وطن کی سرزمین پر اگا تھا، پرورش پاتا رہا، حضرت حاجی صاحب کا حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے ذکر آتا، اسی موضوع پر دونوں اپنی اپنی بات کہتے، اس طرح حضرت حاجی صاحب سے ایک نسبت قائم ہوگئی تھی۔

---

(۱) تمہید جمال قاسمی۔ مولانا جمال الدین ص:۱ (مجتبائی دہلی ۱۸۹۵ء)

مولانا کو حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی سے بھی اس وقت سے محبت وعقیدت تھی جب حضرت مولانا محمد قاسم حضرت مولانا مملوک العلی کے ساتھ دہلی سے نانوتہ یا نانوتہ سے دہلی جاتے تھے، راستہ میں کاندھلہ پڑتا تھا، حضرت مولانا مملوک العلی نے حضرت مولانا مظفر حسین سے وعدہ کیا ہوا تھا کہ اس راستہ سے گزریں گے تو حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی سے ملاقات کئے بغیر آگے نہیں بڑھیں گے، اس وعدہ کو حضرت مولانا مملوک العلی نے ہمیشہ اہتمام سے نبھایا، جب نانوتہ یا دہلی جاتے کاندھلہ اترتے اور مولانا مظفر حسین سے ملاقات کرتے، حضرت مولانا مملوک العلی کا ایسا ہی رابطہ حضرت حاجی امداد اللہ سے بھی تھا۔

دونوں بزرگوں میں یہ روابط اور قربت وانسیت ایسی نہیں تھی کہ مولانا کے شاگرد اور وہ عزیز جو ہمہ وقت حضرت مولانا کی تربیت وصحبت میں رہتے تھے (جن میں حضرت مولانا محمد قاسم بھی شامل تھے) متاثر نہ ہوتے، جیسے جیسے وقت گذرتا رہا، حضرت مولانا محمد قاسم کے دل میں دونوں کی محبت وعقیدت کا اثر گہرا ہوتا رہا، خصوصاً حضرت مولانا مظفر حسین کی خدمت میں اکثر وقت گذارتے اور حضرت مولانا کے صفات وکمالات کی نقل کرتے اور انکو اپنے اندر سمونے کی پوری کوشش کرتے، حضرت مولانا مظفر حسین کے فیض صحبت سے مولانا محمد قاسم کی طبیعت پر اتباعِ سنت کا نہایت گہرا اور پر اثر نقش قائم ہوگیا تھا۔

سر سید احمد نے جو حضرت مولانا محمد قاسم سے اس وقت سے واقف تھے جب حضرت مولانا تعلیم کے لئے دہلی گئے (سر سید احمد کو حضرت مولانا مظفر حسین سے بھی ارادت و محبت تھی، سر سید مولانا مظفر حسین کو چچا صاحب لکھا اور کہا کرتے تھے) اس طویل واقفیت اور تعارف کے پس منظر میں سر سید احمد نے لکھا ہے کہ:

''ان کو جناب مولانا مظفر حسین کاندھلوی کی صحبت نے اتباعِ سنت پر بہت راغب کردیا تھا'' (۱)

حضرت مولانا نانوتوی نے حضرت مولانا مظفر حسین کی صحبت بابرکت سے اتباع سنت کے علاوہ اور کیا کیا کمالات حاصل کئے اور کونسے انسانی جوہر اور فضائل عالیہ تھے جو

(۱) حضرت مولانا کی وفات پر سر سید احمد کا تعزیتی مضمون۔ مشمولہ سر سید احمد کی تعزیتی تحریریں، مرتبہ اطہر عباس (علی گڑھ)

حضرت مولانا مظفر حسین کی بدولت ترقی پذیر ہوئے اور پروان چڑھے اس کی تفصیل معلوم ہونے کا کوئی ذریعہ میری دسترس میں نہیں، مگر اس میں شک نہیں کہ حضرت مولانا کاندھلوی کی صحبت سے حضرت مولانا نانوتوی نے بہت کچھ حاصل کیا اور شریعت وسنت کے راستہ پر آگے بڑھتے چلے گئے۔

حضرت مولانا میں فطری صلاحیت اعلیٰ درجہ کی تھی جس کو باکمال بزرگوں کی صحبت و معیت نے صیقل کر کے گوہر آب دار بنا دیا تھا۔ سادگی، تواضع، بےنفسی، اخلاق عالیہ، تعلق مع اللہ، رغبت سنت، استقامت، تورع، زہد، دنیا سے بے رغبتی، آخرت کی فکر، اور کمالاتِ انسانی کا کون سا جوہر ایسا تھا جو حضرت مولانا کی طبیعت میں نہیں تھا اور حضرت مولانا نے اس کو عمدہ سے عمدہ کرنے کی کوشش نہیں فرمائی، مگر ابھی اس جوہر کو پرکھ کر اس پر اجازت و معرفت کی مہر لگانے کا موقع نہیں آیا تھا، جب حضرت مولانا حضرت حاجی صاحب سے بیعت ہوئے تو حاجی صاحب نے غالباً قلیل وقفہ کے بعد حضرت مولانا کو اجازت وخلافت سے نواز دیا تھا۔

بیعت واجازت

حضرت حاجی صاحب سے کب بیعت ہوئے اور اس کے محرکات کیا تھے اس کا صحیح علم نہیں، تعلیم کے زمانہ میں حضرت مولانا محمد قاسم اور حضرت مولانا گنگوہی دونوں کا حضرت شاہ عبدالغنی سے بیعت ہونے کا خیال تھا اس ارادہ پر عمل نہیں ہوا تھا کہ حضرت مولانا گنگوہی تعلیم سے فارغ ہو گئے اور چند روز بعد جب ایک علمی ضرورت سے تھانہ بھون جانا ہوا تو حضرت حاجی امداد اللہ کے زمرۂ خدام و مستفیدین میں داخل ہو گئے اور تھانہ بھون کے دوسرے تیسرے سفر میں حضرت حاجی صاحب نے حضرت مولانا گنگوہی کو اجازت وخلافت عطا فرمائی۔

حضرت مولانا گنگوہی کے حضرت حاجی صاحب سے بیعت ہونے کی خبر ملی تو حضرت مولانا نانوتوی نے بھی حضرت حاجی صاحب کے دامن فیض سے وابستہ ہونے کا فیصلہ کرلیا، حضرت گنگوہی فرماتے تھے کہ:

"مولوی محمد قاسم نے اعلیٰ حضرت کی تعریفیں کر کر کے ہمیں مرید کرایا اور بعد میں اعلیٰ

حضرت سے اصرار و کوشش کر کے مولوی محمد قاسم صاحب کو ہم نے مرید بنوایا'' (۱)

حضرت حاجی صاحب کے دامن فیض سے حضرت مولانا کب وابستہ ہوئے تھے اسکی تاریخ نہیں ملی لیکن جناب انوار الحسن شیر کوٹی صاحب کی یہ رائے قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی اور حضرتؒ نانوتوی سنہ ۱۲۶۶ھ (۵۰-۱۸۴۹ء) میں حاجی صاحب سے بیعت ہو گئے تھے۔ (۲) قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت گنگوہی و نانوتوی سنہ ۱۲۶۹ھ (۵۲-۱۸۵۱ء) کے قریب تک حضرت شاہ عبدالغنی کے حلقۂ درس میں سے تھے اور حضرت گنگوہی کی روایت سے معلوم ہو رہا ہے کہ اس وقت تک دونوں کا شاہ عبدالغنی سے بیعت ہونے کا خیال تھا (۳) مگر اس پر عمل نہیں ہوا تھا، اسلئے شیر کوٹی صاحب کی اطلاع درست نہیں، حضرت گنگوہی کے حضرت حاجی صاحب سے بیعت ہونے کا واقعہ تقریباً سنہ ۷۱-۱۲۷۰ھ (۵۵-۱۸۵۴ء) میں پیش آیا ہوگا، اسکے بعد بظاہر چند ہفتوں یا ایک ڈیڑھ مہینہ میں حضرت مولانا محمد قاسم بھی اس خانقاہ کے حلقہ بگوش ہو گئے تھے۔

اجازت نامہ بیعت، مکتوبہ حضرتِ امدادؒ

بیعت کے بعد جو واردات پیش آئیں اور حضرت حاجی صاحب نے کس طریقہ سے سفر سلوک طے کرایا کس طریقہ کی تعلیمات اسوۂ راہ تھیں، اس میں ذکر و شغل مجاہدات کی بنیادی اہمیت تھی یا اخلاقی تربیت اور نگرانی کی، اس درمیان حضرت مولانا کی حضرت حاجی صاحب سے خط و کتابت بھی ہوئی یا نہیں اور درمیان کے جو احوال و کیفیات تھیں ان میں سے کسی کا بھی علم نہیں، خیال یہ ہے کہ حضرت حاجی صاحب نے حضرت مولانا نانوتوی کو بھی جلد ہی بیعت و اجازت سے نواز دیا ہوگا، کیوں کہ وہاں بھی حضرت مولانا گنگوہی کے معاملہ کی طرح کسی چیز کی کمی نہیں تھی، تمام صلاحیتیں ہر پہلو سے مکمل تھیں، جو کسی مردِ خدا کی نگاہ خاص اور توجہ کی منتظر تھیں اور ظاہر ہے کہ یہ مرحلہ لمحوں میں طے ہو گیا ہوگا۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ حضرت مولانا نانوتوی کو بھی بہت جلد اجازت بیعت

(۱) تذکرۃ الرشید، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی۔ حاشیہ ص: ۴۶ (سہارنپور ۱۹۷۷ء)

(۲) انوار قاسمی، ص: ۱۳۲ جلد اول

(۳) تذکرہ الرشید ص: ۴۲ جلد اوّل

ہوگئی ہوگی، کم از کم یہ بات یقینی ہے کہ سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک (۱۲۷۳ھ) کے بعد حضرت مولانا نانوتوی کو خلافت واجازت سے سرفراز فرمادیا تھا۔ حضرت حاجی صاحب نے جو اجازت نامہ تحریر فرمایا تھا وہ درج ذیل ہے، ملاحظہ ہو:

''بخدمت مولوی خورشید حسین صاحب واضح باد

اگرچہ ایں روسیاہ گمراہ ہم سزاوار ایں امر عظیم نیست مگر امتثال امر بزرگاں نمودہ اخذ بیعت تبرکاً میکند، لہٰذا آں برگزیدۂ کونین را نیز بطوریکہ ایں مدبر را از بزرگان خود اجازت اخذ بیعت است اجازت دادہ می آید، مناسب کہ ہر کدام کس طالب کہ رجوع نماید اخذ بیعت نمودہ تعلیم نام خدا نمایند، ہرگز انکار نکنند۔ ہدایت کنندہ ہادی مطلق است آنرا کہ فرستاد ہدایت ہم خواند کرد'' (۱)

ترجمہ: بخدمت مولوی خورشید حسین صاحب واضح ہو کہ اگر چہ یہ گمراہ سیاہ رو اس بڑی خدمت کا اہل نہیں ہے مگر بزرگوں کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے تبرکاً لوگوں کو بیعت کر لیتا ہے۔ اس لئے آں برگزیدۂ کونین کو بھی اسی طریقہ کے مطابق جس طرح کے اس نااہل کو اپنے بزرگوں سے بیعت لینے کی اجازت ہے، اجازت (بیعت) دی جارہی ہے۔

مناسب یہ ہے کہ جو شخص آپ سے رجوع کرے اس کو بیعت کر کے اللہ کے نام کی تعلیم دیں، ہرگز انکار نہ کریں۔ ہدایت دینے والا ہادی مطلق ہے، جس کو چاہتا ہے کہ بھیجے اس کو ہدایت بھی خود ہی کرتا ہے۔

اس خط سے یہ صاف معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت حاجی صاحب نے حضرت مولانا کو سنہ ۱۸۵۷ء کے واقعات کے غالباً دو تین سال کے بعد اس وقت خلافت واجازت عطا فرمائی تھی، جب مولانا روپوشی کی زندگی گذار رہے تھے اور حاجی صاحب مکہ معظمہ چلے گئے تھے، حاجی صاحب کے مکتوبات میں مولانا سے خورشید حسین کے نام سے انہی خطوط میں خطاب کیا گیا ہے جو ملکہ وکٹوریہ کے معافی کے عام اعلان سے پہلے کے لکھے ہوئے ہیں، اور یہ خط بھی غالباً اسی دوران کا ہے۔

---

(۱) مرقوماتِ امدادیہ مع مقدمہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی ص:۹ (دہلی) ترجمہ نور الحسن راشد کاندھلوی

ارشاد و تلقین

حضرت مولانا کا فنائیت، بے نفسی اور گم نامی کا جو مزاج تھا اس میں اس کی تو امید ہی نہیں کہ حضرت مولانا نے حاجی صاحب کی اجازت کا کسی سے ذکر بھی کیا ہو، بہ ظاہر حضرت مولانا گنگوہی یا خود حضرت حاجی صاحب کے ذریعہ سے دوسروں کو اس کا پتہ چلا ہوگا، مگر یہ اطلاع بھی حضرت مولانا کی بے نفس طبیعت پر اثر انداز نہ ہو سکی، حضرت مولانا نے اپنا وہی معمول وہی طریقہ آخر تک باقی رکھا، بہت کم اور مشکل ہی سے کسی کو بیعت فرماتے تھے، جو شاگرد یا متوسلین بیعت ہوئے ان میں کئی عالی ہمت اور صاحب استعداد اصحاب تھے، ان کا سفر طریقت تیزی سے طے ہوا، اور وہ بہت جلد صاحب نسبت ہو گئے تھے، ایسے شاگرد یا اصحاب میں سے جو بھی حضرت مولانا کی نظر میں اجازت وارشاد کے اہل ہوتے مولانا ان کو مکہ معظمہ بھیج دیتے کہ حضرت حاجی صاحب سے استفادہ کریں، یہ حضرت مولانا کی ایک خاص ادا تھی جس کو حضرت حاجی صاحب خوب جانتے تھے۔ اس لئے حضرت مولانا کے جو مرید و مستفید اس خیال سے مکہ معظمہ حاضر ہوتے، حضرت حاجی صاحب ان کو اجازت وخلافت سے مالا مال فرما دیتے تھے، حضرت مولانا کے جو خلفائے کرام ہیں یا حضرت حاجی صاحب کے خلفاء میں حضرت مولانا کے جو شاگرد ہیں ان کی یہی نوعیت ہے کہ انہوں نے حضرت مولانا نانوتوی کی نگرانی میں سیر سلوک مکمل فرمائی اور حضرت مولانا کے اشارہ پر حضرت حاجی صاحب نے ان کو اجازت بیعت سے نوازا ہے۔

وعظ و تذکیر

حضرت مولانا کی صحبت اہل معرفت اور صاحب ذوق اصحاب کیلئے ایک نعمت اور اکسیر تھی، حضرت مولانا کے متوسلین نیز اور اہل تعلق کا حضرت مولانا سے وعظ و نصیحت کیلئے اصرار ہوتا جس کو حضرت مولانا بہت کم منظور فرماتے تھے، شروع میں وعظ نہ کہتے تھے مگر حضرت مولانا کے مربی حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی نے ایک مرتبہ اصرار کر کے وعظ کہلوایا، خود بیٹھ کر سنا اور دعاؤں سے نوازا (۱)

(۱) حالاتِ طیب یا تذکرہ مولانا محمد قاسم نانوتوی مرتبہ مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مشمولہ قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی احوال وآثار باقیات و متعلقات ص: ۱۹۰

اس کے بعد وعظ نہ کہنے کا معمول ختم ہو گیا کبھی کبھی وعظ کہتے جو عجیب و غریب ہوتا تھا، اس کے مضامین، طریقۂ استدلال اور تاثیر عوام واعظین کی تقریروں سے بہت مختلف اور نرالی ہوتی تھی۔

سادگی، بے نفسی اور استغناء

حضرت مولانا ہزار کمالات کے باوجود خود کو چھپانے کی ہر ممکن کوشش کرتے، سادہ معمولی لباس پہنتے، سادگی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ اکثر لوگوں کو شبہ ہو جاتا، وہ مولانا کو معمولی پارچہ باف یا مزدوری پیشہ سمجھ لیتے تھے، بعد میں پتہ چلتا کہ یہی فخر العلماء حضرت مولانا محمد قاسم صاحب ہیں۔

حضرت حاجی امداد اللہ سے بیعت ہونے کے بعد اکثر مسجد میں رہتے، وہیں ہم مشرب ساتھیوں کے ساتھ کھانا کھاتے وہیں سو جاتے، دنیاوی معاملات و مسائل پر اگرچہ گہری نظر رکھتے تھے مگر اپنا دامن ہر آلودگی سے پاک اور مال و دولت کے خیال سے بھی دور رکھتے تھے، پوری زندگی اس طرح گذاری کہ جیسے اس دنیا کے رہنے والے ہی نہیں، نہ مال و دولت کی محبت، نہ اس کی طرف توجہ نہ اس کے جمع کرنے کا خیال اور نہ اہل دولت کی کچھ قدر و منزلت، یعنی کن فی الدنیا کانك غریب او عابری سبیل کی حقیقی مثال تھے۔

مطابع میں ملازمت اور تصحیح کتب کی خدمت

اگرچہ حضرت مولانا کی پوری زندگی خدمت دین سے عبارت تھی، ہمیشہ درس و افادہ، تعلیم و تلقین، اصلاح و ارشاد وغیرہ میں مشغول رہتے تھے، مگر ان میں کسی ذریعہ سے آمدنی کے تصور کو بھی برا سمجھتے تھے، حالاں کہ حضرت مولانا کی علمی لیاقت و صلاحیت اس مرتبہ کی تھی کہ اگر چاہتے تو اعلیٰ سے اعلیٰ ملازمتیں اور بلند سے بلند سرکاری منصب پیشوائی کے لئے موجود تھے، کون سا بڑا عہدہ ایسا تھا کہ اگر حضرت مولانا اس کو قبول فرما لیتے تو اس کی قدر و منزلت میں اضافہ نہ ہوتا، اور کون سا علمی ادارہ اور منصب ایسا تھا کہ مولانا وہاں بیٹھتے اور اس کو چار چاند نہ لگ جاتے، مگر حضرت مولانا کو کسی

اور بڑے کام کے لئے پیدا فرمایا گیا تھا، جب کبھی حضرت کو عہدہ و منصب کی پیش کش کی گئی، بڑی تنخواہ کی راہ دکھائی گئی تو حضرت مولانا نے اسکو قبول کرنے سے انکار کر دیا، حضرت مولانا نے ان فرمائشوں پر زبانِ حال سے کہا ہوگا، شاید یہی قال سے بھی دہراتے ہوں گے کہ:

برو ایں دام بر مرغ دگرنہ — کہ عنقا را بلند است آشیانہ

حضرت مولانا معاش کے لئے مطابع میں تصحیح کتب کی معمولی اور کم تنخواہ کی ملازمت کو پسند کرتے تھے۔

حضرت مولانا نے سب سے پہلے مطبع احمدی دہلی میں ملازمت کی، حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کی رفاقت میں بخاری شریف کے آخری (غالباً تین) پاروں کے حواشی کی ترتیب و تکمیل میں مشغول رہے، اس کے بعد مطبع مجتبائی (دہلی و میرٹھ) سے وابستہ ہوئے، منشی جی مطبع فروخت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے تھے، اس زمانہ میں کسی اور مطبع میں ملازمت کی، کچھ دنوں کے بعد منشی جی نے ہندوستان واپس آ کر ایک اور مطبع قائم کیا، جس کا نام مطبع مصطفائی رکھا تھا، اس میں ملازم رہے، صراحت تو نہیں ملی مگر قرائن اور تحریرات سے جھلکتا ہے کہ آخری ملازمت مطبع ہاشمی میرٹھ کی تھی۔

اس دور کے مطابع اور ان کی خدمات

اس زمانہ میں عمدہ پریس قائم تھے، جو اسلامی علوم اور فنی موضوعات پر اہم فاضلانہ کتابیں مقابلہ و تحقیق، حواشی اور ضروری لوازم کے ساتھ شائع کیا کرتے تھے، یہ مطابع بظاہر اشاعتی تجارتی کتب خانے تھے، مگر ان میں سے کئی پریس بڑی علمی اکیڈمیوں کی حیثیت رکھتے تھے، یہاں سے جو کتابیں چھپ کر آتی تھیں، وہ صحت متن، جامع حواشی اور فہم مطالب کے لحاظ سے بے نظیر ہوتی تھیں، ان مطابع میں ایسے ایسے اہل نظر جید علماء اور فضلاء ملازم رکھے جاتے تھے، جو ان میں سے ہر ایک کتاب کے متن کے قلمی نسخوں سے مقابلے اور تصحیح میں ماہر ہوتے اور ان کے مضامین پر اعلیٰ درجہ کی فنی دسترس رکھتے تھے،

اور ان کتابوں کے جلیل القدر مصنفین کی علمی فروگذاشتوں اور مطالب کی درستگی میں طاق ہوتے تھے، اس لئے جو علماء یکسوئی اور خاموشی سے دینی علمی خدمت انجام دینا چاہتے تھے، ان کے لئے درس وتعلیم کے بعد سب سے اہم موقع ان مطابع کی ملازمت کا تھا، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بھی جو زاہدانہ متوکلانہ مزاج اور شہرت وتعارف سے بیزار طبیعت رکھتے تھے، تعلیم سے فراغت کے بعد اسی شعبہ سے وابستہ ہو گئے تھے، اگر چہ تصحیح متون وحواشی کا کام اکثر اوقات درس وتعلیم سے زیادہ اہمیت ونزاکت کا ہوتا ہے اس میں جو جانکاہی ہوتی ہے اس کا اکثر پڑھنے والوں کو اندازہ بھی نہیں ہوتا، پھر اس میں ایسی ناموری اور شہرت بھی نصیب نہیں ہوتی جو درس وتعلیم کے ذریعہ سے ہو جاتی ہے، مگر حضرت مولانا کی قانع طبیعت نے اس کو اور خدمات پر ترجیح دی، اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ تصحیح کرنے اور حواشی لکھنے والوں کی زیادہ شہرت بھی نہیں ہوتی، ممکن ہے اسی خیال سے مطابع میں حضرت مولانا نے اس خدمت کو ذریعۂ معاش بنایا ہو، مگر اس کوشش اور گم نامی کی دلی تمنا کے باوجود حضرت مولانا کو اپنی زندگی میں جو شہرت اور ناموری اور عزت ومرتبہ حاصل ہوا، وہ حضرت کے معاصرین میں سے کم ہی لوگوں کو ملا ہوگا۔

مطابع کی ملازمت سے حضرت مولانا کی وابستگی کی تفصیل تو نہیں ملی، مگر مطبع احمدی سے وابستگی اس سلسلہ کی پہلی وابستگی معلوم ہوتی ہے، اس وقت سے تقریباً تیئس چوبیس سال تک مطابع کی ملازمت کی مگر قرآن شریف کی چند اشاعتوں کے علاوہ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ اس لمبے عرصہ میں حضرت مولانا نے کس کس کتاب کی صحت ودرستگی فرمائی اور کس کتاب کا حاشیہ اور بین السطور لکھے، اگر کسی ذریعہ سے اس کا پتہ چل جائے تو ان کتابوں بلکہ اور علوم میں حضرت مولانا کی نظر، علمی گہرائی اور گرفت کا کسی قدر تعارف ہو سکتا ہے۔

مطبع کی ملازمت ہو یا کوئی اور مصروفیت سفر وحضر میں طلبہ ساتھ ہوتے اور سبق جاری رہتے تھے، مطابع کی ملازمت اور تصحیح کتب کے زمانہ میں بھی طلبہ کی جماعت استفادہ کے لئے حاضر خدمت رہتی تھی جب ملازمت کے کام سے فرصت پاتے اسباق

شروع ہو جاتے، مطبع احمدی کے دورِ ملازمت کی مصروفیات کا زیادہ سراغ نہیں ملتا، لیکن مطبع مجتبائی کی ملازمت کے زمانہ میں بیشتر وقت درس و تعلیم میں گزرتا تھا۔

حضرت مولانا نے اگرچہ اپنی زندگی خدمت دین اور تعلیم وافادہ کے لئے گویا وقف کر دی تھی، مگر تعلیم کے لئے ملازمت کرنا اور اس کی اجرت لینا گوارہ نہیں تھا، جس کسی کو حضرت مولانا سے استفادہ کی تمنا ہوتی وہ خود خدمت میں حاضر رہتا اور بقدرِ ظرف و صلاحیت فائدہ اٹھاتا تھا۔

حضرت مولانا کے غالبًا صرف ایک طالب علم یا شاگرد ایسے ہیں کہ ان کو پڑھانے کے لئے حضرت مولانا نے ان کے وطن میں قیام کیا اور اس کے لئے تنخواہ لینی منظور کی، یہ طالب علم مولانا اسماعیل علی گڈھی ہیں، روایت ہے کہ ان کے والد صاحب کے اصرار پر حضرت مولانا نے علی گڑھ کا سفر کیا تھا، اور وہاں رہ کر مولانا اسماعیل کو صحیحین پڑھائی تھیں، اس خدمت کے لئے صرف پندرہ روپے ماہانہ تنخواہ لینا طے فرمایا تھا، اس میں سے بھی بعد میں پانچ روپے کم کرادیئے تھے، صرف دس روپے رہ گئے تھے:

"جب تک میں تمہارے یہاں رہوں ماہوار پندرہ روپے مجھے دے دیا کرنا تاکہ گھر بھیج دوں، اس قلیل رقم کو سنکر مولوی اسماعیل شرمندہ تھے، لیکن بات پہلے ہی طے ہو چکی تھی کہ یہ مسئلہ بجائے تمہارے فیصلہ کے میری رائے کا تابع رہے گا اسی لئے خاموش ہو گئے، کئی ماہ حسب وعدہ پندرہ روپے کی رقم پیش کرتے رہے اسی عرصہ میں ایک دن مولوی اسماعیل جب پڑھنے کے لئے حاضر ہوئے تو مولانا نے فرمایا کہ میاں اسماعیل جو رقم اب تک تم دیتے تھے اس پر نظر ثانی کی ضرورت پیش آ گئی ہے، وہ خوش ہوئے کہ شاید کچھ اضافہ کی منظوری عطا فرمائی جائے گی، لیکن جب ان سے مولانا یہ فرمانے لگے کہ بھائی، پندرہ جو تم دیتے تھے ان میں سے دس تو میں اپنے گھر کے لوگوں کو دیا کرتا تھا اور پانچ روپے (غالبًا) والدہ کی خدمت میں پیش کرتا تھا، کل خط آیا کہ والدہ صاحبہ کا انتقال ہو گیا ہے اسلئے اس پانچ کی ضرورت اب باقی نہ رہی" (۱)

حضرت مولانا کے بعض خطوط سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اپنے اکثر طالب علموں کے

(۱) سوانح قاسمی مولانا مناظر احسن گیلانی ص: ۲۹ ۴ جلد ۱

کھانے پینے اور ضروری خرچہ کی حضرت مولانا اپنی جیب خاص سے کفالت فرماتے تھے جب سفر ہوتا اس وقت بھی منتخب شاگرد ہمرکاب ہوتے، سفر کے دوران اور قیام گاہ ہر جگہ اسباق اور تعلیم وافادہ کے لئے موقع نکال لیتے تھے۔

تعلیم کے بعد سنہ ۱۸۵۷ء تک دہلی میں قیام کیا، سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد زیادہ وقت روپوشی میں گذرا، اس میں بھی درس اور اسباق کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا اس دور میں بھی حدیث شریف کی اعلیٰ ترین کتابوں خصوصاً صحیحین صحیح بخاری صحیح مسلم کے سبق ہوتے تھے، جس میں شاگرد کی حیثیت سے حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی بھی حاضر رہتے تھے(۱)

دوسرے سفر حج (شوال سنہ ۱۲۸۶ھ جنوری ۱۸۷۰ء سے سنہ ۱۲۸۷ھ سنہ ۱۸۷۰-۷۱ء تک) کے بعد زیادہ وقت درس حدیث اور تعلیم میں گذرتا تھا، جس میں عجیب وغریب علوم بیان فرماتے تھے۔

حضرت مولانا کے معلوم شاگردوں کی فہرست میں مشکل سے چودہ پندرہ نام ہیں، اگرچہ ان میں سے ہر ایک حضرت مولانا کا فیض یافتہ ہے اور حضرت مولانا کی محبت اور تلمذ سے مالا مال رہا ہے لیکن جن تلامذہ کو حضرت مولانا سے نسبت خاص حاصل ہے اور حضرت مولانا بھی ان کے تلمذ اور صلاحیت وسعادت کا اعتراف فرماتے تھے، ان کے نام ذکر کئے جاتے ہیں:

۱-مولانا سید احمد حسن امروہوی
۲-مولانا محمد یعقوب نانوتوی
۳-مولانا فخر الحسن گنگوہی
۴-شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن
۵-مولانا عبد العلی میرٹھی
۶-مولانا محی الدین مرادآبادی
۷-مولانا عبد الحق پورقاضوی
۸-مولانا حکیم رحیم اللہ بجنوری
۹-مولانا منصور علی خاں مرادآبادی
۱۰-مولانا عبد العدل پھلتی
۱۱-مولانا محمد فاضل پھلتی

(۱) تذکرہ یا حالات طیب مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی مشمولہ قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی احوال وآثار باقیات ومتعلقات ص: ۲۰۵

حضرت مولانا کے یہی شاگرد نہیں، ان کے علاوہ بھی متعدد شاگرد تھے جن کا عموماً تذکرہ نہیں ملتا، تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

پادریوں اور پنڈتوں سے مناظرے اور دین وشریعت پر اعتراضات کے جوابات

حضرت مولانا کو اپنی ذات کی نفی، گم نامی کی کوشش اور شہرت سے سخت نفرت تھی مگر جب سنتے کہ کسی دشمن اسلام نے اسلام یا دین شریعت کے کسی گوشہ یا عنوان پر اعتراضات کئے ہیں اور انکے جوابات کا دعویدار ہے تو بے قرار ہو جاتے تھے اور چاہتے کہ جس طرح بھی ممکن ہو اس کے جوابات دیئے جائیں، یہ جوابات بھی ایسے عالمانہ اور باوقار ہوں کہ اعتراض کرنے والا بھی ان کے وزن کو جانچ لے، سننے والے اور پڑھنے والے سمجھ لیں کہ ان اعتراضات میں کچھ وزن اور حقیقت نہیں، چونکہ ممتاز علماء اور مناظرین جانتے تھے کہ حضرت مولانا کو مبداء فیاض سے وہبی علوم کا ایک خزانہ ملا ہے مولانا بعض باتوں کو جس طرح واضح فرماتے ہیں اس کی اس خطہ میں بلکہ دور دور تک کوئی نظیر نہیں، اس لئے ایسے موقعوں پر حضرت مولانا سے گذارش کی جاتی اور حضرت مولانا ان مجلسوں میں تشریف لاتے تو اہل علم ونظر علم وکمال کی ایسی منزلوں سے آشنا ہو جاتے جہاں ان کا طائر خیال بھی پرواز نہیں کر سکتا تھا۔

حضرت مولانا نے کئی مناظروں اور تقابل مذاہب (RELEGIOUS COMPARISION) کی مجلسوں یا مناظرہ کی مجلسوں میں شرکت فرمائی، ہر ایک میں حضرت مولانا کی تقریر ایک سوغات اور بیش بہا تحفہ ہوتی، جس کے دامن میں اسلامی تعلیمات کے بے نظیر تعارف کے علاوہ غیر مسلموں کے اعتراضات کے ایسے جوابات ہوتے کہ جنکی جامعیت اور قوت کا مخالفین بھی بھری مجلسوں میں اعتراف کر لیتے تھے، ان محفلوں کی جو تقریریں یا جوابات قلم بند ہو کر محفوظ ہو گئے وہ برصغیر کے علمی خزانہ کا ایک نادر حصہ ہیں۔

دہلی میں عیسائیوں کے اعتراضات کے جوابات اور ایک مناظرہ

حضرت مولانا طالب علمی کے بعد جب دہلی میں مقیم تھے اس وقت دہلی میں عیسائی مناظرین اور پادریوں کا بہت زور اور چرچا تھا، عیسائی مذہب کے تنخواہ دار مبلغ اور مناظر ہر جگہ کوچہ و بازار میں کھڑے ہوکر عیسائیت کی تبلیغ اور منادی کرتے اور مختلف موضوعات پر علمائے اسلام کو مقابلہ اور مناظرہ کی دعوت دیتے تھے، ان کے مقابلہ کے لئے منجانب اللہ علماء کی ایک طاقتور جماعت سامنے آئی جس نے پادریوں کے شبہات و اعتراضات کے جوابات دیئے اور خود آگے بڑھ کر موجودہ انجیل اور عیسائیت کے موجودہ نظریات واختلافات کو اس کے جوابات اور اس کی کمزوریوں کو بیان کرنا اور ان کی علمی استدلالی حیثیت کو بے بنیاد ثابت کرنا شروع کردیا تھا، جس سے عیسائی مبلغوں کی دنیا میں ایک ہلچل سی مچ گئی تھی اور وہ خود کو اس بلائے بے درماں یا مدلل تقریروں اور اعتراضات کے سامنے بے بس اور لاجواب محسوس کررہے تھے۔ اس زمانہ میں جن حضرات نے عیسائیت کے اعتراضات کے جوابات دیئے اور ان کا گلی کوچوں میں تعاقب کرکے ہر جگہ کلمۂ حق پہنچایا، ان میں سے ایک اہم ممتاز اور خاص نام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کا بھی ہے۔

ایسے ہی ایک موقع پر پادری تاراچند نے مسلمانوں کو مناظرہ کا چیلنج کیا تو حضرت مولانا نے اپنے شاگردوں سے فرمایا کہ:

''تم بھی کھڑے ہوکر بازاروں میں کچھ بیان کیا کرو اور جہاں وہ لوگ مقابلہ نصاریٰ بیان کرتے ہیں، ان کی امداد کیا کرو'' (۱)

جب تاراچند سے مناظرہ طے ہوگیا تو حضرت مولانا معمولی آدمیوں کا لباس پہنے بیکسوں کی سی صورت بنائے وہاں تشریف لے گئے، وہاں تاراچند سے گفتگو کی وہ لاجواب ہوکر خاموش ہوگیا۔ اور میدانِ مناظرہ سے فرار ہوگیا، یہی کیفیت اور مقابلوں اور مباحثوں میں بھی ہوئی۔ ان مناظروں میں دہلی بلکہ ہندوستان کے نامور عالم و مناظر،

(۱) تذکرہ یا حالات طیب مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی مشمولہ قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی احوال وآثار باقیات ومتعلقات ص:۲۰۹

مولانا سید ابوالمنصو رحضرت مولانا کے رفیق و معاون رہتے تھے، حضرت مولانا کی گرفت عقلی کلامی ہوتی تھی، جس کو مولانا ابوالمنصو ر بائبل کے حوالوں، اختلافات اور بائبل کے مفسرین کے اقوال سے مدلل فرمادیتے تھے، اور حریف کے لئے جواب کا کوئی موقع اور تاویل کی گنجائش نہیں چھوڑتے تھے۔

میلہ خداشناسی چاندا پور

حضرت مولانا کے ان مناظروں اور ان میں مقابل مناظرین اور پادریوں کے خاموش اور نادم وشرمسار ہونے کی اطلاعات یقیناً عام ہوگئی ہوں گی اور حضرت مولانا کے تعارف میں اور کمالات کے علاوہ عیسائیوں سے مناظروں اور اسلام کی بے نظیر تفہیم وتشریح کا بھی اضافہ ہوگیا تھا، اس لئے جب عیسائیوں نے روشن خیال ہندوؤں کے تعاون سے جگہ جگہ تحقیق مذاہب کیلئے جلسوں کا ایک سلسلہ شروع کیا جن میں ہندوستان میں موجود بڑے مذاہب کے اعلیٰ علمی نمائندے آکر اپنے مذہب کی خصوصیات وامتیازات اور اس کا اس عہد اور آئندہ نسلوں کے لئے ضروری اور مفید ہونا ثابت کرتے تھے۔ ایک جلسہ کا ربیع الثانی ۱۲۹۲ھ (مئی ۱۸۷۶ء) میں ضلع شاہ جہاں پور کے ایک قصبہ چاندا پور کے قریب انتظام کیا گیا تھا، حضرت مولانا کو اس میں شرکت کی دعوت دی گئی، حضرت مولانا تشریف لے گئے، حضرت مولانا نے اس جلسہ میں اسلام کے مقاصد، نظریات وعقائد اور اس پر جو چند اعتراضات کئے جاتے ہیں ان کے اس شان اور دھوم دھام سے جوابات دیئے کہ مخالفین کو بھی تسلیم کئے بغیر گنجائش نہ رہی۔ حضرت مولانا کی اس تقریر یا خطبہ کی بہت شہرت ہوئی اور اسکا علمی استدلالی وزن محسوس کیا گیا، اسلئے جب یہی تقریب دوبارہ منعقد کی گئی تو اس وقت بھی حضرت مولانا کو تقریر کے لئے بلایا گیا۔

خداشناسی کے دوسرے میلہ میں شرکت

خداشناسی کا دوسرا میلہ یا جلسہ ربیع الاول سنہ ۱۲۹۴ھ (مارچ ۱۸۷۷ء) میں برپا ہوا، اس جلسہ میں دوسرے مذاہب کے متعدد رہنماؤں کے علاوہ سوامی دیانند سرسوتی بھی آئے، اگرچہ جلسہ مناظرہ اور سوال وجواب کا نہیں تھا مگر نہ چاہتے ہوئے بھی

مقررین اور مضامین کی ایسی ترتیب بن گئی تھی کہ اس میں علمائے اسلام کو اس موقع پر کیے گئے اعتراضات کے جوابات پیش کرنے کا بہت اچھا موقع ملا، سوامی دیانند سرسوتی نے جو کچھ کہا اس کے جواب میں مولانا محمد علی بچھرایونی نے وضاحت کی اور حضرت مولانا نانوتوی نے وجودِ الٰہی اور توحید کے موضوع پر ایسا واضح مدلل اور دلکش بیان کیا کہ سننے والے عش عش کرا ٹھے، اور جو پادری حضرت مولانا کے حریف اور مقابل تھے ان میں سے بھی ایک کو کہنا پڑا کہ:

''اگر تقریر پر ایمان لایا جاتا تو یہ تقریر خوش ایسی لطیف اور دل میں اثر کرنے والی ہے کہ اس پر ایمان لائیے''(۱)

اس جلسہ میں حضرت مولانا نے سوامی دیانند سرسوتی کے اعتراضات وسوالات اور پادریوں کے مباحث وموضوعات کے ایسے برجستہ اور غیر معمولی جوابات عنایت فرمائے کہ پادریوں کو جلسہ گاہ سے فرار ہونے کے علاوہ کوئی راستہ نظر نہ آیا، یہاں تک کہ جلدی اور خفت کی وجہ سے اپنی بعض کتابیں بھی وہیں چھوڑ گئے۔

حضرت مولانا اس جلسہ سے نہایت کامیاب واپس ہوئے، حضرت مولانا کی ذات بابرکات سے اس وقت جو تائید دین ہوئی وہ غیر معمولی بات تھی، ایسی جو بعد کے دور اور تاریخ کے لئے ایک سند، نمونہ اور مثال بن گئی۔

رڑکی میں سوامی دیانند سے مراسلت

اسی سال کے (اواخر شوال سنہ ۱۲۹۴ھ اکتوبر ۱۸۷۷ء) میں سفر حج پر گئے، حج سے واپسی پر سخت بیمار ہوئے یہاں تک کہ زندگی کی امید ختم ہوگئی، مگر پھر اللہ تعالیٰ نے صحت بخشی، مرض سے صحت ہوگئی تھی مگر اس کے بعض حصے اور نہایت کمزوری باقی رہی، اسی میں شعبان سنہ ۱۲۹۴ھ (اگست ۱۸۷۴ء) آگیا، رجب کی آخری تاریخوں میں آریہ سماج کے بانی اور ہندوستان کے مشہور سوامی اور مبلغ سوامی دیانند سرسوتی رڑکی پہنچے اور وہاں پہنچ کر اپنے معمول کے مطابق اور مذہبوں کی تردید شروع کی اور ایک تقریر میں اسلام پر سخت

(۱) قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی احوال وآثار باقیات ومتعلقات ص: ۲۱۴

اعتراضات کئے، اس زمانہ میں حضرت مولانا کی صحت خراب تھی، بخار آتا تھا چند قدم چلنے سے سانس اکھڑ جاتا تھا، اور خشک کھانسی اس قدر تھی کہ بات کرنی مشکل تھی۔

سوامی جی کے اعتراضات کے مقامی مسلمانوں نے جوابات دیئے مگر سوامی جی کہتے تھے میں عام آدمیوں سے بات نہیں کرتا مسلمانوں کا کوئی بڑا عالم مجھ سے بات کرے تو میں بحث اور تبادلہ خیال کے لئے تیار ہوں، رڑکی کے مسلمانوں نے حضرت مولانا سے درخواست کی، حضرت مولانا نے فرمایا کہ میرے یہ شاگرد اس کے جوابات اور اس سے مباحثہ کے لئے بہت ہیں مگر سوامی جی کہتے تھے ''مولبی کاسم آئیں تو ان سے بات ہو'' ہر چند کوشش کی گئی کہ اس بیماری میں حضرت مولانا کو تکلیف نہ دی جائے مگر سوامی جی جب کسی طرح تیار نہ ہوئے تو حضرت مولانا نے سفر کا ارادہ فرمالیا اور رڑکی پہنچ گئے، سوامی جی کو شاید خیال بھی نہیں ہوگا کہ حضرت مولانا کے رڑکی تشریف لانے کا میرا مطالبہ پورا ہوسکتا ہے، جانتے تھے کہ حضرت مولانا سخت بیمار ہیں ادھر رمضان سر پر ہیں اس لئے سفر ناممکن ہے مگر حضرت مولانا کی دین کے لئے تڑپ اور دردمندی نے اس کیفیت میں بھی سفر کرا دیا، جب حضرت مولانا آگئے تو سوامی جی کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، اب کیا کریں، سامنا کریں تو کس منہ سے، ایک سوال کا جواب دینا مشکل، نہ کریں تو چیلے چانٹوں پر سے اثر ختم ہوتا ہے، اس لئے حیلے بہانے شروع کئے، حضرت مولانا نے سوامی جی کو خط لکھ کر ملاقات کر کے اور ہر طرح سے کوشش کی کہ سوامی جی سے انکے اعتراضات اور سوالات پر گفتگو ہو جائے، حضرت مولانا سے ایک ہفتہ خط و کتابت ہوئی مگر سوامی نے حیلے بہانے کر کے اس کا موقع ہی نہیں آنے دیا کہ حضرت مولانا سے گفتگو ہوتی، حضرت مولانا سے خط و کتابت چل رہی تھی کہ سوامی جی بلا کسی اطلاع کے رڑکی سے اچانک چلے گئے، اب بحث و مناظرہ کا موقع ہی باقی نہیں رہا تھا، مگر حضرت مولانا نے اپنی بات پہنچانے کا اہتمام کیا کہ رڑکی کے بازاروں میں سوامی کے اعتراضات و سوالات کے جوابات کے وعظ کہے اور سوامی کی خرافات کی صاف تردید کی۔

سوامی دیانند کے مباحثہ کے چیلنج اور حضرت مولانا کے سفر رڑکی کے نتیجہ میں حضرت

مولانا کے متعدد مکتوبات اور دو تصانیف وجود پذیر ہوئیں، حضرت مولانا ۸/اگست سنہ ۱۸۷۸ء (۱۲۹۵ھ) کورڑکی پہنچے تھے، اسی دن سوامی جی کو خط لکھا تھا، یہ خط وکتابت دس دن (۱۸/اگست) تک جاری رہی، اسی دوران حضرت مولانا نے سوامی جی کو جو خط لکھے ان میں سے آٹھ خط دستیاب ہیں، مگر جب سوامی صاحب کسی طور بھی مباحثہ وگفتگو پر تیار نہ ہوئے تو حضرت مولانا نے اپنے شاگردوں خصوصاً مولانا فخر الحسن گنگوہی کو ہدایت فرمائی کہ بازاروں اور عوامی مجمعوں میں سوامی کے اعتراضات کے جوابات دو، اس ہدایت پر عمل ہوا، اور خود حضرت مولانا نے بھی سوامی دیانند کے اعتراضات کے جوابات قلم بند فرمائے حضرت مولانا نے سوامی جی کے اعتراضات کے جوابات کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ان کے علیحدہ علیحدہ جوابات لکھے، سوامی جی کے اسلام پر عام اعتراضات کے جواب میں انتصار الاسلام تالیف کی اور اس اعتراض کے جواب میں کہ مسلمان کعبہ کی پوجا (عبادت) کرتے ہیں قبلہ نما تحریر فرمائی۔ یہ حضرت مولانا کی آخری تالیفی کوشش تھی، اس کے بعد صحت کی خرابی نے اس کا موقع ہی نہیں دیا کہ حضرت مولانا کچھ اور لکھ سکتے، اس تالیف پر وہ باب علم گویا بند ہو گیا جو اس عہد میں خصوصاً اور برصغیر ہند کی اسلامی تاریخ میں عموماً ایک نئی آواز اور نیا علم کلام تھا۔ وکان امر الله قدرا مقدورا۔

سب سے بڑا اور زندۂ جاوید کارنامہ مدارسِ اسلامیہ کا قیام

حضرت مولانا کی زندگی کا بڑا حصہ بڑی دینی علمی اسلامی خدمات میں بسر ہوا، اور ان خدمات کا ہر ایک پہلو امت مسلمہ خصوصاً ہندو پاک کے مسلمانوں کے لئے ہدایت وترقی کا سامان، بے نظیر تحفہ اور قابل فخر ورثہ ہے مگر حضرت مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ اور غیر معمولی خدمت، جس نے برصغیر ہند میں احیائے اسلام اور ترویج دین وشریعت کے علاوہ امت کی ہدایت وفلاح کا ایک بہت بڑا اور دائمی نفع کا ذریعہ بنا دیا، دینی مدارس کا قیام ہے، سنہ ۱۸۵۷ء میں جنگی اقدام کی ناکامی اور اس کے نتیجہ میں پہنچے نقصان سے یہ سبق ملا تھا کہ اب اس ملک میں اسلام اور اسلامی تعلیمات

کو سخت خطرہ درپیش ہے، اگر ابھی سے اس کی تلافی اور انتظام نہ کیا گیا تو آئندہ نسلوں کا دین وایمان محفوظ رہنا سخت مشکل ہوگا، اس سے حفاظت کی یہی ایک تدبیر ہے کہ جگہ جگہ دینی ادارے اور ایسے مدرسے قائم کئے جائیں جو خود کفیل ہوں، ان کے چلانے کے لئے مسلمانوں کے اپنے تعاون کے علاوہ کسی دوسری امداد اور توجہ کی ضرورت نہ ہو، حکومت کوئی بھی ہو، سرکاری نظام کسی طرح بھی کام کرے، یہ مدرسے اور ادارے اپنے مقررہ راستے پر سفر طے کرتے رہیں، ان مدرسوں میں اس کی کوشش اور محنت کی جائے کہ یہاں سے ایسے افراد تیار ہوکر نکلیں جو امت کی کشتی کے کھیون ہار اور ملت کے درد کا درماں ثابت ہوں، دین وشریعت کے تمام معاملات میں پوری پوری اور صحیح صحیح رہنمائی فرمائیں اور جب امت پر کوئی وقت آپڑے یا کوئی دشواری پیش آئے تو یہ علماء دینی علوم وشریعت کی مدد سے اس کا بروقت ادراک کرکے اپنی فہم وبصیرت سے اس کا کوئی حل نکال سکیں۔

حضرت مولانا کی یہی فراست اور دور بینی تھی جس کی اساس پر دیو بند میں ایک چھوٹے سے مدرسے (دار العلوم دیو بند) کی شروعات ہوئی۔ جو بڑھ کر نہ صرف ایک تناور اور گھنیرا درخت بلکہ بجائے خود ایک بڑا انگلستاں اور علم وعقل کا ایسا دبستاں بن گیا جس میں تنوع اور رنگارنگی بھی تھی اور ملت کی تمام ضرورتوں، دکھوں اور مسائل کا دانش مندانہ اسلامی حل بھی۔

مدرسہ دیو بند کے بعد حضرت مولانا نے اسی طریقہ پر اور کئی مدرسوں کی بنیاد رکھی جس میں گلاؤٹھی کا منبع العلوم، مظفرنگر کا مدرسہ مرادیہ، مرادآباد کا مدرسہ شاہی ممتاز ہیں، ان کے علاوہ نگینہ میں اور دوسرے مقامات پر بھی مدرسے قائم فرمائے، یہ سلسلہ کچھ ایسا بابرکت ثابت ہوا کہ چراغ سے چراغ جلتے گئے اور سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر ہند میں مسلمانوں کے وجود اور دینی تشخص اور معاملات ومسائل کے لئے جو ایک بڑا خطرہ سامنے آگیا تھا اس کی بڑی حد تک تلافی ہوگئی، حضرت مولانا کا برصغیر کے مسلمانوں پر یہ اس قدر بڑا احسان ہے کہ اس کی وسعت وگہرائی اور اس کی معنویت کے اظہار کے لئے زبان وبیان کی صلاحیتیں ناکافی اور تشکر وامتنان کے الفاظ بونے معلوم ہوتے ہیں، بس یہی کہا

جا سکتا ہے کہ حق تعالیٰ حضرت مولانا اور ان کے رفقائے کرام اور اس راستے پر چلنے والوں کو پوری امت کی طرف سے اپنے شایان شان اجر و جزا عطا فرمائے اور ان کے مدارج و مراتب بلند کرے اور ان سب پر اپنے فضل و رحمت کی متواتر بارش فرمائے: وما ذلک علی اللہ بعزیز.

مکتوبات و تصانیف

حضرت مولانا کی تصانیف کی تعداد اور مقدار بہت زیادہ نہیں ہے، مولانا کے سلسلہ تصانیف کی ابتداء صحیح بخاری کے آخری پاروں کے حاشیوں کی تالیف سے ہوئی تھی، اس کے بعد حضرت مولانا نے برسوں تک کوئی کتاب نہیں لکھی (اگر لکھی تو وہ محفوظ نہیں رہی اس کا علم نہیں) راقم سطور کی معلومات میں حاشیہ صحیح بخاری کے بعد حضرت مولانا کی پہلی تحریر جو کتابی صورت میں شائع ہوئی وہ انتباہ المؤمنین ہے، مولانا کی پہلی معروف تالیف ہدیۃ الشیعہ ہے جو شیعوں کے سوالات کے جواب میں ۱۲۹۱ھ میں لکھی تھی، اس کتاب کی ایک ضمنی بحث کو علیحدہ لکھا جو آب حیات کے نام سے شائع ہوئی، یہ حضرت مولانا کی کل باقاعدہ تصانیف ہیں۔

حضرت مولانا کے فکر و خیالات کی اصل ترجمانی اور اس کے تنوع کا اظہار حضرت مولانا کے مکتوبات میں ہوا ہے، جن میں حضرت مولانا کی تقریریں، مناظروں کے برجستہ کہے گئے مباحث، اور وہ مکتوبات اور خطوط کے جوابات ہیں۔ حضرت مولانا کے متوسلین اور ملک کے بڑے علماء مختلف موضوعات اور اختلافی بحثوں اور نظریات کے متعلق سوالات پیش کیا کرتے تھے، حضرت مولانا ان کے جواب میں کبھی کبھی کوئی مفصل تحریر رقم فرمادیتے تو وہ علم کا ایک شعلۂ جوالہ محسوس ہوتی تھی، جس میں اس موضوع کے تمام گوشوں پر سیر حاصل گفتگو کے علاوہ اس کے نکات اور نامعلوم پہلوؤں کو بھی حل کرنے کی ایسی کوشش ہوتی جو اس وقت بھی بے مثال تھی اور آج تک بھی اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

حضرت مولانا کے مکتوبات کے موضوع کا دامن اگرچہ بہت وسیع ہے، جس میں قرآن و سنت، فقہ و شریعت، عقائد و کلام کے بے شمار پہلوؤں کی گرہیں کھولی گئی ہیں اور ان مسائل و مباحث کی خاص طور سے تنقید و تحقیق ہے جن کا حضرت مولانا کے دور میں علمی

دینی محفلوں میں چرچا اور تذکرہ تھا، اور یہ ایک بڑا المیہ اور خسارہ ہے جس کا ہماری دینی علمی تاریخ میں بارہا اعادہ ہوا ہے کہ اس عہد کی بڑی اور نادر روزگار شخصیتوں کو وقتی بحثوں اور غیر ضروری اختلافی موضوعات میں الجھا کر ان کے ذہن اور وقت کا ایک خاصا حصہ اس میں ضائع کرا دیا جاتا ہے، حالاں کہ یہ شخصیتیں اس مرتبہ کی ہوتی ہیں کہ اگر وہ علوم عالیہ، تفسیر وحدیث اور اسرارِ شریعت وسلوک پر توجہ فرماتیں تو ان علوم کے بہت سے گوشوں سے پردے اٹھتے، نئے نئے عنوانات اور ایسی تحقیقات سامنے آتیں کہ ایک دنیا ان سے استفادہ کرتی، مگر کیا کیا جائے اس غیر ضروری مصروفیت کی وجہ سے ان کے علوم کا ایک خزانہ قلم بند ہونے سے محروم رہ جاتا ہے، جسکے نتیجہ میں امت ایسے بڑے علمی نقصانات سے گذرتی ہے جس کی تلافی نہیں ہوسکتی۔

بہر حال حضرت مولانا کے تقریباً ایک سو پندرہ مکتوبات معلوم ہیں، جو پچاس کے قریب مضامین وسوالات کی گرہ کشائی کررہے ہیں، ان مکتوبات میں سے کئی مکتوب یا کسی ایک موضوع پر دو تین مکتوبات کا مجموعہ ہیں جو حضرت مولانا کی تصنیف کی حیثیت سے چھپ گئے ہیں اور تصانیف میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ایسے مکتوبات میں جو تصانیف کے زمرہ میں شامل اور عموماً مطبوعہ دستیاب ہیں، مصابیح التراویح، اجوبہ اربعین، الاجوبة الکاملة فی الاسولة الخاملة، الدلیل المحکم علی قراء ۃ الفاتحة للمؤتم، توثیق الکلام فی الانصات خلف الامام، اسرار قرآنی، انتباہ المؤمنین، انتصار الاسلام، تحذیر الناس، تحفہ لحمیہ، تصفیۃ العقائد، ابطال جزء لایتجزیٰ، حق الصریح فی اثبات التراویح، احکام الجمعہ وغیرہ ہیں ان میں سے اکثر کتابوں کے نام بھی ناشرین کے تجویز کئے ہوئے ہیں، نہ حضرت مولانا نے ان کو کتابی صورت میں مرتب کیا نہ ان کے نام طے فرمائے۔

ان کے علاوہ بھی حضرت مولانا کے مکتوبات کا ایک بڑا اور وقیع ذخیرہ ہے، جو علیحدہ علیحدہ مختلف اصحاب نے مرتب کئے تھے جن میں سب سے اہم مجموعہ، قاسم العلوم ہے جو منشی ممتاز علی نے مرتب کیا تھا، یہ مجموعہ چار حصوں میں میرٹھ سے چھپا تھا، لطائف قاسمیہ،

مکتوباتِ قاسمیہ، مکتوبات قاسمیہ (دیگر) مرتبہ مولانا عبدالغنی پھلاودی، فرائد قاسمیہ، فیوض قاسمیہ، جمال قاسمی حضرت مولانا کے مکتوبات کے معروف مجموعے ہیں لیکن حضرت مولانا کے اور بھی مکتوبات ہیں جو مختلف کتابوں یا خطوط کے مجموعوں میں شامل ہیں۔

ضرورت ہے کہ حضرت مولانا کے تمام مکتوبات کو مضامین کی ترتیب سے مرتب کیا جائے ان کا عمدہ اردو ترجمہ ہو اور ان کو ضروری حواشی کے ساتھ شائع کیا جائے۔

سفرحج حضرت مولانا کو تین مرتبہ زیارت حرمین کی سعادت میسر آئی، پہلا سفر حج سنہ ۱۸۵۷ء (۱۲۷۳ھ) کے بعد اس وقت ہوا جب مولانا تحریک سنہ ۱۸۵۷ء میں شرکت کی وجہ سے روپوشی میں وقت گذار رہے تھے۔

اس سفر کی ابتداء ۵/جمادی الاول سنہ ۱۲۷۷ھ (۲/نومبر سنہ ۱۸۶۰ء) کو ہوئی، نانوتہ سے چل کر چھ مہینہ میں ۲۱/ذی قعدہ (یکم جون سنہ ۱۸۶۱ء) کو مکہ معظمہ پہنچے، ایک سال بعد غالباً رمضان المبارک سنہ ۱۲۷۸ھ میں واپسی ہوئی۔

دوسرے سفرحج کا ارادہ اچانک ہوا، مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے الفاظ میں "چند رفقاء کو ساتھ لے کر حج کر آئے" اس سفر کیلئے آٹھ شوال سنہ ۱۲۸۶ھ (جنوری ۱۸۷۰ء) کو وطن سے روانہ ہوئے تھے، تقریباً بیس دن تک جہاز کے انتظار میں بمبئی ٹھہرنا ہوا، اسی فرصت اور قیام کے زمانہ میں آبِ حیات کا اکثر حصہ لکھا تھا، مکہ معظمہ پہنچنے کی تاریخ دستیاب نہیں، حج کے بعد ۲۳/ذی الحجہ سنہ ۱۲۸۶ھ ۲۶ مارچ سنہ ۱۸۷۰ء کو مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کیلئے روانہ ہوئے، اس سفر میں زیادہ وقت صرف نہیں ہوا، جلد ہی واپس آ گئے تھے۔

تیسرا اور آخری سفرحج سنہ ۱۲۹۴ھ میں ہوا، اس سفر میں حضرت مولانا گنگوہی مولانا محمد یعقوب اور احباب و رفقاء کی ایک خاصی بڑی جماعت ساتھ تھی، ۱۰/شوال سنہ ۱۲۹۴ھ (۱۸/اکتوبر سنہ ۱۸۷۷ء) میں وطن سے نکلے اٹاوہ ہوتے ہوئے بمبئی پہنچے، بمبئی سے ذی قعدہ کی پہلی تاریخ (سات نومبر) کو چلے ۱۴/ذی قعدہ کو جدہ کے ساحل پر اترے، حج کے بعد غالباً ۲۵/ذی الحجہ کو مدینہ طیبہ حاضری کے قصد سے روانہ ہوئے پچیس دن مدینہ طیبہ کی مبارک فضاؤں میں گذار کر مکہ معظمہ واپس ہو گئے، اور چند دنوں کے بعد ہندوستان کے

لئے واپس چلد یئے۔

آخری بیماری اور وفات

آخری حج سے واپسی کے سفر میں جہاز میں بیمار ہو گئے تھے، یہ بیماری جان لیوا ثابت ہوئی کسی وقت بھی اس سے پورا افاقہ نہیں ہوا، کبھی آرام کی صورت ہو جاتی پھر بیماری حملہ کرتی جس کی وجہ سے بے انتہا کمزوری ہوگئی تھی مگر اس درمیان بھی معمولات اور درس کا سلسلہ جاری رہا، اسی میں رڑکی پھر میرٹھ کا سفر ہوا۔

بیماری نے شدت اختیار کر لی تھی اسی حالت میں اپنے استاد حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کی مزاج پرسی کیلئے سہارنپور گئے، وہاں جا کر صحت اور خراب ہوگئی بالآخر دیوبند واپس ہوئے، یہ حضرت مولانا کا آخری سفر تھا، سہارنپور سے واپسی سفر آخرت کا آغاز تھی، اسی وقت سے صحت نازک ہوتی چلی گئی، آخری دو دن بے ہوشی اور غفلت کے گذرے، کوئی دوا علاج کارگر ثابت نہ ہوئی، ہر لمحہ مرض بڑھتا رہا، منگل کے دن مکمل غفلت اور بے ہوشی طاری ہوگئی، ۴؍ جمادی الاول سنہ ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۵؍ اپریل سنہ ۱۸۸۰ء پنجشنبہ کی صبح کو آخری سانس لیا اور روح عالم بالا کو پرواز کر گئی۔ سخت بیماری کی خبر دور دور تک پہنچ گئی تھی، اسلئے ہر طرف سے آنے والوں کا بڑا ہجوم رہتا تھا، وفات کی خبر بھی بجلی کی طرح پھیلی اور چند گھنٹوں میں ایسا مجمع ہو گیا کہ مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے مشاہدے اور معلومات کے مطابق ''اتنا مجمع ان بستیوں میں کبھی دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا''

حضرت مولانا کے ایک نیاز مند حکیم مشتاق احمد دیوبندی نے اپنی ایک زمین حضرت مولانا کے دفن اور قبرستان کیلئے اسی وقت وقف کی، اسی میں مغرب کے بعد حضرت مولانا کو دفن کیا گیا، وفات پر ایسا رنج وغم ہوا جسکی مثال دیکھنے میں نہیں آئی تھی، مگر اس وقت بھی سب نے خود پر قابو رکھا اور رونا پیٹنا یا کوئی اور کام خلافِ شریعت نہیں ہوا۔ کئی لوگوں نے مرثیے لکھے، قطعاتِ تاریخ وفات کہے گئے اور مہینوں غم تازہ رہا۔

رحمه الله تعالى و رضي عنه.

[۱۴] حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ (۳)

حضرت مولانا مملوک العلی کے فرزند ارجمند، ۱۳/صفر ۱۲۴۹ھ ۲/ جولائی ۱۸۳۳ء کو تولد ہوئے، منظور احمد معروف تاریخی نام ہے، وطن کے مکتب میں قرآن شریف پڑھا تقریباً گیارہ سال کی عمر میں والد ماجد کے ہمراہ نانوتہ سے دہلی آئے، والد کے ظل عاطفت اور شہرۂ آفاق علمی حلقہ میں شریک اور دہلی کالج کے طالب علم رہے، حدیث شریف حضرت مولانا محمد قاسم، حضرت مولانا احمد علی محدث اور حضرت شاہ عبدالغنی سے پڑھی۔

۱۸۵۷ء سے پہلے تک اجمیر بنارس، رڑکی میں سرکاری مدرسوں میں اعلیٰ مدرس رہے ۱۸۵۷ء کے بعد مطبع مجتبائی میرٹھ، مطبع منشی نول کشور لکھنؤ اور بریلی میں مولانا محمد احسن کے مطبع صدیقی سے وابستہ رہے۔

مدرسہ دیوبند (دارالعلوم) قائم ہونے کے بعد بریلی سے دیوبند آ گئے تھے، مدرسہ کے مدرس اول مقرر کئے گئے اور آخری لمحات تک اسی عہدہ پر فائز اور مدرسہ کی علمی تعلیمی ترقی میں مشغول رہے۔

۲/ربیع الاول ۱۳۰۲ھ (۱۰/دسمبر ۱۸۸۵ء) شب دوشنبہ کو نانوتہ میں وفات ہوئی وہیں دفن کئے گئے مفصل حالات باب نمبر (۲۰) میں حضرت مولانا مملوک العلی کی اولاد و احفاد کے تعارف میں گذر گئے ہیں۔

[۱۵] مولانا محمد احسن نانوتویؒ (۴)

مولانا محمد احسن کا مولانا مملوک العلی کے خانوادہ بلکہ گھرانہ سے قریبی رشتہ تھا، مولانا محمد احسن کے والد شیخ لطف علی نانوتوی حضرت مولانا مملوک العلی کے چچا شیخ محمد حسن کے بیٹے اور مولانا محمد مظہر نانوتوی کے چھوٹے بھائی تھے، یعنی مولانا محمد مظہر اور مولانا محمد احسن

مولانا مملوک العلی کے بھتیجے تھے۔

مولانا محمد احسن کا صحیح سنہ ولادت معلوم نہیں، تقریباً سنہ ۱۲۴۱ھ (۲۶-۱۸۲۵ء) میں ولادت ہوئی، بچپن کے حالات اور ابتدائی تعلیم درسیات کی کیفیت بھی معلوم نہیں، متوسط سے اعلیٰ درجوں تک مولانا مملوک العلی سے پڑھا، مولانا احسن کے دل میں حضرت مولانا مملوک العلی کا کس قدر احترام تھا اس کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حضرت مولانا کو جنابِ اعلیٰ حضرت یا حضرت مولانا صاحب کے تعظیمی الفاظ سے یاد کرتے تھے۔(۱)

مولانا محمد احسن نے مولانا سبحان بخش شکارپوری کو بھی اپنا استاد لکھا ہے، مولانا شکارپوری دہلی کالج میں مدرس دوم تھے اس لئے قرین قیاس ہے کہ مولانا محمد احسن نے دہلی کالج میں بھی پڑھا ہو۔ اپنے معاصرین اور ہم وطن علماء اور عزیزوں کی طرح حدیث حضرت شاہ عبدالغنی مجددی اور حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری سے پڑھی۔ حصن حصین کی سند و اجازت حضرت شاہ عبدالغنی کے علاوہ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری اور مولانا سبحان بخش شکارپوری سے تھی۔

ملازمتِ بنارس مولانا محمد احسن کے بڑے بھائی مولانا محمد مظہر بنارس کالج میں عربی کے مدرس اول تھے، جب مولانا محمد مظہر سنہ ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں حج کیلئے جانے لگے تو مولانا نے اس ملازمت پر مولانا محمد احسن کو عارضی طور پر اپنے قائم مقام کی حیثیت سے مقرر کرا دیا تھا، مگر مولانا محمد مظہر کو اس سفر میں توقع سے زیادہ وقت لگا، مولانا ایک سال کی رخصت لے کر گئے تھے مگر وقت مقررہ پر واپس نہ آسکے، سفر میں دو سال نکل گئے تھے اور رخصت کے وقت پر ایک سال زائد گذر گیا تھا، اس لئے مولانا اس کام پر واپس نہیں گئے، مولانا محمد احسن کا تقرر جو عارضی تھا اس کو مستقل کرا کر خود اس فکر سے یکسو ہو گئے۔

مولانا محمد احسن شوال ذی قعدہ ۱۲۶۸ھ (اگست ۱۸۵۲ء) تک بنارس کے مدرسہ میں کام کرتے رہے، غالباً اسی سال کے آخر میں بنارس سے بریلی کالج میں آگئے تھے۔(۲)

(۱) ملاحظہ ہو مولانا محمد احسن نانوتوی، ایوب قادری ص: ۲۲، ۲۳، ۳۳ (کراچی ۱۹۶۶ء) (۲) ایضاً ص ۳۸ تا ۴۳

بریلی میں ملازمت وتقرر مولانا کی زندگی کا ایک بڑا اور اہم سنگ میل ہے، اگرچہ بنارس کی ملازمت کے دور میں بھی مولانا علمی کاموں سے دور نہیں تھے لیکن بریلی پہنچ کر ان میں جو تیزی، سرگرمی اور رنگارنگی آئی بنارس میں اس کا نام ونشان بھی نہیں تھا، بریلی پہنچ کر مولانا کی مخفی صلاحیتیں بیدار ہوگئیں، اور ان کے ایسے جوہر کھلے کہ اہل نظر علماء اور مولانا کے معاصرین بھی دنگ رہ گئے ہوں گے۔

بریلی کا دورِ ملازمت مولانا کی خدمات، ترقیات، علمی تصنیفی کارناموں اور عملی جدو جہد کے شباب کا دور تھا۔ جس میں میدانی جدو جہد بھی تھی، تعلیم وافادہ بھی تھا، تصنیف و تالیف بھی اور اصلاح وتبلیغ بھی، اس وقت مولانا متنوع بلکہ متضاد کاموں کو اس خوبی سے انجام دے رہے تھے کہ حیرت ہوتی ہے۔ مولانا اس وقت ایک مدرس، سرکاری مدرسہ یا کالج کے استاد ہی نہیں تھے بلکہ بڑے عالم اور علاقہ کے نامور مرجع اور مقتدا تھے، بریلی شہر کے امام عیدگاہ اور مفتی تھے، اعلیٰ درجہ کے مدرس تھے، پایہ کے مصنف ومترجم تھے، اہم ترین علمی کتابوں کے مرتب ومحقق اور ناشر تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی کتابوں کے پارکھ، قلمی نسخوں کے رمز آشنا اور اُنکے تصحیح وغلط کے رازداں تھے۔ ایک مدرسہ کے بانی و نگراں اور ایک ہفت روزہ اخبار کے مدیر وسرپرست بھی تھے۔

مولانا کو بریلی کالج میں فارسی کا مدرس بنایا گیا تھا بعد میں جب عربی کا شعبہ قائم ہوا تو اس کے بھی سربراہ بنادیئے گئے، غالباً آخر تک دونوں شعبے مولانا کی سرپرستی میں کام کرتے رہے۔

بریلی میں مولانا نے بھرپور اور نہایت مصروف وقت گذارا۔ مولانا اپنے علمی اشاعتی، تصنیفی کام میں مشغول تھے کہ سنہ ۱۲۹۰ھ (۷۴-۱۸۷۳ء) میں، مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے والد مولوی علی نقی خاں (۱) نے مولانا کے خلاف ایک عوامی محاذ کھول دیا، عوام میں سخت شورش بھڑکائی، جس نے خطرناک صورت اختیار کرلی تھی مگر مولانا محمد احسن نامساعد حالات کے باوجود بریلی میں رہتے رہے، لیکن جب سنہ ۱۸۷۷ء

(۱) تفصیلات کے لئے دیکھئے مولانا محمد احسن نانوتوی، ایوب قادری ص: ۸۴ تا ۹۱

(۱۲۹۴ھ) میں بریلی کالج ناقابل برداشت مصارف کی وجہ سے بند کردیا گیا تو مولانا محمد احسن اور ان کے بھائی مولانا محمد منیر جن کے دم سے بریلی میں علمی دینی حرکت اور علمی کارواں میں حرارت وقوت تھی، سب کام ختم کرکے اپنے وطن نانوتہ واپس آ گئے تھے، اس کے بعد اکثر وقت نانوتہ میں قیام رہا۔

مولانا کی علمی تصنیفی خدمات

مولانا محمد احسن کو زمانہ تعلیم سے تحریر وتالیف سے مناسبت اور دلچسپی تھی، جب مولانا دہلی میں پڑھتے تھے اس زمانہ میں نیچرل فلاسفی پر اُردو میں ایک کتاب لکھی تھی جو ایک سو تیس صفحات پر مشتمل تھی، اس کے دو ایڈیشن دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر کی دلچسپی سے چھپے تھے (۱) دوسری تالیف تحفۃ المحصنین ہے جس میں ان عورتوں کا ذکر ہے جن سے نکاح منع ہے، یا ان میں سے دو کو ایک نکاح میں جمع کرنا حرام ہے، یہ کتاب بنارس میں تقرر کے دو سال بعد سنہ ۱۲۶۳ھ میں عیدین کے درمیان (اکتوبر، دسمبر ۱۸۴۷ء) میں لکھی تھی، جو پہلی مرتبہ مصطفائی لکھنؤ سے شائع ہوئی (۲) اس وقت سے مولانا کے قلم کا سفر ہمیشہ جاری رہا اور ہمیشہ بہتر سے بہتر کی جانب دوڑتا اور ترقی کرتا رہا۔

مولانا نے دس گیارہ کتابیں لکھیں، تقریباً اسی قدر کتابوں کے ترجمے کئے اور اتنی ہی کتابوں کی تصحیح وتحقیق کی اور ان پر حاشیے لکھے۔ مولانا کی اردو تصانیف نافعہ خریداران (جس میں خرید وفروخت کے مسائل آسان زبان میں لکھے ہیں) رسالہ عروض، قواعد اردو (حصہ چہارم) اور نیچرل فلاسفی ہیں۔ حضرت نانوتوی کی مشہور کتاب تحذیر الناس بھی مولانا محمد احسن کی مرتبہ ہے، عربی میں مولانا کی تالیف مفید الطالبین بہت مشہور ہے جو مدارس اسلامیہ کے ابتدائی درجوں کے نصاب میں آج بھی شامل ہے، نفحۃ الیمن پر مفصل حاشیہ، اسی طرح کنز پر نہایت عمدہ مفصل حاشیہ مولانا کی علمی تصنیفی یادگار ہے۔

---

(۱) مولانا محمد احسن نانوتوی، ایوب قادری، ص:۲۵۔ ایک نادر مجموعہ مکاتیب (مکتوبات مشاہیر علمائے عصر بنام اسپرنگر پرنسپل دہلی کالج مرتبہ ڈاکٹر محمد اکرام چغتائی) ص:۹۹ سہ ماہی اُردو کراچی شمارہ دوم ۱۹۸۵ء

(۲) تحفۃ المحصنین اور نافع خریداران کی پہلی طباعتوں کا ایک ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں ہے۔

اردو تراجم

مولانا نے تقریباً دس کتابوں کا عربی یا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا، جن میں چند بہت بڑی بڑی اور غیر معمولی علمی کتابوں کے ترجمے بھی ہیں اور چھوٹی کتابوں کے بھی۔ بڑی کتابوں میں حضرت امام غزالی کی احیاء العلوم کا مکمل اور بہترین عمدہ ترجمہ مذاق العارفین کے نام سے بڑی چار جلدوں میں چھپا۔ علامہ ابن قیم کی تبعید الشیطان به تقریب اغثة اللہفان کا ترجمہ تہذیب الایمان کے نام سے شائع کیا، حصن حصین کا خیر متین کے نام سے سلیس اردو ترجمہ کیا، حضرت شاہ ولی اللہ کی تالیفات عقد الجید فی الاجتہاد و التقلید اور الانصاف کے سلک مروارید اور کشاف کے نام سے عمدہ اردو ترجمے کئے، حضرت مجدد الف ثانی کی تالیف اسرار الصلوٰۃ کا نکاتِ نماز کے نام سے ترجمہ کیا، انگریزی کی ایک کتاب کا بھی اردو میں ترجمہ کیا۔ جس کا نام حمایت الاسلام ہے۔ ترجمہ کے سلسلہ میں مولانا کی ایک بڑی دینی علمی یادگار بلکہ کارنامہ حضرت مولانا خرم علی کے درمختار کے اردو ترجمہ کی تکمیل اور اشاعت ہے، مولانا خرم علی بلہوری نے درمختار کا اردو ترجمہ کیا تھا جو نامکمل تھا، اور ناقص ہونے کی وجہ سے اس کے چھپنے کی بھی اُمید نہیں تھی، مولانا محمد احسن کو اس کا پتہ چلا تو انہوں نے مولانا خرم علی کے وارثوں سے حق تصنیف ادا کر کے یہ ترجمہ خریدا، پھر اس کے ناتمام حصہ کو اسی نہج پر مکمل کیا، مختصر حاشیے لکھے اور اس کو غایۃ الاوطار ترجمہ اردو درمختار کے نام سے چار بڑی جلدوں میں شائع کر دیا۔

مولانا خرم علی بلہوری نے جو ترجمہ کیا تھا اس میں باب الاذان سے کتاب الصلوٰۃ تک کا ترجمہ شامل نہیں تھا، مولانا محمد احسن نے اس باب کا مکمل ترجمہ کیا اور مولانا خرم علی کے ترجمہ پر نظر ثانی کی۔ اس بڑے کام میں مولانا محمد احسن کے بڑے بھائی، مولانا محمد مظہر شروع سے آخر تک شریک اور مولانا احسن کے معاون و مددگار رہے۔

تصحیح وحواشی اور تدوین متن

ترجموں کے علاوہ مولانا احسن کی ایک اور قابل ذکر دینی خدمت چند بڑی کتابوں کی دقت نظر سے تصحیح کے بعد اشاعت اور ان کے ضروری حاشیے لکھنے کی ہے، مولانا نے قاضی عیاض کی شہرہ

آفاق تصنیف شفاء کو مرتب کیا، اس کے متن کی تصحیح کی اور مختصر حاشیے کے ساتھ اپنے مطبع صدیقی سے شائع کر دیا۔ کنز الدقائق پر بھی بہت مبسوط اور جامع حاشیہ لکھا، کنز پر ہندوستانی علماء کے جو حاشیے چھپے ہیں ان میں مولانا محمد احسن کا حاشیہ سب سے جامع اور بہتر معلوم ہوتا ہے۔ انکے علاوہ بھی متعدد کتابوں کو اپنے افادات و تصحیحات سے گراں بہا بنایا۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی کتابوں کی تصحیح واشاعت

مولانا نے حضرت شاہ ولی اللہ کی اہم کتابوں کی تصحیح و اشاعت کا بڑا کارنامہ نہایت عمدہ طریقہ سے انجام دیا۔ حضرت شاہ صاحب کی دو کتابوں کے ترجمہ کا ذکر آچکا ہے، ان کے علاوہ حضرت شاہ صاحب کی اہم اور ممتاز ترین تصانیف میں سے تین کتابیں حجة الله البالغه، ازالة الخفاء عن خلافة الخلفاء اور قرة العينين فى تفضيل الشيخين بہت محنت توجہ اور تصحیح و تحقیق کے بعد شائع کیں۔

حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفاء کی طباعت مولانا منشی جمال الدین کتانوی مدار المہام ریاست بھوپال کی ہدایت پر منشی جی کے صرفہ سے عمل میں آئی تھی۔ منشی جی نے ان کتابوں کی طباعت کے اخراجات کے علاوہ ان کے قلمی نسخوں کی فراہمی کی بھی کوشش کی، مولانا نے دونوں کتابوں کے قلمی نسخوں (حجۃ اللہ البالغہ کے چار اور ازالۃ الخفاء کے تین) کو سامنے رکھ کر ان کا متن مرتب کیا، ضروری جامع اور مختصر حاشیہ لکھا، نہایت عمدہ کتابت کرائی، ایسی کہ اس زمانہ میں اس کی نقل بھی آسان نہیں۔ مشکل مقامات پر اعراب لگائے اور دونوں کتابوں کو جملہ خوبیوں سے مرصع کر کے چھاپا، یہ بات دلچسپ اور قابل ذکر ہے کہ ان دونوں اہم ترین نہایت دقیق علمی کتابوں کا کاتب ایک غیر مسلم (مٹھولال) تھا۔

اس کے علاوہ شاہ صاحب کی ایک اور کتاب قرۃ العینین ہے۔ مولانا بریلی سے نانوتہ واپسی کے بعد بھی ہمیشہ علمی کاموں میں لگے رہتے تھے، اس زمانہ میں مولانا نے جو کتابیں مدون و مرتب کیں یا انکے ترجمے کیے وہ مطبع مجتبائی سے چھپے۔ قرۃ العینین کو تین

قلمی نسخوں کی مدد سے جن میں سے ایک سنہ ۱۲۲۹ھ کا لکھا ہوا تھا مرتب کیا، اپنے قدیم علمی معمول کے مطابق اسکی مشکلات کو حل کیا اور اس پر مختصر حاشیہ بھی لکھا، قرۃ العینین کا یہ نسخہ مطبع مجتبائی سے سنہ ۱۳۱۰ھ (۹۳-۱۸۹۲ء) میں چھپا تھا چند سال پہلے اسکا عکس پاکستان سے شائع ہوا ہے۔ حصن حصین کا اردو میں ترجمہ کیا جو خیر متین کے نام سے شائع ہوا۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے سلسلہ تصانیف وطباعت کی خدمت میں مولانا کا ایک اور کام بھی قابل ذکر ہے، مولانا نے مطبع مجتبائی کی فرمائش پر حضرت شاہ عبدالعزیز کے مجموعہ فتاویٰ کی قلمی نسخوں سے مطابقت وتصحیح کی اور اس کو لائق اشاعت بنایا۔ یہ نسخہ پہلی مرتبہ سنہ ۱۵-۱۳۱۴ھ میں مطبع مجتبائی سے چھپا تھا (۱) اس کے بعد بھی کئی بار شائع ہوا ہے۔

مولانا کا مطبع صدیقی بریلی اور اس کی مطبوعات

برصغیر ہند میں اعلیٰ درجہ کے جو چند اشاعتی دینی علمی ادارے قائم ہوئے جن کی مطبوعات و خدمات سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اور ہمیشہ آنکھوں سے لگائی جاتی ہیں اور جو حسن طباعت کے علاوہ صحت، حسن کتابت اور اپنی دوسری خوبیوں میں بھی ممتاز ہیں انھیں میں مطبع صدیقی بریلی بھی شامل بلکہ سرفہرست ہے۔ مطبع صدیقی مولانا محمد احسن نے قائم کیا تھا مولانا کے چھوٹے بھائی مولانا محمد منیر حسن اس کے مہتمم تھے، کتابوں کی تصحیح وتحقیق اور حاشیہ وغیرہ کا کام مولانا محمد احسن انجام دیتے تھے۔ مطبع صدیقی نے مولانا احسن کی کتابوں کے علاوہ دینی، علمی، اصلاحی، درسی، تاریخی ادبی موضوعات پر بیسیوں کتابیں شائع کیں، جن میں صحت کا اہتمام اور طباعت وکتابت کی عمدگی ایک مشترک وصف ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ مولانا محمد احسن نے یہ پریس قائم کرنے سے پہلے ہی کتابوں کی تجارت واشاعت شروع کر دی تھی بعد میں مطبع قائم کیا، اس مطبع کی ابتداء کب ہوئی اس کا صحیح علم نہیں، قیاس ہے کہ محرم سنہ ۱۲۷۹ھ (جولائی ۱۸۶۳ء) میں آغاز ہوا ہوگا، مولانا کی

---

(۱) فتاویٰ عزیزی کی سب سے پہلی طباعت کا راقم کو علم نہیں لیکن پہلا اردو ترجمہ غالباً وہ ہے جو مولانا نواب رامپور، مہاجر مکی اور عبدالجلیل نعمانی نے ۱۳۱۱ھ میں کیا تھا جو پہلی مرتبہ رمضان ۱۳۱۳ھ میں مطبع کنز العلوم حیدرآباد سے چھپا تھا۔

بیاض میں اس پریس کا پہلا تذکرہ ربیع الاول سنہ ۱۲۷۹ھ (ستمبر ۱۸۶۲ء) کی ایک تحریر میں ہے۔ مطبع صدیقی کو صرف اشاعتی ادارہ کہنا اچھا معلوم نہیں ہوتا، جس کو بلا تامل ولی اللہی اکیڈمی اور برصغیر ہند کے مایۂ ناز علمی اشاعتی تحریری اداروں میں ذکر کیا جا سکتا ہے۔ مطبع صدیقی نے سنہ ۱۲۷۹ھ سے سنہ ۱۲۹۵ء تک تقریباً سولہ برس کام کیا، جب بریلی میں مولانا کے خلاف شورش بھڑکائی گئی اور پھر بریلی کالج بھی ختم ہوگیا جس سے مولانا وابستہ تھے، تو مولانا مطبع کا کام ختم کرکے نانوتہ واپس آگئے تھے۔(۱)

مولانا کا ہفت روزہ احسن الاخبار، بریلی

مولانا محمد احسن نے بریلی سے ایک ہفت روزہ اخبار بھی جاری کیا تھا جس کا نام مولانا کے نام پر احسن الاخبار تھا، احسن الاخبار محمد اشرف کی اطلاع کے مطابق ۲۲/ربیع الاول سنہ ۱۲۷۹ھ ۱۷/ستمبر ۱۸۶۲ء سے چھپنا شروع ہوا تھا عموماً جمعہ کو چھپتا تھا اس کی سالانہ قیمت سات روپے دس آنے تھی (۲) افسوس اس اخبار کے شمارے اور اس کے متعلق مفصل معلومات دستیاب نہیں۔

مولانا کے قائم کیے ہوئے مدرسے مصباح التہذیب اور مصباح العلوم، بریلی

بریلی میں متعدد بڑے علماء موجود تھے جو اپنی اپنی جگہ درس و تعلیم میں مشغول رہتے تھے، مولانا محمد احسن کی صلاحیتوں کا بھی اسی میدان میں آغاز ہوا تھا، مولانا نے بریلی پہنچ کر اپنی اور مصروفیات کے ساتھ ایک دینی مدرسہ کی بھی بنیاد ڈالی، جس کا سنہ ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء) میں آغاز ہوا اس کا نام مصباح التہذیب رکھا گیا، مدرسہ کے پہلے مہتمم مرزا غلام قادر بیگ تھے مگر مولوی احمد رضا کے والد مولوی نقی علی خاں کی مخالفت کی وجہ سے مدرسہ پر بھی اثر پڑا، بعد میں مولانا محمد احسن نے اس کا نام بدل کر مصباح العلوم کردیا، جو کسی نہ کسی صورت میں

(۱) تفصیلات کے لئے دیکھئے مولانا محمد احسن نانوتوی ص:۱۴ (لکھنؤ ۱۸۸۸ء) نیز مولانا محمد احسن نانوتوی ص:۷۹

(۲) اختر شہنشاہی۔ محمد اشرف ص:۱۴ (لکھنؤ ۱۸۸۸ء) نیز مولانا محمد احسن نانوتوی ص ۷۹

اب تک موجود ہے اور چل رہا ہے۔

مدرسہ احسن المدارس، نانوتہ جب مولانا بریلی سے نانوتہ آ گئے تو نانوتہ میں احسن المدارس کے نام سے ایک مدرسہ شروع کر دیا، جس کو مولانا منشی جمال الدین کی بدولت بھوپال سے امداد ملتی تھی، یہ مدرسہ سنہ ۱۹۳۷ء تک قائم رہا، جب سنہ ۱۹۳۷ میں کانگریس کی وزارت قائم ہوئی تو کانگریس کے بعض کارکنوں نے مدرسہ کو ختم کر کے یہاں پرائمری اسکول قائم کرا دیا۔ انا لله وانا اليه راجعون.

مولانا کو بنیاد اور نشانہ بنا کر چند لوگوں کی علمائے دیوبند کے خلاف الزام تراشی اور مخالفت، جو بریلی اور دیوبند کے قضیہ کی بنیاد اور اصل وجہ ہے

اوپر گذر گیا ہے کہ مولانا احسن بریلی میں علم و عمل کے ہر اک دائرہ میں سرگرم تھے، مولانا بریلی آئے اور وہاں کی دینی علمی فضاؤں پر چھا گئے، مولانا کے حسن عمل، کوشش اور اخلاص کی وجہ سے اہل شہر بھی مولانا کے نیازمندوں میں شامل ہو گئے تھے، یہاں تک کہ مولانا بریلی کے مرجع اور مقتدا ہو گئے، شہر کی عیدین کے امام بن گئے، رویت ہلال کا فیصلہ بھی مولانا کے فتوے پر ہوتا اور دینی مسائل میں بھی مولانا کا فتویٰ معتمد تھا، مولانا کی اس پذیرائی کی وجہ سے مولانا کے خانوادہ کے کئی اہل علم وفضل اصحاب مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا فضل الرحمان دیوبندی اور شیخ الہند کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی دیوبندی ایک ایک کر کے سب بریلی میں جمع ہو گئے تھے اور وہاں علم وعمل کی تابناکی میں اضافہ کر رہے تھے، شہر کے جو پرانے علماء تھے یا اور اہل درس وافادہ جو شہر میں پہلے سے دینی خدمتوں میں مشغول تھے وہ بھی ان حضرات کے مداح تھے، یہ سب صاحبان آپس میں روابط رکھتے تھے اور ایک دوسرے کے مددگار و دم ساز تھے، کوئی اختلاف

وانتشار نہ تھا، معاصرت اور کشاکشی سے محفوظ تھے۔ بریلی کے علماء میں احمد رضا فاضل بریلوی کے والد، مولوی علی نقی خاں بھی شامل تھے، وہ عیدین کی نمازیں مولانا کی امامت میں پڑھتے تھے، مولانا کے بریلی کے قیام کے زمانہ میں مولوی علی نقی خاں کی دو کتابیں چھپیں، دونوں میں حضرت مولانا رشید احمد اور مولانا محمد قاسم کی تحسین کی تھی مگر شاید موصوف کو مولانا کے عروج واقتدار سے ناگواری تھی، بریلی کی عیدین کی امامت اور مذہبی قیادت اپنے لئے چاہتے تھے، مگر مولانا جیسی بڑی علمی شخصیت کے ہوتے ہوئے ان کو کون پوچھتا، انکی یہ حسرت دل کی دل میں رہی جارہی تھی اور وہ مولانا کے خلاف آواز اٹھانے اور شورش برپا کرنے کیلئے کسی موقع کی تلاش میں تھے لیکن کوئی ایسی بات نہیں ملی تو انہوں نے لکیر کو سانپ بنا کر دکھانے کا ارادہ کرلیا اور بدقسمتی سے اس میں کامیاب بھی ہو گئے۔

اس وقت تک نہ اہل بریلی کو نہ بریلی کے عمائد وعلماء کو دیوبند کے بزرگوں اور علماء سے کچھ پرخاش تھی نہ اختلاف ومنازعت، تاہم بدایوں کے چند علماء مولوی فضل رسول بدایونی اور ان کے چند ماننے والے شاہ ولی اللہ اور اس خانوادہ کے علماء خصوصاً حضرت شاہ محمد اسماعیل کے نظریات وعقائد کی تردید میں برسوں سے مسلسل لکھ رہے تھے، لیکن یہ بھی اک واقعہ ہے کہ بدایوں اور نواح کے اکثر علماء اور مشائخ اس قضیہ میں غیر جانبدار رہے اور جس طرح بدایوں میں مولوی فضل رسول کے ہم نواؤں کا ایک حلقہ تھا اسی طرح خاندان ولی اللہی کے منتسبین کی بھی ایک جماعت تھی جو اپنی اپنی جگہ دینی خدمت انجام دے رہی تھی اور خانوادہ حضرت شاہ ولی اللہ سے دین واعتقاد صحیح کی جو دولت ملی تھی اس کو عام کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ مولوی علی نقی شاید تنہا شخص تھے جو اس ماحول کے خلاف تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں اختلاف عام ہو، رواداری اور یگانگت کا یہ ماحول ختم ہو۔ چنانچہ انہوں نے اس کے لئے ایک بہانہ تلاش کرلیا جس کے ذریعہ سے یہی نہیں کہ مولوی محمد احسن کے خلاف سخت ہنگامہ کیا، بلکہ علمائے دیوبند کے خلاف بھی ایک مستقل محاذ قائم کرلیا جو اَب بھی جاری اور سرگرم ہے۔

وجہِ اختلاف ومنافرت ہوا یہ کہ بدایوں کا وہ گھرانہ جو مولوی فضل رسول بدایونی کے متوسلین میں تھا اس کے ایک فرد مولوی عبد القادر بدایونی کا مولانا امیر احمد سہسوانی سے امکان و امتناع نظیر کے موضوع پر سنہ ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء) میں بدایوں کے قصبہ شیخو پور میں مناظرہ ہوا تھا، فریقین کی تحریروں کو مولانا محمد نذیر سہسوانی نے مرتب کر کے مناظرہ احمدیہ کے نام سے شائع کر دیا تھا، اس مناظرہ میں اثر ابن عباس ان اللہ خلق بسبع ارضین فی کل ارض آدم کآدمکم بھی زیر بحث آیا تھا، مرتب روداد مولانا نذیر صاحب نے اس کتاب کے آخر میں یہ بھی لکھدیا تھا کہ:

''مولوی محمد احسن صدیقی نانوتوی بھی اس (صحت اثر ابن عباسؓ) کے معتقد ہیں اور اسی مضمون پر ان کی مہر ثبت ہے اور اسی کے اور علمائے دین قائل و معتقد ہیں''

اس تصدیق کی وجہ سے مولانا محمد احسن کی تکفیر کی گئی، اس کوشش اور تحریک میں مولوی علی نقی آگے آگے تھے، یہاں تک کہ عید الفطر سنہ ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) کے موقعہ پر مولوی نقی علی نے مولانا کی امامت کے خلاف بھی آواز بلند کی اور چاہا کہ مولانا نماز نہ پڑھا سکیں، ہنگامہ ہوا تو مولانا احسن نے خود پیش کش کی کہ فلاں صاحب نماز پڑھا ئیں مگر مولوی نقی علی کسی طرح بھی مصالحت پر تیار نہیں ہوئے، مقامی علماء اور عوام کی اکثریت مولانا کے ساتھ تھی، اس لئے عوام نے معمول کے مطابق مولانا محمد احسن کی امامت میں عید کی نماز ادا کی، مگر مولوی نقی علی خاں نے عیدگاہ میں عام مسلمانوں کے ساتھ نماز نہیں پڑھی، حسین باغ میں نماز عید کا الگ اہتمام کیا اور خود نماز پڑھائی۔

یہ اس اختلاف اور کشاکش کی ابتداء تھی جو آج تک جاری ہے اور جس نے بڑھتے بڑھتے ایک مستقل فرقہ یا گروہ بریلویت کی صورت اختیار کر لی ہے، دیوبندیت نہ کوئی مستقل جماعت ہے نہ فرقہ اور نہ مناظرہ بازوں کا گروہ، یہ نام تو ان کو بریلوی علماء نے دیا ہے۔ علمائے دیوبند سلف کے عقیدہ، طریقہ اور علم وعمل کی جامعیت کے قائل و پیرو کار ہیں۔ وہ خانوادہ حضرت شاہ ولی اللہ کے اکابر علماء کے طریقہ تعلیم و تدریس، خدمت حدیث وفقہ، حدیث وفقہ کی گہرائی اور اصول وتفسیر پر نظر، نیز اخلاق وکردار میں سنت نبوی کو اسوہ اور

رہنمائے طریق بنانا اور دل وجان سے اس کی تبلیغ واشاعت انکا معمول ومزاج ہے۔

اس فکر کا نام دیوبندیت رکھدیا گیا ہے[1] حالانکہ اس جماعت کیلئے اگر کسی علیحدہ نام کی ضرورت ہو یا اس کے ذریعہ سے اُن کا تعارف کرایا جائے تو ان کو ولی اللہی کہنا زیادہ بہتر اور مناسب ہے کیوں کہ یہ سب اسی شجر پر بہار کے ثمر اور اسی گلستاں کے گل بوٹے ہیں۔

مذکورہ تفصیلات سے اس اختلاف کی روداد معلوم ہوگئی اور یہ بات بالکل صاف ہوگئی ہے کہ اس اختلاف ونزاع کی وجہ صرف یہ تھی کہ مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے والد مولوی نقی علی خاں، مولانا محمد احسن کے علمی مراتب، شہر میں مرجعیت ومقبولیت اور عیدین کی امامت کی وجہ سے اپنے دل میں مولانا سے سخت نفرت رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ میں خود عیدین کی امامت کروں، اسی برے خیال نے نقی علی خاں صاحب کو اس حرکت پر آمادہ کیا جو برصغیر کے مسلمانوں میں ایک نہ ختم ہونے والی خلیج بن گئی ہے۔(۱)

بریلی سے واپسی اور وفات

مولانا بریلی سے نانوتہ واپسی کے بعد بھی اپنے معمول کے مطابق علمی دینی کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ سنہ ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۴ء) میں جب مولانا کی عمر تقریباً ستر سال تھی بیمار ہوئے، اس بیماری سے شفا نہ ہوئی، یہی مرض الموت ثابت ہوا۔ علاج کے لئے دہلی لے جائے گئے مگر وہاں کے علاج سے بھی فائدہ نہ ہوا تو رمضان المبارک سنہ ۱۳۱۲ھ میں وطن واپسی کے ارادہ سے دہلی سے دیوبند آگئے، مولانا کے چھوٹے بھائی مولانا محمد منیر نانوتوی دارالعلوم دیوبند کے مہتمم تھے، ان کے مکان پر قیام کیا، ابھی وطن جانے کا موقع نہیں ہوا تھا کہ اسی میں رمضان المبارک سنہ ۱۳۱۲ھ (مارچ ۱۸۹۵ء) کے آخری ہفتہ میں دیوبند میں وفات ہوگئی، حضرت مولانا محمد قاسم کے برابر میں دفن کئے گئے۔(۲)

---

(۱) اس قضیہ کا اور اس سے متعلقہ تفصیلات کا ڈاکٹر ایوب قادری نے اپنی کتاب مولانا محمد احسن نانوتوی میں خاصی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ص: ۸۴ تا ۹۴ بعض معلومات کا راقم سطور نے اضافہ کیا ہے۔

(۲) مولانا محمد احسن نانوتویؒ ص ۹۹ تا ۱۰۲

[۱۶] مولانا قاضی محمد ایوب پھلتیؒ (۵)

مولانا قاضی مفتی محمد ایوب بن مولوی حکیم قمر الدین بن حکیم محمد انور صدیقی حنفی پھلتی۔ ۱۲۴۱ھ تا ۱۲۴۴ھ کے درمیان پھلت ضلع مظفر نگر میں تولد ہوئے، ابتدائی درسیات مولانا نصر اللہ خویشگی سے مظفر نگر میں پڑھیں، پھر دہلی آئے یہاں متعدد علماء کے حلقہ درس میں حاضر رہے۔ حضرت شاہ محمد اسحاق کی مجالس وعظ میں حاضر رہتے تھے صَرف کی چند کتابوں کی ابتداء حضرت شاہ صاحب نے کرائی۔

دہلی میں حضرت مولانا مملوک العلی کے علاوہ حضرت شاہ ابو سعید مجددی، مولانا شاہ عبد الغنی مجددی، مولانا شاہ محمد عمر خلف شاہ محمد اسماعیل شہید، مولانا سدید الدین دہلوی، مولانا ملا نواب رام پوری نیز مولانا سید محمد دہلوی وغیرہ سے پڑھا، خیال ہوتا ہے کہ دہلی کالج میں بھی داخلہ ہوا ہے، وہاں بھی پڑھا ہوگا، اس خیال کی اس سے تائید ہوتی ہے کہ مولانا محمد ایوب کے استادوں میں علی اکبر اور علی اصغر سونی پتی کے نام بھی آتے ہیں، یہ اس زمانہ میں دہلی کالج کے طالب علم تھے، غالباً کسی بڑے استاد بظاہر مولانا مملوک العلی نے مولانا محمد ایوب کا سبق ان دونوں کے حوالہ کیا ہوگا۔؟

اپنے خالہ زاد بھائی مولانا مفتی عبد القیوم بڈھانوی سے بھی پڑھا، دو مرتبہ حرمین شریفین کی زیارت اور حج کے لئے گئے حجاز میں شیخ محمد بن ناصر حازمی سے اجازت وسند حاصل کی، شاہ محمد یعقوب (برادر حضرت شاہ محمد اسحاق) سے بیعت کی اور سلسلہ نقشبندیہ کا سلوک حاصل کیا۔

حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی سے ارادت وعقیدت تھی۔ مولانا کا ایک سلسلہ اجازت مولانا مظفر حسین عن الشاہ محمد یعقوب بھی ہے۔(۱)

۱۲۶۶ھ میں بھوپال گئے، ایک مدرسہ میں مدرس ہوئے، پھر نواب سلطان جہاں

(۱) التمهيد لتعريف ائمة التجديد، مولانا عبید اللہ سندھی ص ۱۷۵ (جام شورو سندھ، ۱۳۹۶ھ ۱۹۷۶ء)

کے اتالیق مقرر کئے گئے، ترقی کرتے ہوئے بھوپال کے نائب قاضی، پھر قاضی بنائے گئے، قضات کی سخت مصروفیت کے باوجود درس حدیث کا بہت اہتمام تھا جو وقت تھا وہ اسی خدمت میں گزرتا تھا، یہاں تک کہ مسلسل اسباق اور کڑی محنت کی تاب نہ لاکر طلبہ اور جگہ چلے جاتے تھے مگر مولانا کا معمول بدستور چلتا رہتا تھا۔

ہندوستان کے دارالحرب ہونے کی بحث پر ایک رسالہ مولانا کی تحریری یادگار ہے۔(۱)

مولانا مفتی محمد ایوب کی ۲۹/ جمادی الثانی ۱۳۱۵ھ ۲۵/ نومبر ۱۸۹۷ء کو وفات ہوئی۔(۲)

[۱۷] مولانا محمد منیر نانوتویؒ (۶)

شیخ لطف علی نانوتوی کے تیسرے بیٹے، مولانا محمد مظہر اور مولانا محمد احسن کے چھوٹے بھائی تھے۔ (۳۲-۱۸۳۱ء) میں تولد ہوئے، ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی، پھر دہلی گئے دہلی میں حضرت مولانا مملوک العلی، مولانا مفتی صدرالدین آزردہ سے پڑھا۔ قرین قیاس ہے کہ دہلی کالج میں بھی داخل ہوئے ہوں گے اور کالج کے دیگر استادوں سے بھی استفادہ کا موقع ملا ہوگا۔

حدیث اپنے عزیزوں اور اس دور کے علماء کی طرح حضرت شاہ عبدالغنی مجددی کی خدمت میں حاضر رہ کر پڑھی، سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک میں سرگرم رہے۔

سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد مئی سنہ ۱۸۶۱ء (شوال ذی قعدہ ۱۲۷۷ھ) میں بریلی کالج میں

(۱) اس کے ایک قلمی نسخہ کا عکس ہمارے ذخیرہ میں ہے۔

(۲) مزید معلومات کیلئے تذکرہ علمائے حال (تطییب الاخوان بذکر علماء الزمان) تالیف مولانا محمد ادریس نگرامی۔ ص ۴۷ (نول کشور، لکھنؤ: ۱۸۹۷ء) یہ حالات غالباً خود مولانا محمد ایوب نے لکھ کر بھیجے تھے۔ نزہۃ الخواطر ص ۸۵-۸۶ ج ۷، کا اندراج بھی اسی پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ دور ملازمت کی چند معلومات جو اگرچہ بہت معتبر معلوم نہیں ہوتیں تاریخ قضاۃ و مفتیانِ بھوپال، تالیف قاضی وجدی الحسینی ص ۱۶۵-۱۶۷ (بھوپال: ۱۹۸۶ء) میں درج ہیں۔

مدرس مقرر ہوئے، اسی وجہ سے بریلی میں قیام رہا اور وہاں تمام علمی کاموں میں اپنے بھائیوں خصوصاً مولانا محمد احسن کے رفیق وشریک بلکہ دست و بازو بنے رہے، مطبع صدیقی بریلی کے مہتمم تھے، طباعت واشاعت کے کام کی نگرانی کرتے تھے، چند کتابوں کی تصحیح کی خدمت میں بھی معاون رہے۔

حضرت امام غزالی کی مشہور کتاب منہاج العابدین کا اردو ترجمہ کیا، جو سراج السالکین کے نام سے مطبع صدیقی سے سنہ ۱۲۸۱ھ میں چھپا تھا، ایک چھوٹی سی کتاب فوائد عجیبہ کے نام سے مرتب فرمائی جو مطبع صدیقی سے چھپی بعد میں بھی شائع ہوئی۔(۱)

سنہ ۱۲-۱۳۱۱ھ (۹۵-۱۸۹۳ء) تقریباً دو سال تک مدرسہ اسلامی (دارالعلوم) دیوبند کے مہتمم رہے، نہایت محتاط دیانتدار، متقی اور بےنفس بزرگ تھے، صحیح سنہ وفات معلوم نہیں۔ ۱۳۲۱ھ (۱۹۰۴ء) تک حیات تھے۔

[۱۸] مولانا ذوالفقار علی دیوبندیؒ (۷)

مولانا ذوالفقار علی خلف شیخ فتح علی عثمانی دیوبندی، دیوبند کے معزز عثمانی خاندان سے نسبت ہے۔ تقریباً سنہ ۱۲۳۷ھ (۲۲-۱۸۲۱ء) میں ولادت ہوئی، وطن اور دہلی میں تعلیم پائی، دہلی کالج کے فیض یافتہ اور مولانا مملوک العلی کے خاص شاگرد ہیں۔

مولانا ذوالفقار علی نے غالباً سنہ ۱۸۴۵ء (۱۲۶۱ھ) میں کالج میں داخلہ لیا، ۱۸۴۷ء میں کالج کی چوتھی جماعت میں پڑھتے تھے، دہلی کالج کے ایک رجسٹر کے حوالہ سے جو سنہ ۱۸۴۷ء میں چھپا تھا (جس میں اس سال کے کالج میں موجود طلبہ کے کوائف ہیں) ڈاکٹر محمد اکرام چغتائی نے لکھا ہے کہ اس میں مولانا ذوالفقار علی کی جنوری سنہ ۱۸۴۷ء سے اکتوبر تک ایک سو اٹھتر (۱۷۸) حاضریاں درج ہیں، بیماری کی وجہ سے تئیس (۲۳) دن غیر حاضر رہے، اس سال مولانا نے کالج میں جو کتابیں پڑھیں اور ان کا امتحان دیا، اس کی

(۱) ان دونوں کتابوں کا ایک ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

تفصیل اس طرح ہے:

تاریخ ہند	۴۰	ادب ۱۲۳ صفحات	۴۲
صرف ونحو انگریزی	صفر	حساب	۲۴
تحریر اقلیدس	۵۰	جغرافیہ	صفر(۱)

مولانا ذوالفقار علی کالج کے ممتاز طالب علموں میں گنے جاتے تھے۔ گارسان دتاسی نے دہلی کالج کے پرنسپل ٹیلر کے حوالہ سے مولانا ذوالفقار علی کی ذہانت وذکاوت کا ذکر کیا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا فارسی اور مغربی علوم کے پڑھنے اور سیکھنے میں گہری دلچسپی لیتے تھے، مولانا ذوالفقار علی نے اس زمانہ میں الجبراء پر انگریزی کتاب کا اردو میں تسہیل الحساب کے نام سے اردو ترجمہ کیا تھا، جو سنہ ۱۸۵۲ء میں بریلی سے چھپا تھا۔ (۲)

دہلی میں تعلیم کے زمانہ میں مولانا مفتی صدرالدین آزردہ کے حلقہ تلمذ میں بھی شامل رہے، مفتی صاحب سے طویل استفادہ کیا، مولانا سے کیا کیا کتابیں پڑھیں اس کی تفصیل معلوم نہیں، تعلیم مکمل کرنیکے بعد سنہ ۵۰-۱۸۴۹ء میں بریلی کالج میں استاد مقرر ہوئے، کئی سال تک اسی ملازمت پر کام کرتے رہے، اس منصب سے ترقی ہوئی تو ڈپٹی انسپکٹر مدارس ضلع میرٹھ بنائے گئے، غالباً اسی ملازمت سے پنشن ہوئی۔ ملازمت کے بعد تمام وقت دیوبند میں گذارا، آخر میں حکومت نے مولانا کو دیوبند کا آنریری مجسٹریٹ مقرر کردیا تھا۔

مدرسہ دیوبند (دارالعلوم) کے شروع سے سرگرم معاون اور بانیان مدرسہ کے ہم قدم اور پرجوش رفیق رہے، مدرسہ کے ساتھ ہر قسم کا تعاون فرمایا، چالیس سال تک مدرسہ کی مجلس شوریٰ کے رکن بھی رہے۔

مولانا کی پہلی تالیف تسہیل الحساب کا ذکر آچکا ہے، اس کے علاوہ جو کتابیں عام طور سے مل جاتی ہیں، ان میں دیوان حماسہ کی شرح تسہیل الدراسہ فی شرح دیوان الحماسہ، دیوان متنبی کی شرح تسہیل البیان فی شرح الدیوان، جو اواخر سنہ ۱۸۹۳ء

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۱۲۹ (۲) ایک نادر مجموعہ مکاتیب، محمد اکرام چغتائی ص ۱۲۶، ۱۲۷

(۱۳۱۱ھ) میں مکمل ہوئی۔ التعلیقات علی السبع المعلقات سنہ ۱۸۹۵ء میں اختتام کو پہنچی، یہ تینوں کتابیں اپنے دوست اور عزیز مولوی عبدالاحد مالک مطبع مجتبائی دہلی کی فرمائش پر لکھی تھیں، ان کا حق طباعت بھی انہیں کو دے دیا تھا۔ ان کے علاوہ قصیدہ بانت سعاد کی شرح الارشاد الی بانت سعاد کے نام سے اور قصیدہ بردہ کی شرح عطر الوردہ کے نام سے لکھیں، معانی و بلاغت پر ایک کتاب معیار البلاغت اور مدرسہ دیو بند (دارالعلوم) کے حالات اور تاریخ پر عربی میں مختصر مگر عمدہ تالیف "الہدیة السنیة فی ذکر المدرسة الدیو بندیة" مرتب فرمائی، ان کے علاوہ بھی بعض تالیفات ہیں جو اگرچہ اردو میں ہیں مگر اپنے موضوع کی بے نظیر کتابوں میں شمار کی جاتی ہیں۔

مولانا کی سب سے بڑی یادگار اور ہندوستان کی دینی علمی تاریخ اور برصغیر ہند میں اسلامی ورثہ اور خدمت کے لئے عظیم ترین تحفہ، مولانا کے فرزند والا شان شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ تھے، کہ جن کی دینی علمی اصلاحی تربیتی اور سیاسی خدمات اور کارناموں سے ہندوستان کی فضائیں مشک بار اور سدا بہار ہیں۔ رحمہما اللہ تعالیٰ رحمة الابرار الصالحین.

مولانا ذوالفقار علی کی سنہ ۱۳۲۲ھ (۱۹۰۴ء) میں تقریباً پچاسی سال کی عمر میں دیو بند میں وفات ہوئی، قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا محمد احسن کے برابر میں دفن کئے گئے۔ رحمۃ اللہ علیہ۔ (۱)

[۱۹] مولانا فصیح الدین عثمانی دیو بندیؒ (۸)

مولانا فصیح الدین بن شیخ صابر علی بن شیخ محمود بخش بن اہل اللہ عثمانی دیو بندی۔ مولانا فصیح الدین، دارالعلوم کے سب سے پہلے مہتمم مولانا رفیع الدین کے چچازاد بھائی تھے۔ مولانا رفیع الدین کے والد مولانا فرید الدین جید عالم تھے، مولانا فرید اور شیخ صابر علی کے

(۱) مزید معلومات کے لئے دیکھئے تاریخ دارالعلوم دیو بند، سید محبوب رضوی نیز تاریخ دیو بند ص ۸۰۷، ۷

سب سے بڑے بھائی شیخ بلند بخت دیو بندی حضرت سید احمد شہید کی تحریک جہاد کے رکن اعظم اور بڑے سپہ سالار تھے، مفصل حالات دستیاب نہیں۔

حضرت مولانا مملوک العلی سے تعلیم حاصل کی، حدیث غالباً حضرت شاہ عبدالغنی مجددی سے پڑھی، شاہ صاحب سے ہی بیعت ہوئے، تعلیم کے بعد محکمہ تعلیم میں ملازم ہوئے، مدرسہ (دارالعلوم) دیو بند قائم ہونے سے ایک سال پہلے سنہ ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۶ء) میں محکمہ تعلیم کی فرمائش پر جغرافیہ ضلع سہارنپور لکھا تھا، دارالعلوم دیو بند کے معاون رہے سنہ ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۷ء) میں وفات ہوئی (۱)

[۲۰] مولانا فضل الرحمٰن عثمانی دیو بندیؒ (۹)

مولانا فضل الرحمٰن خلف شیخ عبدالرحیم عثمانی دیو بندی، دہلی کالج میں اور مولانا مملوک العلی سے تعلیم حاصل کی، فارسی زبان وادب میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ اس عہد کے اور متعدد علماء کی طرح سرکاری محکمہ تعلیم سے وابستہ ہوئے، ترقی کرتے ہوئے انسپکٹر مدارس کے عہدہ تک پہنچے اور اسی سے سبکدوش ہوئے۔

دارالعلوم دیو بند کے بانیوں اور سب سے سرگرم معاونین میں سے تھے۔ تقریباً پینتالیس سال دارالعلوم کی خدمات انجام دیں اور مدرسہ دیو بند کی ننھی کونپل سے تناور درخت بننے تک بے لوث آبیاری فرماتے رہے۔ فارسی اردو کے اچھے شاعر تھے، شاعری کے متعدد نمونے دستیاب ہیں، جن میں وہ قطعۂ تاریخ خاصا معروف ہے جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کی وفات پر کہا تھا، جس سے حضرت مولانا کا سن وفات بھی نکلتا ہے، اس کا آخری شعر یہ ہے:

سن وفات کہی فضل نے ز روئے الم
وفاتِ سرورِ عالم کا یہ نمونہ ہے

(۱) مزید معلومات کے لئے دیکھئے تاریخ دارالعلوم دیو بند، سید محبوب رضوی نیز تاریخ دیو بند ص ۷۸، ۷۹

۱۲؍جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۲۵ھ (۱۵؍جون ۱۹۰۷ء) کو دیوبند میں وفات ہوئی (۱)

[۲۱] مولانا انصار علی انبہٹویؒ (۱۰)

مولوی انصار علی خلف احمد علی بن قطب علی انصاری انبہٹوی، تفصیلی حالات مفقود ہیں، مختصر اور منتشر اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے خاندان کے تعلیم یافتہ شخص تھے، دہلی میں مولانا مملوک العلی سے تعلیم حاصل کی تھی، حدیث شریف مدینہ منورہ جاکر پڑھی، ریاست گوالیار میں صدر الصدور مقرر ہوئے، اسی ملازمت پر زندگی گذری۔ مولانا مملوک العلی کی دختر سے نکاح ہوا، مولانا عبد اللہ انصاری جو مدرسۃ العلوم (M.A.O. COLLEGE) علی گڑھ کے پہلے ناظم دینیات مقرر ہوئے مولانا انصار علی کے فرزند تھے۔ مولانا کے مزید حالات اور سن وفات دریافت نہیں۔ (۲)

[۲۲] مولانا محمد حسن رام پوریؒ (۱۱)

رام پور انصاری خاندان کے فرد تھے سنہ ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۴ء) میں ولادت ہوئی سترہ سال کی عمر تک قرآن شریف پڑھا، اسی وقت شاہ امام علی سے بیعت ہوئے اور دو سال تک پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر رہے، پیر و مرشدؒ نے دہلی جاکر تعلیم حاصل کرنے کی ہدایت کی تو دہلی پہنچے اور حضرت مولانا مملوک العلی سے عربی پڑھی، تعلیم کے زمانہ میں

(۱) حیات شیخ الہند، مولانا اصغر حسین میاں صاحب ص ۲۷-۲۶ (لاہور ۱۹۷۰ء)
تاریخ دیوبند ص: ۸۰ نیز تعارفی کتابچہ بر احوال مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی، مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی ص ۹-۸ (مالیر کوٹلہ ۱۹۹۱ء)
(۲) ملاحظہ ہوں تذکرۃ الخلیل، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی، ص: ۳۹-۳۸ (سہارنپور: ۱۳۹۵ھ، ۱۹۷۵ء) انوار العاشقین، مولانا مشتاق انبہٹوی، ص: ۱۳۶ (لاہور: ۱۳۹۸ھ)

سلوک ومعرفت میں قدم رکھ دیا تھا، اور اس میں بڑا مرتبہ پایا تھا۔ مولانا کے حالات دیکھ کر مولانا مملوک العلی بھی ان کا ادب کرتے تھے۔

ایک دن مولانا محمد حسن نے حضرت مولانا مملوک العلی سے عرض کیا کہ میں نے دعاء کی ہے کہ اے اللہ! میرے استاد کو ایک لڑکا دے جو حافظ قرآن، عالم اور ولی ہو، میری دعاء قبول ہوگئی، مولانا مملوک العلی سن کر ہنسے، اس کے بعد ہی مولانا محمد یعقوب تولد ہوئے، جو اسی دعاء کی وجہ سے کبھی کبھی (مذاق میں) فرمایا کرتے تھے کہ میں ازلی ولی ہوں۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے نحو وصرف کی ابتدائی کتابیں مولانا محمد حسن سے پڑھی تھیں، حضرت مولانا گنگوہی کو مولانا محمد حسن سے حزب البحر کی اجازت بھی حاصل تھی، مولانا محمد حسن سے شاہ کریم بخش رام پوری کو اجازت تھی، حاجی عابد حسین دیوبندی میاں جی کریم بخش کے خلیفہ اور مجاز تھے، یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

مولانا محمد حسن کا چالیس سال کی عمر میں ۱۷/ذی قعدہ سنہ ۱۲۱۹ھ (۲۲ستمبر ۱۸۵۳ء) کو رام پور میں انتقال ہوا، وہیں دفن کئے گئے۔(۱)

[۲۴] مولوی حکیم امین الدین دیوبندیؒ (۱۴)

حکیم مولوی امین الدین خلف دیوان بخشش علی، بن شیخ علیم الدین عثمانی دیوبند کے مشہور عثمانی خاندان سے تعلق ہے۔ تقریباً سنہ ۱۲۵۰ھ میں ولادت ہوئی، مولانا مملوک العلی نانوتوی سے تعلیم پائی، مزید احوال دریافت نہیں۔ چون (۵۴) سال کی عمر میں ۶/ذی الحجہ سنہ ۱۳۰۳ھ (۵ستمبر ۱۸۸۶ء) کو وفات ہوئی، ایک فرزند یادگار تھے، مولوی بشیر احمد دیوبندی۔(۲)

---

(۱) ملاحظہ ہو تذکرۃ العابدین، حافظ نذیر حسین دیوبندی، ص:۵۷، ۵۴ (دہلی: ۱۳۳۳ھ)

نیز انوار العاشقین مولانا مشتاق احمد انبیٹھوی (دہلی: ۱۳۳۳ھ) ص:۱۳۵-۱۳۶ (لاہور: ۱۳۹۸ھ)

(۲) تذکرۃ الحافظ (تذکرہ حافظ لطافت علی شیخ پوری) مرتبہ مولانا نعیم دیوبندی، ص:۲۵-۲۷ (دیوبند: ۱۳۹۰ھ)

قسم چہارم

[۲۴] مولانا محمد یوسف خلف مولانا عبدالقیوم بڈھانویؒ (۱)

مولانا عبدالقیوم خلف مولانا عبدالحیؒ بڈھانوی، ضلع مظفر نگر کے باشندہ اور خاندانِ ولی اللہی کے کمالاتِ معنوی کے وارث اور حضرت شاہ محمد اسحاق کے شاگرد اور داماد تھے۔ مولانا عبدالقیوم کے دو صاحبزادے تھے، مولانا محمد یوسف اور مولانا محمد ابراہیم، مولانا محمد یوسف بڑے تھے۔

مولانا محمد یوسف کا سنہ ولادت معلوم نہیں، والد ماجد اور والدہ محترمہ سے ابتدائی درسیات کی تکمیل کی، مولانا مفتی محمد ایوب پھلتی سے بھی پڑھنے کا موقع ملا، اعلیٰ تعلیم کے لئے دہلی گئے، دہلی میں مولانا مفتی صدر الدین آزردہ اور مولانا مملوک العلی کے علمی کمالات اور حلقۂ درس کا پورے ملک میں شہرہ تھا، مولانا دونوں علماء کی خدمت میں حاضر ہوئے اور علوم وفنون کی تکمیل کی، یہ صراحت نہیں ملی کہ مولانا مملوک العلی سے کیا کیا پڑھا مگر خیال ہے کہ اعلیٰ درسیات میں تلمذ کی سعادت ملی ہوگی۔

مکہ معظمہ حضرت شاہ محمد یعقوب کی خدمت میں حاضر ہوئے بیعت کی اور اجازت و خلافت سے نوازے گئے، حج سے واپسی پر بھوپال میں قیام کیا اور اپنے بزرگوں کی تابندہ روایات کو آگے بڑھاتے ہوئے علمی دینی خدمات میں مصروف ہوگئے۔

مولانا کے علمی مرتبہ اور بھوپال میں وقعت ومنزلت کا اس سے علم ہوتا ہے کہ جب ریاست میں دفترِ قضاء وافتاء میں بعض فیصلوں میں اختلاف ہوا تو دونوں کے درمیان رابطہ اور معاملات کی شرح وتحقیق کے لئے ایک ادارہ مجلس العلماء کے نام سے علیحدہ قائم کیا گیا جو دونوں محکموں کا سرپرست اور مشیر تھا، اس کا صدر مولانا محمد یوسف کو بنایا گیا۔

مولانا محمد یوسف کی ۱۳۲۵ھ (۸-۱۹۰۷ء) میں وفات ہوئی (۱) تفصیلی حالات دریافت نہیں۔

[۲۵] مولانا سدید الدین دہلویؒ (۲)

حضرت مولانا مملوک العلی کے استاد مولانا رشید الدین خاں دہلوی کے فرزند تھے والد ماجد مولانا مملوک العلی سے اور دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی۔ تعلیم پوری ہوتے ہی ۳۰/اکتوبر سنہ ۱۸۳۰ء (۴/شعبان ۱۲۴۵ھ) کو دہلی کالج کے شعبہ عربی میں استاد کی حیثیت سے تقرر ہوگیا تھا، کئی برس دہلی کالج میں تعلیم کی خدمت انجام دی۔ مولوی عبدالحق کی اطلاع ہے کہ سنہ ۱۸۴۳ء (۱۲۵۹ھ) میں مولوی سدید الدین کی جماعت میں دس طالب علم تھے (۲) غالباً سنہ ۱۸۴۷ء (۱۲۶۳ھ) سے پہلے دہلی کالج کی ملازمت ترک کردی تھی، سنہ ۱۸۴۹ء میں آگرہ کالج میں عربی کے مدرس ہوگئے تھے۔ کالج کیلئے ایک دو کتابوں کے اردو ترجمے بھی کئے، آگرہ ملازمت کی ابتدا تھی کہ مولوی صاحب کو یہ اطلاع ملی کہ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں امین کی جگہ خالی ہے اور اس کے لئے مناسب شخص کی تلاش ہے، مولوی صاحب نے اس کیلئے کوشش کی، جنوری سنہ ۱۸۵۱ء (محرم ۱۲۶۷ھ) میں اس عہدہ پر مولوی صاحب کا تقرر ہوگیا اور وہ آگرہ سے کلکتہ کیلئے روانہ ہوگئے مگر یہ اہم ملازمت بھی مولوی صاحب کو راس نہیں آئی، کالج میں پرنسپل کی ناقدری ہوئی بعض تبدیلیوں کی وجہ سے ہنگامہ ہوگیا اور مولوی صاحب بھی اپنے عہدے سے علیحدہ ہونے پر مجبور ہوئے، یہ

---

(۱) درج بالا اطلاعات تاریخ قضات ومفتیان بھوپال، تالیف مولانا وجدی الحسینی ص: ۱۵۳،۱۵۸ (بھوپال ۱۹۸۶ء) سے اخذ کی گئی ہیں، ان کی کسی اور ذریعہ سے اس کی تصدیق نہیں ہوسکی۔ یہ کتاب میرے خیال میں بہت لائق اعتماد نہیں ہے۔ اس میں کتابت کی بے شمار غلطیوں کے علاوہ تاریخی فروگذاشتیں بھی کثرت سے ہیں، اسلئے صرف اس پر اعتماد درست معلوم نہیں ہوتا، مگر اس وقت کسی اور ذریعہ سے اس کی تصدیق نہیں ہوئی۔

(۲) مرحوم دہلی کالج ص: ۷۶ (دہلی ۱۹۴۵ء)

واقعہ غالباً سنہ ۱۸۵۳ء کا ہے، اس وقت اسپرنگر نے مولانا کا ہگلی کے ایک مدرسہ میں تقرر کرادیا، سنہ ۱۸۵۶ء (۱۲۷۲-۱۲۷۳ھ) تک اسی مدرسے میں پڑھاتے رہے۔

سنہ ۱۸۶۳ء (۸۰-۱۲۷۹ھ) میں مولوی سمیع اللہ دہلوی نے دہلی میں ایک مدرسہ شروع کیا تھا، مولوی سدید الدین جن کی کلکتہ سے پنشن ہوگئی تھی، اس مدرسہ کے مدرس اول مقرر ہوئے۔ اس کے بعد رامپور آگئے۔ (۱)

نواب کلب علی خاں نے مولانا کی قدر افزائی کی، مولانا کو تعلیم کے علاوہ اور عہدوں سے بھی نوازا، مولانا کا رامپور کے ممتاز علماء میں شمار تھا۔ (۲)

مولانا سدید الدین نے اسپرنگر کی فرمائش پر علامہ سیوطی کی ''الاتقان فی علوم القرآن'' مرتب کی جو کلکتہ سے شائع ہوئی۔ دہلی کالج کی ملازمت کے زمانہ میں الف لیلیٰ کے بعض حصوں کا اردو ترجمہ کیا تھا اور آگرہ کی ملازمت کے دوران ''تاریخ آگرہ'' لکھی تھی، یہ دونوں کتابیں بھی چھپ گئی تھیں۔ اس کے علاوہ بھی مولانا کی متعدد تالیفات و تحریرات مطبوعہ دریافت ہیں۔ مولانا سدید الدین کی تاریخ وفات معلوم نہیں۔

[۲۶] مولوی ڈپٹی نذیر احمد بجنوری دہلویؒ (۳)

بڈھانہ ضلع مظفر نگر یوپی میں ایک صدیقی خاندان صدیوں سے رہتا ہے، اس خانوادہ کی ایک بہت بڑی اور معروف شخصیت شیخ عبدالغفور اعظم پوری تھے جو حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے ممتاز خلفاء میں سے تھے۔ اجازت کے بعد شیخ عبدالغفور بڈھانہ سے اعظم پور چلے گئے تھے اس لئے اعظم پوری مشہور ہوئے، شیخ عبدالغفور کی اولاد بجنور میں رہی وہیں پھلی پھولی، اس خاندان کے بعض افراد یا شاخیں بجنور کے اطراف میں آباد ہوگئیں مگر ان میں باہمی روابط اور رشتہ داریاں قائم رہیں، اسی شاخ کے ایک فرد موضع

(۱) سوانح عمری مولوی سمیع اللہ خاں دہلوی، مولوی ذکاء اللہ، ص:۵۶ حصہ اول (لکھنؤ: ۱۹۹۷ء)

(۲) تذکرہ کاملانِ رامپور مرتبہ احمد علی شوق، ص:۴۷ (پٹنہ:) نیز نزہۃ الخواطر، ص:۱۹۷ جلد ۷

ریہڑ نگینہ ضلع بجنور چلے گئے تھے، اسی گاؤں میں ڈپٹی نذیر احمد تولد ہوئے۔(۱)

ڈپٹی نذیر احمد کی تاریخ پیدائش کی روایت میں خاصا اختلاف اور تضاد پایا جاتا ہے، ڈاکٹر افتخار صدیقی کی تحقیق کے مطابق سنہ ۱۸۳۰ء (۴۶-۱۲۴۵ھ) صحیح معلوم ہوتا ہے۔(۲)

ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی، متوسط درسیات تک مولانا نصر اللہ خاں خویشگی سے پڑھیں جب مولانا خویشگی کا بجنور سے مظفر نگر تبادلہ ہوگیا تو نذیر احمد اور ان کے بھائی مولانا کے پاس مظفر نگر آ گئے، مولانا خویشگی مظفر نگر سے اعظم گڑھ چلے گئے تھے، اس لئے مولانا کی ہدایت کے مطابق نذیر احمد کے والد ان کو لے کر دہلی پہنچے، یہ سنہ ۱۸۴۲ء کا واقعہ ہے، تین سال تک پنجابی کڑہ کی مسجد میں دہلی کے ممتاز عالم اور مدرس مولانا عبد الخالق دہلوی سے پڑھتے رہے۔

جنوری سنہ ۱۸۴۶ء (محرم ۱۲۶۲ھ) میں دہلی کالج میں داخلہ ملا، تعلیم حاصل کی مگر شوق علم فراواں تھا، کالج کے اسباق سے سیری نہیں ہوئی تھی اس لئے مولانا مملوک العلی سے کالج سے فارغ اوقات میں پڑھانے کی درخواست کی مگر مولانا کے اوقات نہایت مصروف تھے، کوئی لمحہ فارغ نہیں تھا مولانا نے مصروفیت کا عذر کیا، ادھر سے اصرار بڑھا تو فرمایا اچھا! جس وقت ہم مدرسہ جایا کرتے ہیں آجایا کرو، ڈپٹی صاحب نے اس کو منظور کر لیا، اس کی تفصیل ڈپٹی صاحب کے الفاظ میں پڑھئے:

''حضرت مولانا نے وقت نہ ہونے کا عذر کیا اور فرمایا کہ راستے میں چلتے چلتے جو پڑھ سکو گے پڑھا دیا کریں گے، اس زمانے کی طالب علمی ایسی کٹھن تھی مرحوم نے اسکو غنیمت جانا۔ مملوک العلی پنس میں سوار ہو کر کالج کو چلتے یہ کتاب لے کر ساتھ ہو لیتے، پنس کے ساتھ دوڑتے ٹھوکریں کھاتے، گرتے مگر واہ رے شوق اس پر بھی سبق ہو جانے کو دولت سمجھتے''۔(۳)

دسمبر سنہ ۱۸۵۳ء میں دہلی کالج سے عربی کی اعلیٰ جماعت کا آخری امتحان پاس

(۱) مولوی نذیر احمد دہلوی، احوال و آثار، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ص:۳۲ (لاہور ۱۹۷۱ء)

(۲) مولوی نذیر احمد دہلوی، احوال و آثار، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ص:۲۱ (لاہور ۱۹۷۱ء)

(۳) حیات النذیر تالیف سید افتخار عالم ص:۶۲۵ (دلی ۱۹۱۹ء) ڈپٹی نذیر احمد کے حوالہ سے یہ واقعہ مولوی عبد الرزاق کانپوری (مؤلف البرامکہ) نے بھی نقل کیا ہے۔ یاد ایام ص:۳۰۶ (حیدرآباد ۱۹۳۶ء)

کرنے کے بعد (اگست ستمبر ۱۸۵۴ء) تک دہلی میں رہے، جلد ہی ضلع گجرات (موجودہ مغربی پنجاب پاکستان) میں استاد کی حیثیت سے سرکاری ملازمت پر تقرر ہو گیا تھا مگر وہاں کے خشک ماحول میں طبیعت نہیں لگی، دوسری ملازمت کی تلاش ہوئی، دو جگہ سے ملازمت کی دعوت ملی، اجمیر کالج میں سو روپے ماہوار پر مدرس عربی یا اسّی روپے ماہوار پر ڈپٹی انسپکٹر تعلیم کانپور، ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے اپنی ضرورت اور آئندہ ترقی کے خیال سے ڈپٹی انسپکٹر کے عہدہ کو پسند کیا، سنہ ۱۸۵۶ء میں کانپور میں انسپکٹر شعبۂ تعلیم مقرر ہوئے، اس ملازمت کو ایک ہی سال گذرا تھا کہ سنہ ۱۸۵۷ء کے واقعات پیش آ گئے تو مولوی صاحب ملازمت چھوڑ کر دہلی آ گئے۔

سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک سے مولوی نذیر احمد الگ رہے، جب دہلی میں تحریک شباب پر تھی تو ایک انگریز خاتون کی جان بچائی اور اس کو گھر میں حفاظت سے رکھا، اس کی وجہ سے خاندان کے افراد کی بھی جان بخشی ہوئی اور مولوی نذیر احمد کو الہ آباد کی ڈپٹی انسپکٹری مل گئی، الہ آباد میں انگریزی پڑھی اور اس میں اچھی مشق بہم پہنچائی۔ سنہ ۶۱-۱۸۶۰ء میں تعزیرات ہند (INDIA PANEL CODE) کے اردو ترجمہ کی تین رکنی کمیٹی میں شریک کئے گئے اور سب سے بہتر ترجمہ نگار تسلیم کئے گئے، ترجمہ مکمل ہونے کے بعد گورنر نے خصوصی انعام سے نوازا اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر ترقی دی، ڈپٹی کلکٹر بننے سے پہلے چند مہینہ تک کانپور میں تحصیل دار رہے۔

سنہ ۱۸۶۳ء (۸۰-۱۲۷۹ھ) سے سنہ ۱۸۷۷ء (۱۲۹۴ھ) تک کان پور، گورکھپور اور اعظم گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر اور زمین کے بندوبست کے نگراں رہے، یکم اپریل ۱۸۷۷ء میں صوبہ شمال کے صوبہ دار مقرر کئے گئے سنہ ۱۸۸۲ء (۱۳۰۰-۱۲۹۹ھ) میں سترہ سو روپے ماہوار کی تنخواہ پر مجلس مال (REVENUE COMMETTEE) کا ممبر نامزد کیا گیا۔

سر سالار جنگ کی وفات (۸ر فروری ۱۸۸۳ء) کے بعد ریاست حیدر آباد کی ملازمت سے دل برداشتہ ہو کر مستعفی ہو گئے تھے۔

تصانیف وتراجم

دہلی واپسی کے بعد تصنیف وتالیف کا سلسلہ پھر تازہ ہوا کئی کتابیں لکھیں قرآن شریف کا ترجمہ کیا اور طلبہ کو اپنے گھر پر درس دیتے رہے۔ڈپٹی صاحب کے شاگردوں اور تصانیف دونوں کی خاصی تعداد ہے، جس کا تذکرہ تفصیل چاہتا ہے مگر دینی تصانیف کے تذکرہ کو نظر انداز کرنا درست نہ ہوگا۔

(۱) ترجمہ قرآن شریف

قرآن شریف کا کسی بھی زبان میں ترجمہ، دنیا بھر کے علمی کاموں میں سب سے زیادہ ذمہ دارانہ کام نہایت نازک اور غیر معمولی وصلاحیت کا عمل ہے، ڈپٹی نذیر احمد کے علم وفضل اور عربی اردو دونوں زبانوں پر بے مثال دسترس اور ترجمہ کی فقید المثال صلاحیت کا ایک زمانہ معترف تھا اور ہے، اسی لیاقت اور کمال کی وجہ سے ڈپٹی صاحب سے کئی مرتبہ قرآن شریف کے اردو ترجمہ کی فرمائش ظاہر کی گئی مگر ڈپٹی صاحب نے اس خدمت کی عظمت ووسعت اور نزاکت کی وجہ سے اس کا ارادہ نہیں کیا، مگر جو کام ہونا ہوتا ہے اسکی کوئی نہ کوئی تدبیر ہو جاتی ہے، ڈپٹی صاحب نے حدیث شریف کے اہم مجموعہ یا تالیف ''تیسیر الاصول الی جامع الاصول'' کے اردو ترجمہ کا ارادہ کیا جب ترجمہ کتاب التفسیر تک پہنچا تو آیات قرآنی کے ترجمہ کی بات آئی، اردو کے جو پرانے ترجمے تھے وہ ڈپٹی صاحب کے معیار پر پورے نہ اترے، اسلئے ڈپٹی صاحب نے متعلقہ آیتوں کا خود ہی ترجمہ کرنے کا ارادہ کرلیا، یہ کام چل رہا تھا کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا جو اصرار اور تقاضہ ہو رہا تھا اس کی تکمیل وتعمیل کا ارادہ ہو گیا، دو عالم مقابلہ اور تعاون کیلئے ملازم رکھے اور اس کام کا آغاز ہو گیا، ڈھائی سال کی شبانہ روز مسلسل مصروفیت ومحنت کے بعد سنہ ۱۳۱۳ھ (۱۸۹۵ء) میں یہ ترجمہ پورا ہوا اور پہلی مرتبہ مطبع انصاری دہلی سے سنہ ۱۴-۱۳۱۳ھ (۱۸۹۶ء) کے آغاز پر چھپا۔

اس ترجمہ پر شبہات واعتراضات

یہ ترجمہ اگرچہ بہت مشہور ومقبول ہوا اور مصنف کی زندگی تک کثرت سے چھپتا رہا، لیکن علمائے کرام کو اس کی استنادی حیثیت، بعض آیتوں کے ترجمہ کی مطابقت اور شوخ اندازِ بیاں پر اعتراض تھا، چونکہ معاملہ قرآن شریف کا تھا اس لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ علماء

اس کی غلطی سے صرفِ نظر کر لیتے اور اس کی فروگذاشتوں پر توجہ نہ فرماتے، اس لئے اس ترجمہ پر بھی کئی طرح سے تنقید ہوئی اور اس کی غلطیوں کو واضح کیا گیا، مولانا ابومحمد عبداللہ (مدرسہ و منتظم مدرسہ صولتیہ کلکتہ) نے اس پر مفصل تنقید لکھی جو "رفع الغواشی عن وجوہ الترجمة والحواشی" کے نام سے سنہ ۱۳۱۸ھ (۱۹۰۱ء) میں کلکتہ سے شائع ہوئی، جس میں ڈپٹی صاحب کے ترجمہ کا مفصل علمی تجزیہ ہے۔

اس تالیف کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ اس میں قرآن شریف کے اس ترجمہ کی غلطیوں، ان کی وجوہات یا اصلاح کے متعلق وہ مفصل خط وکتابت بھی شامل ہے جو گل محمد خاں منگلوری (منگلور ضلع سہارنپور یوپی) کی ڈپٹی صاحب سے ہوئی تھی، خان صاحب کے شبہات واعتراضات کے ڈپٹی صاحب نے جو جوابات دیئے تھے وہ بھی درج کئے گئے ہیں۔ اسی سلسلہ کی دوسری کاوش حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی تالیف اصلاح ترجمہ دہلویہ ہے، اس کا سنہ تالیف معلوم نہیں، لیکن یہ سنہ ۱۳۲۰ھ (۳-۱۹۰۲) کے قریب چھپی تھی۔ (۱)

اس میں سنجیدہ عالمانہ زبان میں ڈپٹی صاحب کی فروگذاشتوں پر گرفت کی گئی ہے اس کی زبان ایسی متین اور باوقار تھی کہ اس کا ڈپٹی صاحب کے سوانح نگاروں نے بطور خاص ذکر اور اعتراف کیا ہے اور حضرت مولانا تھانوی کے شبہات واعتراضات کے وزن کو بھی تسلیم کیا ہے۔ (۲)

تاہم متعدد فروگذاشتوں کے باوجود ڈپٹی صاحب کا ترجمہ قرآن کریم ایک بڑی خدمت ہے جس کا ایک ضمنی مگر بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس کے بعد قلیل عرصہ میں قرآن شریف کے کئی اور ترجمے کئے گئے جو چھپتے بھی رہے جس سے امت کو بہت نفع ہوا۔

---

(۱) دونوں تالیفات اور تنقیدات کا ایک ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے۔

(۲) ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ ترجمہ کے معترضوں میں سب سے زیادہ سنجیدہ اور معقول اعتراضات مولانا اشرف علی تھانویؒ نے کئے تھے۔ (ڈپٹی نذیر احمد ص: ۲۷۷)

ڈپٹی صاحب کی اور تالیفات

(۱) الحقوق والفرائض دینی موضوعات پر ترجمہ قرآن کے بعد ڈپٹی صاحب کی تمام تالیفات میں مفید ترین تالیف ''الحقوق والفرائض'' ہے۔ جس میں ایک مسلمان پر قرآن مجید اور دین وشریعت کی طرف سے نافذ حقوق کی تفصیل اور ان کے متعلق آیات شریفہ حسن ترتیب اردو ترجمہ اور ضروری وضاحت کے ساتھ درج ہیں، یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔

(۲) ادعیۃ القرآن قرآن کریم میں جو دعائیں آئی ہیں، وہ تمام دعائیں شان نزول، ترجمہ اور ضروری فوائد کے ساتھ اس کتاب میں یکجا کی گئی ہیں۔

(۳) الاجتہاد ایک مسلمان خاص طور سے سوچنے، غور وفکر کرنے والے مسلمان کو دین و مذہب کے متعلق جو سوالات عموماً پیش آتے ہیں، ان کے متکلمانہ جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۴) امہات الامہ یہ کتاب گڑ گانوہ کے ایک عیسائی کے اعتراضات کے جواب میں لکھی گئی تھی، جس کا مقصد اگر چہ نیک تھا، مگر غیر محتاط زبان نازیبا کلمات نیز اپنی کئی اور کمزوریوں کی وجہ سے سخت ناپسند کی گئی بلکہ اختلاف و انتشار کا سبب ہوئی، اس کے خلاف بار بار شدید ردعمل ہوا، اس کے نسخے جلائے گئے، یہ کتاب تین مرتبہ چھپی تینوں مرتبہ اس کے نسخے جلا کر خاک کئے گئے، اس کی وجہ سے ڈپٹی صاحب کا علمی مقام اور قرآن کے ترجمہ کی اشاعت اس طرح متاثر ہوئی کہ بعد میں پہلی والی بات کبھی حاصل نہ ہو سکی، اگر ڈپٹی صاحب اپنی غلطی کا صاف اعتراف کر لیتے اور اس کتاب کی اشاعت ختم کرنے کا اعلان کر دیتے تو شاید ایسا سخت ردعمل نہ ہوتا، مگر ڈپٹی صاحب نے نہ معلوم کس وجہ سے اس سے رجوع نہیں کیا، جس کے اثرات دینی حلقوں

میں اب تک محسوس کئے جاتے ہیں۔

ادبی تالیفات ڈپٹی صاحب کی کتابوں میں سب سے اہم اور مشہور ترین تالیفات وہ ہیں جو عورتوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی اصلاح کے لئے لکھی گئیں تھیں اور جو اپنی خوبیوں کی وجہ سے ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئی تھیں، جن میں مرآۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، محصنات، ابن الوقت ایامی، مبتلا، رویائے صادقہ، شامل ہیں۔ یہ کتابیں پچاس برس پہلے گھر گھر پڑھی جاتی تھیں، ان کے علاوہ منتخب الحکایات، چند پند سودمند، مبادی الحکمت، ما یغنیک فی الصرف، نصاب خسرو، رسم الخط، اور صرف صغیر وغیرہ بھی علمی یادگار ہیں۔ نیز دو جلدوں میں لکچروں کا مجموعہ، کئی انگریزی کتابوں کے اعلیٰ درجہ کے ترجمے، خصوصاً تعزیرات ہند، قانون شہادت، مصائب غدر اور تاریخ دربار تاج پوشی کے تراجم، ڈپٹی صاحب کی ترجمہ پر ماہرانہ گرفت اور اعلیٰ صلاحیت و کمال کے گواہ ہیں، اس کے علاوہ بھی کئی تحریریں علمی یادگار ہیں۔(۱)

[۲۷] مولوی ضیاء الدین دہلوی (ایل ایل ڈی) (۴)

شیخ ضیاء الدین، بن محمد بخش، بن غلام حسین دہلوی بسی دارا پور کے رہنے والے تھے، ان کے والد داروغہ تھے۔ حضرت مولانا مملوک العلی اور مفتی صدر الدین آزردہ سے اور دہلی کالج میں پڑھا، تعلیم کے بعد نارمل اسکول میں مدرس مقرر کئے گئے، بعد میں دہلی کالج میں عربی کے پروفیسر ہوئے، دہلی کالج بند ہو گیا تو مولانا ضیاء الدین کو اسسٹنٹ کمشنر بنا دیا گیا تھا، پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے اور مولوی فاضل، منشی فاضل کے (اعلیٰ درجہ کے معیاری علمی امتحانات تھے) ممتحن بھی رہے، علمی خدمات کی وجہ سے متعدد اعزازات ملے۔ آخر میں پنشن لے کر دہلی آگئے تھے جامع مسجد کے پاس گوشہ نشین رہے، بہت متقی

(۱) تفصیلات کے لئے دیکھئے حیات النذیر مرتبہ مولوی افتخار عالم مارہروی، اور ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، احوال و آثار ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی

پرہیز گار متواضع اور خلیق تھے، عبادات اور اپنے معمولات و اوراد کے سختی سے پابند تھے، دہلی میں ہوتے تو جامع مسجد میں نماز ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

سنہ ۱۳۲۶ھ (غالباً جنوری ۱۹۰۹ء) میں حج کیلئے گئے اور مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ جاتے ہوئے راستہ میں ہیضہ سے فوت ہوکر اپنی مراد کو پہنچ گئے:

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را"

انشاء اردو، منتخبات اردو، مقرعہ العملہ، مفتاح الارض وغیرہ تالیفات اور طبعیات پر ایک رسالہ اور رسوم دہلی کا ایک حصہ تحریری یادگار ہیں۔(۱)

[۲۸] مولوی منشی ذکاء اللہ خاں دہلویؒ (۵)

بہادر شاہ کے بیٹے مرزا کوچک سلطان کے اتالیق حافظ ثناء اللہ کے فرزند تھے، سنہ ۱۸۳۲ء (۴۸-۱۲۴۷ھ) میں دہلی میں پیدا ہوئے، تقریباً بارہ سال کی عمر میں دہلی کالج میں داخل ہوئے، مولانا مملوک العلی مولانا صدر الدین آزردہ سے تعلیم حاصل کی، دہلی کالج کے ممتاز طالب علموں میں سے تھے۔ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی دہلی کالج میں ریاضی کے استاد مقرر کر دیئے گئے تھے، وہاں سے ترقی ہوکر آگرہ کالج کے پروفیسر ہوئے، سات آٹھ سال اسی ملازمت پر گذار کر سنہ ۱۸۵۵ء ڈپٹی انسپکٹر مدارس بلند شہر مراد آباد بنائے گئے۔ سنہ ۱۸۶۹ء (۸۶-۱۲۸۵ھ) میں نارمل اسکول دہلی کے مدرس اعلیٰ بنائے گئے تھے مگر اس ملازمت پر جانے سے پہلے ہی میور سنٹرل کالج الہ آباد میں عربی فارسی کے پروفیسر ہو گئے، چھبیس سال اسی عہدہ پر کام کیا، وہیں سے وظیفہ یاب ہوئے، اس کے بعد دہلی میں قیام کیا اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔

ڈپٹی ذکاء اللہ کا ہندوستان کے کثیر التصانیف مصنفین میں شمار ہے، مختلف موضوعات

(۱) وصال الجمیل تالیف امان الرحمٰن چشتی دہلوی (مؤلفہ و مطبوعہ دہلی: ۱۳۴۳ھ) نیز دیکھئے:
نزہۃ الخواطر میں بھی مولانا ضیاء الدین کا مختصر تعارف درج ہے۔ نزہہ میں جو سنہ وفات لکھا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔

پر جن میں تاریخ، ریاضی اور ادب خاص عنوان تھے، تصانیف کا بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑا۔ تین سو سے زائد تصانیف مؤلفات اور ترجموں کا سراغ ملتا ہے، جن میں تاریخ ہندوستان (جو ہندوستان کی تاریخ پر اہم کتابوں کا خلاصہ ہے) اس کے علاوہ تاریخ عروج عہد انگلشیہ، آئین قیصری، سوانح عمری مولوی سمیع اللہ دہلوی مشہور ہیں۔ کثیر تصانیف کے علاوہ جو بہت تیزی سے چھپتی رہتی تھیں مضامین کا بھی بہت بڑا ذخیرہ یادگار ہے، کئی رسائل میں پابندی سے ہر ہفتہ یا ماہانہ مضامین لکھتے تھے۔(۱)

مولانا کے کثرت تحریر و تصنیف کا یہ عالم تھا کہ خود اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ میں اپنے قلم سے باون ہزار (۵۲۰۰۰) صفحات لکھ چکا ہوں۔(۲)

تقریباً اکیاسی سال کی عمر میں ۱۴ر ذی قعدہ سنہ ۱۳۲۸ھ (۷ر نومبر ۱۹۱۰ء) کو دوشنبہ کے دن دہلی میں انتقال ہوا۔(۳)

[۲۹] مولوی سمیع اللہ دہلوی (۶)

مولوی سمیع اللہ خاں، بن عزیز اللہ خاں، بن محمد احمد خاں ایک پرانے علوی خاندان سے تعلق تھا جو شیخ جلال الدین سرخ (مخدوم جہانیاں جہاں گشت) کی اولاد میں ہے، مولوی صاحب کے والد منشی عزیز اللہ خاں، آکٹرلونی کے میر منشی تھے۔

مولوی سمیع اللہ جن کا گھریلو نام محمود خان تھا۔ سنہ ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۴ء) میں پیدا ہوئے، آغا مرزا تاریخی نام ہے، والد کو بچوں کی تعلیم و تربیت کا بے حد خیال تھا، ناظرہ قرآن شریف پڑھنے کے بعد فارسی شروع ہوتے ہی عربی کی کتابوں کی ابتداء ہوئی، دہلی کالج کے مدرس اول و دوم مولانا مملوک العلی اور مولانا سید محمد دہلوی سے دونوں کے گھروں

(۱) تاریخ ادب اردو، سکسینہ ترجمہ مرزا محمد عسکری ص: ۶۱۔۶۰ (نول کشور لکھنؤ طبع اول)

(۲) نزہۃ الخواطر ص: ۱۳۹ جلد ۷ (حیدرآباد: ۱۴۰۲ھ)

(۳) واقعات دار الحکومت ص: ۱۷۱ جلد دوم (آگرہ ۱۹۱۹ء) ہجری تاریخ کتبۂ وصال پر درج ہے، یہی وصال الجمیل میں بھی درج ہے جس کے مصنف دہلی کے رہنے والے تھے اور دہلی کی مقتدر شخصیتوں سے ذاتی طور سے واقف تھے۔

پر پڑھنا شروع کیا۔ مولوی ذکاء اللہ کی اطلاع کے مطابق:

''مولوی سید محمد سے انہوں نے کافیہ اور شرح ملا اور مختصر المعانی کا درس لیا اور مولوی مملوک العلی صاحب سے منطق اور اصول فقہ کی کتابیں پڑھیں، دونوں علماء سے تلمذ اور استفادہ کے بعد معقولات کی اعلیٰ درسیات مولانا مفتی صدر الدین آزردہ کی خدمت میں حاصل کیں۔'' (۱)

مولوی سمیع اللہ کے خاندان کے اصحاب اپنے زمانہ کے مشہور وکیل اور قانون داں تھے، اس لئے مولوی سمیع اللہ کو بھی قانون پڑھنے کا شوق ہوا، اسی زمانہ میں کچھ دنوں کے لئے دہلی سے بجنور گئے، بجنور میں سر سید احمد منصف تھے، یہ وقت سر سید احمد کے ساتھ گذرا اور اس میں قانون سے واقفیت حاصل کی اور اسی وقت عدالت کے کتب خانہ اور سرکاری کاغذات کی مدد سے ایک مجموعہ قوانین تیار کرلیا، نومبر سنہ ۱۸۵۶ء میں منصفی اور وکالت کا امتحان دیا، سمیع اللہ امتحان میں اول آئے، اور تمام طلبہ سے ممتاز رہے، مفتی صاحب اپنے شاگرد کی اس کامیابی سے خوش ہوئے، ان کو مبارک باد دی مگر آبدیدہ ہوکر فرمایا:

''افسوس اب تم قانونی مشاغل میں مصروف ہونے کے باعث علوم قدیمہ کی شمع کو روشن نہ رکھ سکو گے اور تمہارے استادوں کا نام زندہ نہ رہ سکے گا جنہوں نے اس غرض سے جہاں تک ان سے ممکن تھا حلیہ علم وادب سے مزین کیا تھا۔'' (۲)

مولوی صاحب نے کتابوں کی اشاعت کیلئے اپنے گھر پر ایک ادارہ قائم کیا تھا جس میں علمی کتابوں کے حاشیہ وغیرہ کی تالیف اور ان کے چھاپنے کا انتظام تھا، مولوی صاحب کی ایک تالیف حاشیہ مختصر المعانی اس پریس میں چھپی تھی، اور کتابیں تیار رکھی تھیں جو سنہ ۱۸۵۷ء میں ضائع ہوگئیں۔

سنہ ۱۸۵۷ء میں دہلی والوں پر جو آفت آئی تھی وہ محتاج بیان نہیں، مولوی سمیع اللہ صاحب نے اس مصیبت کے وقت اپنے متعلقین مفتی صدر الدین آزردہ وغیرہ کی جس قدر بھی اور جس طرح کی مدد ممکن تھی بہم پہنچائی، جس سے مولوی صاحب کی انسانیت دوستی

---

(۱) سوانح عمری مولوی سمیع اللہ خاں، مولوی ذکاء اللہ ص: ۱۷-۱۸ (لکھنؤ ۱۹۹۷ء)

(۲) سوانح عمری مولوی سمیع اللہ خاں، مولوی ذکاء اللہ ص: ۲۴ (لکھنؤ ۱۹۹۷ء)

اعلیٰ خاندانی شرافتوں کا خوب اظہار اور تجربہ ہوا۔

۷/اگست سنہ ۱۸۵۸ء (۲۶/ذی الحجہ ۱۲۷۴ھ) کو کانپور کے منصف کے عہدہ پر تقرر ہوا، اس وقت سے سرکاری ملازمت میں آ گئے تھے، اور منصف صدر سے جج کے عہدہ تک تبادلے اور ترقیات ہوتی رہیں، ۱۵/نومبر سنہ ۱۸۹۲ء کو سرکاری خدمات سے پنشن لے کر علیحدہ ہو گئے اور بقیہ زندگی یادِ خدا اور قومی خدمات میں بسر کرنے کا ارادہ کرلیا۔

مولانا سمیع اللہ صاحب کو ابتدا سے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور علمی ادارے قائم کرنے کا خیال تھا، پہلے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا، جس کا آغاز بہت اچھا ہوا تھا مولانا رشید الدین دہلوی کے فرزند مولانا سدید الدین دہلوی اس کے صدر مدرس تھے، جو بعد میں رامپور چلے گئے تھے، اور مولوی سمیع اللہ سرکاری ملازمت کی وجہ سے دہلی سے باہر رہتے تھے اسلئے کالج کی خاطر خواہ ترقی نہ ہوسکی اور یہ مدرسہ یا اسکول جلد ہی بند ہو گیا تھا۔ اپنے اسی ذوق کی وجہ سے سرسید کے تعلیمی کارواں میں شامل ہوئے، سرسید احمد کے ساتھ پر جوش تعاون کیا اور سرسید کے علمی تعلیمی منصوبہ کی ترقی اور آبیاری کے لئے سرگرم رہے، کالج کی ابتداء کی تاریخ بھی مولوی صاحب کے مشورہ سے طے ہوئی تھی، اس وقت مولوی سمیع اللہ علی گڑھ میں سب جج تھے، انہوں نے اپنے معمول کے مطابق اس کیلئے جدو جہد کی اور افتتاحی مجلس کو کامیاب بنایا، کالج کی ترقی میں بھی مولوی صاحب کا خاص حصہ ہے۔ مالی امداد کرتے اور اپنے مشوروں سے بھی تعاون کیا کرتے تھے مگر آخر میں سنہ ۱۸۸۹ء میں ٹرسٹی بل کی وجہ سے سرسید سے سخت اختلاف ہو گیا تھا جس سے بددل ہو کر مولوی صاحب کالج اور اس کی کمیٹیوں سے مستعفی ہو کر یکسو ہو گئے۔

مولوی سمیع اللہ صاحب کا ۵/ربیع الاول سنہ ۱۳۲۶ھ ۷/اپریل ۱۹۰۸ء شنبہ کو علی گڑھ میں انتقال ہوا، میت دہلی لاکر مہندیان کی مسجد سے متصل شیخ عبد العزیز شکر بار اور مولانا مملوک العلی کے مزارات کے قریب دفن کی گئی۔(۱)

(۱) تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: سوانح عمری مولوی سمیع اللہ خاں، مولوی ذکاءاللہ (لکھنؤ ۱۹۹۷ء)

[۳۰] مولانا انوار الحق حقی دہلویؒ (۷)

حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی اولاد میں سے تھے، مولانا انوار الحق کے والد شاہ احسان الحق اور دادا مفتی اکرام الدین خانصاحب دہلی کی معروف شخصیتوں میں سے تھے۔ مولانا مملوک العلی اور مفتی صدر الدین آزردہ سے تعلیم حاصل کی، تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا، راجپوتانہ کے گورنر جنرل کے میر منشی تھے، آخر میں پنشن لے کر گھر آ گئے تھے۔ نہایت خلیق، منکسر المزاج، پاکیزہ صورت شخص تھے تفصیلی حالات نہیں ملے۔

۲۰ ر رمضان المبارک سنہ ۱۳۲۰ھ (دسمبر ۱۹۰۲ء) پنجشنبہ کو وفات ہوئی، دوسرے دن جو جمعۃ الوداع تھا، جامع مسجد دہلی میں نمازِ جنازہ ہوئی۔ (۱)

[۳۱] مولانا سید عبد اللہ دہلویؒ (۸)

دہلی کالج کے مدرس دوم مولانا سید محمد دہلوی کے فرزند، عالم اور درویش صورت بزرگ تھے۔ مولانا مملوک العلی سے تعلیم حاصل کی حافظ موسیٰ مانک پوری کے خلیفہ خواجہ عبد اللہ دہلوی سے اجازت وخلافت حاصل کی۔

نوے سال کی عمر میں ۲۴ ر ذی قعدہ سنہ ۱۳۳۰ھ (نومبر ۱۹۱۲ء) کو دہلی میں وفات ہوئی۔ (۲)

(۱) حیات شیخ عبد الحق محدث دہلوی، پروفیسر خلیق احمد نظامی حاشیہ ص: ۲۶۴ (دہلی ۱۳۷۳ھ)
(۲) وصال الجمیل (در احوال شاہ جمیل الرحمن راشد دہلوی) تالیف امان الرحمن دہلوی ص: ۱۷ (دہلی ۱۳۴۳ھ)

[۳۲] مولانا سید ہاشم علی دہلویؒ (۹)

مولانا کے عہد کی متعدد تحریروں اور فتاویٰ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا اپنے عہد میں دہلی کے ممتاز عالم اور اہل فتویٰ میں شمار کئے جاتے تھے، اکثر درسیات مولانا مملوک العلی سے پڑھی تھیں، فرماتے تھے کہ:

''حسامی اور تلویح یہ کتابیں اپنے استاد مولوی مملوک العلی سے پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔''(۱)

سنہ ۱۸۵۷ء میں آزادی کی تحریک کے وقت دہلی کے علماء نے جہاد کا جو فتویٰ مرتب کیا تھا اس پر دہلی کے جید ترین علماء کے دستخط تھے، منجملہ ان علماء کے مولانا کی مہر بھی اس فتوے پر ثبت ہے: (محمد ہاشم)(۲)

مولانا کا دہلی کے اس دور کے علماء کی تحریروں اور فتاویٰ وغیرہ میں ذکر آتا ہے اور مولانا شیخ محمد تھانوی کی تالیف دلائل الاذکار کے آخر میں جو چند تقریظات درج ہیں ان میں ایک تقریظ مولانا ہاشم کی بھی ہے۔(۳) عبدالرحیم ضیاء نے مقالات طریقت میں مولانا کے حوالہ سے شاہ عبدالعزیز کے کئی واقعات نقل کئے ہیں۔

افسوس ہے راقم کو مولانا کے حالات بلکہ سن وفات بھی نہیں ملا۔

[۳۳] مولوی علی احمد (برادر ڈپٹی نذیر احمد) بجنوری دہلوی (۱۰)

مولوی علی احمد خلف سعادت احمد نسب اور وطن وغیرہ کا ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے

(۱) مقالات طریقت وفضائل عزیزیہ، عبدالرحیم ضیاء ص:۴۸ (حیدرآباد دکن ۱۲۹۲ھ)

(۲) نوائے آزادی، عبدالرزاق قریشی ص:۸-۹ (بمبئی ۱۹۵۷ء)

(۳) دلائل الاذکار ص:۱۰۲ (فخر المطابع دہلی ۱۲۷۱ھ)

تعارف میں ذکر آچکا ہے۔تقریباً سنہ ۱۸۲۷ء (۴۳-۱۲۴۲ھ) میں تولد ہوئے۔ڈپٹی نذیر احمد سے ڈھائی تین سال بڑے تھے، ابتدائی تعلیم سے آخر تک ڈپٹی نذیر احمد کے ساتھ رہے، مولانا نصر اللہ خاں خویشگی سے پڑھا، مولانا کے مشورہ پر دہلی آئے، دہلی کے علماء سے کچھ کتابیں پڑھیں، پھر دہلی کالج میں داخلہ ہوا۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ساتھ انہوں نے بھی مولانا مملوک العلی سے پڑھا۔سنہ ۱۸۵۴ء میں تعلیم سے فارغ ہوئے اور اسی سال بریلی کے مدرسہ میں عربی کے استاد مقرر کئے گئے، لمبے عرصہ تک اسی عہدہ پر کام کرتے رہے، آخر میں ضلع بجنور کے انسپکٹر مدارس ہوگئے تھے، اسی منصب سے سبکدوش ہوئے، پوری عمر تعلیم کے شعبہ سے وابستہ رہے، عربی میں بڑی دستگاہ حاصل تھی ادیب تھے، اعلیٰ استعداد عربی سے گہری واقفیت اور فنی نظر میں ڈپٹی نذیر احمد سے کم نہیں تھے مگر اُن کی شہرت نہیں ہوئی اور کوئی بڑا تصنیفی کارنامہ بھی یادگار نہیں۔

مؤلف حیات النذیر نے لکھا ہے کہ:

"مولوی علی احمد مذہبی پابندی اور تقویٰ میں (مولوی نذیر احمد سے) بدرجہا بڑھے ہوئے تھے، عالم گم نامی میں رہے۔" (۱)

مولوی صاحب نے ڈپٹی نذیر احمد کی فرمائش پر عربی صرف ونحو کے بنیادی اصول و قواعد پر توضیح المرام کے نام سے ایک مفصل کتاب لکھی تھی، جو چھپ گئی تھی۔

۱۷ر دسمبر سنہ ۱۹۰۰ء (۲۴ر شعبان ۱۳۱۸ھ) کو بجنور میں وفات ہوئی۔

[۳۴] کریم الدین پانی پتی دہلوی (۱۱)

کریم الدین کے اجداد پیلی بھیت کے رہنے والے تھے، ان کے دادا پانی پت آگئے تھے، وہیں کریم الدین کے والد سراج الدین پیدا ہوئے۔سراج الدین کے چار بیٹوں میں سے ایک کریم الدین بھی تھے، کریم الدین یکم شوال سنہ ۱۲۳۷ھ (۲۲ جون ۱۸۲۲ء) کو

(۱) حیات النذیر، مولوی افتخار عالم، ص:۷ (دہلی ۱۹۱۹ء)

پانی پت میں پیدا ہوئے، والد اور دادا دونوں متوکل اور مسجد نشیں تھے، گھر میں سخت تنگی اور مالی پریشانی تھی۔

کریم الدین نے پانی پت میں فارسی کی ابتدائی کتابیں اور عربی صرف ونحو پڑھی، پھر دہلی آگئے، تعلیم میں مشغول رہے، اس زمانہ میں دہلی کالج کا غلغلہ بلند تھا، کریم الدین کا اٹھارہ سال کی عمر میں سنہ ۱۲۵۵ھ (۱۸۴۰ء) میں دہلی کالج میں داخلہ ہوا، کالج میں منطق فلسفہ، ہندسہ، حساب، ہیئت، پیمائش، علم المرایا والمناظر، تاریخ، عربی زبان وادب اور فقہ پڑھی، پھر کالج کے پرنسپل کی ہدایت پر سیاست مدنی قوانین دیوانی وفوجداری، ریاضی وغیرہ حاصل کیں اور بہت کم وقت میں انگریزی میں ایسی مہارت حاصل کرلی کہ انگریزی کتابوں کے اردو ترجمے کئے۔

کالج میں مولانا مملوک العلی، کریم الدین کے محبوب اور اہم ترین استاد تھے۔ کریم الدین نے اپنی کتابوں تذکرہ فرائد الدہر اور طبقات شعرائے ہند میں مولانا کا نہایت احترام اور محبت سے ذکر کیا ہے، وہ مولانا کو استاذنا وھادینا اور میرے استاذ کہہ کر یاد کرتا ہے، مگر تعجب ہے کہ محمد اکرام چغتائی صاحب کو کریم الدین کے مولانا مملوک العلی کا شاگرد ہونے میں شبہ ہے، چغتائی صاحب نے لکھا ہے کہ:

''کریم الدین کے اساتذہ میں مولانا مملوک العلی نانوتوی کا نام بھی لیا جاتا ہے ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ علوم مولانا سے پڑھتے ہوں۔''(۱)

جس سے تاثر ملتا ہے کہ چغتائی صاحب کریم الدین کو مولانا کا شاگرد نہیں سمجھتے مگر چغتائی صاحب کا یہ خیال صحیح نہیں۔ چغتائی صاحب نے اسی صفحہ پر کریم الدین کی تالیف تاریخ شعرائے عرب میں مولانا مفتی صدر الدین کے تذکرہ میں کریم الدین کے الفاظ ''شیخنا واستاذنا وھادینا'' سے مفتی صاحب کے کریم الدین کے استاد ہونے پر استدلال کیا ہے، اسی کتاب میں مفتی صاحب کے تذکرہ کے چھ صفحہ بعد مولانا مملوک العلی کا ذکر ہے، وہاں کریم الدین نے یہی الفاظ مولانا مملوک العلی کے لئے لکھے ہیں، اگر یہ

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص:۱۴۲

الفاظ مفتی صاحب کے کریم الدین کے استاد ہونے کی دلیل بن سکتے ہیں تو مولانا مملوک العلی کے متعلق الفاظ سے یہی استدلال کیوں نہیں کیا جا سکتا؟ اور کریم الدین نے صرف اسی موقع پر حضرت مولانا مملوک العلی کو اپنا استاذ نہیں لکھا، بلکہ اس نے اپنی اس کتاب میں مولانا سے تلمذ و استفادہ کا کئی جگہوں پر صاف اعتراف کیا ہے، کریم الدین نے مولانا کے کتب خانہ خصوصاً ان کی قلمی کتابوں سے خاصا استفادہ کیا ہے، ان میں سے اور جن کتابوں کے تذکرہ کا تاریخ شعرائے عرب میں موقع آیا وہاں لکھ دیا ہے کہ اس کتاب کا قلمی نسخہ میرے استاد مولانا مملوک العلی کی کتابوں میں ہے، ایک جگہ لکھتا ہے:

''میرے استاد جناب مولوی مملوک العلی مدرس اول مدرسہ دہلی کے''.........(۱)

ایک اور موقع پر صراحت ہے:

''میرے استاد مولوی مملوک العلی صاحب''(۲)

اس لئے چغتائی صاحب کی یہ رائے درست نہیں، کریم الدین بلا شک وشبہ مولانا مملوک العلی کے شاگرد تھے۔

کریم الدین نے دہلی کالج کے علمی ماحول میں تعلیم پائی تھی، اس لئے تعلیم سے فارغ ہوتے ہی علمی کاموں میں مشغول ہو گئے۔ کتابوں کے اردو ترجمے کئے، متعدد تصانیف مرتب کیں، اور علمی ادبی محفلوں سے جڑے رہے۔ کریم الدین کو شعر وادب سے بھی خاص دلچسپی تھی، اس کے گھر پر ماہانہ طرحی مشاعرہ ہوتا تھا اور وہ دہلی کی سماجی علمی محفلوں کی جان سمجھے جاتے تھے۔

کریم الدین سنہ ۱۸۵۰ء میں آگرہ کالج میں مدرس اول مقرر ہوئے، سنہ ۱۸۵۷ء میں ملازمت جاتی رہی، حالات بہتر ہوئے تو کریم الدین لاہور پہنچے، یہاں بھی محکمہ تعلیم سے وابستہ ہوئے، پہلے سررشتہ دار پھر انسپکٹر آف اسکول بنائے گئے، اس عہدہ سے وظیفہ یاب ہوئے۔ صحیح سنہ اور تاریخ وفات معلوم نہیں، شیخ اسماعیل پانی پتی نے بلا کسی حوالہ کے

(۱) تاریخ شعرائے عرب (ترجمہ تذکرہ فرائد الدہر) ص:۲۰۵ (دہلی ۱۸۴۷ء)

(۲) تاریخ شعرائے عرب (ترجمہ تذکرہ فرائد الدہر) ص:۳۱۶، ۳۷۰ (دہلی ۱۸۴۷ء)

لکھا ہے کہ کریم الدین سنہ ۱۸۷۹ء میں فوت ہوئے (۱) مگر اس اطلاع کی کسی اور ذریعہ سے تصدیق نہیں ہوئی۔

کریم الدین بہت فعال اور تیز قلم مصنف ومترجم تھے، کئی کتابوں کے ترجمے کئے اور متعدد موضوعات پر تیس سے زائد تالیفات یادگار چھوڑیں (۲) جن میں اردو شعراء کے تذکرہ طبقات شعرائے ہند کو بہت شہرت ملی اور کتابوں میں تذکرہ فرائد الدہر، اس کا اردو ترجمہ تاریخ شعرائے عرب، نیز تاریخ ابوالفداء کا چار جلدوں میں ترجمہ نہایت اہم ہے۔ (۳)

[۳۵] مولوی حکیم عبدالرحمٰن حیرت جھنجھانوی (۱۲)

حکیم عبدالرحمٰن بن شمس الدین امام بخش عاجز بن صدیقی۔ جھنجھانہ کے پرانے علمی دینی گھرانے سے تعلق تھا، تقریباً سنہ ۱۲۴۴ھ (۱۸۲۸ء) میں ولادت ہوئی۔ حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کے نواسہ تھے اس وجہ سے کاندھلہ بھی گھر کی طرح تھا، والد کی جلد ہی وفات ہوگئی تھی، تعلیم وتربیت کی ذمہ داری کاندھلہ کے رشتہ داروں نے انجام دی۔ کاندھلہ رہ کر تین سال میں قرآن شریف کا حفظ اور دور مکمل کیا، مولانا ابوالحسن کاندھلوی سے ابتدائی فارسی پڑھی، مولانا عبدالرزاق جھنجھانوی سے فارسی کی درسیات کا سبق لیا۔ دہلی آئے تو شاہ محمد اسحاق کے مدرسہ میں قیام کیا، مولانا امام بخش صہبائی سے فارسی میں کمال حاصل کیا، حکیم احسن اللہ خاں دہلوی سے طب پڑھی، اسی دوران مولانا مملوک العلی کے مکان پر بھی رہے اور پڑھا، حضرت مولانا سے غالباً عربی متوسطات اور فنون کی

---

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص: ۱۴۷

(۲) کریم الدین کے حالات کے لئے دیکھئے ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص: ۱۳۸-۱۸۲

(۳) کریم الدین کی تاریخ شعرائے عرب (ترجمہ فرائد الدہر) مطبوعہ مطبع العلوم دہلی: ۱۸۴۷ء، اور ترجمہ تاریخ ابوالفداء چار جلدیں (مطبوعہ مطبع العلوم مدرسہ دہلی ۱۸۴۷ء) مع ضمیمہ، ترجمہ المختصر فی اخبار البشر (یعنی مکمل ۵ جلد) کا ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

کتابوں میں تلمذ ہوا ہوگا، صحیح معلوم نہیں۔ حکیم عبدالرحمٰن نے لکھا ہے:

"چندے اقامت مابر مکان جناب مولوی مملوک العلی صاحب ہم قرار یافت، و کوکب طالب علمی بمہر توجہ بزرگانہ آں حضرت می تافت" (۱)

ترجمہ: کچھ دنوں جناب مولوی مملوک العلی صاحب کے مکان پر بھی قیام رہا اور ان حضرت کی توجہ بزرگانہ سے طالب علمی کا ستارہ چمکتا رہا۔

مولانا امام بخش صہبائی سے شعر وسخن میں بھی استفادہ کیا اور مولانا کے فن شعر کے شاگردوں میں ممتاز گنے گئے۔

حیرت کی سولہ سال کی عمر تھی کہ مولانا ابوالحسن اور مولانا مظفر حسین صاحبان نے ان کو سرسید کے سپرد کر دیا تھا، سرسید نے دونوں بزرگوں کی اس عنایت وہدایت کا زندگی بھر خاص خیال رکھا۔ سرسید کو حیرت سے اپنے عزیزوں بلکہ سگے چھوٹے بھائیوں کی طرح انسیت تھی، سرسید ان کو ہمیشہ سفر وحضر میں اپنے پاس اور ساتھ رکھتے، ساتھ کھانا کھاتے اور اسی کمرہ میں سلاتے جہاں خود سوتے، حالی نے مرزا غلام نبی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

"حافظ عبدالرحمان جو پینتالیس برس سید صاحب کے رفیق رہے وہ رہتک میں بھی ان کے ساتھ تھے، اگر چہ وہ سرکاری نوکر تھے مگر سید صاحب قلت تنخواہ کے سبب ان کو اپنے پاس رکھتے تھے، ان سے اکثر ہنسی چہل کے باتیں ہوتی رہتی تھیں، حافظ جی اپنی ترقی کے لئے اکثر کہا کرتے مگر چوں کہ ترقی کی گنجائش نہ تھی، سید صاحب ہنسی سے یہ کہہ کر ٹال دیتے تھے کہ تمہارا خط اچھا نہیں اور نہ کبھی اچھا ہو سکتا ہے کیوں کہ تم بدصورت ہو اور بدصورت کبھی خوش نویس نہیں ہو سکتا۔ ایک دن حافظ جی نے کہا آپ تو ماشاء اللہ بہت وجیہ ہیں آپکا خط کیوں اچھا نہیں، سید صاحب نے کہا میرے گلے کی رسولی نے میری وجاہت کو بگاڑ دیا ہے، اس واسطے میں بھی بدصورت ہو گیا ہوں پس میرا خط کیوں کر اچھا ہو سکتا ہے"۔ (۲)

اس محبت واپنائیت کا کمال یہ تھا کہ:

شامہ مشام افروز (مجموعہ مکتوبات فارسی) عبدالرحمٰن حیرت جھنجھانوی ص:۳۶ (مرادآباد ۱۳۰۳ھ)

(۲) حیات جاوید، مولانا الطاف حسین حالی ص:۴۱۳ جلد اول (انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۳۹ء)

''ان کی نیکی اور خوبی کو ہر کوئی یاد کرتا ہے سنہ ۱۸۴۶ء سے جس کو چالیس برس ہوئے سید احمد خاں کے ساتھ بطور عزیز رشتہ داروں کے رہتے تھے، اس عرصہ دراز میں کبھی ایک دن ایسا امر پیش نہیں آیا جو دونوں میں سے کسی کے ملال کا باعث ہوا ہو، اس سے حافظ صاحب مرحوم کی خوبی اور نیک مزاجی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے''۔(۱)

حیرت سرسید کے بچوں سید محمود اور حامد کے استاد اور معلم و مربی تھے، عبدالرحمان حیرت شروع سے سائنٹفک سوسائٹی، تہذیب الاخلاق اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے منیجر اور ناشر تھے، سوسائٹی کے تمام کاموں کے علمی سرپرست اور سوسائٹی کے روحِ رواں بھی وہی تھے۔ اخبار ان کے اہتمام میں چھپتا تھا، سوسائٹی کی مطبوعات کی تصحیح کی خدمت بھی حیرت انجام دیتے تھے، سترہ اٹھارہ برس تک سوسائٹی کا کام کرتے رہے، آخر میں اگرچہ سوسائٹی کا کام ختم ہو گیا تھا مگر عبدالرحمٰن حیرت سے سرسید کے قدیم روابط اسی طرح قائم رہے، اس کے بعد بھی سرسید احمد نے حیرت کا ہمیشہ اسی طرح خیال رکھا۔

عبدالرحمان حیرت کی تقریباً انسٹھ سال کی عمر میں، ۵/جمادی الثانی سنہ ۱۳۰۳ھ (مارچ ۱۸۸۲ء) کو علی گڑھ میں سرسید کی کوٹھی پر وفات ہوئی، علی گڑھ میں دفن کئے گئے۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے تعزیتی نوٹ میں لکھا ہے کہ:

''سید احمد خاں کو ان کے انتقال کا بہت رنج ہوا کیوں کہ آج ان کا چالیس برس کا دوست دنیا سے اٹھ گیا''۔(۲)

حیرت اچھے منتظم، فاضل طبیب، فارسی اردو کے ادیب، شاعر اور انشاء پرداز تھے فارسی، اردو دونوں زبانوں میں کئی تالیفات اور ایک دیوان علمی یادگار ہے، تالیف میں سے سفینہ رحمانی، انشائے فیض رحمانی، شمامۂ مشام افروز، فارسی نثر میں اور مجموعہ کلام کے علاوہ مثنوی جنگ عشق، ساقی نامہ اور محمود نامہ اردو میں ہیں۔ آخر الذکر کے علاوہ سب کتابیں چھپی ہوئی ہیں جو ہمارے ذخیرہ میں موجود ہیں۔

---

(۱) ، (۲) مضمون تعزیت سرسید کے اخبار انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوا۔ ملاحظہ ہو سرسید کی تعزیتی تحریریں، مرتبہ اصغر عباس، ص: ۵۰ (علی گڑھ ۱۹۸۹ء)

[۳۶] مولوی کریم بخش دہلوی (۱۳)

مولوی کریم بخش کے خاندان ونسب وغیرہ کی تفصیل مجھے نہیں ملی، مولوی کریم بخش دہلی کالج کے طالب علم تھے، کالج کے طلبہ کے احوال اور تفصیلات پر سنہ ۱۸۴۷ء (۱۲۶۳ھ) کے مطبوعہ رجسٹر کے اندراج کے مطابق سنہ ۱۸۴۷ء (۱۲۶۳ھ) میں کریم بخش کی عمر تقریباً بیس سال تھی، یعنی ان کی سنہ ۱۸۲۷ء (۱۲۴۳ھ) میں ولادت ہوئی ہوگی۔

مولوی کریم بخش کا سنہ ۱۸۴۳ء میں کالج میں داخلہ ہوا، سنہ ۱۸۴۷ء میں عربی کی اول جماعت کی قسم ثانی میں پڑھتے تھے، جس کے استاد حضرت مولانا مملوک العلی تھے اس سال میں جو کتابیں یا مضامین پڑھے وہ یہ ہیں: ہدایہ، تاریخ یمینی، دیوان متنبی، جامع التواریخ، جزئیات وکلیات، رسالہ ہیئت، علم مثلث، جواب مضمون، کریم بخش کا کالج کے اچھے طالب علموں میں شمار تھا، اس سال پوری جماعت میں دوسرے نمبر پر آئے تھے۔

مولوی کریم بخش سنہ ۱۸۵۲ء میں دہلی کالج کے رسالہ قران السعدین کے مدیر تھے، اور کئی کتابوں کے مؤلف ومترجم بھی تھے، چند کتابوں میں شریک تصنیف کی حیثیت سے شامل رہے۔

مولوی صاحب کی تالیفات وترجموں میں رسالہ جبر ومقابلہ ہٹن (HUTTON) کی تالیف کا اردو ترجمہ جو اصول علم مثلث کے نام سے چھپا شائع ہو چکے ہیں، دونوں کتابوں کی تالیف وترجمہ میں پنڈت رام چندر بھی شامل رہے۔ عجائبات محنت شعاری ایچ ایس رائڈ (H. S. RIDE) کی کتاب (THE PHENOMENA OF INDUSTRIAL LITE AND CONDITION OF INDUSTRIAL SUCCESS) کا اردو ترجمہ کیا، ہندوستانی پینل کوڈ کے ترجمہ میں عظمت اللہ کیساتھ رہے دائرہ علم جغرافیہ شیام لال کی تصحیح، رسالہ اصول محصول، انتباہ المدرسین مل (MILL) کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ جغرافیہ جہاں وغیرہ جو

سب شائع ہو چکی ہیں، علمی تحریری یادگار ہیں۔(۱)

[۳۷] مولانا یعقوب علی بدایونی (۱۴)

مولانا یعقوب علی کا تذکرہ مولوی سید محمد سید پوری بدایونی نے اپنی اہم تالیف مظہر العلماء و الکملاء میں کیا ہے، جو ڈاکٹر محمد ایوب قادری کی اطلاع کے مطابق درج ذیل ہے:

''مولوی یعقوب علی صاحب بدایونی معمولی طور سے کتب درسیہ ابتدائی اساتذہ کرام سے پڑھ کر اپنے نانہال بریلی کو تشریف لے گئے، ملازمت کی حالت میں بھی اساتذہ کرام سے پڑھا۔ استاذ الاساتذہ مولانا مملوک العلی صاحب کے ارشد تلامذہ میں ہیں۔''

''آخر عمر تک سررشتہ تعلیم کے عہدہ ہائے جلیلہ پر مامور رہے، تحریر فتاویٰ میں معروف و مشہور تھے، آپ کی تحریر مستند کہی جاتی تھی، بریلی میں وفات ہوئی۔ مولوی اسحاق صاحب بریلوی بھی آپ کے شاگردانِ رشید میں سے ہیں''۔(۲)

[۳۸] مولانا حکیم مرزا منور علی ہاپوڑی (۱۵)

حکیم مرزا منور علی خلف مرزا شہسوار خاں صاحب، سنہ ولادت وغیرہ اور متعلقات درج نہیں۔ فارسی مولانا امام بخش صہبائی سے، عربی مولانا فضل حق خیر آبادی اور مولانا مملوک العلی نانوتوی سے پڑھی، طب میں حکیم احسن اللہ کے شاگرد تھے۔

سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد جے پور گئے فوج میں افسر مقرر ہوئے، مگر مطب کا سلسلہ باقی رکھا۔ تقویٰ وطہارت میں کامل سیر چشم اور نہایت مہمان نواز تھے، سنہ ۱۳۰۷ھ

(۱) مفصل تعارف کے لئے ایک نادر مجموعہ مکاتیب، ص:۳۱۹-۳۲۱

(۲) سہ ماہی العلم کراچی۔ اپریل، مئی، جون ۱۹۸۷ء

(۹۰-۱۸۸۹ء) میں وفات ہوئی۔(۱)

[۳۹] قطب الدین دلاور علی طرزی ہاپوڑی (۱۶)

قطب الدین دلاور علی بن امداد علی بن اللہ بخش جعفری، حضرت جعفر صادق کی اولاد میں تھے۔ دلاور علی کے والد امداد علی بلند شہر میں سرکاری وکیل تھے، سنہ ۱۸۵۷ء رئیس بارا گڑھ (بلند شہر) کے مختار تھے۔ سنہ ۱۸۵۷ء میں حریت پسندوں کے ساتھ تعاون کی وجہ سے جائداد ضبط ہو کر نیلام ہوئی۔ دلاور علی بلند شہر میں پیدا ہوئے، وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی، اعلیٰ درسیات کے لئے دہلی گئے، دہلی میں مولانا سدید الدین سے فارسی اور مولانا مفتی صدر الدین آزردہ اور مولانا مملوک العلی سے عربی ادب، منطق و فلسفہ اور حدیث پڑھی، غالب سے شعر میں استفادہ کیا، فارسی میں شعر کہتے تھے۔ مجموعۂ کلام اور چند تالیفات یادگار تھیں۔

سنہ ۱۹۰۳ء (۲۱-۱۳۲۰) میں ملازمت سے پنشن لی، آخر میں ہاپوڑ واپس آ گئے تھے، ہاپوڑ میں چار شوال سنہ ۱۳۲۹ھ (۲۸ر ستمبر ۱۹۱۱ء) کو وفات ہوئی۔(۲)

یہ جناب مالک رام کے ان مندرجات کا خلاصہ ہے جو تلامیذ غالب میں شامل ہیں، یہ ممکن تو ہے کہ طرزی مولانا مملوک العلی کے شاگرد ہوں، بشرطیکہ وفات کے وقت دلاور علی طرزی کی عمر تقریباً اسّی (۸۰) سال ہو، کیونکہ مولانا مملوک العلی کی سنہ ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۱ء) میں وفات ہوگئی تھی۔ مولانا سے تلمذ و استفادہ کیلئے اور ان جماعتوں میں شرکت کیلئے جو مولانا سے کالج میں پڑھتی تھیں، تیرہ سال تک کی عمر ہونی چاہئے۔

نیز مالک رام صاحب کی اس اطلاع میں دو فروگذاشتیں اور ہیں، لکھا ہے کہ مولانا مملوک العلی سے حدیث پڑھی، اول تو حدیث شریف پڑھنے کا دور تعلیم کے آخر میں آتا

(۱) رموز الاطباء، حکیم فیروز الدین لاہوری ص: ۴۲۰ (لاہور سنہ ۱۹۲۴ء)

(۲) تلامذۂ غالب، مالک رام۔ ص: ۲۰۳ (طبع اول نکودر: بلا سنہ)

ہے، دوسرے مولانا مملوک العلی صاحب کے حدیث پڑھانے کی کوئی روایت واطلاع اس وقت تک دریافت نہیں ہوئی، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ مولانا سے ادب اور معقولات وغیرہ پڑھی ہوں گی، حدیث کے اسباق کی تصدیق میں تأمل ہے۔

اس اطلاع میں ایک اور بڑی غلطی یہ ہے کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی (ولادت ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۰ھ، ستمبر ۱۸۶۳ء) کو دلاور علی طرزی کا ہم سبق لکھا ہے جو ممکن ہی نہیں، اس لئے کہ مولانا تھانوی کی ولادت سے تیرہ سال پہلے مولانا مملوک العلی کی وفات ہوگئی تھی۔ یہ ممکن ہے کہ طرزی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی یا حضرت مولانا گنگوہی وغیرہ میں سے کسی کے ہم سبق ہوں، بہرصورت طرزی کا حضرت مولانا مملوک العلی سے تلمذ مزید معلومات اور صحیح تحقیق کا متقاضی ہے۔

قسم پنجم

مولانا کے چند شاگرد جن کے حالات نہیں ملے

[۴۰تا۴۸] (۱تا۸)

حضرت مولانا کے جو شاگرد معلوم ہیں ان میں سے چند ایسے بھی ہیں کہ ان کے صرف نام ملتے ہیں، احوال وتعارف دریافت نہیں، مگر ان کا جو بھی مختصر سے مختصر حوالہ ہے اس میں حضرت مولانا سے تلمذ کی صراحت ہے، اس لئے وہ نام یہاں درج کئے جاتے ہیں، ممکن ہے کسی وقت ان کا تعارف اور علمی خدمات کا تذکرہ مل جائے۔

(۴۰) مولوی مشتاق احمد: دہلی میں خاندان حضرت شاہ عبدالحق محدث کی آخری علمی شاخ میں مولانا انوارالحق حقی قابل ذکر ہیں، مولانا انوارالحق کے استادوں میں ایک

استاد کا نام مولانا مشتاق احمد ہے، جو مولانا مملوک العلی کے شاگرد تھے۔(۱)

(۴۱) مولانا وجیہ اللہ: مولوی وجیہ اللہ کا وطن، نسب، تعلیمی تفصیل کچھ معلوم نہیں۔ مولانا قاری عبدالرحمٰن پانی پتی نے حضرت مولانا مملوک العلی سے تعلیم اور مولانا مفتی صدر الدین آزردہ کے ذریعہ ایک اہم امتحان کے واقعہ میں ضمناً یہ بھی فرمایا ہے کہ:

''مولوی محمد مظہر صاحب سہارنپوری اور مولوی وجیہ اللہ صاحب اور میں تینوں ہم درس تھے۔''(۲)

اس مختصر اشارہ کے علاوہ مولانا وجیہ اللہ کے متعلق راقم کو کچھ نہیں ملا۔

(۴۲) مولانا علیم اللہ بجنوری: حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے شاگرد مولانا حکیم رحیم اللہ بجنوری کے والد ماجد مولانا علیم اللہ صاحب کے احوال بھی دریافت نہیں مگر مولانا حکیم رحیم اللہ کے تعارف میں ضمناً یہ اطلاع درج ہے کہ ان کے والد مولانا علیم اللہ حضرت مولانا مملوک العلی کے شاگرد تھے۔(۳)

(۴۳) حافظ فخر الدین گنگوہی کے والد ماجد: حافظ فخر الدین صاحب گنگوہی حضرت مولانا خلیل احمد انبہٹوی مہاجر مدنی کے خلیفہ اور خاص متوسلین میں تھے۔ حافظ فخر الدین کے والد کے تعارف میں یہ اندراج ہے کہ وہ حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی کے شاگرد تھے۔(۴)

(۴۴) مولوی خدا بخش دہلی: کالج کے طالب علم اور مولانا مملوک العلی کے شاگرد تھے، مولوی خدا بخش نے دہلی کالج کے چند اور سابق طالب علموں کی شرکت میں ایک پریس قائم کیا تھا جس میں برکت علی بھی شامل تھے، خدا بخش کے تفصیلی حالات کا راقم سطور کو علم نہیں۔(۵)

(۱) تذکرہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی، پروفیسر خلیق احمد نظامی حاشیہ ص:۲۶۴ (دہلی ۱۹۵۳ء)

(۲) تذکرہ رحمانیہ، مولانا عبدالحلیم انصاری پانی پتی، ص:۲۷ (لاہور ۱۴۰۰ھ)

(۳) تاریخ دارالعلوم دیوبند۔ مرتبہ جناب سید محبوب رضوی، ص:۱۹۰ (مطبوعہ الرشید ساہیوال)

(۴) تذکرۃ الخلیل، ص:۳۹۶ (سہارنپور ۱۳۹۵ھ)

(۵) ایک نادر مجموعہ مکاتیب، ص:۳۶۰

(۴۵) عبدالرحمان(۱) (۴۶)شمس الدین(۲) (۴۵) ریاض الدین

یہ تینوں دہلی کالج کے طالب علم تھے اور سنہ ۱۸۴۷ء میں کالج کی عربی کی اعلیٰ جماعت کی صف اول و دوم میں شامل تھے، اس جماعت کے طلبہ جس میں ان تینوں کے علاوہ علی اکبراور علی اصغر سونی پتی بھی شامل تھے، فقہ اور ادب کی اعلیٰ کتابیں درمختار، تاریخ یمینی دیوان حماسہ وغیرہ پڑھتے تھے، یہ کتابیں عربی کی اعلیٰ جماعت کی تھیں جن کو حضرت مولانا مملوک العلی پڑھاتے تھے، اس طرح یہ بھی حضرت مولانا کے شاگرد ہیں، ان تینوں کے متعلق راقم کو کچھ اور معلوم نہیں۔(۳)

(۴۸) حاجی احمد علی احراری رام پوری: انکے بھی نام کے علاوہ کچھ اور معلوم نہیں۔

قسم ششم

چند شیعہ تلامذہ

کالج کے اساتذہ خصوصاً حضرت مولانا، غیر مسلم اور دوسرے فرقہ کے طالب علموں کو بھی اسی محبت اور توجہ سے پڑھاتے تھے جس طرح اور طالب علموں کو، کالج کے حضرت مولانا کے شاگردوں میں تین شیعہ صاحبان بھی تھے۔ تینوں ہی ذہین ذی لیاقت اور باصلاحیت تھے، تینوں کا یہاں تذکرہ ضروری ہے، جس سے اور باتوں کے علاوہ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ہمارے اکابر علمی معاملات اور تدریس و تعلیم میں فکر اور نظریہ کے اختلافات کو نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔ شاید وہ زبانِ حال سے کہتے ہوں گے: ''میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے''

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب، ص:۲۵۶

(۲) ایک نادر مجموعہ مکاتیب، ص:۲۵۶

(۳) ایک نادر مجموعہ مکاتیب، ص:۴۴

مولانا کے شیعہ شاگردوں اور دہلی کے ممتاز طلبہ میں سے مولوی برکت علی دہلوی، علی اکبر سونی پتی اور اسکے بھائی علی اصغر سونی پتی کا تعارف ملا ہے جو یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔

[۴۹] مولوی برکت علی تھانیسری (۱)

موضع بونڈری ضلع تھانیسر (موجودہ ہریانہ) کے ایک شیعہ خاندان سے نسبی رشتہ تھا، غالباً سنہ ۱۸۲۵ (۴۱-۱۲۴۰ھ) کے قریب ولادت ہوئی ہوگی، تقریباً سنہ ۱۸۴۱ء (۵۷-۱۲۵۶) میں دہلی کالج میں تعلیم کے لئے داخل ہوئے، شیعہ جماعت کے طلبہ میں ممتاز تھے۔

اگرچہ چغتائی صاحب نے مولوی برکت علی کے استادوں میں مولانا مملوک العلی کا نام ذکر نہیں کیا، لیکن مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ فقہ اور دینیات کے علاوہ سنی اور شیعہ طلبہ کی درسی کتابیں ایک ہی ہوتی تھیں، ان میں فرق اور اختلاف نہیں تھا۔ کالج کے طلبہ کے رجسٹر سنہ ۱۸۴۷ء کے حوالہ سے چغتائی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس سنہ (۱۸۴۷ء) میں شیعہ جماعت کو جو کتابیں پڑھائی جا رہی تھیں ان میں تاریخ یمینی، دیوان حماسہ، ہدایہ بھی شامل تھیں، یہ سب کتابیں حضرت مولانا مملوک العلی پڑھاتے تھے، اس لئے اس میں شک نہیں کہ برکت علی مولانا مملوک العلی کے شاگرد تھے۔

تعلیم کے بعد لکھنؤ کے اسکول میں مدرس ہوئے، اسی زمانہ میں لکھنؤ کے شیعہ علماء خصوصاً سید محمد مجتہد سے استفادہ کیا مگر لکھنؤ کی ملازمت اور قیام سے خوش نہیں تھے، چاہتے تھے کوئی اور جگہ مل جائے، کئی سال کی کوشش کے بعد مدرسہ تعلیم المعلمین لاہور میں مدرس اول مقرر ہو گئے، جو اُن کے پسند کے مطابق تھی، یہاں محنت سے کام کیا اور آخر تک لاہور میں رہے۔ سنہ ۱۸۵۷ء تک زندہ تھے، صحیح تاریخ وفات معلوم نہیں۔ (۱)

---

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب، محمد اکرام چغتائی ص: ۳۴۸-۴۲۴

[۵۰] علی اکبر سونی پتی (۲)

سونی پت کے خاندان سادات کا فرد تھا، تقریباً سنہ ۱۸۲۵ء (۱۲۴۰ھ) میں پیدا ہوا، بچپن سونی پت میں گذرا۔ یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی، غالباً سنہ ۱۸۳۸ء کے قریب دہلی آیا، سنہ ۱۸۴۰ء کے وسط (۱۲۵۶ھ) میں علی اکبر کو دہلی کالج میں داخلہ ملا، تقریباً سات سال کالج میں پڑھا، اکثر درسیات مولوی کریم الدین پانی پتی سے اور ہدایہ حماسہ اور حدیث کالج میں پڑھی، وہ سنہ ۱۸۴۷ء میں کالج کی عربی جماعت کے فریق اول کا طالب علم تھا، اسلئے اس سال کالج میں درمختار، تاریخ یمینی، جامع التواریخ، دیوان حماسہ، جزئیات وکلیات، رسالہ ہیئت، علم مثلث اور جواب مضمون پڑھے۔ امتحانات میں اعلیٰ درجہ کے نمبرات سے کامیاب ہوا، اس جماعت کے استاد اول حضرت مولانا مملوک العلی تھے اس طرح علی اکبر بھی مولانا کے شاگردوں میں شامل ہے۔

اسپرنگر نے بھی جو کالج کا پرنسپل تھا اس کی لیاقت وذہانت کی وجہ سے اس پر خاص نظر رکھی، اور جب اسپرنگر کو نواب اودھ کے کتب خانوں کی قلمی کتابوں کی فہرست بنانے کے لئے لکھنؤ بھیجا گیا تو وہ علی اکبر کو بھی ساتھ لے گیا تھا، اسپرنگر ۳ / مارچ سنہ ۱۸۴۸ء (۲۶ / ربیع الاول ۱۲۶۴ھ) کو لکھنؤ پہنچا تھا اور فوراً ہی اپنے متعلقہ کام میں لگ گیا تھا، اسپرنگر نے مخطوطات اودھ کی جو فہرستیں مرتب کیں ان میں سے صرف پہلی جلد سنہ ۱۸۵۶ء میں کلکتہ سے چھپی تھی، جس میں علی اکبر کا خاص تعاون شامل تھا۔

علی اکبر فروری سنہ ۱۸۵۰ء (ربیع الاول ربیع الثانی ۱۲۶۶ھ) میں لکھنؤ سے دہلی آیا اور اسی مہینہ دہلی کالج میں عارضی مدرس بنالیا گیا، پھر اس نے یہ ملازمت ترک کردی، دہلی کچہری میں ناظر ہوا، اسکے بعد اسپرنگر کی کوششوں سے اپریل سنہ ۱۸۵۰ء (۶۷-۱۲۶۶ھ) میں آگرہ کالج کے شعبہ عربی میں مدرس ہوگیا، مگر وہاں پہنچ کر کچھ ہی دنوں کے بعد بیمار ہوگیا، جس کی وجہ سے ملازمت چھوڑ کر دہلی آگیا۔ دہلی میں ۲۵ / جون سنہ ۱۸۵۲ء

(۶۹-۱۲۶۸ھ) کو صرف ستائیس سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔

[۵۱] علی اصغر سونی پتی (۳)

علی اکبر کا حقیقی چھوٹا بھائی تھا، سنہ ۱۸۲۷ء (۱۲۴۲ھ) میں پیدا ہوا۔ علی اکبر کے ساتھ دہلی کالج میں داخلہ ہوا، کالج کے اور استادوں کے علاوہ مولانا مملوک العلی سے بھی پڑھا۔ اس کا بھی کالج کے اچھے طالب علموں میں شمار تھا، فقہ اور ادب کی وہی اعلیٰ کتابیں جو علی اکبر نے حضرت مولانا مملوک العلی سے پڑھی تھیں اس نے بھی پڑھیں۔

علی اصغر تعلیم کے بعد غالباً سنہ ۱۸۵۱ء میں آگرہ کالج میں اردو کا مدرس دوم ہو گیا تھا، مزید کوائف اور وفات وغیرہ معلوم نہیں۔

یہ حضرت مولانا کے کثیر شاگردوں کی بہت بڑی جماعت میں سے چند اصحاب کا تذکرہ ہے، اگر چہ اس فہرست میں وسیع و کثیر اضافہ ممکن ہے لیکن اگر اضافہ نہ بھی ہو اسوقت بھی یہ فہرست ہزاروں معلوم شخصیات پر بھاری ہے، اسی سے معلوم ہوجاتا ہے کہ مولانا مملوک العلی کے دریائے علم و فیض کی بارش کیسی رحمت فشاں، ہمہ گیر اور حیات آفریں تھی۔ جہاں جہاں وہ برس گئی اُس کے اثر سے صد رنگ گل بوٹے اُگ آئے، گلستاں کھل اُٹھے اور بہاروں کا ساماں ہو گیا مگر یقیناً:

ایں سعادت بہ زور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

باب (۲۲)

سر سید احمد کے مولانا مملوک العلی نانوتوی سے تلمذ اور دہلی کالج میں پڑھنے کی روایت پر ایک نظر

ہمارے حلقوں میں بعض روایتیں سینہ بہ سینہ چلتی ہیں اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ان ہی میں سے کچھ روایتیں سینہ سے کاغذ کے سفینہ یعنی تحریرات اور کتابوں میں بھی منتقل ہو جاتی ہیں، مگر ضروری نہیں کہ یہ سب روایتیں پوری طرح درست اور مطابق واقعہ ہوں۔ ان میں سے بعض روایتیں تو بزرگوں سے ہماری عقیدت و محبت کا مظہر ہوتی ہیں، جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا، اور بعض ایسی ہوتی ہیں کہ جو اگرچہ کسی بڑی شخصیت کی اطلاع یا تحریر کی وجہ سے کتابوں میں نقل ہوگئی ہیں اور ان کا کثرت سے اعادہ اور تکرار بھی ہوا ہے مگر تاریخی حقائق ان روایتوں کا ساتھ نہیں دیتے، ایسی ہی مشہور مگر بے اصل روایتوں میں سے ایک روایت یا اطلاع یہ بھی ہے کہ سر سید احمد اور قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ دونوں ایک درس گاہ مدرسہ دہلی (یا دہلی کالج) کے تعلیم یافتہ اور ایک ہی استاد، استاد العلماء حضرت مولانا مملوک العلی نانوتویؒ کے شاگرد تھے۔ یہ بات یہاں تک پہنچی کہ بعض اصحاب نے حضرت مولانا محمد قاسم اور سر سید کو ہم سبق لکھ دیا ہے اور اس نظریہ کا ایک قابل ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ سر سید احمد کے حضرت مولانا محمد قاسم کے رفیق درس، ہم مدرسہ و ہم استاذ ہونے کا سر سید احمد کے حلقوں اور علی گڑھ میں کم تذکرہ آتا ہے مگر حضرت مولانا کے وابستگانِ فیض ہی اس کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ بہر حال ہمارے حلقوں میں خاصی شہرت کے باوجود یہ روایت و اطلاع صحیح نہیں اور معتبر ثبوت کی محتاج ہے۔

راقم سطور کی معلومات میں اس روایت کی بنیاد مولانا عبید اللہ سندھی کی تحریروں پر ہے، مولانا سندھی نے اپنی تالیفات "التمہید لتعریف ائمة التجدید" اور "شاہ ولی اللہؒ کی سیاسی تحریک" میں اس کا ذکر کیا ہے کہ سر سید احمد مولانا مملوک العلی نانوتوی کے شاگرد تھے اور دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ کالج مسلم یونیورسٹی ولی اللہی تحریک کے دو رخ یا ایک مکتب فکر کی دو شاخیں ہیں۔ التمہید میں لکھا ہے کہ:

"واخذ عنه السيد احمد الدهلوى موسس الجامعة الاسلامية علی گره" (۱)

یہی خیال شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک میں ان الفاظ میں دہرایا گیا ہے:

"سر سید احمد خاں استاد اساتذۃ الہند مولانا مملوک العلی کے شاگرد تھے" (۲)

اپنے اسی خیال کی وجہ سے مولانا سندھی یہ بھی کہتے ہیں کہ:

"اس (ولی اللہی) جماعت کی مرکزی قوت ایک اختلاف کی بنا پر دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی اور دلی کے عوض دیوبند اور علی گڑھ دو مرکز بن گئے، جس طرح مولانا محمد قاسم دلی کالج کے عربی حصے کو دیوبند لے گئے، اسی طرح سر سید احمد خاں نے دلی کالج کے انگریزی حصہ کو علی گڑھ پہنچا دیا۔" (۳)

مولانا سندھی کی یہ اطلاع مولانا محمد میاں صاحب اور دوسرے اہل قلم نے اپنی کتابوں اور مضامین میں بار بار نقل کی، وہاں سے نئی کتابوں اور تحریرات میں منتقل ہوئی، اس طرح اس کو شہرتِ عام اور گویا استناد کا درجہ حاصل ہوگیا۔ حالاں کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ سر سید احمد نے مولانا مملوک العلی سے یا دہلی کالج میں پڑھا ہو۔ مولانا سندھی سے پہلے کسی نے اس کا ذکر نہیں کیا، سر سید احمد کی تحریروں، تصانیف، مکتوبات اور سوانحات میں بھی اس کا تذکرہ نہیں آیا، سر سید احمد کے معاصرین، رفقائے کار، علی گڑھ تحریک کے

---

(۱) التمهيد لتعريف ائمة التجديد۔ ص:۱۴۷ مرتبہ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی، (جام شورو، سندھ: ۱۳۷۶ھ)

(۲) شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، حاشیہ ص: ۱۲۷ (طبع دوم، لاہور: ۱۹۴۵ء)

(۳) شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص: ۱۸۵ (طبع اول لاہور: ۱۹۴۲) ص: ۱۲۶ (طبع دوم لاہور: ۱۹۴۵ء)

رہنماؤں اور علی گڑھ تحریک سے متعلق معتبر ذخیرہ میں اس کا کہیں اندراج نہیں اور سر سید احمد کی تحریریں بھی اس کی عملاً تردید کر رہی ہیں کہ سر سید احمد نے مولانا مملوک العلی سے یا دہلی کالج میں پڑھا ہے، آئندہ صفحات میں اسی اجمال کی کسی قدر تفصیل ہے۔

سر سید احمد کے حضرت مولانا مملوک العلی سے تلمذ یا دہلی کالج میں تعلیم و استفادہ کی تحقیق و تصدیق کے کئی ذرائع ہو سکتے ہیں، جن میں سر سید احمد کی تالیفات، تحریرات اور مکتوبات، سر سید احمد کے احوال و خدمات پر لکھی گئی معتبر کتابیں، سر سید احمد کے معاصرین و رفقاء کی اطلاعات، دہلی کالج کا ریکارڈ، کالج کی تاریخ، اس کے اساتذہ کے احوال و خدمات پر دریافت ماخذ، اس زمانہ کے دہلی کالج کے استادوں کی روایتیں یا یادداشتیں، مولانا مملوک العلی کے کسی شاگرد کا قول، یا کوئی اور ایسا مستند ذریعہ جس پر بلا تامل اعتماد کیا جا سکے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، مگر اس تذکرہ اور جائزہ سے پہلے سر سید احمد کی تاریخ ولادت اور ان کے علمی تعلیمی سفر کا کچھ تذکرہ ضروری ہے۔

سر سید احمد، ۵/ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ، ۱۷/اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ (۱) حضرت شاہ غلام علی دہلوی کی مجلس میں تعلیم کی ابتداء ''بسم اللہ'' ہوئی، قرآن شریف پڑھا مولوی حمید الدین سے (جو سر سید احمد کے نانا مولوی فرید الدین کے یہاں ملازم تھے) فارسی کی ابتدائی کتابیں اپنی والدہ (عزیز النساء بیگم) سے گلستاں پڑھی، پھر عربی تعلیم کا آغاز ہوا، متوسط عربی درسیات میں مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے مقامات حریری کے چند مقامے اور عربی ادب کی چند کتابیں پڑھی تھیں کہ سرکاری ملازمت میں آ گئے، جس کی وجہ سے درسیات کا نصاب پورا کرنے کا موقع نہیں ملا، مگر ملازمت کی مصروفیات اور دہلی قیام کے زمانہ میں سر سید احمد نے اس کی تلافی یا تکمیل کا سفر جاری رکھا، جو اگرچہ درسیات کے اختتام تک نہیں پہنچا مگر اس میں کچھ پیش رفت اور ترقی ضرور ہوئی۔

یہ سر سید احمد کے تعلیمی سفر کی وہ روداد ہے جو حالی نے حیاتِ جاوید میں کسی قدر

---

(۱) حیات جاوید الطاف حسین حالی۔ ص: ۱۳ (دہلی: ۱۹۳۹ء) (ترقی اردو بیورو، دہلی کی چھپی ہوئی حیات جاوید جو آج کل عموماً دستیاب اور مستعمل ہے اسی اشاعت کا عکس ہے)۔

وضاحت سے ذکر کی ہے(۱) سرسید پر لکھنے والوں نے عموماً اسی پر اعتماد کیا ہے (مگر ان اطلاعات کے بعض پہلو مشتبہ اور تصحیح طلب ہیں جسکی کسی اور موقع پر وضاحت کی جائے گی)۔

سرسید تعلیم میں مشغول تھے کہ ان کا محکمہ مال میں امین کے عہدہ پر تقرر ہو گیا جو سرسید کی سرکاری ملازمت کا آغاز تھا۔ امین سے صدر امین بنے، اس کے علاوہ مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے، ملازمت کے سلسلہ میں ابتک فتح پور سیکری اور آگرہ میں قیام رہا، ان ملازمتوں کے زمانہ میں سرسید احمد کی تصریح کے مطابق آگرہ اور دہلی میں اور حالی کے بقول روہتک میں بھی تعلیم واستفادہ کا سلسلہ جاری تھا۔

حالی کی معلومات کے بعد اب سرسید احمد کی تصریحات پر ایک نظر مناسب ہے، سرسید نے اپنی تحریرات ومؤلفات میں (اپنے خاندان کے افراد کے علاوہ) صرف تین یا چار علماء سے تعلیم حاصل کرنے اور اپنے علمی استفادہ کا اعتراف کیا ہے، جو یہ ہیں:

۱-مولانا شاہ مخصوص اللہ (خلف حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ) (۲)

۲-مولانا نور الحسن کاندھلوی (۳)

۳-مولانا فیض الحسن سہارنپوری (ضمناً) (۴)

۴-حکیم غلام حیدر دہلوی (۵)

ان چاروں کے علاوہ کسی اور عالم یا طبیب کا سرسید اپنے استاد کی حیثیت سے ذکر نہیں کرتے۔ نیز اس موضوع پر الطاف حسین حالی اور سرسید احمد کی تصریحات میں کسی قدر فرق اور اختلاف بھی ہے۔ حالی نے سرسید احمد کے اساتذہ کی جو فہرست حیات جاوید میں

---

(۱) آثار الصنادید، ص:۱۲۶ باب چہارم (طبع اول دہلی: ۱۸۴۷ء)

(۲) سرسید احمد نے اپنے سفر پنجاب، (فروری: ۱۸۸۴ء) میں کہا تھا کہ میں ان کو اپنا استاد سمجھتا ہوں میں نے ان سے ایک کتاب مسمی نمنار، اصول فقہ کی اور چند مقامے مقامات حریری کے پڑھے ہیں اور کہا:

''میں ان سبقوں کو بھول نہیں گیا ہوں جو آپ نے مجھے پڑھائے ہیں''

سرسید کا سفرنامہ پنجاب مؤلفہ مولوی سید اقبال علی مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی، ص:۲۰۶ (لاہور: ۱۹۷۳ء)

(۳) حیات جاوید۔ ص:۴۰

(۴) آثار الصنادید، ص:۹۵ باب چہارم (طبع اول دہلی: ۱۸۴۷ء) ص:۵۴ باب چہارم (نول کشور لکھنؤ: ۱۹۰۰ء)

(۵) آثار الصنادید، ص:۱۲۶ باب چہارم (طبع اول دہلی: ۱۸۴۷ء)

درج کی ہے وہ سر سید احمد کی خود نوشت اطلاعات سے کسی قدر مختلف ہے اور مذکورہ علماء سے تعلیم واستفادہ کی ترتیب کی وضاحت میں بھی سر سید احمد کی تحریریں حالی کی تصریحات کی تصدیق نہیں کرتیں۔

حالی سر سید کے استادوں میں مولانا نور الحسن کاندھلوی کا جان بوجھ کر تذکرہ نہیں کرتے، حالاں کہ مولانا نور الحسن سر سید کے سب سے بڑے مربی اور استاد ہیں، ان کی صحبت کا سر سید کی زندگی پر گہرا اثر پڑا تھا، جس کا خود سر سید کو بھی اعتراف ہے(۱) مگر حالی اس فہرست میں مولانا نوازش دہلوی کا اضافہ کرتے ہیں (۲) اور یہ بھی کہتے ہیں کہ سر سید احمد نے شاہ مخصوص اللہ صاحب سے مشکوٰۃ شریف وغیرہ پڑھی تھی مگر سید احمد کی تحریروں میں اس تعلیم وتلمذ کا کچھ ذکر نہیں۔

سر سید احمد نے یہ تو ذکر کیا ہے کہ انہوں نے شاہ مخصوص اللہ صاحب سے قرآن شریف پڑھا ہے اور شاہ مخصوص اللہ سے قرآن شریف کی جو متواتر سند ملی تھی وہ بھی تبیین الکلام کی تمہید میں درج کی ہے (۳) مگر شاہ صاحب سے مشکوٰۃ شریف وغیرہ پڑھنے کا ذکر نہیں کیا۔ جس وقت حالی سر سید احمد کو شاہ مخصوص اللہ صاحب کے درس میں حاضر دکھا رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ روہتک سے دہلی واپسی کے بعد سر سید نے شاہ مخصوص اللہ سے حدیث پڑھی (۴) سر سید احمد اس زمانہ میں شاہ مخصوص اللہ کی گوشہ نشینی کی صراحت کر رہے ہیں اور لکھ رہے ہیں کہ:

"ایک عرصہ ہوا کہ سر رشتۂ تدریس کو ہاتھ سے دے کر گوشہ نشین ہیں" (۵)

اس لئے یہ اطلاع مشتبہ ہے۔

---

(۱) آثار الصنادید ص:۶۵ باب چہارم (طبع اول) طبع نول کشور ص ۳۷

(۲) حیات جاوید، ص:۴۶ حصہ اول (دہلی ۱۹۳۹ء)

(۳) تصانیف احمدیہ (تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ الاسلام) جلد اول حصہ اول (علی گڑھ: ۱۳۰۰ھ ۱۸۸۳ء)

(۴) حیات جاوید، ص:۴۶ حصہ اول

(۵) آثار الصنادید ص:۹۵ باب چہارم (طبع اول دہلی: ۱۸۴۷ء) ص:۵۴ باب چہارم (لکھنؤ)

اگر چہ سر سید احمد کی تعلیم کی روداد اور استادوں کے تعارف میں سر سید احمد کی خود نوشت اطلاعات کونظر انداز کرنے کی کوشش اور صحیح معلومات سے احتراز واحتیاط اور سر سید کی اطلاعات کو کمی زیادتی کے ساتھ پیش کرنے کے حالی کے طرز عمل پر بحث و گفتگو کی خاصی گنجائش ہے مگر یہ صفحات اس کا محل نہیں، یہاں صرف اس قدر ذکر کرنا ہے کہ حالی اور سر سید کی اطلاعات اور حیات جاوید میں مندرجہ واقعات کی ترتیب میں اختلاف کے باوجود سر سید و حالی دونوں سر سید احمد کے مولانا مملوک العلی سے تلمذ واستفادہ یا دہلی کالج میں تعلیم پانے کا ذکر نہیں کرتے۔

سر سید احمد کا ذوق ومزاج یہ ہے کہ وہ اپنے بزرگوں، استادوں اور محسنین کا بار بار ذکر کرتے ہیں جس میں تشکر وممنونیت کا احساس صاف جھلکتا ہے، اور سر سید نے جن علماء یا اہل کمال سے تعلیم حاصل کی تھی یا تعلیمی استفادہ کیا تھا ان کے خانوادہ اور متعلقین کے ساتھ سر سید احمد نے ہمیشہ گہرے تعلقات قائم رکھے، ان کے احسانات کا بدلہ دینے اور اس قرض کو چکانے کی مسلسل کوشش کی جو سر سید پر عاید تھا، یہ خوبی سر سید احمد کے اخلاق و کردار کا ایک خاص حصہ ہے۔ سر سید کا یہ بھی معمول ہے کہ وہ جب کسی ایسے عالم کا ذکر کرتے ہیں جن سے اُنہوں نے پڑھا یا استفادہ کیا ہے تو وہ عموماً اس کی صراحت کر دیتے ہیں کہ یہ میرے استاد ہیں، میں نے ان سے استفادہ کیا ہے، ان کی میرے حال پر عنایت کی نظر ہے، مجھ پر کرم فرماتے ہیں، میرے دوست ہیں، آثار الصنادید میں بیس سے زائد مقامات پر اس طرح کی صراحت اور اعتراف درج ہے۔

آثار الصنادید میں سر سید احمد نے اس کا بھی التزام کیا ہے کہ وہ اس کتاب میں ان ہی علماء، بزرگوں یا اہل فضل وکمال کا تذکرہ کریں گے جن کو انہوں نے خود دیکھا ہے (۱) (اگر چہ اس میں خانوادۂ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے چند بزرگوں اور رسول شاہی سلسلہ کے چند فقیروں کا استثنیٰ بھی ہے، جس کی وجہ بھی سر سید نے ذکر کر دی ہے) اور اس میں اپنے بزرگوں، استادوں اور محسنین اور دوستوں کا ذکر خاص طور سے شامل کیا ہے، جس میں ان

(۱) آثار الصنادید، ص: ۲۰ (در تذکرہ مولانا شاہ فخر الدین دہلوی) نول کشور لکھنؤ: ۱۹۰۰ء

کے کرم اور عنایت کی صراحت ہے۔

سب سے پہلے حضرت شاہ غلام علی دہلوی (وفات: ۱۲۴۶ھ) کی عنایت وشفقت کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے:

''میرے تمام خاندان کو اور خصوصاً جناب والد ماجد کو آپ سے نہایت اعتقاد تھا اور میرے جناب والد ماجد اور میرے بڑے بھائی جناب احتشام الدولہ سید محمد خاں بہادر مرحوم کو آپ ہی سے بیعت تھی اور آپ کو میرے خاندان پر اس قدر شفقت اور محبت تھی کہ میرے والد ماجد کو اپنے فرزند سے کم نہیں سمجھتے تھے۔

میرے والد ماجد بھی آپ کی صحبت کی برکت سے آزاد مزاج اور وارستہ طبع تھے، کبھی کبھی بموجب اس مصرع کے ''کرمہائے تو مارا کرد گستاخ'' کوئی بات گستاخانہ عرض کرتے یا کوئی حرکت آپ کے خلافِ مرضی سرزد ہوتی تو آپ بار بار ارشاد فرماتے کہ اگرچہ میں اپنے تئیں غم زن وفرزند سے دور رکھا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی مرضی نہ ہوئی کہ اس شخص کی محبت اپنے فرزندوں سے سوا دے دی، جو چاہو سو کہو اور جو چاہو سو کرو۔ میں ہر روز آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور اپنی شفقت اور محبت سے مجھ کو اپنے پاس مصلے پر بٹھا لیتے اور نہایت شفقت فرماتے، لڑکپن میں کچھ تمیز تو ہوتی نہیں خصوصاً صغرسن میں جو چاہتا سو کہتا اور حرکات بے تمیزانہ مجھ سے سرزد ہوتیں اور آپ ان سب کو گوارا فرماتے، میں نے اپنے دادا کو تو نہیں دیکھا، آپ ہی کو دادا حضرت کہا کرتا تھا۔'' (۱)

اس کے بعد متعدد اصحاب سے ذاتی روابط، انکی بزرگانہ شفقت ومحبت وغیرہ کا موقع بہ موقع اقرار واعتراف کیا ہے، یعنی آثار الصنادید میں جن علماء اور اہل کمال کا ذکر ہے ان میں سے جس کسی سے سرسید کی ذاتی واقفیت تھی، ان کی سرسید پر عنایت وکرم کی نظر تھی، سرسید احمد سے دوستی تھی، بے تکلف ملاقات تھی، یا کوئی اور وجہ ربط وملاقات تھی، سرسید نے ہر اک کا صاف ذکر اور اعتراف کیا ہے، مثلاً حکیم غلام حیدر کے تعارف میں لکھا ہے:

''راقم کو حضرت موصوف کی خدمت میں نسبت شاگردی حاصل ہے'' (۲)

---

(۱) آثار الصنادید، ص: ۱۴۰ باب چہارم (نول کشور لکھنؤ: ۱۹۰۰ء) (۲) ایضاً ص: ۳۷

اور کیونکہ آثار الصنادید کی تصنیف کے وقت بھی سرسید مولانا نور الحسن صاحب کاندھلوی کے زیر تربیت تھے، اس لئے مولانا سے اپنے تلمذ کا یوں اعتراف کیا ہے:

''بہ مقتضائے اس کے کہ: بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم..... راقم آثم کے حال پر ان حضرات کی نگاہ توجہ کو اب ایسا مصروف کر دیا ہے کہ بدرجہ عنایت نظر تربیت استادانہ منظور فرماویں تاکہ شاید یہی نظر عنایت بارگاہ کریم میں اس احقر کی نجات کا سبب ہو جائے''(۱)

یہاں ضمناً یہ وضاحت بھی مفید ہوگی کہ اگر چہ آثار الصنادید میں صرف ان علماء یا اہل کمال کا ذکر کیا گیا ہے جو اس وقت میں موجود تھے مگر یہ سرسید کی مولانا نور الحسن سے غیر معمولی نیاز مندی اور تلمذ کا اثر ہے کہ اس میں مولانا کا تذکرہ شامل کیا گیا، حالاں کہ دہلی نہ مولانا نور الحسن کاندھلوی کا وطن تھا، نہ ہی مولانا وہاں ملازم ہوئے، نہ تعلیم کے علاوہ دہلی میں قیام کیا، اس طرح مولانا نور الحسن وہ واحد شخص ہیں جو دہلی میں نہیں رہتے تھے پھر بھی آثار الصنادید میں ان کا ذکر ہے۔

لیکن سرسید نے مولانا مملوک العلی اور مولوی نوازش علی صاحب کا جو تعارف لکھا ہے اس میں اس طرح کا صاف اعتراف تو دور رہا، ایسا تاثر بھی نہیں ملتا کہ جس کی بنیاد پر یہ بھی کہا جا سکے کہ سرسید احمد کی ان دونوں علماء سے قربت یا خاص واقفیت تھی۔ سرسید احمد نے مولانا مملوک العلی کے تعارف میں جو چند سطریں لکھی ہیں، وہ یہاں نقل کی جارہی ہیں، ملاحظہ ہوں:

''جناب مولوی مملوک العلی سلمہ اللہ تعالیٰ

شاگرد رشید مولوی رشید الدین خاں، صاحب علم معقول و منقول ہیں، استعداد کامل اور کتب درسیہ کا ایسا استحضار ہے کہ اگر فرض کرو ان کتابوں سے گنجینۂ عالم خالی ہو جائے تو انکی لوح حافظہ سے پھر نقل انکی ممکن ہے۔ ان سب کمال اور فضیلت پر خلق و حلم احاطہ تقریر سے افزوں ہے، اگر چہ زئی دنیاداروں کی ہے لیکن سیرت اور سریرت میں درویشانہ۔

(۱) آثار الصنادید، باب چہارم ص: ۷۰ (نول کشور لکھنؤ: ۱۹۰۰ء)

اگرچہ چودہ پندرہ برس سے مدرسہ شاہ جہاں آباد میں عہدۂ مدرسی رکھتے تھے لیکن اب کئی سال سے سرگروہ مدرسین ہیں، کہ مدرس اول اس سے عبارت ہے۔ انشاء نظم ونثر کی طرف کم توجہ ہے، اگر ایسا فاضل اس طرف بھی متوجہ ہوتا تو یقین ہے کہ اس فن میں اپنے اقران و امثال سے ممتاز ہوتا۔‘‘(۱)

کیا اس میں ایک حرف بھی ایسا ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکے کہ سرسید احمد مولانا کے شاگرد ہیں، یا ان کو حضرت مولانا سے عقیدت ومحبت تھی، یا سرسید کے مولانا سے نیاز مندانہ روابط تھے، یہ سطریں اس قسم کے ہر اک تاثر سے خالی ہیں۔

مولانا مملوک العلی کے تعارف کے بعد اسی صفحہ سے مولانا مفتی رحمت علی عرف میر لال کا ذکر شروع ہوگیا ہے، ان کے احوال میں بھی سرسید احمد نے مفتی صاحب سے اپنے ذاتی روابط کی اطلاع دی ہے اور لکھا ہے کہ:

’’آباء اور اجداد اور راقم کو ان کے خاندان بلند مکان کے ساتھ رابطہ اتحاد قدیمی چلا آتا ہے اور یہی سبب ہے کہ نظر توجہ آں حضرت کی راقم آثم کے حال پر بکمال مبذول ہے۔‘‘(۲)

اگر سرسید احمد کو مولانا مملوک العلی سے شاگردی کی نسبت تھی، یا سرسید نے مولانا سے کچھ علمی استفادہ کیا تھا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ سرسید اس کا تذکرہ نہ کرتے۔ وہ مولانا کے تعارف سے پہلے اور تعارف کے بعد جن لوگوں کا ذکر کر رہے ہیں دونوں کے احوال میں دونوں سے اپنی نیازمندی کا برملا اعتراف کر رہے ہیں، اگر سرسید کا مولانا سے بھی عقیدت وتلمذ کا رشتہ تھا تو مولانا مملوک العلی سے استفادہ کے اعتراف میں کیا رکاوٹ تھی؟ اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ سرسید احمد مولانا مملوک العلی کو دہلی کے صرف ایک بڑے عالم اور مدرس کی حیثیت سے جانتے پہچانتے تھے، اس کے علاوہ مولانا سے کوئی قربت اور ارادت ونسبت نہیں تھی۔

---

(۱) آثار الصنادید ص:۷۰ باب چہارم (نول کشور لکھنؤ: ۱۹۰۰ء، نیز طبع اول ص:۱۲۷، دہلی)

(۲) آثار الصنادید ص:۷۰ باب چہارم (نول کشور لکھنؤ: ۱۹۰۰ء)

آثار الصنادید کے اس اندراج کے علاوہ سرسید احمد نے مولانا مملوک العلی کا اپنے مکتوبات و مضامین میں بھی دو تین موقعوں پر (ضمناً) ذکر کیا ہے، مگر وہاں بھی مولانا کے علمی مقام و مرتبہ کی وجہ سے مولانا کا عام ذکر ہے، ان مندرجات میں بھی مولانا سے ذاتی روابط کا ذکر بلکہ اثر و نشان بھی نہیں جھلکتا، مثلاً ایک خط میں ہے:

''مولوی عبداللہ صاحب فرزند ہیں مولوی انصار علی صاحب کے، نواسے ہیں مولوی مملوک العلی صاحب کے، داماد ہیں مولوی محمد قاسم نانوتوی کے اور ان سب بزرگوں سے مجھے ذاتی واقفیت تھی''۔(۱)

مولانا مملوک العلی کے صاحبزادے مولانا محمد یعقوب نانوتوی مدرسہ (دارالعلوم) دیوبند کے صدر مدرس، ممتاز عالم اور سرسید کے ہم عصر تھے، مولانا یعقوب کو سرسید احمد کے مذہبی نظریات سے کھلا اختلاف تھا۔ مولانا نے ان کی تردید و تنقید بھی کی، اس کے علاوہ سرسید احمد کی تحریروں میں مولانا محمد یعقوب صاحب کا مدرسہ دیوبند کے حوالہ سے بھی ذکر آیا ہے مگر یہ تحریریں بھی اس تأثر سے خالی ہیں کہ سرسید احمد کو مولانا مملوک العلی سے تلمذ یا استفادہ کی نسبت تھی۔

سرسید احمد نے مدرسۃ العلوم (M.A.O. COLLEGE) علی گڑھ میں مولانا مملوک العلی کے نواسہ مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی کا ناظم دینیات کی حیثیت سے تقرر کیا تھا، مولانا انصاری اس وقت سے اپنی وفات (۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۵) (۲) تک شعبہ دینیات کے ناظم و سربراہ رہے، سرسید احمد کی مولانا سے ملاقاتیں اور خط و کتابت رہتی تھی، سرسید احمد کے خطوط میں بھی مولانا انصاری کا کئی موقعوں پر ذکر آیا ہے، مگر ان میں سے کسی ایک خط سے بھی یہ اطلاع اور تاثر نہیں ملتا کہ چوں کہ مولانا انصاری سرسید احمد کے استاد کے

(۱) مکتوبات سرسید، مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی (قادیانی) ص:۲۶۶ جلد اول (لاہور: ۱۹۷۶ء)

(۲) مولانا انصاری کی تاریخ وفات اور مدفن کے متعلق تاریخ دارالعلوم اور نزہۃ الخواطر دونوں کی اطلاعات میں غلطی ہے۔ تاریخ دارالعلوم میں تاریخ وفات صحیح نہیں لکھی، مولانا انصاری کو بمبئی میں نہیں (جیسا کہ نزہۃ الخواطر میں لکھا ہے) بلکہ ان کے آبائی وطن انبہٹہ ضلع سہارنپور میں دفن کیا گیا تھا، قبر معلوم ہے۔

نواسے ہیں، البذا اس تعلق کی وجہ سے سرسید احمد مولانا انصاری سے رابطہ خاص رکھتے ہیں، ان سے دلی قربت اور وابستگی ہے۔

سرسید احمد نے آثار الصنادید میں مولانا مملوک العلی کے علاوہ (مدرسہ دہلی یا دہلی کالج) کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

''اب دو تین برس کے عرصہ سے مدرسہ فارسی و عربی اور جائے مقرر ہوا۔''(۱)

یہاں بھی اس کا موقع تھا کہ سرسید احمد اس کا تذکرہ کرتے کہ میں نے فلاں سنہ میں اس مدرسہ میں پڑھا ہے، بعض اور عمارتوں کے تذکرہ میں سرسید نے ان سے اپنے رشتہ یا مناسبت کا ذکر کیا ہے، دہلی کالج کے تعارف میں کالج سے اپنی کسی وابستگی اور خاص دلچسپی کا ذکر نہ کرنا بتا رہا ہے کہ سرسید احمد دلی کالج سے کبھی وابستہ و منسلک نہیں رہے۔

حیات جاوید کے بعد سرسید کے احوال و سوانح، افکار و نظریات اور اثرات پر درجنوں کتابیں لکھی گئی ہیں، مگر ان سب کے سوانحی حصہ خصوصاً سرسید کی تعلیم کے عنوانات میں عموماً وہی اطلاعات دہرائی گئی ہیں جو حیات جاوید میں درج ہیں، سرسید کے بچپن اور تعلیمی سفر کے متعلق حیات جاوید کی اطلاعات پر اب تک کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں ہوا۔

مگر اس ذخیرہ کی چند کتابیں اس عموم سے کسی قدر مستثنیٰ بھی ہیں، جن میں مولوی امین زبیری ماہروی کی تالیف تذکرہ سرسید (۲) اور ڈبلیو ٹرال (CHRISTIAN WILHELM TROLL) کی کتاب ''سرسید احمد خاں فکر اسلامی کی تعبیر نو'' قابل ذکر ہیں (۳) زبیری سرسید احمد کے دیکھنے والوں میں سے تھے اور ان کے علی گڑھ

---

(۱) آثار الصنادید، باب سوم، ص: ۳۲ (نول کشور لکھنؤ)

(۲) تذکرہ سرسید کا پبلشرز یونائیٹڈ لمیٹڈ، لاہور کا ایڈیشن پیش نظر ہے، اس پر سنہ طباعت درج نہیں۔ بہ ظاہر کراچی کے سنہ ۱۹۶۴ کے ایڈیشن کی مکرر اشاعت ہے۔

(۳) سرسید احمد خاں فکر اسلامی کی تعبیر نو (A. REINTERPRETATION OF MUSLIM THEOLOGY) کا اردو ترجمہ ہے، جو قاضی افضل حسین اور اکرام صاحب چغتائی نے کیا ہے، (مطبوعہ القمر انٹر پرائزز، لاہور)

مگر اس کتاب کے متعدد تجزیے قطعاً غلط اور ایسے ہیں کہ ہر مسلمان کو ان سے سخت اختلاف ہوگا، افسوس ہے کہ فاضل مترجمین نے نہ ان پر وضاحتی نوٹ لکھے نہ مقدمہ میں اس کا تجزیہ کیا۔

تحریک کے اکثر رہنماؤں سے ذاتی مراسم تھے، سرسید کی تحریک کا ایک ایک گوشہ زبیری کی نظر میں تھا اور ایسے بہت سے ذرائع اور مآخذ و معلومات بھی ان کی دسترس میں تھے جو حالی یا اور تذکرہ نگاروں کو میسر نہیں آئے، ڈبلیو ٹرال نے بھی سرسید کا ایک نئے زاویہ سے تعارف کرانے کی کوشش کی ہے، ٹرال صاحب کے متعدد مآخذ سرسید احمد کے اور سوانح نگاروں سے مختلف اور اہم ہیں، ڈبلیو ٹرال نے چند اصل دستاویزات اور عہد سرسید کے ریکارڈ سے بھی استفادہ کی کوشش کی ہے جس سے سرسید کے متعلق چند معلومات کا اضافہ ہوا ہے، مگر مولوی امین زبیری اور ٹرال صاحب نے بھی سرسید احمد کے استادوں میں مولانا مملوک العلی کا ذکر نہیں کیا ہے۔

سرسید پر لکھی ہوئی کتابوں میں سے پروفیسر خلیق احمد نظامی کی ''سید احمد خاں''(۱) اور ڈاکٹر ثریا حسین کی ''سرسید احمد اور ان کا عہد'' معروف اور معتبر سمجھی جاتی ہیں، ان مصنفین نے بھی سرسید کے استادوں میں مولانا مملوک العلی کا نام شامل نہیں کیا اور کالج پر نئے پرانے لکھنے والوں میں سے کسی نے بھی یہ نہیں لکھا کہ سرسید احمد دہلی کالج کے طالب علم تھے۔

حالیہ دنوں میں سرسید احمد اور ایم او اے کالج کے مذہبی روابط و خدمات پر دو کتابیں یا مضامین کے مجموعے چھپے ہیں (۲) ان دونوں میں بھی اس کا معتبر ذکر نہیں آیا کہ سرسید احمد مولانا مملوک العلی کے شاگرد یا دہلی کالج کے فیض یافتہ تھے، لیکن برصغیر ہندو پاکستان کی اسلامی تاریخ و ثقافت کے دو بڑے مؤرخین ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور شیخ محمد اکرام نے سرسید کے استاد کی حیثیت سے مولانا مملوک العلی کا نام لکھا ہے، مگر یہ بھی اس وجہ سے لائق استدلال نہیں کہ ڈاکٹر قریشی نے یہ وضاحت کردی ہے کہ ان کی اس اطلاع کا ماخذ مولانا سندھی کی تحریر ہے (۳) اسلئے اس کی استنادی حیثیت مشتبہ ہے، شیخ محمد اکرام نے اگرچہ

---

(۱) پبلی کیشن ڈویژن دہلی کی جون سنہ ۱۹۷۱ء کی اشاعت پیش نظر ہے۔

(۲) الف: سرسید اور علوم اسلامیہ، مرتبہ پروفیسر ڈاکٹر محمد یسین مظہر صدیقی۔ (علی گڑھ، ۲۰۰۱ء)

ب: سرسید و ایم اے او کالج اور دینی مشرقی علوم، ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، (علی گڑھ، ۲۰۰۱ء)

(۳) مؤخر الذکر میں اگرچہ دو جگہ سرسید کو مولانا مملوک العلی کا شاگرد لکھا ہے (ص: ۱۰۴-۱۱۷) مگر دونوں موقعوں پر حوالہ درج نہیں۔

اپنی اس اطلاع کا ماخذ درج نہیں کیا مگر لکھا ہے کہ:

''اس زمانے میں سرسید احمد نے جن بزرگوں سے فیض حاصل کیا ان میں امام الہند شاہ ولی اللہؒ کے پوتے شاہ مخصوص اللہ، شاہ عبدالعزیز کے جانشین محمد اسحاق اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے استاد اور محسن، مولانا مملوک العلی نانوتوی کے نام لئے جاتے ہیں۔''(۱)

شیخ اکرام کی اس عبارت کے فقرے ''کے نام لئے جاتے ہیں'' سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اکرام کو اس اطلاع پر اعتماد نہیں تھا اور وہ اس کو مشتبہ سمجھتے تھے، لہٰذا ان دونوں متقدر مؤرخین کی اطلاع بھی تصدیق کی محتاج ہے۔

سرسید احمد کی سوانحات اور ان پر لکھنے والے اہل قلم کی تحریرات سے قطع نظر سرسید کی دلی کالج میں یا مولانا مملوک العلی سے پڑھنے کی روایت پر اس پہلو سے بھی نظر ڈالنی چاہئے کہ سرسید احمد کے ہم عصر وہ اہل علم جو دہلی کالج سے وابستہ اور سرسید سے براہِ راست واقف تھے اس سلسلہ میں کیا کہتے ہیں، انہوں نے سرسید احمد کا مولانا مملوک العلی سے تلمذ کا ذکر کیا ہے یا نہیں، اگر نہیں کیا تو اس سے یہ بات مزید مؤکد ہو جاتی ہے کہ سرسید احمد نے مولانا مملوک العلی سے یا دلی کالج میں کچھ نہیں پڑھا۔ سرسید احمد کے ایسے ہم عصر اصحاب میں سے کریم الدین پانی پتی اور قادر بخش صابر دہلوی نے اپنی اپنی کتابوں میں سرسید احمد کا تذکرہ لکھا ہے مگر یہ دونوں تذکرے بھی اس وضاحت سے خالی ہیں کہ سرسید احمد دلی کالج یا مولانا مملوک العلی کے فیض یافتگان میں شامل تھے۔

کریم الدین پانی پتی نے طبقات شعرائے ہند میں سرسید کا مختصر تعارف کرایا ہے، اس میں اگرچہ سرسید کے حلم، اخلاق اور نیک طینت کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ:

''سید احمد خاں منصف دہلی باشندہ قدیم شاہ جہاں آباد نیک بنیاد کے ہیں بہت متواضع اور حلیم اور خوش خلق اور نیک اطوار آدمی ہے، ایک کتاب اعمال پُر کارِ متناسبہ میں اور ایک تاریخ دہلی قدیم میں مسمّی آثار الصنادید درمیان اردو کے تصنیف سے اس کی ہے، وہ چھپ چکی ہے۔ بالفعل سنہ ۱۸۴۷ء میں عہد منصفی شاہ جہاں آباد پر مامور ہیں، استعداد فارسی اچھی حاصل ہے۔''(۲)

(۱) موج کوثر، شیخ محمد اکرام، ص: ۸۰ (لاہور: ۱۹۷۵ء) (۲) طبقات شعرائے ہند، ص: ۴۶۳

مگر اس عبارت میں اس کا کچھ اشارہ و تذکرہ نہیں کہ سرسید احمد مولانا مملوک العلی کے شاگرد، دلی کالج کے سابق طالب علم، یا مؤلف کے ہم مدرسہ ہیں۔

اس دور کی ایک اور شخصیت مرزا قادر بخش صابر دہلوی کی تھی، جو اگرچہ دہلی کالج کے طالب علم نہیں اور ان کو مولانا مملوک العلی سے تلمذ بھی حاصل نہیں، مگر ان کا سرسید احمد کے خاص دوست اور علمی تصنیفی رفیق (خصوصاً آثار الصنادید کی ترتیب و تدوین میں معاون و مددگار) مولانا امام بخش صہبائی سے تلمذ و نیازمندی کا بہت گہرا رشتہ تھا، قادر بخش صابر نے اپنی کتاب گلستانِ سخن میں سرسید احمد کا ایک شاعر اور معتبر شخص کی حیثیت سے تذکرہ کیا ہے(۱) قرائن کہتے ہیں کہ قادر بخش صابر کا سرسید احمد سے ہر وقت کا رابطہ اور ملاقات تھی، مولانا صہبائی قادر بخش صابر کی اس تالیف سے پوری طرح باخبر اور اس کام میں صابر کے معاون و سرپرست تھے اور اس وقت صہبائی دہلی کالج میں فارسی کے استاد بھی تھے، پھر بھی صابر یہ تذکرہ نہیں کرتے کہ سرسید احمد نے دہلی کالج میں پڑھا ہے، اگر سرسید دہلی کالج کے طالب علم ہوتے تو صابر اس کا تذکرہ ضرور کرتے۔

میرا خیال ہے کہ مولانا سندھی نے سرسید احمد کے دلی کالج کے طالب علم ہونے کی روایت غالباً فرحت اللہ بیگ سے اخذ کی ہے، مرزا فرحت اللہ بیگ نے ڈپٹی نذیر احمد کے تذکرہ میں، ڈپٹی نذیر احمد سے یہ الفاظ منسوب کئے ہیں کہ:

(جب میرا دہلی کالج میں داخلہ ہوا تو) ''اس زمانہ میں سرسید احمد خاں فارسی کی جماعت میں، منشی ذکاء اللہ حساب کی جماعت میں، اور پیارے لال انگریزی کی جماعت میں پڑھتے تھے۔''(۲)

مگر اس اطلاع میں فرحت اللہ بیگ کو سہو ہوا، اس کا غلط ہونا ایسا واضح ہے کہ ممکن نہیں ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد نے یہ بات کہی ہو، کیونکہ سرسید احمد (ولادت ۱۲۳۲ھ/ ۱۸۱۷ء) ڈپٹی نذیر احمد (ولادت ۴۶-۱۲۴۵ھ ـ ۱۸۳۰ء) سے چودہ سال بڑے تھے اور جب نذیر احمد (جنوری سنہ ۱۸۴۶ء میں) دہلی کالج میں تعلیم کے لئے داخل ہوئے تو اس سے آٹھ

(۱) گلستانِ سخن، قادر بخش صابر، مرتبہ خلیل الرحمان داؤدی، ص:۲۳۸ تا ۲۴۳ جلد اول (لاہور:۱۹۶۶ء)

(۲) ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی۔ مرتبہ رشید حسن خاں، ص:۴۵ (دہلی:۱۹۹۲ء)

سال پہلے (فروری سنہ ۱۸۳۹ء میں) سرسید احمد سرکاری ملازمت میں آ گئے تھے۔ سرسید احمد شروع میں آگرہ کمشنری میں نائب منشی مقرر ہوئے، ۲۰ردسمبر سنہ ۱۸۴۱ء کو مین پوری کے منصف بنائے گئے اور سنہ ۱۸۴۶ء تک کئی اہم سرکاری عہدوں پر کام کر چکے تھے اور جس سال ڈپٹی نذیر احمد کا دہلی کالج میں داخلہ ہوا اس وقت اگر چہ سرسید احمد دہلی واپس آ گئے تھے اور دہلی میں مقیم تھے لیکن اس زمانہ میں سرسید احمد دہلی کے ایک متعارف اور باحیثیت شخص تھے، جو اور خدمات کے علاوہ دلی میں منصف کے عہدہ پر بھی مامور تھے اور اسی مشغولیت کے ساتھ آثار الصنادید کی تالیف میں لگے ہوئے تھے اور اس سے پہلے سرسید احمد کی کئی تالیفات اور ترجمے شائع بھی ہو چکے تھے، اس لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ ڈپٹی نذیر احمد کے طالب علمی کے زمانہ میں سرسید احمد دلی کالج میں پڑھتے ہوں۔

فرحت اللہ بیگ کے اس قول کی ڈپٹی نذیر احمد کے احوال وتصانیف کے معتبر محقق، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے بھی مدلل تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ:

''یہاں انہوں (فرحت اللہ بیگ) نے مولانا محمد حسین آزاد کی جگہ سرسید احمد کا نام لکھدیا ہے، اگر وہ (فرحت اللہ بیگ) ذرا توجہ اور احتیاط سے کام لیتے تو انہیں یاد آ جاتا کہ سرسید احمد نذیر احمد سے عمر میں اتنے بڑے تھے کہ دہلی کالج میں (نذیر احمد کے سرسید کے) ہم جماعت ہونے کا وہم بھی پیدا نہ ہونا چاہئے۔''(۱)

اس لئے فرحت اللہ بیگ کی روایت صحیح نہیں اور اس کے علاوہ بھی اب تک کسی معتبر تحریر یا ماخذ سے اس کی تصدیق نہیں ہوئی کہ سرسید احمد مولانا مملوک العلی کے شاگرد یا دلی کالج کے طالب علم تھے، اور جب تک اس کی معتبر ذریعہ سے تصدیق نہ ہو جائے اس وقت تک مولانا سندھی کی یہ اطلاع اور مولانا سندھی کے اعتماد پر جہاں کہیں بھی یہ بات لکھی گئی ہے بے ثبوت رہے گی، اس پر اعتماد درست نہ ہوگا۔ اس روایت کو حوالہ کے طور پر پیش کرنا صحیح نہیں ہے، صرف مولانا سندھی کی وجہ سے اس کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔

(۱) ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے اپنی کتاب (یا تحقیقی مقالہ میں) فرحت اللہ بیگ کی اور بھی کئی اطلاعات کی تردید کی ہے۔ درج بالا اقتباس کے لئے ملاحظہ ہو: مولوی نذیر احمد احوال وآثار، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، ص: ۲۸-۲۹ (لاہور: ۱۹۷۱ء)

باب (۲۳)

حضرت مولانا مملوک العلی اپنے عہد کے چند تذکرہ نگاروں اور سرسید احمد کی نظر میں

علم وعمل، تقویٰ، اخلاق وکردار کے اعلیٰ ترین محاسن، درس وتعلیم میں انہماک اور ہر وقت کی دینی علمی خدمات اور وقار اور مرتبہ کی وجہ سے مولانا کا دہلی اور نواح کے علماء کی نظروں میں بڑا وقار اور مرتبہ تھا، جس کا مولانا کے نامور معاصرین اور اس دور کے بڑے بڑے علماء نے بھی بھرپور اعتراف کیا ہے۔ مولانا کے شاگرد اور بعد کے اہل قلم مولانا کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ سرسید احمد نے بھی مولانا کا نہایت بلند الفاظ میں تذکرہ کیا ہے اور مولانا کے چند شاگردوں نے بھی اپنی تالیفات اور تذکروں کے صفحات مولانا کے احوال وتعارف کی نذر کئے ہیں، یہ صفحات اور تذکرے اگرچہ مولانا کی شخصیت اور کمالات کا احاطہ نہیں کرتے مگر اس کے خاص پہلوؤں پر اہم روشنی ڈالتے ہیں اور ان کے اجمال سے بھی خاصی مدد اور رہنمائی مل جاتی ہے۔

یہ تمام مندرجات یا تحریریں مولانا کو جاننے سمجھنے کے لئے بنیادی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں اور جن کتابوں میں یہ تذکرے ہیں ان میں سے تین اہم کتابیں کمیاب ہیں مشکل سے دستیاب ہوتی ہیں، اسلئے ان کے یہ اقتباسات یہاں شامل کئے جا رہے ہیں۔

اُن میں سے پہلی تحریر مولانا کے خاص شاگرد اور تربیت یافتہ (شیخ الہند مولانا محمود حسن کے والد ماجد) مولانا ذوالفقار علی دیوبندی کی ہے، جو مدرسہ عربی (دار العلوم)

دیوبند کے حالات پر مولانا کی تالیف "الہدیة السنیة فی ذکر المدرسة الدیوبندیة" میں شامل ہے۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا عبدالرشید صاحب بستوی اور عزیز ابوالحسن ارشد سلمہٗ نے کیا ہے، جو عربی عبارت کے بعد درج ہے۔

دوسری تیسری تحریر مولانا کے ایک اور شاگرد اور اردو تاریخ و ادب کی خاصی معروف شخصیت مولوی کریم الدین پانی پتی کی یادگار ہے۔ کریم الدین پانی پتی دہلی کالج کا طالب علم اور مولانا کا خاص شاگرد ہے، اس نے مولانا کے فیض صحبت کے علاوہ مولانا کے کتب خانہ سے بھی فائدہ اٹھایا ہے، وہ اپنی کتابوں اور تحریرات میں مولانا کا بہت محبت و احترام سے تذکرہ کرتا ہے۔ تذکرہ فرائد الدہر یا تاریخ شعرائے عرب اور طبقات شعرائے ہند کریم الدین کی دو اہم اور معروف ترین تالیفات ہیں، دونوں میں مولانا کا تذکرہ ہے، فرائد الدھر میں کسی قدر مفصل اور طبقات شعرائے ہند میں مختصر۔ پہلے فرائد الدھر (مؤلفہ رجب ۱۲۶۳ھ جون ۱۸۴۷ء) کی عبارت ذکر کی جائے گی بعد میں طبقات شعرائے ہند کے آخر میں سرسید احمد کے تاثرات نقل ہوں گے جو آثار الصنادید میں شامل ہیں۔

آغاز الہدیة السنیة (۱) کی عبارت سے ہو رہا ہے۔ مولانا ذوالفقار علی صاحب نے لکھا ہے:

(۱)

[الهدية السنية فی ذكر المدرسة الديوبندية]

الامام الهمام، استاذ الانام، شيخ الاسلام، ثمال الارامل عصمة الايتام، مالك ازمة الفضل الخفی و الجلی۔ مولاناوسيدنا المولوی مملوك العلی الصديقی، رضی الله تعالىٰ عنه وارضاه عنا. نسب كانّ الشمس القت عليه ردائها۔

(۱) الهدية السنية پہلی مرتبہ مطبع مجتبائی دہلی سے ۱۳۰۷ (۱۸۹۰ء) میں چھپی تھی، بعد میں تاریخ دارالعلوم پر شائع بعض خاص اشاعتوں اور متعدد رسائل میں اس کا خلاصہ یا ترجمہ بھی چھپا ہے۔ مجتبائی کی پہلی طباعت کا ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

واعطاه البدر المنير نورها و ضيائها، رحيب الصدر، ورفيع الذكر، قطب دائرة المحققين، وارث علوم الانبياء والمرسلين، وكنز الهداية واليقين۔

وكان قدس سرّه متواضعاً لله كريما، و للطلبة ابا رحيما، صاحب الاخلاق العظيمة المحمد ية، والسيرة الكريمة النبوية صلى الله عليه وآله واصحابه و سلم و عظم وكرم۔

لا يوجد نظيره فى ارباب العمائم الذين هم لقصر العلوم واساتين و دعائم، ولله در القائل كانه قال فيه، شعر:

تیری صورت سے کسی کی نہیں ملتی صورت
ہم جہاں میں تری تصویر لئے پھرتے ہیں

واستفاض فيضه فكثرت تلامذتهٗ مدد نجوم السماء او كقطرات الداماء، فقرء وا عليه و بهروا، وفرغوا من التحصيل ومهروا، و جدّ وا فى الافادة، بعد تكميل الاستفادة، فمن لثم سدته السنية يومافاز، ومن لاذ بعتبة الكريمة ولو ساعة حاز، حتى صارت رياض العلوم بامطار فيوضه مخضرة الربى معتلة الصباء قد ايبعت ثمارها، وسجعت اطيارها، وتدفقت انهارها، وخطبت على منابر ايكها الحمائم، وتبسمت عن وجوه ازهارها الكمائم، بعد مانضبت مائها، وذهب روائها، وخمدت نارها، وجمدت بحارها، وكسد سوقها، وفسد منطوقها، ومحت رسمها، وعفت د يارها، فلم يبق فيها انيس ولم يسمر بها سميره ولا ينبئك مثل خبير۔

فابى العلم الا ان يوجد فى منتسبيه ومستفيديه و منتحليه فلاحامل كتاب الا هو متقلد بقلادة احسانه ومنته،

ولا رافع قلم الاوهو واضع جبهته علی سد ته، فلله دره من شمس ملائت العالم نورًا وضیائاً وسناءً وبهاءً، وانارت للعلم اقمارًا، ثوابت و سیارا، ومن نجم یهتدی به الساری فی ظلمات الجهل والضلال والسادر فی غلواء الخبال والنکال ومن بحر لم یرکمثله عطاءً و حیاءً وسخاءً وحباءً، ومن سحاب اصاب وابله کل محل ذو خصیب و صفصف و جدیب ومن حدیقته عطرت الکون بریاها، واراحت الارواح من نسیمها وصباها، ومن عذب فرات سائغ سقی عطشی العلوم واردهم ، وداوی مرضی الجهل فشفاهم ، فجزاه الله تعالی عن تلامذته خیر الجزاء، واوفی الانصباء ماذرشارق، ولالاح بارق، ودجی غاسق، ونهمر وازق.

ترجمہ: ازمولانا عبدالرشید صاحب بستوی وابوالحسن ارشد کاندھلوی سلمہٗ

امام ہمام، استاذ خلائق، شیخ الاسلام، بیواؤں کے حامی، یتیموں کے ملجا، ظاہری و باطنی فضل وکمال کی باگ ڈور کے مالک، ہم سب کے سربراہ، مولانا مولوی مملوک العلی صدیقی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ) آپ کا نسب ایسا تاب ناک کہ جیسے آفتاب نے اس کے اوپر اپنی نورانی چادر ڈال دی ہو اور ماہِ تمام نے اسے اپنی روشنی و تابندگی بخش دی ہو۔ آپ وسیع الظرف، عالی مرتبہ، حلقہ علمائے محققین کے دارومدار، انبیاء ورسل کے علوم کے وارث وامین، رشد وہدایت اور ایمان ویقین کے گنجینہ تھے۔

مولانا قدس سرہ خدا تعالیٰ کے حوالے سے متواضع، منکسر المزاج اور شریف، طلبہ کے لئے سراپا رحمت وشفقت والد، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بلند اخلاق اور پاکیزہ سیرت سے متصف تھے۔ آپ کی نظیر ان اصحاب جبہ ودستار

میں مل نہیں سکتی جو علم وفضل میں کوتاہ دستی کے سبب محض ستون اور کھمبے کی مانند ہیں کسی نے کیا ہی خوب شعر کہا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ جیسے مولانا موصوف ہی کے حق میں کہا تھا:

تیری صورت سے کسی کی نہیں ملتی صورت
ہم جہاں میں تری تصویر لئے پھرتے ہیں

آپ کا فیض بہت عام ہوا۔ چنانچہ آپ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے والوں کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ جتنے آسمان کے ستارے یا خون کے قطرے۔ ان لاتعداد لوگوں نے آپ سے اکتساب فیض کیا اور فاضل و باکمال بن کر نکلے، علوم و معارف کی تحصیل سے فراغت حاصل کی اور ماہر فن بن گئے۔ اکتساب فیض کی تکمیل کے بعد ان سبھی حضرات نے بھی افادۂ عام کے جذبے سے ایک عالم کو فیض یاب کیا۔ جس کسی نے ایک دن بھی آپ کے دروازے پر جبیں سائی کی وہ بامراد ہو گیا اور جس کسی نے ایک ساعت کے لئے بھی آپ کی چوکھٹ کا سہارا پکڑا اس نے فیوض و برکات حاصل کر لئے۔ یہاں تک کہ آپ کے بارانِ فیوض سے علوم و معارف کے چمن مرغ زار و لالہ زار ہو گئے، ان کے پھل پک گئے، پرندے چہچہانے لگے، نہریں بھر گئیں، ان کے منبر پر فاختائیں نغمہ سنج ہو گئیں اور بند کلیوں کا پردہ کھل کر پھول مسکرانے لگے۔ جب کہ پانی خشک ہو چکا تھا، چمک دمک جا چکی تھی، آگ بجھ چکی تھی، اس کا بازار ٹھپ پڑ گیا تھا، اس کی بولیاں خراب ہو گئی تھیں، اس کے نقوش مٹ گئے تھے اور اسکی بستیاں نیست و نابود ہو چکی تھیں، نہ ان میں کوئی غم خوار رہ گیا تھا، اور نہ ہی کوئی داستاں سرا۔ ظاہر ہے کہ یہ ساری تفصیلات، ایک باخبر کی مانند، دوسرا کون بتا سکتا ہے۔

علم نے یہ قسم کھالی تھی کہ وہ ان کے منتسبین، مستفیدین اور اپنے دست گرفتگاں کے سوا کسی کے پاس نہ رہیگا۔ اس لئے فی زمانہ جس کسی کے بھی ہاتھ

کوئی کتاب ہے وہ مولانا محترم کا منت کش احسان اور گراں بارِ کرم ہے، اور جس کسی نے قلم پکڑ رکھا ہے، وہ آپ کے در کی جبہ سائی کر چکا ہے، خدا ہی کی کرشمہ سازی کا مظہر ہے وہ آفتاب عالم تاب جس نے سارے عالم کو بقعۂ نور بنا دیا، علم وفضل کے ماہ تاب ثوابت اور سیارے منور کر دیئے، اسی طرح خدا ہی کی صفت قدرت کا آئینہ دار ہے وہ ستارۂ ہدایت جس سے جہل وگمراہی کی تاریکیوں کا سفر کرنے والے کو راستہ ملتا ہے اور مصیبت و پریشانی کے باعث حیران و پریشان شخص کو راہِ نجات نصیب ہوتی ہے، نیز ایسا سمندر بھی جس کی بخشش، حیا، جود و کرم کی کوئی مثال نہیں، اور ایسا بادل جس کی تیز بارش نے قحط زدہ اور شاداب، ہموار اور غیر مسطح ہر قسم کی زمین کو سیراب کیا، نیز ایسا چمنستان جس کی خوشبو سے کائنات معطر ہوگئی اور اس کی بادِ نسیم و صبا سے روحیں شادکام ہوئیں، نیز ایسے شیریں چشمے جن سے تشنگانِ علوم سیراب ہو گئے، جہالت کے مریض شفا یاب ہو گئے، حق تعالیٰ مولانا کو ان کے تلامذہ کی جانب سے بہترین اور بھرپور صلہ عطا فرمائے، جب تک کہ کوئی ستارہ روشن رہے برق چمکے اور اس کو تاریکی گھیرے رہے اور جب تک بارش کا سلسلہ باقی رہے۔

(۲)

تذکرہ فرائد الدھر یا تاریخ شعرائے عرب (اردو)

تالیف: کریم الدین پانی پتی

مؤلفہ و مطبوعہ دہلی: ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۷ء

مولانا و اولانا و استاذنا و ہادینا و شیخنا، جناب مولانا مملوک العلی عالم الخفی والجلی، مدرس اول مدرسہ دہلی، رہنے والے نانوتہ کے، قدوۂ متاخرین، امام تبحرین متقدمین، اس ذات حمیدہ صفات کا شمہ سایہ، حال ہے کہ ایسا فاضل کامل وزاہد و عابد پابند شرع شریف مرتضوی بہت کم دیکھنے میں آیا ہے، نظیر اس کا خطہ ہند سے مفقود، ہر فن و علم کا سامان اس کے پاس ہر وقت موجود، اس کے فیض عام سے عقل فیاض زلہ ربا! جس نے اس کے مشغل تعلیم سے روشنی نہیں پائی وہ عقل اور بصیرت سے نابینا۔

گھر اس کا محط رجال طلباء، مدرسہ اس کا مجمع علماء و فضلاء، صدہا شاگرد اس ذات بابرکات سے فیض اٹھا کر اطراف و اقطارِ ہندوستان میں فاضل ہو کر گئے، درمیان اکثر بلاد افغانستان کے اور ہندوستان میں اپنا نام پیدا کر گئے۔

بالفعل عہدۂ اول مدرسی عربی مدرسہ دہلی میں مامور ہیں، سوا درس دہی طلباء مدرسہ کے، اپنے گھر پر بھی لوگوں کو ہر ایک علم کی کتابیں پڑھاتے ہیں، تمام علوم درسیہ متاخرین و متقدمین پر وہ عبور ہے کہ عقل اول بھی ان کی فیض رسانی کے مقابلہ میں مجبور ہے۔ تمام اوقات گرامی ان کے تعلیم طلباء میں نصف شب تک منقسم ہیں۔

حلیہ ان کا یہ ہے کہ ہنستی پیشانی، خندہ رو، سفید ریش، صورت نورانی مثل

عالم ربانی کے، ہمارے زمانے میں ان کی ذات سے ہندوستان میں علم نے ترقی اور رفعت پائی ہے اس قول کاشفی کا مصداق وہی ہیں:

آں فاضل زمانہ کہ ازیمن درس اوست
ہم عقل در ترفع ہم علم در کمال

متواضع اور حلیم اور بردبار اور صاف اور مفکر اور مدبر اور دانشمند ہیں، غرض کہ جتنی تعریف اور جتنے اوصاف اخلاق بتلاشی تمام پیدا کئے جائیں اس میں سب موجود ہیں، معارض کو چاہئے کہ دو چار گھڑی ان کی خدمت میں بیٹھ کر ان اوصاف کو ملاحظہ کرے اس وقت میرے قول کی تصدیق بحلف کریگا اور کہے گا کہ سچ ہے، بے مبالغہ اور قطع نظر تعریف کے امر واقعی اس شخص نے بیان کیا ہے۔

تمام عمر میں باوجود اس کثرت علم اور فضل کے وعظ عام نہیں کیا، اور تصانیف کتب پر مائل نہیں ہوئے، باعث اس کا یہ ہے کہ چوں کہ ان کی خدمت میں صدہا طالب علم اطراف و جوانب سے واسطے تعلیم پانے علوم کے حاضر ہوتے ہیں اور ان کے حسن اخلاق سے یہ بعید ہے کہ کسی طالب علم کی خاطر رنجیدہ کریں، پھر اس صورت میں فرصت واسطے تصانیف کے ہونی معلوم! لہٰذا اپنا ہرج گوارہ کیا، دل شکنی کسی کی منظور نہ کی۔

مگر ہاں ایک کتاب تحریر اقلیدس کا جو عربی زبان تھی، بموجب حکم پرنسپل مدرسۂ دہلی کے ۱۸۴۴ء میں ترجمہ اردو زبان میں کر کے پانی کر دیا اور بہت اچھی طرح سے ہر اک مشکل کو حل کیا ہے، یہ ترجمہ ۱۸۴۴ء میں دو دفعہ چھپ چکا ہے، یہی باعث مذکورہ بالا نہ منظوم کرنے افکارِ شعریہ کا ہے، اور سوائے اس کے یہ ہے کہ شعر گوئی پیشہ علماء کا نہیں ہے بلکہ پایہ تحقیق و تدقیق کو مضر ہے، مگر ایک مسودہ عربی خط کا جو مسمّیٰ فیروز بادشاہ زادی کو انہوں نے ایام طالب علمی میں بے نقطہ لکھا تھا ڈھونڈ لایا ہوں، تیمناً و تبرکاً اپنی کتاب میں لکھتا ہوں وہ یہ ہے۔

[خط مکتوبات کے عنوان میں گذر چکا اس لئے یہاں درج نہیں کیا گیا]

(۳)

طبقات شعرائے ہند

تالیف: کریم الدین پانی پتی

مؤلفہ ومطبوعہ دہلی: ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۷ء

مولانا مملوک العلی مدرس اول مدرسہ دہلی، جناب مولوی مدظلہ العالی، عالم بے بدل اور متقی بے مثل اور فاضل کامل ہیں۔ عہدہ میر مولوی بمشاہرہ سو روپیہ ماہواری مدرسہ میں مقرر ہیں، حق یہ ہے کہ اس فاضل کی جیسی قدر چاہئے ویسی نہیں، کیوں کہ ایسے عمدہ فاضل بے بدل بہت کم ہوتے ہیں اور واقع میں بناء مدرسہ عربی ان کی ذات سے مستحکم ہے۔

فارسی اور اردو اور عربی تینوں زبانوں میں کمال رکھتے ہیں، ہر ایک علم اور فن سے جوان زبانوں میں ہیں مہارت تامہ ان کو حاصل ہے اور جس فن کی کتاب اردو زبان میں انگریزی سے ترجمہ ہوتی ہے اس کے اصل اصول سے بہت جلد ان کا ذہن چسپاں ہو جاتا ہے، گویا اس فن کو اول ہی سے جانتے تھے اور جس کار پر مامور ہیں اس میں کبھی کسی طرح کا حتی الوسع ان سے قصور نہیں ہوا۔

مدرسہ میں ان کی ذاتِ بابرکات سے اتنا فیض ہوا ہے جو کہ شاید کسی زمانہ میں کسی استاذ سے ہوا ہو، بندہ کے زعم میں یہ ہے کہ کبھی ایسا فائدہ لوگوں نے کسی فاضل سے نہ اٹھایا ہوگا، اگر ان کو کانِ علم اور مخزنِ اسرار کہوں تو بجا ہے، کیوں کہ وہ فاضل ایسا ہی ہے۔ کوئی کتاب کسی فن کی مشکل اس کے پاس لے جاؤ حفظ پڑھا دیں گے، گویا اس کو حفظ کر رکھی ہے۔ اس لئے رات و دن سوائے مدرسہ کے ان کے گھر پر طلباء پڑے رہتے ہیں، ہر وقت ان کو گھیرے رہتے ہیں

اور وہ خلیق اس طرح کے ہیں کہ کسی سے انکار نہیں کر سکتے۔

سب کو پڑھاتے ہیں، تمام شب اور دن میں شاید دو پہر رات کو آرام کرنا ان کو نصیب ہوتا ہوگا، والّا نہ، رات دن درس دہی طلباء میں گذرتا ہے۔

اور باوجود اس کثرتِ درس اور فیض رسانی کے پابند شرع شریف ایسے ہیں کہ اس طرح کے آدمی کم دیکھنے میں آئے ہیں، غرضیکہ جتنا ان کی تعریف میں لکھوں بجا ہے، اگر کوئی امر بطور مبالغہ بھی لکھوں وہ بھی امر واقعی ان کی ذات میں پاتا ہوں، بہت بے نظیر فاضل ہیں، ان کے ثانی کوئی فاضل ایسا نہیں جس سے اس طرح کا فیض عام اور تشفی خاص و عام حاصل ہو۔

عمر اُن کی ۱۸۴۷ء میں قریب ساٹھ برس ہوگئی، بہت خندہ پیشانی اور عقلمند اور ذکی اور ذہین اور تیز فہم اور محقق اور مدقق ہیں۔

تحریر اقلیدس کا ترجمہ زبان اردو میں چار مقالہ اوّل کا اور دو مقالوں آخر گیارہویں، بارہویں کا کیا ہے، حق یہ ہے کہ علم ہندسہ کو پانی کی طرح بہا دیا ہے، اصل وطن ان کا نانوتہ ہے، مدت سے شاہجہاں آباد میں رہتے ہیں۔(۱)

(۱) طبقات شعرائے ہند ص: ۴۶۳، ۴۶۴ (عکس طبع اول لکھنؤ ۱۹۸۴ء)

(۴)

آثار الصنادید

سرسید احمد خاں

جناب مولوی مملوک العلی سلمہ اللہ تعالیٰ

شاگرد رشید مولوی رشید الدین خاں صاحب۔ علم معقول و منقول میں استعداد کامل اور کتب درسیہ کا ایسا استحضار ہے کہ اگر فرض کرو کہ ان کتابوں سے گنجینۂ عالم خالی ہو جاوے تو ان کی لوحِ حافظہ سے پھر نقل ان کی ممکن ہے۔

ان سب کمال اور فضیلت پر خلق و حلم احاطہ تحریر سے افزوں ہے، اگر چہ زئی دنیاداروں کی ہے، لیکن سیرت اور سریرت میں درویشانہ۔

اگر چہ چودہ پندرہ برس سے مدرسہ شاہجہاں آباد میں عہدہ مدرسی رکھتے تھے لیکن اب کئی سال سے سرگروہ مدرسین ہیں کہ مدرسی اول اس سے عبارت ہے، انشاء نظم و نثر کی طرف کم توجہ ہے، اگر ایسا فاضل اس طرف بھی متوجہ ہوتا تو یقین ہے کہ اس فن میں اپنے اقران و امثال سے ممتاز ہوتا۔(۱)

(۱) آثار الصنادید سرسید احمد الف: ص ۱۲۷ باب چہارم (طبع اول سید المطابع دہلی: ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۷ء)
ب: ص ۷۰ باب چہارم، (منشی نول کشور لکھنؤ: ۱۳۱۸ھ ۱۹۰۰ء)

چند
یادگار تبرکات

استاذ الکل، حضرت مولانا مملوک العلی نانوتویؒ

کی مکتوبہ چند خاص غیر مطبوعہ تحریریں،

مطبوعہ تصانیف کے چند اوراق

اور

نانوتہ میں مولانا کے ذاتی مکان

نیز دہلی کے قبرستان مہندیان میں مدفن کے عکس

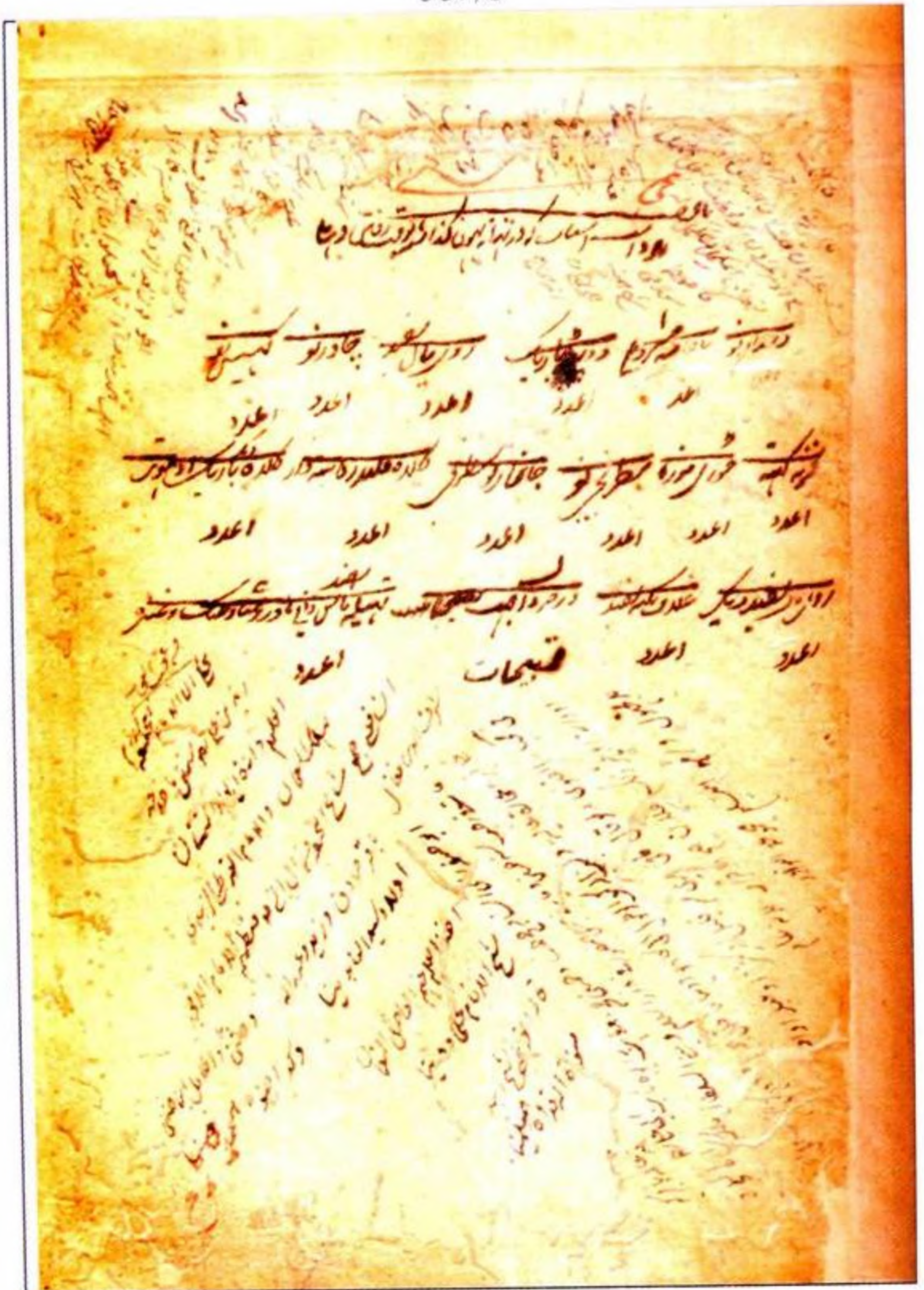
بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله الذي ملهم الالغاز وكاشف الاسرار عن نبينا محمد صاحب الاعجاز والصلوة على
رسوله الذي علم الله واصحابه دقائق الشرائع وحقائق الحقائق والمجاز وبعد فيقول العبد
الضعيف الهي بخش عفوه رب العرش ان اللغز المنسوب الى بهاء الدين العاملي عامله
الله بلطفه الخفي لما كان منطويا على الاعضال والاشكال فشرحته على كمال الاختصار والايجاز
مقتصرا على اظهار المعمى والاسرار ايها الاصحاب الكرام والاخوان العظام من حسباني
قبس حي مقول ان محمد جالينوسي المشرب وبقراطي المطلب اي كان منسوبا
الى الطريقة جالينوس الحكيم وكان منسوبا [illegible] وبذلك [illegible] كتاب القانون
للشيخ الرئيس والفضائل [illegible] السابقة والاحفظ عليه [illegible] نسيج الافكار
لكونه [illegible] ملتمس القياس اي مشتملا على ادلة الفلاسفة
مشهورا بين الانام بالنصب صفة لحبيب وكونه لكونه خبر المبتدا [illegible]
اي ابو كذا [illegible] والعام [illegible] صاحب الله [illegible]

حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کی ایک بیاض میں مولانا مملوک العلی کے قلم سے نقل حضرت مفتی صاحب کی تالیف 'شرح شیخ بہاء الدین عاملی' کا پہلا صفحہ، جس پر مفتی صاحب کی ایک علمی یادداشت بھی درج ہے

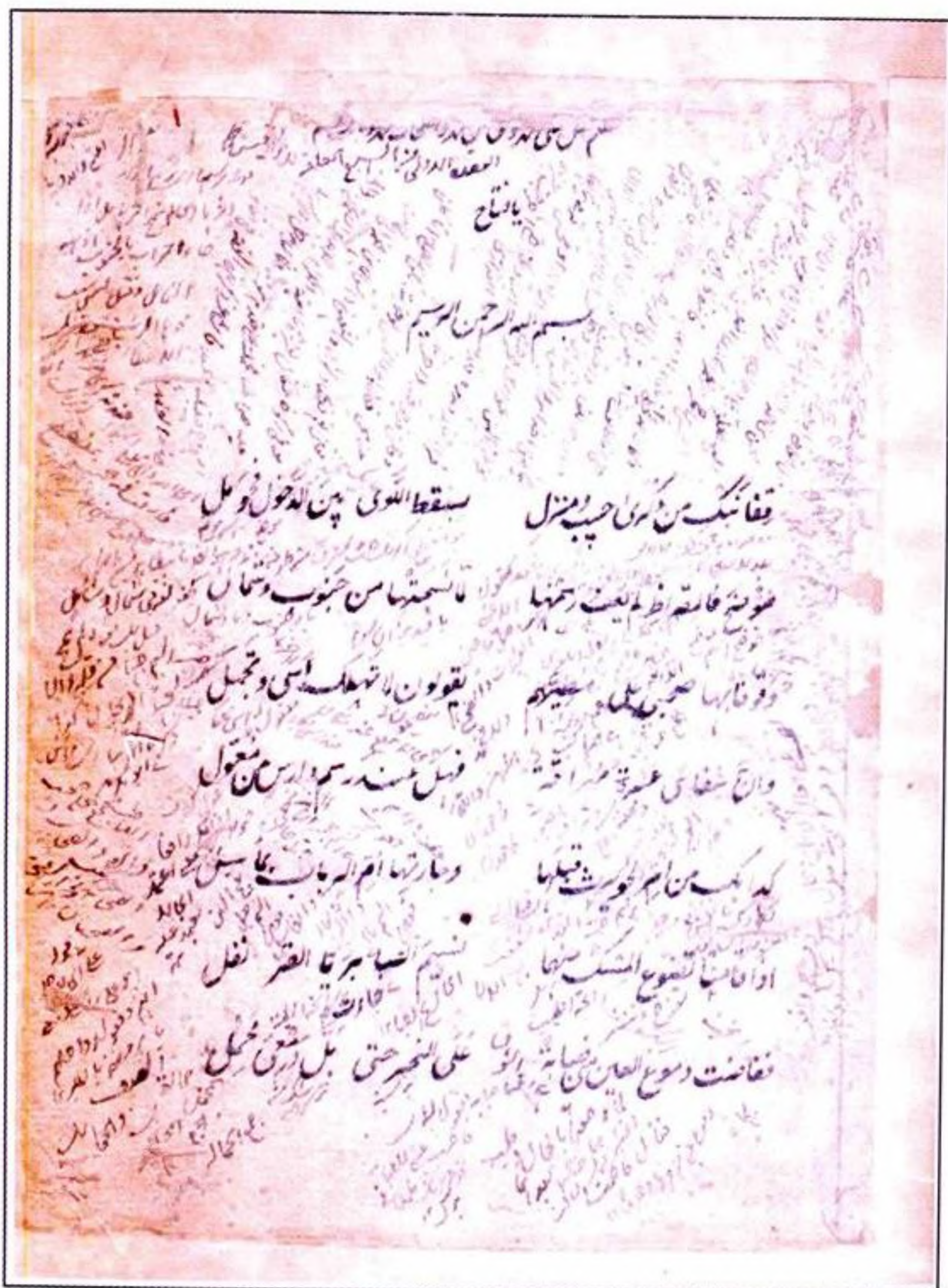
557/2

مولانا مملوک العلی کی مکتوبہ 'شرح شیخ بہاء الدین عاملی' کا آخری صفحہ۔ یہ نسخہ بھی اصل کی طرح نامکمل ہے۔

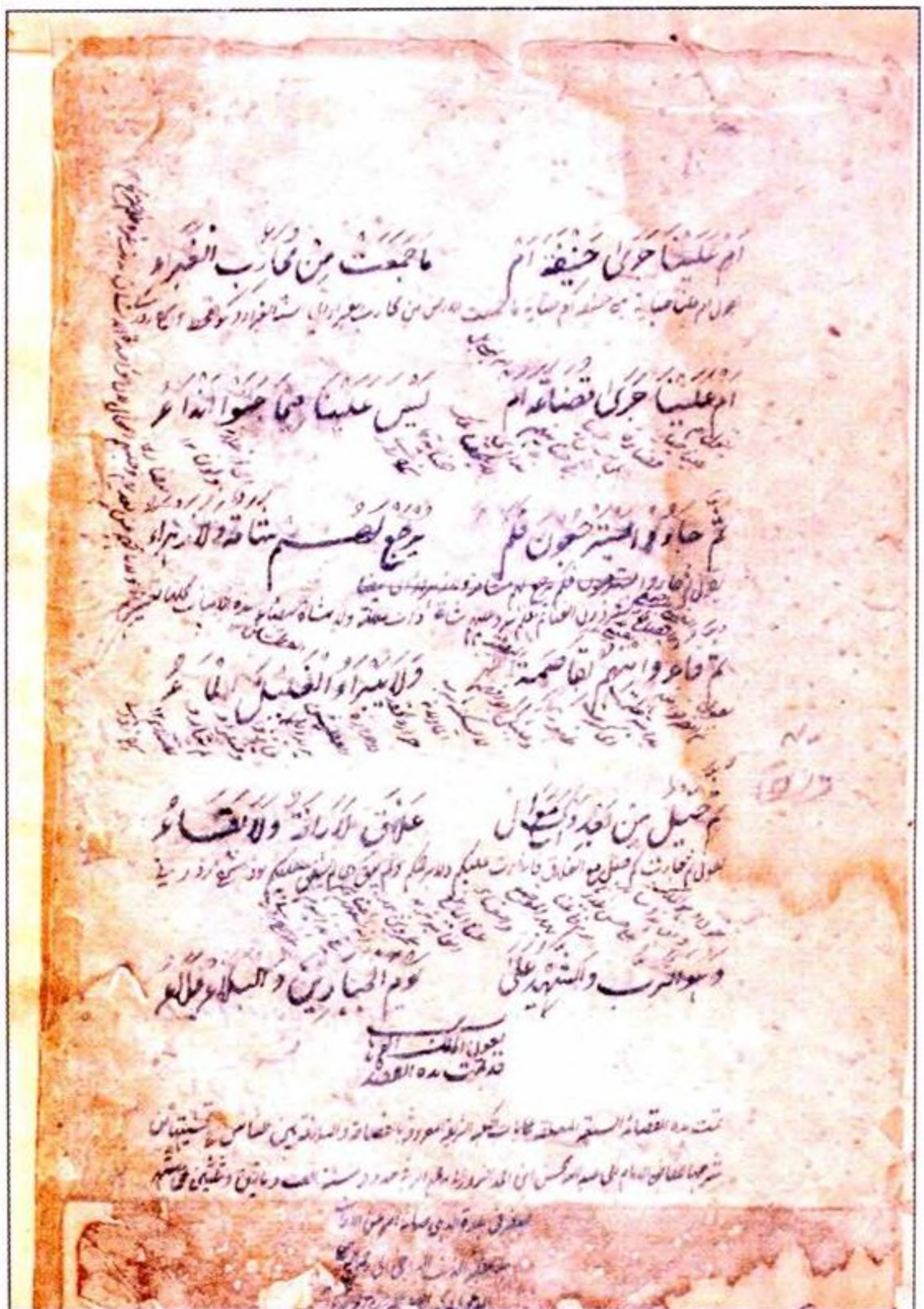


مولانا مملوک العلی کی مکتوبہ شرح شیخ بہاء الدین عاملی کے اوپر کا صفحہ جس پر ایک یادداشت درج ہے جو (بہ ظاہر) مولانا نے تھانہ بھون سے دہلی تعلیم کے لئے جاتے وقت لکھی تھی۔

558/1



مولانا مملوک العلی کے قلم سے مکتوبہ شرح سبعہ معلقات زوزنی کا پہلا صفحہ
(مکتوبہ ۱۲۳۰ھ)



ام علینا جرّی حنیفة ام ما جمعت من محارب الغبراء

ام علینا جرّی قضاعة ام لیس علینا فیما جنوا انداء

ثم جاؤوا یسترجعون فلم ترجع لهم شامة ولا زهراء

ثم جاؤوا منهم بقاصمة الظهر ولا یبرد الغلیل الماء

ثم خیل من بعد ذاک مع الغلاق لا رأفة ولا ابقاء

وهو الرب والشهید علی یوم الحیارین والبلاء بلاء

مولانا مملوک العلی کے قلم سے مکتوبہ 'شرح سبعہ معلقات زوزنی' کا آخری صفحہ

(مکتوبہ ۱۲۳۰ھ)

[illegible]

ثم الصلاة على أزكى الورى حسبا — محمد وأمير المؤمنين علي

ما أومض البرق في الديجور مبتسما — وما جرى من دموع العاشق الثمل

[illegible]

والعتب في شغل يا هنك من شغل

ولا تذكرت بها شيئا من الغزل

تغني اللبيب عن التفصيل والجمل

تمام شد راقم مملوک علی

قال الشیخ جلال الدین السیوطی فی کتاب بغیة الوعاة فی طبقات اللغویین والنحاة فی ترجمة صاحب القاموس [illegible]

[illegible]

حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ کی بیاض میں درج مولانا مملوک العلی کی مکتوبہ 'لامیہ صلاح الدین صفدی' کا آخری صفحہ، جس پر مولانا کے دستخط ثبت ہیں: 'تمام شد راقم مملوک علی'

حضرت مولانا مملوک العلی کی بیاض میں درج ایک عربی یادداشت جس پر مولانا کے دستخط ثبت ہیں "نوشتہ مملوک الطلبہ مملوک علی"

ومن لا یذد عن حوضه بسلاحه یهدم ومن لا یظلم الناس یظلم

وکائن تری من صامت لک معجب زیادته او نقصه فی التکلم

لسان الفتی نصف ونصف فؤاده فلم یبق الا صورة اللحم والدم

وان سفاه الشیخ لا حلم بعده وان الفتی بعد السفاهة یحلم

سألنا فأعطیتم وعدنا فعدتم ومن اکثر التسآل یوما سیحرم

مولانا مملوک العلی کے قلم سے مکتوبہ قصیدہ کا ایک صفحہ

562

مولانا مملوک العلی کی بیاض کا ایک صفحہ

تحریر اقلیدس کے چار مقالہ اول کا ترجمہ مولوی مملوک العلی مدرس اول نے
عربی سے زبان اردو میں ۱۸۴۴ میں کیا

(۱)

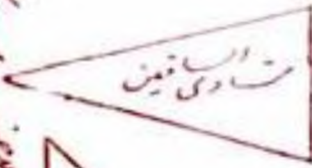
Element
of
Geometry
Books I II III and IV
of Euclid translated
by
Mowlvee Mamlook Ally
of the Delhie College
1844

مطبع رفاہ عام کے لیتھوگرافک پریس واقعہ خاص دار الخلافہ شاہجہان آباد گذر
ترکمان دروازہ کے بیچ میں اہتمام مولوی کریم الدین سے چھاپا ہوا فقط

اقلیدس کے چار مقالہ اول کا عربی سے ترجمہ مولانا مملوک العلی کا سرورق۔ مطبوعہ دہلی ۱۸۴۴ء

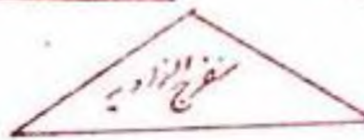
پہلی مثلث ہی اور مثلث کی چھہ قسمین ہین ایک متساوی الاضلاع ۳
جنکی تمیون لکیرین اسمین برابر ہون دوسری
متساوی الساقین جنکی دو لکیرین اسمین برابر ہون
تیسری مختلف الاضلاع جسکے تمیون ضلع
آپسمین مختلف ہون چوتھی قائمۃ الزاویہ
جسمین ایک زاویہ قائمہ ہو پانچوین منفرج الزاویہ
جسمین ایک زاویہ منفرجہ ہو چھٹی
حادالزوایا جسکے سب زاوئیے حادی ہون
ذوار بعۃ الاضلاع وہ شکل ہوتی ہی جسکو
چار خطون نے گھیرا ہو اوسکی پانچ قسمین ہین
اول مربع جسکے چارون ضلع برابر اور چارون
زاوئیے قائمین ہون دوسری مستطیل جسکے چارون
زاوئیے قائمین ہون اور خط دو دو خط مقابل کے
آپسمین برابر ہون تیسری معین جسکے چارون خط
آپسمین برابر ہون لیکن زاوئیے قائمین نہون
چوتھی شبہ معین جسکے نہ چارون خط برابر ہون
اور نہ زاوئیے قائمین لیکن مقابل کے دو دو زاوئیے اور دو دو ضلع
آپسمین برابر ہون پانچوین منحرف جو ان سب کے
خلاف ہو کثیر الاضلاع وہ شکل ہی جسکے ضلع
چار سے زیادہ ہون خطوط متوازیہ











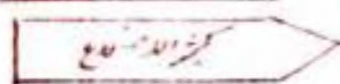




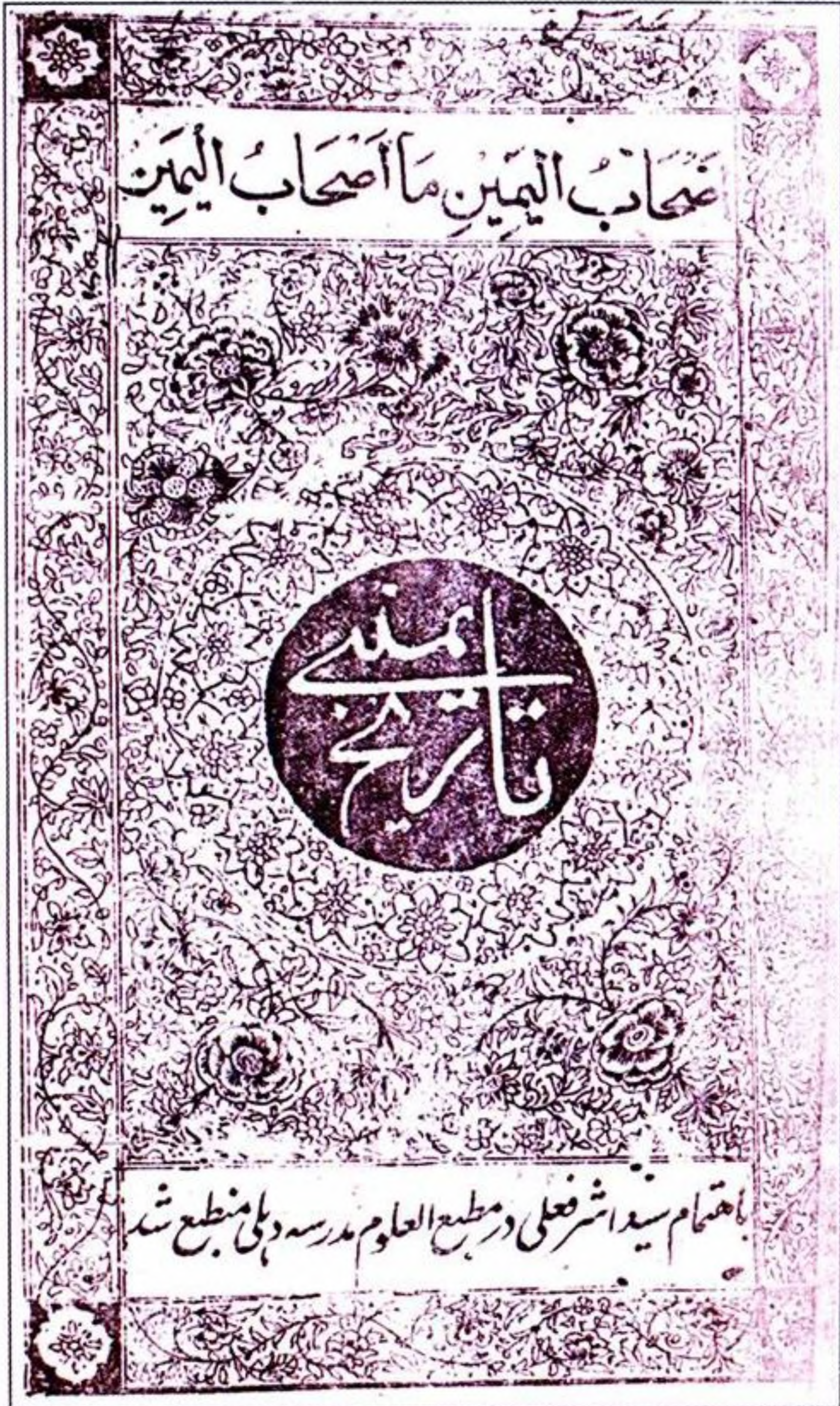








اقلیدس کے چار مقالہ اول کا عربی سے ترجمہ مولانا مملوک العلی کا ایک ورق۔



مولانا مملوک العلی کی مرتبہ 'تاریخ یمنی' کا سرورق، مطبوعہ مطبع العلوم، مدرسہ دہلی کا سرورق

قالوا لئن لم يرحمنا ربنا ويغفر لنا لنكونن من الخاسرين

الا ان نقمة منهم بسيف الدولة جزاء عن فعلهم الفظيع و

خطبهم الشنيع وسعيهم المذموم عند الجميع فصبه عليهم

عزالى الغيث بنوء المريخ من غير انه غيث قطره عيث وغيمه

حشوه ضيم وسحابه عذاب وكذلك اخذ ربك اذا اخذ القرى

وهي ظالمة ان اخذه اليم شديد وبرز [illegible] بنو [illegible]

[illegible] عبد الملك بن نوح وسائر اهل العسكر الى ظاهر

مقابلين لعسكر الامير سيف الدولة يعلنان جلادة و [illegible]

[illegible] ظاهر العتو [illegible] خيفا الحرد [illegible]

الارض [illegible] الا قطار عليهم [illegible]

عليهم [illegible] الادبار وجوارح [illegible]

[illegible] وظل القوم على [illegible]

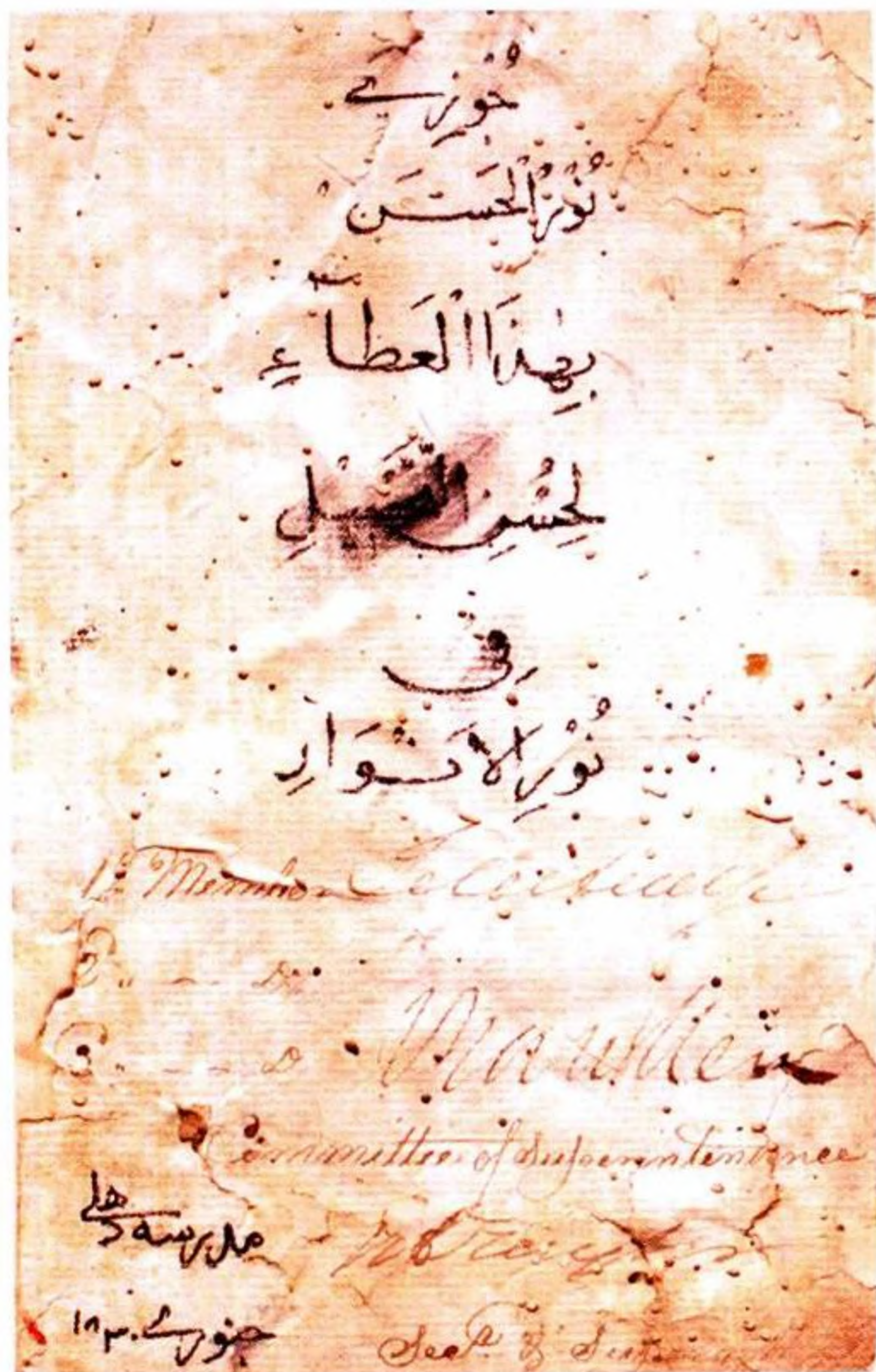
على الدار [illegible] تهافت الفراش في النار [illegible]

[illegible] كما قال الله تعالى يخربون بيوتهم بايديهم وايدي

المؤمنين فاعتبروا يا اولي الابصار وتردد [illegible]

سيف الدولة في مواضعه على سلم [illegible]

مولانا مملوک العلی کی مرتبہ تاریخ یمینی ایک صفحہ



جنوری

نور الحسن

بهذا العطاء

لحسن التحصيل

في

نور الانوار

Committee of Superintendence

مدرسہ دہلی

جنوری ۱۸۳۰

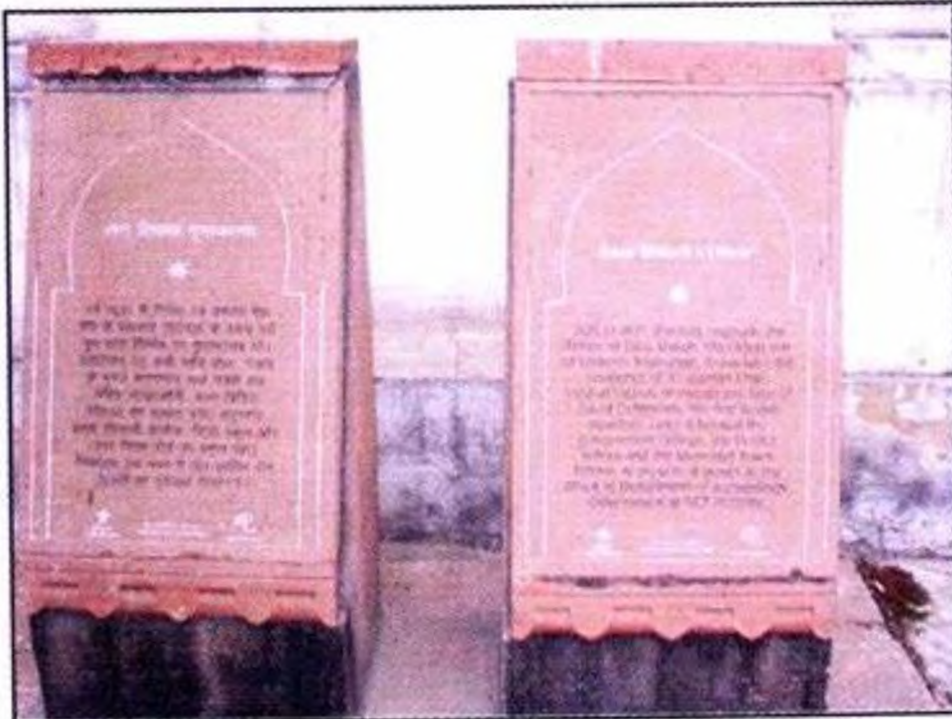
دہلی کالج (مدرسہ دہلی) کی ایک نادر یادگار۔ یہ سند توصیف جنوری ۱۸۳۰ء میں حضرت مفتی الٰہی بخشؒ کے پوتے، سر سید احمد خاںؒ کے استاد اور اس کتاب کے مؤلف کے پانچویں پشت میں دادا مولانا نور الحسنؒ کو عطا کی گئی تھی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

[illegible]

قصبہ کاندھلہ کی جدید وقدیم عیدگاہ کے تنازعہ میں مولانا محمد یعقوبؒ نانوتوی بن مولانا مملوک العلی کا تحریر کردہ تصفیہ نامہ۔ تحریر کا آخر میں تاریخ تحریر و دستخط درج ہیں: 'مکتوبہ ۳/شعبان ۱۲۸۹ھ دوشنبہ، کتبہ احقر العباد محمد یعقوب نانوتوی عفی عنہ'

دہلی میں کشمیری گیٹ پر واقع 'گورو گوبند سنگھ اندر پرستھ یونیورسٹی' کے احاطہ میں 'لائبریری داراشکوہ' کی عمارت کا ایک عکس۔ اسی عمارت میں مدرسہ دہلی (دہلی کالج) قائم ہوا تھا۔ 'مدرسہ دہلی' کی نسبت سے ہی اس کے سامنے کی سڑک 'مدرسہ روڈ' کہلاتی ہے، ہر چند کہ اب اس کا نام 'شام ناتھ روڈ' کر دیا گیا ہے۔ اس عمارت میں اب 'محکمہ آثار قدیمہ' کی لائبریری اور عجائب گھر ہے اور وہ کمرہ محفوظ ہے جو مولانا مملوک العلی کے زیر استعمال تھا۔



'لائبریری داراشکوہ' کے باہر نصب ہندی اور انگریزی کتبے، جس میں اس کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔



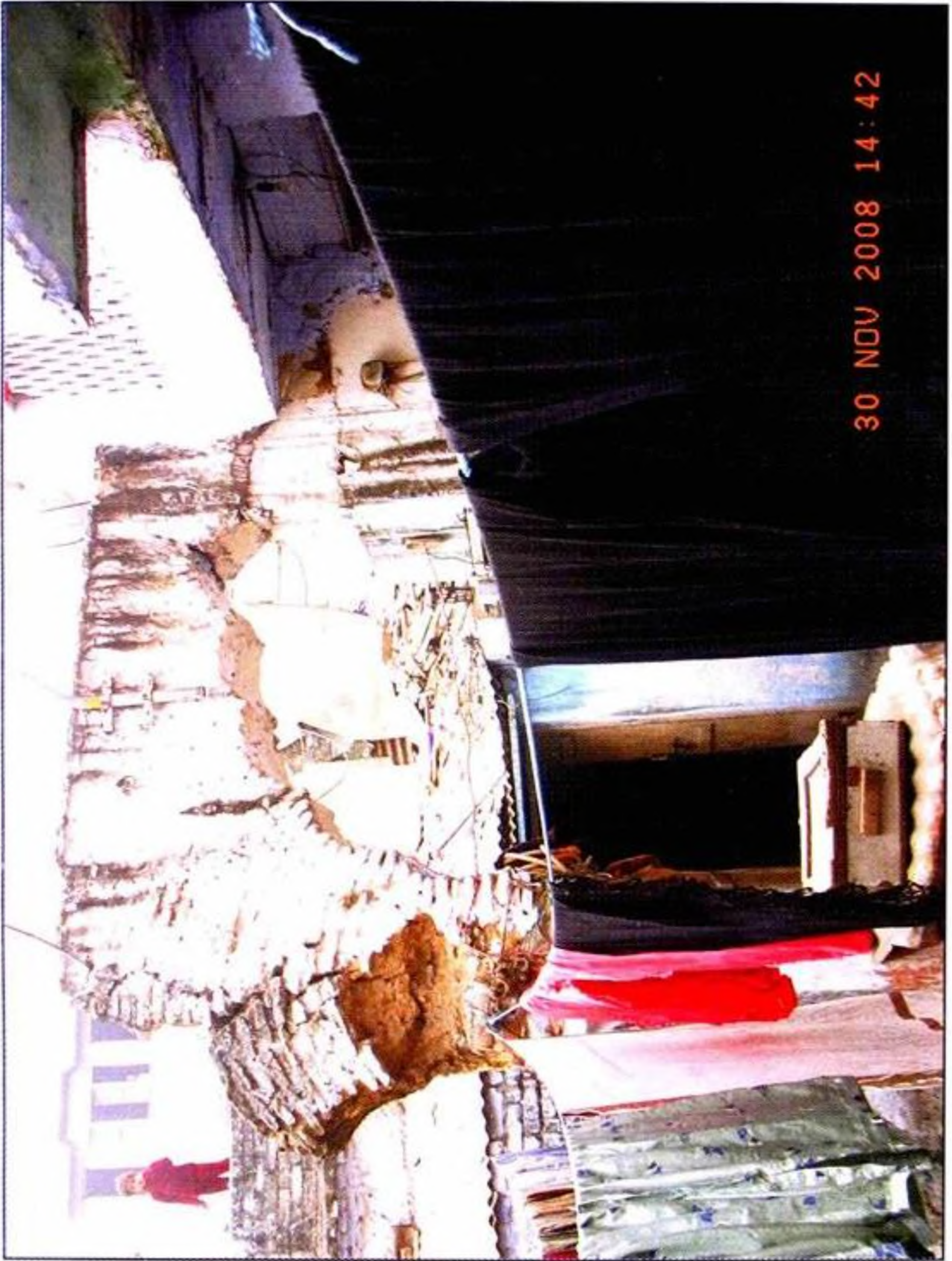
نانوتہ میں مولانا مملوک العلی کی رہائش گاہ کے دور انحطاط کا ایک عکس ۔ افسوس کہ اب اس مکان کا نشان بھی باقی نہیں رہا۔



کل من علیھا فان؛ شاہ جہان آباد، دہلی کے تاریخی قبرستان مہندیان میں مولانا مملوک العلیؒ کی آخری آرام گاہ۔ دہلی گیٹ سے متصل یہ قبرستان اب مولانا آزاد میڈیکل کالج اور جے پی اسپتال کے احاطہ میں گھر چکا ہے۔ اسی احاطہ میں، مولانا کے سرہانے کی طرف شیخ عبدالعزیزؒ شکر بار (ولادت: ۹۰۷ھ جونپور، وفات: ۹۷۵ھ) کا مدفن ہے۔ اسی قبرستان سے تقریباً دوسو قدم کے فاصلے پر جانب جنوب مسجد سے متصل احاطہ میں حضرت شاہ عبدالرحیمؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، حضرت شاہ عبدالقادرؒ اور ان کے خانوادے کے متعدد جلیل القدر اکابر علماء و مشائخ مدفون ہیں۔ اناللہ انا الیہ راجعون۔ 'دفن ہوگا نہ کہیں ایسا خزانہ ہرگز'



اندرون قبرستان مہندیان کا وہ احاطہ جس میں شیخ عبدالعزیز شکر بارؒ اور ان کے قدموں میں تقریباً ۳ میٹر جانب مغرب حضرت مولانا مملوک العلیؒ مدفون ہیں۔ گیٹ پر نصب پتھر پر 'درگاہ شیخ عبدالعزیز شکر بار' کندہ ہے۔ یہ قبرگاہ اصلاً 'مسجد مہندیان' المعروف بہ 'مسجد عبدالعزیز شکر بار' کے صحن میں واقع ہے۔ بعد میں اس کو 'جنوں والی مسجد' یا 'کلی مسجد' بھی کہا جانے لگا۔ پس منظر میں اس مسجد کے درمیانی اور جنوبی در نظر آرہے ہیں۔ یہ مسجد فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱ تا ۱۳۸۸ء) کے دور حکومت میں (غالباً ۷۵۵ھ/۱۳۵۴ء کی) تعمیر ہے۔ تقسیم کے بعد بھی عرصہ تک اس میں نماز پنجگانہ ادا کی جاتی رہی ہے۔



آثار کہہ رہے ہیں عمارت عظیم تھی: حضرت شاہ محمد اسحٰق کے مشہور و معروف مدرسہ کی ایک محراب، جو زمانے کے ہزار تھپیڑوں کے باوجود اب بھی پورے وقار اور متانت سے سر اٹھائے کھڑی ہے اور تغیرات زمانہ کی گواہ بنی ہوئی ہے۔ یہ مدرسہ اندرون کھیر والا پھاٹک بازار چتلی قبر میں واقع تھا، جس کو دہلی پر قبضہ کے بعد برطانی حکمرانوں نے اجاڑ دیا تھا۔

اشاریہ

(INDEX)

- شخصیات
- مقامات
- کتابیات

- فہرست مراجع

ہدایات

☐ اشاریہ (شخصیات) میں اسماء کی حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب شروع کرنے سے قبل جناب آقائے دوجہاں نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اسمائے مبارکہ کو درج کیا گیا ہے۔

☐ اشاریہ (کتابیات) میں صحیفہ ہدایت، اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن مجید کو ترتیب شروع ہونے سے قبل درج کیا گیا ہے۔

☐ حضرت مولانا مملوک العلی صاحب کے کتب خانہ کی جو فہرست ہے وہ اس سے علیحدہ ہے، اشاریہ (کتابیات) میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔

36

اشاریہ شخصیات

ب

پ

ت

ٹ

ث

ج

ع

ن

و

ہ

ی ے

اشاریہ مقامات

اشاریہ کتابیات

ن

و

ہ

ی ے

رسائل و جرائد

جرنل رضا لائبریری (رام پور) شمارہ (۱) ۱۹۸۹ء
ص ۲۹۲
جرنل کلکتہ ص ۴۲۵
سہ ماہی احوال و آثار شمارہ جنوری تا مارچ ۱۹۹۸ء
ص ۶۲
سہ ماہی العلم کراچی اپریل تا جون ۱۹۸۷ء
ص ۵۲۳

فکر و نظر (اسلام آباد) شمارہ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۹ء
ص ۲۶۵
ماہنامہ برہان دہلی جلد ۱۴ شمارہ ۴ ص ۲۲۰
ماہنامہ تہذیب الاخلاق جمادی الثانی ۱۳۰۴ھ
ص ۳۳۱
مجلہ شفاء الصدور جنوری ۱۹۵۸ء ص ۳۵۱

فہرست مراجع

القرآن کریم

قلمی

عربی

نمبر شمار		نام کتاب	مصنف	تعارف نسخہ	سنہ کتابت
۱	۱	السبع المعلقات	بقلم حضرت مولانا مملوک العلی	نسخہ ذاتی	۱۲۳۰ھ
۲	۲	شرح رسالہ بہاء الدین عاملی	حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی	نسخہ مصنف	
۳	۳	نسخہ دوم		بقلم مولانا مملوک العلی	
۴	۴	مجموعہ اسانید حدیث اساتذہ دیوبند	مولانا ناصر بلیاوی مؤلفہ ۱۳۴۳ھ	مکتوبہ بخط مولف مملوکہ راقم سطور	۱۳۵۰ھ
۵	۵	مجموعۃ الاسانید العالیۃ والشہادات السامیۃ	مولانا زید ابوالحسن فاروقی	عکس نسخہ مؤلف	

فارسی

نمبر شمار		نام کتاب	مصنف	تعارف نسخہ	سنہ کتابت
۶	۱	اسراریہ (تذکرہ مشائخ علماء)	شیخ کمال سنبھلی	نسخہ ندوۃ العلماء لکھنؤ	
۷	۲	بیاض مولانا احمد علی محدث دہلوی	حضرت مولانا احمد علی	نسخہ ذاتی	
۸	۳	بیاض حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی	حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی	نسخہ ذاتی	
۹	۴	بیاض مولانا محمد ابوالحسن کاندھلوی	مولانا ابوالحسن حسن کاندھلوی		
۱۰	۵	بیاض اول مولانا فضل حق خیرآبادی	مولانا فضل حق خیرآبادی	عکس نسخہ مصنف	
۱۱	۶	بیاض ثانی مولانا فضل حق خیرآبادی	مولانا فضل حق خیرآبادی	عکس نسخہ مصنف	
۱۲	۷	تذکرۃ الصالحین	شیخ عبدالرشید قادری کیرانوی (مؤلفہ ۱۱۶۳ھ)	عکس نقل نسخہ مصنف	
۱۳	۸	تذکرہ چشتیہ فردوسیہ، بہشتیہ	شیخ علاء الدین برناوی (وفات ۱۰۸۸ھ)	نسخہ مصححہ از نسخہ مصنف در	۱۳۰۸ھ

١٤	٩	کلمات الصادقین	شیخ محمد صادق ہمدانی، دہلوی	عکس نسخہ مخزونہ خدابخش لائبریری پٹنہ	
١٥	١٠	مجموعہ مکتوبات بنام حضرت حاجی	مکتوبہ بدست مولانا عبداللہ گنگوہی وغیرہ	عکس نسخہ مؤلف	
١٦	١١	امداد اللہ تھانوی			
١٧	١٢	مجموعہ مکتوبات سید احمد شہید (نسخہ اوّل)		مخزونہ کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ	
١٨	١٣	مجموعہ مکتوبات سید احمد شہید (نسخہ دوم)		مخزونہ کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ	
١٩	١٤	منظورۃ السعداء	سید جعفر علی نقوی بستوی	نسخہ ندوۃ العلماء لکھنؤ	
٢٠	١٥	وقائع وملفوظات شیخ محمد صادق گنگوہی	مملوکہ راقم سطور	بقلم مولانا نور الحسن کاندھلوی	شعبان ١٢٦٦ء

اُردو

٢١	١	تاریخ تھانہ بھون	مولانا ناظر حسن تھانوی	عکس نسخہ مصنف	
٢٢	٢	حالات مفتی الٰہی بخش کاندھلوی	مولانا ریاض الحسن، محمد سلیمان کاندھلوی	نسخہ مصنف	
٢٣	٣	سراج المعرفت	مفتی رحمت علی خاں دہلوی	مملوکہ راقم سطور	
٢٤	٤	شجرہ فاروقیان تھانہ بھون	مولانا ناظر حسن صاحب تھانوی	نسخہ مؤلف مملوکہ راقم سطور	
٢٥	٥	نسب نامہ صدیقیان سہارنپور			

عربی مطبوعات

٢٦	١	التمہید تعریف ائمۃ التجدید	مولانا عبید اللہ سندھی مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی	جام شورو سندھ	١٣٩٦ھ
٢٧	٢	الرحلۃ الحجازیہ		مصر	١٣٢٩ھ
٢٨	٣	الاعلام جلد نمبر ٤	خیر الدین الزرکلی	طبعہ رابعہ بیروت	١٩٧٩ء
٢٩	٤	الاعلام جلد نمبر ٦	خیر الدین الزرکلی	طبعہ رابعہ بیروت	١٩٧٩ء
٣٠	٥	الاعرف الجلی من اسانید الشیخ اشرف علی		دار الاشاعت دیوبند	١٣٣٩ھ

۳۱	۶	العلامہ فضل حق خیر آبادی حیاتہ و آثارہ مع تحقیق کتاب الثورۃ الہندیہ	ڈاکٹر مہر النساء	لاہور	۱۴۰۶ھ
۳۲	۷	المکاتیب	مولانا رشید الدین دہلوی (مؤلف نفحۃ الیمن)	مطبع مجتبائی دہلی	۱۳۱۱ھ
۳۳	۸	بخاری شریف	حضرت امام بخاری		
۳۴	۹	بغیۃ الوعاۃ فی طبقات اللغویین والنحاۃ	علامہ جلال الدین سیوطی تحقیق ابوالفضل ابراہیم	بیروت	۱۲۹۹ھ
۳۵	۱۰	ترمذی شریف (طبع اول)	حضرت امام ترمذیؒ		
	الف:	بتصحیح و حاشیہ مولانا مملوک العلی		اشرف المطابع	۱۲۶۵ھ
				مطبع احمدی دہلی	۱۲۶۵ھ
		و مولانا احمد علی محدث سہارنپوری		فخر المطابع، دہلی	۱۲۷۱ھ
	ب:	بتصحیح و حاشیہ مولانا سبحان بخش شکارپوری			
۳۶	۱۱	تاریخ الادب العربی (عربی ترجمہ) کارل بروکلمان		قاہرہ	۱۹۷۷ء
۳۷	۱۲	تاریخ یمینی	حواشی مولانا مملوک العلی	اشرف المطابع، دہلی	
۳۸	۱۳	تاریخ یمینی		مطبع صدیقی لاہور	۱۹۱۹ء
۳۹	۱۴	سلسلۃ الزبرجد فی اسناد الشیخ حسین احمد			
۴۰	۱۵	سنن نسائی	بحواشی و افادات شاہ محمد اسحٰق	مطبع سلطانی دہلی	۱۲۵ھ
۴۱	۱۶	شرح المعلقات السبع للزوزنی	حسین بن احمد بن حسین زوزنی	دار صادر، بیروت	۱۳۸۲ھ
۴۲	۱۷	مرآۃ الحرمین	ابراہیم رفعت پاشا		
۴۳	۱۸	مقدمہ مسلسلات شاہ ولی اللہ	شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی	سہارنپور	۱۳۵۸ھ
۴۴	۱۹	نزہۃ الخواطر جلد ۷	مولانا عبدالحئی حسنی رائے بریلوی	دائرۃ المعارف حیدرآباد	۱۳۹ھ
۴۵	۲۰	نزہۃ الخواطر جلد ۸	مولانا عبدالحئی حسنی رائے بریلوی	طبع دوم، حیدرآباد	۱۴۰۲ھ
۴۶	۲۱	نفحۃ العنبر فی حیات امام العصر الشیخ انور	مولانا محمد یوسف بنوری	کراچی	۱۳۷ھ

فارسی مطبوعات

۴۷	۱	اخبار الاخیار	شیخ عبدالحق	مطبع احمدی دہلی	۱۲۷ھ
۴۸	۲	آئین اکبری	ابوالفضل	سرسید ایڈیشن	۱۲۷ھ

۴۹	۳	بیاض دلکشا	مولانا نصر اللہ خویشگی	فتح الاخبار، کول	۱۲۷ھ
۵۰	۴	تاریخ محمدی	مرزا محمد رستم بدخشی مترجمہ مولانا امتیاز علی عرشی	رامپور	۱۹۶۰ھ
۵۱	۵	تذکرہ روز روشن	مظفر حسین صبا	بھوپال	۱۲۹۲ھ
۵۲	۶	دلائل الاذکار فی اثبات الجبر والاسرار	مولانا شیخ محمد تھانوی	مطبع فخر المطابع دہلی	۱۲۷۰ھ
۵۳	۷	دیوانِ مومن	مومن خاں	مطبع سلطانی، قلعہ معلی دہلی	۱۲۷۱ھ
۵۴	۸	رسالہ نکاح ثانی (مجموعہ فتاوی)	حضرت شاہ عبدالعزیز وشاہ رفیع الدین وغیرہ	مطبع مطبع الرحمٰن، دہلی	۱۲۶۸ھ
۵۵	۹	شامہ مشامِ افروز (مکتوبات فارسی)	عبدالرحمٰن حیرت جھنجھانوی	مراد آباد	۱۳۰۲ھ
۵۶	۱۰	ضیاء القلوب	حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی	مطبع مجتبائی دہلی	۱۲۸۴ھ
۵۷	۱۱	فتاویٰ عزیزی جلد اول جلد دوم		مطبع مجتبائی دہلی	۱۳۲۲ھ ۱۳۲۵ھ
۵۸	۱۲	گوہرین نامہ	احسن اللہ خاں ثاقب	لکھنؤ	۱۳۴۱ھ
۵۹	۱۳	مجموعہ مکاتیب سید احمد شہید		خطی نسخہ کا عکس، لاہور	۱۳۹۵ھ
۶۰	۱۴	مکتوبات قدوسیہ	حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی	دہلی	۱۲۹۷ھ
۶۱	۱۵	ملفوظات حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی		مطبع مجتبائی میرٹھ	۱۳۱۴ھ

اردو مطبوعات

۶۲	۱	آپ بیتی خودنوشت	ڈا(ظل حسنین انصاری)	آپ بیتی نمبر فن اور شخصیت، بمبئی	۱۹۸۰ء
۶۳	۲	ابن الوقت	ڈپٹی نذیر احمد	نذیر حسین، دہلی	بلاسنہ
۶۴	۳	آثار الصنادید	سرسید احمد	مطبع سید الاخبار، دہلی	۱۸۴۷ء
۶۵	۴	آثار الصنادید		مطبع نول کشور لکھنؤ	۱۳۱۸ھ
۶۶	۵	احکام العیدین	نواب قطب الدین	مطبع نول کشور لکھنؤ	۱۲۹۰ھ
۶۷	۶	احوال علمائے فرنگی محل	شیخ الطاف الرحمٰن بارہ بنکوی	طبع اول مجتبائی لکھنؤ	بلاسنہ

۶۸	۷	اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار	ترجمہ فضل احمد جیوری	لاہور	۱۳۹۵ھ
۶۹	۸	ارواح ثلاثہ طبع اول	مرتبہ مولانا سید ظہور الحسن کسولوی	امداد الغربا، سہارنپور	۱۳۵۲ھ
	۹	ارواح ثلاثہ طبع جدید	مرتبہ مولانا سید ظہور الحسن کسولوی	مکتبہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون	؟
۷۰	۱۰	ارشاد محمدی	مولانا شیخ محمد تھانوی	مطبع دار العلوم، میرٹھ	؟
۷۱	۱۱	اشاعت خاص سہ ماہی احوال و آثار کاندھلہ (بیاد مولانا انعام الحسن کاندھلوی)	نور الحسن راشد کاندھلوی	کاندھلہ	۱۹۹۷ء
۷۲	۱۲	افادات سنن نسائی	مولانا شیخ محمد تھانوی	مطبع مجتبائی دہلی	۱۳۱۶ھ
۷۳	۱۳	الفصل للوصل (سفر نامہ لکھنؤ ولاہور حضرت تھانوی اور ان کے ملفوظات)	وصل بلگرامی	بارہ بنکی	۱۳۵۳ھ
۷۴	۱۴	امداد المشتاق	مولانا اشرف علی تھانوی	مکتبہ برہان دہلی	۱۹۸۰ء
۷۵	۱۵	امیر الروایات مجموعہ قصص و حکایات	مولانا حبیب احمد کیرانوی	ماہنامہ الہادی، دہلی	۱۳۴۳ھ ۱۳۴۶ھ
۷۶	۱۶	انوار العاشقین	مولانا مشتاق احمد انبہٹوی	لاہور	؟
۷۷	۱۷	انوار قاسمی جلد اوّل (سوانح مولانا محمد قاسم)	مولانا انوار الحسن شیرکوٹی	لاہور	۱۳۸۹ھ
۷۸	۱۸	انوار محمدی	مولانا شیخ محمد تھانوی	مطبع مجتبائی، میرٹھ	۱۲۹۱ھ
۷۹	۱۹	انوار انوری (مجموعہ افادات و ملفوظات علامہ انور شاہ کشمیری)	مولانا محمد انوری لائل پوری	لائل پور	۱۳۸۷ھ
۸۰	۲۰	اٹھارہ سو ستاون ۱۸۵۷ء اخبارات و دستاویزات	محمد عتیق صدیقی	علی گڑھ	؟
۸۱	۲۱	ایک نادر مجموعہ مکاتیب (مکتوبات مشاہیر بنام اسپرنگر)	ڈاکٹر محمد اکرام چغتائی	سہ ماہی اردو، کراچی	۱۹۸۵ء ۱۹۸۷ء
			(ب)		
۸۲	۲۲	برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ	ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ترجمہ ہلال احمد زبیری	کراچی	۱۹۸۳ء

۸۳	۲۳	بیاض یعقوبی	مرتبہ حکیم امیر احمد عشرتی	دہلی	۱۹۲۹ء
			(ت)		
۸۴	۲۴	تاریخ ادب اردو (اردو)	رام بابو سکسینہ	طبع اول، لکھنؤ	
۸۵	۲۵	تاریخ تھانہ بھون	مولانا شیخ محمد تھانوی	ماہنامہ البلاغ، کراچی	
۸۶	۲۶	تاریخ دار العلوم دیوبند	سید محبوب رضوی		
۸۷	۲۷	تاریخ دیوبند	سید محبوب رضوی		
۸۸	۲۸	تاریخ شعرائے عرب	کریم الدین پانی پتی	مطبع العلوم، دہلی	۱۸۴۷ء
۸۹	۲۹	تاریخ صحافت اردو جلد اول	امداد صابری	دہلی	۱۹۶۷ء
۹۰	۳۰	تبرکات (نادر مکتوبات حضرت حاجی امداد اللہ و حضرت مولانا گنگوہیؒ)	نور الحسن راشد کاندھلوی	کاندھلہ	۱۳۹۵ھ
۹۱	۳۱	تحفہ صادقیہ (نسب نامہ انصاریان انبہٹہ)	مولانا مشتاق احمد انبہٹوی	لاہور	۱۳۲۹ھ
۹۲	۳۲	تحقیق وحدت الوجود والشہود	ترجمہ: ثناء الحق صدیقی	کراچی	۱۹۶۳ء
۹۳	۳۳	ترجمہ تاریخ التعلیم میجر باسو	ترجمہ: وارث سرہندی	کراچی	۱۹۷۶ء
۹۴	۳۴	ترجمہ تحریر اقلیدس	ترجمہ مولانا مملوک العلی	طبع اول دہلی مطبوعہ احمدی میرٹھ	۱۸۴۴ء
۹۵	۳۵	تذکرہ رحمانیہ (سوانح قاری عبد الرحمٰن پانی پتی).	مولانا عبد العلیم انصاری	لاہور	۱۴۰۰ھ
۹۶	۳۶	تذکرۃ الرشید جلد اول	مولانا عاشق الٰہی میرٹھی	سہارنپور	۱۹۷۷ء
۹۷	۳۷	تذکرہ سرسید	مولوی محمد امین زبیری	یونائیٹڈ لمیٹڈ، لاہور	
۹۸	۳۸	تذکرۃ العابدین	حافظ نظیر حسین دیوبندی	دہلی	۱۳۳۳ء
۹۹	۳۹	تذکرہ علمائے پنجاب	اختر راہی صاحب	لاہور	۱۹۹۸ء
۱۰۰	۴۰	تذکرہ علمائے فرنگی محل	مفتی عنایت اللہ فرنگی محلی	عکس طبع اول کراچی	۱۴۱۱ھ
۱۰۱	۴۱	تذکرہ غوثیہ	منسوب بہ مولانا گل حسن	دہلی	بلاسنہ
۱۰۲	۴۲	تذکرۃ الحافظ (تذکرہ حافظ لطافت علی دیوبندی)	مولانا نعیم دیوبندی	دیوبند	۱۳۹۰ء

نمبر	نمبر	نام کتاب	مصنف	مقام	سنہ
١٠٣	۴٣	تذکرہ کاملان رامپور	حافظ احمد علی خاں شوق	پٹنہ	
١٠۴	۴۴	تذکرہ مولانا احمد علی محدث سہارنپوری	سید محبوب رضوی	دیوبند	
١٠۵	۴۵	تذکرہ مولانا محمد احسن نانوتوی	محمد ایوب قادری	کراچی	١٩٦٦ء
١٠٦	۴٦	تصانیف احمدیہ	سرسید احمد خاں	علی گڑھ	١٣٠٠ھ
١٠٧	۴٧	تعارفی کتابچہ براحوال مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی	مفتی فضل الرحمٰن ہلال عثمانی	مالیرکوٹلہ	١٩٩١ء
١٠٨	۴٨	تلخیص الصحاح ترجمہ جامع الاصول	مولانا محی الدین خاں دہلوی	مطبع صدیقی، لاہور	١٩١٩ء تا
١٠٩	۴٩	تلامیذ غالب	مالک رام	طبع اول، نکودر	بلاسنہ
			(ج)		
١١٠	۵٠	جغرافیہ ضلع سہارنپور	ذاکر بیگ نانوتوی	اتحاد پریس، سہارنپور	١٩٠٠ء
١١١	۵١	جماعت مجاہدین	چودھری غلام رسول مہر	طبع دوم، لاہور	بلاسنہ
١١٢	۵٢	جمیل الکلام (ملفوظات حضرت تھانوی)	مفتی جمیل احمد تھانوی	شامل الفصل للوصل	
			(ح)		
١١٣	۵٣	حالات طیب مولانا محمد قاسم نانوتوی (نیز دیکھئے تذکرہ مولانا محمد قاسم)	مولانا محمد یعقوب نانوتوی	بھاولپور	١٢٩٧ھ
١١۴	۵۴	حالات مشائخ کاندھلہ	مولانا احتشام الحسن کاندھلوی	دارالاشاعت، کاندھلہ	١٣١٧ھ
١١۵	۵۵	حیات جاوید	مولانا الطاف حسین حالی	انجمن ترقی اردو دہلی	١٩٣٩ء
١١٦	۵٦	حیات خلیل	مولانا محمد ثانی حسنی	لکھنؤ	١٣٩٦ھ
١١٧	۵٧	حیات شاہ محمد اسحٰق	حکیم محمود احمد برکاتی	دہلی	١٣١٢ھ
١١٨	۵٨	حیات شیخ الہند	مولانا اصغر حسین میاں صاحب	لاہور	١٩٧٧ء
١١٩	۵٩	حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی	پروفیسر خلیق احمد نظامی	دہلی	١٣٧٣ھ
١٢٠	٦٠	حیات النذیر	سید افتخار عالم مارہروی	دہلی	١٩١٩ء

			(د)		
١٢١	٦١.	دلی اور اسکے اطراف	مولانا حکیم سید عبدالحئی حسنی	دہلی	١٩٥٨ء
١٢٢	٦٢	دہلی کی آخری شمع (١٢٦١ھ کا یادگار مشاعرہ)	مرزا فرحت اللہ بیگ مرتبہ رشید حسن خاں	دہلی	١٩٩٢ء
			(ڈ)		
١٢٣	٦٣	ڈپٹی نذیر احمد کے لیکچروں کا مجموعہ		آگرہ	١٣٣٦ھ
١٢٤	٦٤	ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ انکی زبانی	مرزا فرحت اللہ بیگ مرتبہ رشید حسن خاں	دہلی	١٩٩٢ء
			(ذ)		
١٢٥	٦٥	ذاتی ڈائری مولانا عبید اللہ سندھی مع رسائل	مولانا عبدالقدوس قاسمی	لاہور	١٩٤٦ء
			(ر)		
١٢٦	٦٦	رموز الاطباء (جلد دوم)	حکیم فیروز الدین	لاہور	
		روایات الطیب	قاری محمد طیب	تاج المعارف، دیوبند	١٩٤٥ھ
١٢٧	٦٧	روداد سال اول دارالعلوم دیوبند	مہتممان مدرسہ دیوبند		١٢٨٤ھ
١٢٨	٦٨	روداد مدرسہ عربی سہارنپور			
			(س)		
١٢٩	٦٩	سرسید احمد کی تعزیتی تحریریں	اصغر عباس	علی گڑھ	١٩٨٩ء
١٣٠	٧٠	سرسید احمد کا سفرنامہ پنجاب	سید اقبال علی	لاہور	١٩٧٣ء
١٣١	٧١	سرسید احمد خاں	پروفیسر خلیق احمد نظامی	پبلیکیشن ڈویژن دہلی	١٩٧١ء
١٣٢	٧٢	سرسید احمد اور علوم اسلامیہ	پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی	علی گڑھ	٢٠٠١ء
١٣٣	٧٣	سرسید ایم.اے.او کالج اور دینی شرقی علوم	ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی	علی گڑھ	٢٠٠١ء

۱۳۴	۷۴	سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات	پروفیسر خلیق احمد نظامی	ندوۃ المصنفین، دہلی	۱۹۸۱ء
۱۳۵	۷۵	سوانح قاسمی	مولانا مناظر احسن گیلانی	دار العلوم بک ڈپو دیوبند	۱۳۷۳ھ
۱۳۶	۷۶	سوانح عمری مولوی سمیع اللہ دہلوی	منشی ذکاء اللہ	لکھنؤ	۱۹۹۷ء
۱۳۷	۷۷	سیرت سید احمد شہید	مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی	لکھنؤ	۱۳۹۷ھ
۱۳۸	۷۸	سیرت یعقوب ومملوک	مولانا انوار الحسن شیرکوٹی	کراچی	۱۳۹۴ھ
۱۳۹	۷۹	سیر المنازل	مرزا سنگین بیگ تحقیق وترجمہ ڈاکٹر شریف قاسمی	دہلی	۱۹۸۲ء
			(ش)		
۱۴۰	۸۰	شاہ ولی اللہ اور انکی سیاسی تحریک طبع اوّل طبع دوم	مولانا عبید اللہ سندھی	لاہور لاہور	۱۹۴۲ء ۱۹۴۵ء
۱۴۱	۸۱	شمائم امدادیہ	حاجی مرتضیٰ خاں	قومی پریس، لکھنؤ	۱۳۱۴ء
			(ص)		
۱۴۲	۸۲	صوبہ شمال ومغربی کے اخبارات ومطبوعات	محمد عتیق صدیقی	علی گڑھ	۱۹۶۲ء
			(ض)		
۱۴۳	۸۳	ضمیمہ امداد المشتاق (شمائل امداد المشتاق)	نور الحسن راشد کاندھلوی	مکتبہ برہان، دہلی	۱۹۸۱ء
			(ط)		
۱۴۴	۸۴	طبقات شعرائے ہند	مولوی کریم الدین پانی پتی	(عکس طبع اول دہلی ۱۸۴۷ھ) لکھنؤ	۱۹۸۳ء
			(ع)		
۱۴۵	۸۵	عروس المومنین	نواب قطب الدین دہلوی	مطبع دار السلام، دہلی	۱۲۶۴ھ
۱۴۶	۸۶	علم وعمل	مرتبہ محمد ایوب قادری	کراچی	۱۹۷۰ء

		(ترجمہ وقائع عبدالقادر خاں)			
۱۴۷	۸۷	عمر رائیگاں آپ بیتی خواجہ احمد فاروقی (مشمولہ ارمغان فاروقی)	مرتبہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	دہلی	۱۹۸۷ء
			(ف)		
۱۴۸	۸۸	فتاویٰ نذیریہ	مولانا شمس الحق ڈیانوی مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری	طبع اول دہلی	۱۳۳۲ھ
۱۴۹	۸۹	فرہنگ آصفیہ	مولوی سید احمد دہلوی	دہلی	۱۹۷۴ء
۱۵۰	۹۰	فرائد الدہر	کریم الدین پانی پتی	مطبع العلوم، دہلی	۱۸۴۷ء
۱۵۱	۹۱	فہرست ذخیرہ شیفتہ کلکشن علیگڑھ	محمود حسن قیصر امروہوی		
۱۵۲	۹۲	فہرست مخطوطات فارسی (رضالائبریری) رامپور		رامپور	۱۴۱۷ھ
۱۵۳	۹۳	فہرست مخطوطات اردو (رضالائبریری) رامپور	مولانا امتیاز علی عرشی	رامپور	۱۹۶۷ء
			(ق)		
۱۵۴	۹۴	قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی احوال وآثار باقیات ومتعلقات	نورالحسن راشد کاندھلوی	کاندھلہ	۱۴۲۲ھ
۱۵۵	۹۵	قدیم دہلی کالج	مالک رام	دہلی	۱۹۷۴ء
۱۵۶	۹۶	قصص الاکابر	مرتبہ شہاب الدین	طبع اول ماہنامہ الہادی دہلی	۱۳۵۶ھ ۱۳۵۶ھ
۱۵۷	۹۷	قومی تہذیب کا مسئلہ	ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین	دہلی	۱۹۸۰ء
			(ک)		
۱۵۸	۹۸	کاروان ایمان وعزیمت	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی	لاہور	۱۹۹۰ء
۱۵۹	۹۹	ترجمہ کلمات الصادقین	شیخ صادق ہمدانی، دہلوی ترجمہ پروفیسر لطیف اللہ	کراچی	۱۹۹۵ء

			(گ)		
۱۶۰	۱۰۰	گلستان سخن	قادر بخش صابر مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی	لاہور	۱۹۶۶ء
			(م)		
۱۶۱	۱۰۱	مآثر صدیقی یا سیرت والا جاہی	نواب نور الحسن خاں	لکھنؤ	۱۳۴۲ھ
۱۶۲	۱۰۲	ماسٹر رام چندر	ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی	دہلی	۱۹۶۱ء
۱۶۳	۱۰۳	مرحوم دہلی کالج	مولوی عبد الحق	طبع دوم، دہلی	۱۹۴۵ء
۱۶۴	۱۰۴	مرآۃ العلوم (فہرست مخطوطات فارسی خدا بخش لائبریری)	مرتب عبد المقتدر	پٹنہ	۱۹۴۲ء
۱۶۵	۱۰۵	مرقاۃ الیقین فی حیات نور الدین	اکبر شاہ خاں نجیب آبادی	لاہور	بلا سنہ
۱۶۶	۱۰۶	مسلمانوں کا روشن مستقبل	مولوی طفیل احمد منگلوری	طبع اول، بدایوں	۱۹۳۸ء
۱۶۷	۱۰۷	مفتی صدر الدین آزردہ	عبد الرحمٰن پرواز اصلاحی	دہلی	۱۹۷۷ء
۱۶۸	۱۰۸	مقالات طریقت	عبد الرحیم ضیاء، حیدر آبادی	حیدر آباد دکن	۱۲۹۲ھ
۱۶۹	۱۰۹	مکاتیب رشیدیہ	مولانا عاشق الٰہی میرٹھی	خیر المطابع، میرٹھ	۱۳۲۴ھ
۱۷۰	۱۱۰	مکتوبات سرسید	شیخ اسماعیل پانی پتی (قادیانی)	لاہور	۱۹۷۶ء
۱۷۱	۱۱۱	مکتوبات اکابر دیوبند		دیوبند	۱۹۸۰ء
۱۷۲	۱۱۲	مکتوبات مولانا محمد یعقوب نانوتوی	مولانا محمد قاسم نیا نگری	طبع اول، احمدی ممبئی	۱۳۲۷ھ
۱۷۳	۱۱۳	ملفوظات حسن العزیز جلد اول	عزیز الحسن مجذوب	مکتبہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون	
۱۷۴	۱۱۴	موج کوثر	ڈاکٹر شیخ محمد اکرام	لاہور	۱۹۷۵ء
۱۷۵	۱۱۵	مولوی نذیر احمد دہلوی احوال و آثار	ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی	لاہور	۱۹۷۱ء
۱۷۶	۱۱۶	مومن شخصیت اور فن	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	دہلی	۱۹۷۲ء
۱۷۷	۱۱۷	میرے والد میرے شیخ	مولانا مفتی محمد تقی عثمانی	دہلی	۱۹۹۵ء

			(ن)		
۱۷۸	۱۱۸	نشر حالات محمدیہ (تذکرہ مولانا شیخ محمد تھانوی)	حکیم محمد عمر چرتھاولی	مطبع عثمانی، میرٹھ	۱۲۹۷ھ
۱۷۹	۱۱۹				
۱۸۰	۱۲۰	نسب نامہ (صدیقیان نانوتہ)	مفتی محمود احمد نانوتوی	دہلی	غالباً ۱۲۸۹ھ
۱۸۱	۱۲۱	نوائے آزادی	عبدالرزاق قریشی	بمبئی	۱۹۵۷ء
			(و)		
۱۸۲	۱۲۲	واقعات دارالحکومت دہلی ج:۲	مولوی بشیر الدین احمد	آگرہ	۱۹۱۹ء
۱۸۳	۱۲۳	وصال الجمیل (احوال شاہ جمیل الرحمٰن راشد دہلوی)	شاہ امان الرحمٰن دہلوی	دہلی	۱۳۴۳ھ
			(ہ)		
۱۸۴	۱۲۴	ہادی ہریانہ (تذکرہ شاہ محمد رمضان)	پروفیسر منظور الحق صدیقی	لاہور	۱۹۶۳ء
			(ی)		
۱۸۵	۱۲۵	یاد ایام	عبدالرزاق (البرامکہ) کانپوری	حیدرآباد، دکن	۱۹۴۶ء
۱۸۶	۱۲۶	مولانا یوسف بنوری نمبر		ماہنامہ بینات کراچی	
			رسائل		
۱۸۷	۱۲۷	سہ ماہی فکر و نظر اسلام آباد	قاضی محمد اعلیٰ تھانوی	نورالحسن راشد کاندھلوی	۱۴۱۰ھ
۱۸۸	۱۲۸	محرم تاریخ الاول			
۱۸۹	۱۲۹		اورینٹل کالج میگزین	لاہور	اگست ۱۹۶۲
۱۹۰	۱۳۰	مجلہ غالب نامہ، دہلی	باقیات آزردہ	نورالحسن راشد کاندھلوی	جنوری ۱۹۸۳ء
۱۹۱	۱۳۱	سہ ماہی احوال و آثار، کاندھلہ جنوری، فروری	حضرت سید طہٰ کتانوی	نورالحسن راشد کاندھلوی	۱۹۹۸ء
۱۹۲	۱۳۲				
۱۹۳	۱۳۳	ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ اکتوبر دسمبر	تقویۃ الایمان اور اس کے خلاف برپا شورش تاریخ وحقیقت کے آئینہ میں	نورالحسن راشد کاندھلوی	۱۹۹۳ء

۱۹۴	۱۳۴	سہ ماہی احوال وآثار کاندھلہ	حضرت میاں جیونور محمد جھنجھانوی اور ان کے پہلے پیرومرشد شاہ احسان علی پٹنی	نورالحسن راشد کاندھلوی	۱۹۹۵ء
۱۹۵	۱۳۵	ماہنامہ المآثر اعظم گڑھ	تعارف جواد ساباط ساباطی	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن محدث اعظمی	۲۰۰۲ء مئی تا جولائی
۱۹۶	۱۳۶	سہ ماہی العلم، کراچی			اپریل تا جون
۱۹۷	۱۳۷	ماہنامہ برہان، دہلی	مولانا حسین احمد مدنی	مرتبہ ایوب قادری	۱۹۸۷ء
۱۹۸	۱۳۸	رضا لائبریری جرنل رامپور	قاضی محمد اعلیٰ تھانوی	نورالحسن راشد کاندھلوی	
۱۹۹	۱۳۹	مجلہ الدراسات الاسلامیہ اسلام آباد	رحلتین الی الہند		
۲۰۰	۱۴۰	سہ ماہی اردو کراچی،	ایک نادر مجموعہ مکاتیب (یہ نام کتابوں میں بھی آچکا ہے)	ڈاکٹر محمد اکرام چغتائی	
۲۰۱	۱۴۱		شجرۂ فیض علم وکمال تلامذہ مفتی الٰہی بخش کاندھلوی	نورالحسن راشد کاندھلوی	

مؤلف کی چند دیگر قلمی خدمات

۱۔قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسمؒ نانوتوی: احوال و آثار اور باقیات و متعلقات (دو اڈیشن) :۷۷۵ر صفحات

۲۔مولانا عبداللہ انصاری: احوال و خدمات و علمی آثار :۲۵۰ر صفحات

۳۔تذکرہ حضرت مولانا محمد مظہرؒ نانوتوی :۲۲۴ر صفحات

۴۔تبرکات: حاجی امداد اللہؒ مہاجر مکی و مولانا رشید احمدؒ گنگوہی کے غیر مطبوعہ مکتوبات مع حواشی وغیرہ: (تین اڈیشن) :۸۸ر صفحات

۵۔حضرت مولانا انعام الحسنؒ کاندھلوی، امیر تبلیغی جماعت: شمارہ خاص مجلہ 'احوال و آثار، کاندھلہ': جس میں حضرت مولانا اظہار الحسنؒ کے مقام و مرتبہ اور شخصیت کا تعارف نیز تبلیغی تحریک کے قیام و فروغ اور اس کی برکات کا بھی جائزہ شامل ہے۔
(دو اڈیشن) :۷۵۰ر صفحات

۶۔مختصر تذکرہ بحر العلوم، خاتم مثنوی مولانا روم، حضرت مفتی الٰہی بخش نشاط کاندھلوی :۸۶ صفحات

۷۔معمولات رمضان المبارک (۸ر اڈیشن) :۸۸ر صفحات

☆ مدیر و مرتب سہ ماہی مجلہ 'احوال و آثار' کاندھلہ۔ ہر شمارہ تحقیقی، تاریخی دستاویزی مقالات اور انتہائی نادر غیر مطبوعہ تبرکات سے مزین۔ (اجراء ۱۴۱۵ھ/۱۹۹۶ء)

☆ دینی، علمی، تاریخی اور ادبی موضوعات پر ۹۰ر سے زاید مقالات ہند و پاک کے موقر رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔

اردو تراجم

۱۔ فضیلت قرآن: ترجمہ فضل القرآن: فارسی تالیف حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی (تین ایڈیشن) :۴۸/صفحات

۲۔ رسائل اصول حدیث: (عربی و فارسی) تالیف مفتی الٰہی بخش کاندھلوی: تمہید، ترجمہ، تعلیق، معہ عکس رسائل :۴۰/صفحات

منتظر طباعت

۱۔ باقیات فتاوٰی رشیدیہ: مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ساڑھے نو سو نہایت اہم غیر مطبوعہ فتوے، مع حواشی وضروری تصریحات :۷۰۰/صفحات

۲۔ کالا پانی۔ انڈمان کی سیلولر جیل میں جہاد حریت کے قیدیوں پر مظالم کی تاریخی دستاویز، سرگزشت مولوی محمد جعفر تھانیسری، خود مصنف کی شائع کی ہوئی دونوں طباعتوں کی مدد سے تصحیح و تکمیل متن اور اہم حواشی کے اضافوں کے ساتھ :۲۵۰/صفحات

۳۔ معرکہ شاملی و تھانہ بھون: ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے تسلط کے خلاف مقامی علماء و قائدین کے زیر قیادت عظیم الشان معرکہ حریت کی دستاویزی داستان، جس میں انگریز افسران کی ڈائریوں اور نادر ترین مآخذ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے :۳۵۰/صفحات

۴۔ تذکرہ حافظ محمد ضامن شہید: معرکہ ۱۸۵۷ء میں تھانہ بھون تحریک کے ایک ممتاز قائد اور شہید کے حالات :۲۴۰/صفحات

۵۔ مظاہر علوم سہارنپور کے بانیان کرام اور ابتدائی دور کے محترم اساتذہ کرام کے حالات اور اہم واقعات :۴۰۰/صفحات

۶۔ متعدد دیگر اہم موضوعات پر چھے کتابیں زیر تالیف و تحقیق۔

ناشر

حضرت مفتی الٰہی بخش اکیڈمی

محلہ مولویان، کاندھلہ ضلع مظفر نگر، (انڈیا)؛

Pin:247775

Delhi College ke Sadar Madarris aur

Rooh-e-Rawan

Ustazul Kul

Hazrat Maulana Mamlookul Ali (R.A.)

Ahwal, Khidmat, Tasaneef, Trajim, Aasar, Khandan aur Tlamiza

Taleef

Noorul Hasan Rashid Kandhlavi

Nashir

Mufti Elahi Bakhsh Academy

Kandhla, Distt: Muzaffar Nagar (U.P.) India

Pin: 217775

